مینجنگ ایڈیٹر خالد علی

چیف ایڈیٹر آصف حسن

ایڈیٹر شاہد علی

سب ایڈیٹر محمد ذیشان

قیمت -/60 روپے

سالانہ قیمت -/1080 روپے

جلد نمبر 16 شمارہ نمبر 10 جولائی 2015ء

ای میل ایڈریس: Dardigest01@gmail.com

خواتین کی بہترین کہانیوں کا انتخاب

ماہنامہ

صائمہ

کراچی

اپنے وقت کی مایہ ناز، اور مشہور و معروف رائٹر۔ "اے آر خاتون" کا دلوں میں اتر جانے والا اور دماغ سے محو نہ ہونے والا چاہت کا ریکارڈ توڑتا ناول "شمع" جولائی 2015 سے ماہنامہ صائمہ میں ہر ماہ ضرور پڑھیں۔

ماہنامہ صائمہ میں آپ بھی اپنی رومانوی کہانیاں، افسانے، غزلیں، شاعری، بیوٹی ٹپس، کھانا پکانے کے طریقے، مشکلات کا حل، اور گھریلو ٹوٹکے وغیرہ شائع کرواسکتی ہیں۔ آپ اپنی کاوشیں ارسال کریں تاکہ ماہنامہ صائمہ میں آپ کے نام سے آپ کی کاوشیں جلوہ گر ہوسکیں۔

کہانیاں ارسال کرنے کے لیے ہمارا پتا ہے۔

نورانی آرکیڈ۔ میزانائن فلور رتن تلاؤ نمبر ۳، کراچی

رابطے کے لئے:۔

021-32711915

021-32744391

نے سٹی پریس تالپور روڈ کراچی سے چھپوا کر شائع کیا۔

خط وکتابت کا پتہ: ماہنامہ ڈر ڈائجسٹ نورانی آرکیڈ نیو اردو بازار کراچی: 32744391

خطوط

سیدہ عطیہ زاہرہ لاہور سے، سب سے پہلے معذرت چاہتی ہوں، اس کی وجہ لاہور کا موسم ہے، آج کل لاہور کی آب و ہوا میں گرمی کے ساتھ ساتھ امتحانی پرچوں کی ہوا بھی شامل ہے۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں اپنی اکیڈمی چلا رہی ہوں اور جب بات طلبہ کے امتحانات کی ہو، تو ذمہ داری بہت بڑھ جاتی ہے۔ پھر میں خود بھی ایم اے اردو کی تیاری کر رہی ہوں۔ جون یا جولائی میں امتحانات متوقع ہیں۔ بس ان سب مصروفیات کی وجہ سے کہانی بروقت نہ لکھ سکی، اب ایک چھوٹی سی کہانی حاضر خدمت ہے اور ہاں میں ان سب دوستوں کی شکر گزار ہوں، جنہوں نے میری کہانی کو پسند کیا، اچھا اب اجازت دیں۔ اللہ حافظ۔

☆☆ عطیہ صاحبہ: کہانی لیٹ بلکہ بہت لیٹ موصول ہوئی، جس کی وجہ سے شامل اشاعت نہ ہو سکی اس کے لئے معذرت، جب کوئی مستقل رائٹر شمارے میں حاضر نہیں رہتا تو ذہن بہت متاثر ہوتا ہے کہ کاش! خیر امید ہے آئندہ خیال رکھیں گی۔ Thanks۔

طاہرہ آصف ساہیوال سے، جون 2015ء کا شمارہ میرے ہاتھ میں ہے، اس بار بھی بروقت ملا اور خوب ملا، اپنی کہانی دیکھ کر بہت خوشی ہوئی مگر جا بجا ہندو الفاظ کی پیوند کاری بہت ناگوار گئی، تمام باتوں سے قبل میں ادارے اور مصنفین دونوں سے عرض کروں گی کہ ہم جو بھی لکھتے ہیں اس کو لکھتے اور اشاعت کے وقت اپنی قومی اور محبوب زبان کو ہر بات پر ترجیح دینی چاہئے۔ ہندی الفاظ سختی سے ترک کر کے واپس اپنے خوب صورت زبان و بیان پر آئیں ساتھ ہی انگریزی کی جگہ متبادل اور مترادف اردو کا لفظ استعمال کیجئے۔ اب بات ہو جائے تحریروں کی تو ردو کا کا اول درجے پر ہے۔ الیس امتیاز صاحب بھی خوب لکھتے ہیں، ضرغام محمود صاحب نے بھی جاندار کہانی تحریر کی، رضوان علی سومرو کی خاصی سنسنی خیز مگر مختصر تحریر تھی، باقی سب بھی ابھی زیر مطالعہ ہے۔ خناس کی یہ قسط بہت ہی پھنس رہی، جادو ٹونہ کے معاملات کو انہوں نے سائنس فکشن سے جا ملایا اور رہ جیسی ماہر نفسیات کو ایک دم ہی عام لڑکی بنا دیا۔ خیر کہانی کی طوالت بھی سمجھ میں نہیں آئی۔ آخر میں تمام پسند کرنے والوں کی مشکور ہوں جنہوں نے میری تحریروں کو پسند کیا، آپ سب سے درخواست ہے کہ جولائی کے شمارے میں آنے والی میری تحریر کو پڑھ کر اپنا تبصرہ دینا نہ بھولئے گا کیونکہ وہ ذاتی طور پر میری سب سے بہترین تحریر ہے مگر فیصلہ بہرحال سب پڑھنے والوں کا ہوگا۔

☆☆ طاہرہ صاحبہ: آپ کی بات درست ہے کہ خواہ مخواہ ہندی الفاظ کی پیوند کاری ٹھیک نہیں لگتی مگر جس ماحول کی کہانی ہوتی ہے تو اسی مناسبت سے الفاظ اچھے لگتے ہیں۔ اب اگر ہندی کہانی ہے اس میں بھگوان کی جگہ "اللہ تعالیٰ" لگا دیں تو کیا مناسب رہے گا، یا پھر "آتما" کی جگہ "روح" لکھ دیا جائے تو اب بھی ٹھیک نہیں۔ ویسے بے جا ہندی الفاظ کا استعمال ٹھیک نہیں۔ کہانی شامل اشاعت ہے اور اب قارئین کی رائے کا انتظار کریں۔

مریم فاطمہ حیدرآباد سے، السلام علیکم، مئی 2015ء کے شمارے میں میری کہانی "موت کا بدلہ" شائع ہوئی، اس بات سے مجھے اتنی خوشی محسوس ہوئی ہے کہ میں بتا نہیں سکتی، میری کہانی کی نوک پلک سنوار کر اسے اور بھی خوب صورت بنا دیا گیا ہے۔ میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں، میں انشاء اللہ آئندہ بھی کہانیاں لکھ کر بھیجتی رہوں گی۔ میری دعا ہے کہ اللہ پاک ڈر ڈائجسٹ کو مزید ترقی دے۔

☆☆ مریم صاحبہ: آپ کی کہانی کافی اصلاح کے بعد شائع ہوئی ہے۔ لکھتے لکھتے آدمی نکھارتی جاتا ہے اور آپ ایک کہانی لکھ کر بیٹھ رہیں، جلد از جلد کہانی بھیجیں اور ساتھ ساتھ ہر ماہ تجزیہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

صبا محمد اسلم گوجرانوالہ سے، السلام علیکم! خیریت کے بعد عافیت کی طالب، جون کا شمارہ ملا، ٹائٹل بہت زبردست تھا، سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھیں، جسے پڑھ کر دلی سکون محسوس ہوا، یہ بات سچ ہے کہ جو مزہ قرآن کو پڑھ کر دل کو بہت اطمینان ہوتا ہے۔ اس کے بعد خطوط کی محفل میں قارئین کے لئے جو خالد علی صاحب نے لکھا۔ وہ بہت اچھا لکھا اور بالکل صحیح ہے کہ ہم سچ میں دنیاداری میں مگن ہیں، ہمیں احکام الٰہی تک کی خبر نہیں ہے ہم اپنے روزے، نماز، زکوٰۃ سے بالکل بے خبر ہیں، خطوط کی محفل میں چار ماہ کی غیر حاضری کے بعد جب دیکھا تو دل خوشی سے باغ باغ ہو گیا یہ دیکھ کر کہ نئے رائٹرز کی آمد ہوئی ہے اور مجھے خوشی ہے کہ ڈر ڈائجسٹ مزید ترقی کر رہا ہے اللہ سے دعا ہے کہ اور مزید ترقی کرے، ڈر ڈائجسٹ کو لکھنے والے سب لوگوں کو اور ایڈیٹرز کو اللہ اپنے حفظ و

اد ن میں رکھے۔ مدثر بخاری، شرف الدین جیلانی، محسن عزیز حلیم، منعم اصغر، شاہد رفیق سہو، محمد ابو ہریرہ بلوچ ان سب کی میں بے حد دل سے شکر گزار ہوں کہ انہوں نے میرے والد کے لیے اور میرے سب گھر والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھا ہے۔ بہت بہت شکریہ۔ والد کے نہ ہونے کا احساس تو ہمیں اب ہوا ہے کہ جب کسی گھر سے کوئی ایک فرد بھی چلا جاتا ہے تو گھر بالکل بے رونق ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا گھر بھی بالکل بے رونق لگتا ہے لاکھ کوشش کے باوجود بھی زندگی کی خوشیوں کی طرف لوٹ کر نہیں آپا رہی۔ ہر وقت ابو کی یاد آتی ہے اور پھر اداسی چھا جاتی ہے۔ بہت کوشش کر رہی ہوں کہ میں واپس ڈائجسٹ میں کہانیاں لکھوں خود کو مصروف رکھنے کی کوشش کروں۔ پلیز آپ لوگ دعا کیجئے گا کہ میں اس کوشش میں کامیاب ہو جاؤں۔ کہانیوں میں سب کی کہانیاں اپنی مثال آپ تھیں۔ کسی ایک کی تعریف کرنا زیادتی ہوگی۔ قوس قزح میں سب کے شعر غزل اچھے تھے سنبل ماہین کی دو لائن کا شعر میرے دل پہ لگا۔ بہت اچھا لکھتی ہیں سنبل ماہین۔ دعا ہے کہ ڈائجسٹ مزید ترقی کرے (آمین)

☆☆ صبا صاحبہ: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا فرمائے اور آپ تمام اہل خانہ کو صبر جمیل دے، والدین کا بدل کوئی بھی نہیں، خیر دل لگتا نہیں بلکہ لگانا پڑتا ہے، جانے والوں کے لئے ہر پل اداس رہنے اور یاد کرنے سے اچھا ہے کہ ان کے لئے دعائے مغفرت کی جائے کوشش کریں، خود کو مصروف رکھنے کی اور اس طرح دل بہلتا رہتا ہے۔ امید ہے آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا یاد رکھیں گی۔

فلک زاہد لاہور سے، السلام علیکم آج کل میں پرانے ڈر ڈائجسٹوں کا بڑے شوق سے مطالعہ کر رہی ہوں۔ ایس امتیاز احمد ڈر ڈائجسٹ کے سب سے زبردست رائٹر ہیں۔ ''سکتے کی موت'' اور ''بدروحوں کا مسکن'' دل ہلاتی کہانیاں تھیں۔ ڈر کے مارے رات بھر سو نہ سکی۔ اپنے بستر میں ہی دبکی پڑی رہی۔ انگریزی کہانیوں میں۔ لا حاصل انتظار، ساجدہ راجہ، خس کم، بشیر احمد بھٹی اور شکاری عطیہ زاہرہ صاحبہ کی لاجواب کہانیاں تھیں۔ فرحان احمد نجیب صاحب کی ''شہزادی'' اور ''شیلا'' اچھی کہانیاں تھیں مجھے روایتی مشرقی کہانیاں کم ہی متاثر کر پاتی ہیں۔ مجھے مغربی طرز کی تحریریں پڑھنے کا بہت شوق ہے اور میرا یہ شوق ڈر ڈائجسٹ کے مطالعے سے پورا ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں انگریزی کہانیاں بھی شائع ہوتی ہیں۔ ڈر ڈائجسٹ میں حوصلہ افزائی ہو رہی ہے۔ یہی میرے لیے کافی ہے۔ اس کے ساتھ ہی اپنی کہانی ''گڑیا'' بھیج رہی ہوں۔ اگر اشاعت کے قابل ہوئی تو۔ خیر میں بھائی ایس، امتیاز احمد، بھائی عثمان غنی، بھائی خالد شاہان، آپی ساحل دعا بخاری، آپی بلقیس خان اور ایس حبیب خان صاحب کی رائے کا شدت سے انتظار رہے گا۔ خدا حافظ

☆☆ فلک صاحبہ: آپ کو دلی طور پر ڈر کی کہانیاں پسند ہیں۔ اس کے لئے بہت بہت شکریہ، میری رائے تو یہ ہے کہ اچھا رائٹر وہ ہے جو اپنے معاشرے پر عبور رکھتا ہے، آپ نے دیکھا ہوگا کہ بڑے بڑے مغربی رائٹرز زیادہ تر اپنے معاشرے کی کہانیاں لکھتے رہے ہیں اور عروج پر پہنچے۔ خیر اپنی اپنی سوچ بوجھ ہے۔ ایک کہانی بھیج کر آپ انتظار میں نہ بیٹھا کریں، کم از کم دو تین کہانیاں تو ارسال کر دیں، گڑیا لائن میں لگی ہے انتظار کریں۔

رویتہ اجمل اٹک سے، السلام علیکم، یہ میرا ڈر ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے میں نے ڈر ڈائجسٹ پڑھا تو مجھے بہت پسند آیا۔ میں خوفناک کہانیاں لکھتی ہوں۔ چند ناول بھی لکھ چکی ہوں۔ میں ڈر ڈائجسٹ میں کہانی بھیجنا چاہتی ہوں۔ مگر مجھے طریقہ نہیں آتا۔ میں نے سنا ہے کہ ایک لفافے میں محدود تعداد سے زائد صفحات بھیجنے سے خط بیرنگ ہو جاتا ہے۔ براہ مہربانی مجھے کہانی بھیجنے کا طریقہ بتائیں۔ اور وہ وجوہات بھی جن کی وجہ سے کہانی ناقابل اشاعت قرار پاتی ہے۔ مجھے امید ہے کہ آپ جواب ضرور دیں گے۔

☆☆ رویتہ صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید کہانی کو لفافہ میں بند کر کے ڈاک سے رجسٹری کرا دیں۔ یہی طریقہ ہے، ڈر کے موضوع پر کہانی لکھیں تو ضرور شائع ہوگی۔ جب تک کہانی سامنے نہ ہو تو کوئی بھی اپنی رائے نہیں دے سکتا امید ہے آپ آئندہ ماہ بھی ضرور رابطہ کریں گی۔ Thanks

ثروت عزیز گوشی کوٹھا کلاں سے، امید کرتی ہوں تمام اہل ڈر خوش ہوں گے۔ خدا سب کو خوش رکھے میں ڈرتے ڈرتے لکھ رہی ہوں کہ شاید شامل اشاعت ہوگا بھی کہ نہیں اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو آئندہ بھی لکھوں گی محسن بھائی جب ڈائجسٹ لے کر آتے ہیں تو میں ان سے لے کر ضرور پڑھتی ہوں۔ ڈر کی کہانیاں سب ہی بہت اچھی ہوتی ہیں پچھلے چند ماہ میں ڈائجسٹ نہ پڑھ سکی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے مجھے چاند سا بیٹا عطا کیا تو میں مصروف رہی لیکن اب میں نے جون کا شمارہ پڑھا تو بہت اچھا تھا۔ قرآن کی باتیں بہت اچھی

تمہیں اگلے ماہ تک کے لئے اجازت چاہتی ہوں دعا ہے کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ ترقی کرتا رہے۔

☆☆ ثروت صاحبہ: چاند سا بیٹا بہت بہت مبارک ہو، اور ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید پہلے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب قوی امید ہے کہ آپ ہر ماہ اپنی مصروفیات کے باوجود ڈر ڈائجسٹ کے لئے بھی چند منٹ نکال لیا کریں گی۔ شکریہ۔

سیدہ صبا شرمین حاجی سجاول سے۔ ڈر ڈائجسٹ لکھنے اور پڑھنے والوں کو میرا سلام۔ میں ڈائجسٹ پڑھتی رہتی ہوں۔ مگر کبھی خط نہیں لکھا۔ سوچا کیوں نہ ڈر ڈائجسٹ میں کہانی بھیجی جائے؟ میں پہلی بار کہانی بھیج رہی ہوں امید ہے پسند آئے گی۔ میری گزارش ہے کہ پلیز میری کہانی ڈر میں شائع کریں۔ مجھے بڑی خوشی ہوگی اور آئندہ لکھنے کا حوصلہ بھی بڑھے گا۔ مجھے اپنی کہانی کا شدت سے انتظار رہے گا۔ ڈر میں سب اچھا لکھ رہے ہیں۔ میں سب کے لیے دعا کرتی ہوں کہ اللہ تعالیٰ سب پر اپنا فضل و کرم رکھے۔ سب خوش رہے اور ڈر میں لکھتے رہیں۔

☆☆ صبا صاحبہ: ڈر ڈائجسٹ میں ویلکم خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے شکریہ۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، پلیز! آئندہ ہ بھی خط بھیجنا نہ بھولے گا۔

آصفہ سراج لاہور سے۔ کہتے ہیں انسان عموماً آہستہ آہستہ ہی مرتا ہے۔ مگر جب کوئی اپنا مرتا ہے تو انسان کی ذات کا ایک مخصوص حصہ بھی اس کے ساتھ ہی دفن ہو جاتا ہے۔ ایسا ہی ہمارے ساتھ ہوا۔ 11 فروری 2015 بروز بدھ بھی قیامت صغریٰ کا دن تھا۔ ہم سب کے لئے جب ہم نے اپنے پیارے ابو جان کو بے جان اور بے حس و حرکت سفید لباس میں دیکھا کاش! کہ کوئی ایسا دن نہ آتا کہ ابو جی ہم سب سے جدا ہو کر جاتے آہ!!! ہمارے پیارے ابو جی اس دنیا سے چلے گئے۔ اب بھی ان کی یاد کے ساتھ کلیجہ پھٹ جاتا ہے۔ خیر انسان کو آہستہ آہستہ صبر آ ہی جاتا ہے۔ مگر پتہ نہیں کیوں ہمیں تو وہ بھی نہیں آتا۔ جیسے ہی آنکھیں بند کرتے ہیں تو جھٹ سے تصور میں ابو جی آجاتے ہیں۔ ساڑھے تین ماہ گزرنے کے بعد بھی ایسا ہی لگتا ہے کہ آج ہی ابو جی ہم سے جدا ہو کر گئے ہوں۔ ابو جی مجھے سب سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ ہم کیسے بھول پائیں گے انہیں مگر ہمیں انہیں بھولنا بھی نہیں ہے۔ ہر قدم کے ساتھ ان کی یاد آتی ہے جب لڑکھڑاتے ہیں تو ان کا ہاتھ آتا ہے جس سے ہمیں وہ سہارا دیتے تھے۔ دعا کے لئے درخواست ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری والدہ صاحبہ کو ہمارے سروں پر سلامت رکھے۔ اور انہیں صحت و تندرستی دے۔ اور انہیں صبر جمیل عطا فرمائے۔ اور ہمارے گھر پر اپنی رحمت کا سایہ رکھے۔ اور سب گھر والوں کو آپس میں حسن سلوک دے۔ اور میرے بہن بھائیوں کو صبر دے خصوصاً میری چھوٹی بہن صبا جو کہ ابو کی بہت لاڈلی اور چہیتی تھی۔ اللہ اس کے دل میں صبر ڈال دے۔ (آمین)

☆☆ آصفہ صاحبہ: یہی نظام قدرت ہے کوئی آتا ہے تو کوئی جاتا ہے خونی اور قلبی رشتے جدا ہو جاتے ہیں اور ان کی یادیں تڑپاتی رہتی ہیں۔ والدین چلے جاتے ہیں اپنے بچوں کو چھوڑ کر اور پھر وہی بچے والدین بن جاتے ہیں، یہی دنیا کی ریت ہے۔ انسان اور کر بھی کیا سکتا ہے۔ خیر جانے والوں کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا چاہیے اور بلا ناغہ دعائے مغفرت کرنی چاہیے۔ تا کہ کل ہمارے ہمارے لیے بھی ایسا ہی ہو۔ ہماری (اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے اور تمام قلبی رشتوں کو صبر جمیل۔

شرف الدین جیلانی ٹنڈوالہ یار سے۔ آپ کو ڈھیروں دعائیں جس طرح آپ نے میری تکلیف محسوس کی، میں آپ کا بہت شکر گزار ہوں، میں تو اللہ تعالیٰ کو ناراض ہی نہیں کرتا، میں تو دوسروں کے لئے جیتا ہوں دوسروں کی خوشی کے لئے رات ہو یا دن میں تو سائبیریا سے آنے والے پرندوں کا بھی بہت ہی خیال رکھتا ہوں، پھر بھی اللہ تعالیٰ نے میرا شریک حیات چھین لیا، کینسر کے مرض نے شریک حیات کو دنیا دیکھنے ہی نہیں دی، ہوسکتا ہے اس میں اللہ تعالیٰ کی مصلحت ہو، کبھی کبھی انسان کسی کو اپنی جان سے بھی زیادہ چاہتا ہے، وہ کہتا ہے کہ وہ مجھ سے کبھی جدا نہ ہوگا لیکن جب تقدیر اس کو جدا کرتی ہے تو وہ شخص بکھر جاتا ہے۔ بس وہ ہوتا ہے اور وہ جدا ہونے والی کی یادیں ہوتی ہیں۔ بلقیس خان کو بے انتہا خوشیاں مبارک، صدا خوش رہیں ہماری دعائیں سب کے لئے۔

☆☆ شرف الدین صاحب: یہی نظام قدرت ہے اللہ کسی کو کسی سے چھینتا نہیں بلکہ ایک اٹل نظام کے تحت ایسا ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ آپ کو صبر جمیل دے اور اہلیہ کو جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام دے، ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آئندہ آپ کو قلبی خوشی دے۔ جانے والوں کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ خیر ان کے لئے دعا کرتے رہا کریں۔ جانے والوں کو دعا کی ضرورت رہتی ہے۔

ایس امتیاز احمد کراچی سے۔ السلام علیکم! امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا! حاضر ہیں ماہ جون 2015ء کے فرینش تجزیے

کے ساتھ۔ ناول خوب صورت اور دل پر بار رہا، ناول کی حسینہ نہ جانے کیا لکھنا چاہ رہی ہے؟ ''قرآن کی باتیں'' مشعل راہ ہے آپ ہم سب کے لئے۔ خطوط کی محفل خوب اور اچھی رہی۔ ''آتما کا انتظار'' طاہرہ آصف نے کرائیں۔ ''ساہیوال'' سے بہت خوب صورت انداز میں لکھی گئی تحریر سطر سطر، سسپنس، گڈ۔ ''ناشکرا'' طارق محمود اٹک کی دلچسپ اسٹوری ہے، ان لوگوں کے لئے پیغام جو شکر ادا نہیں کرتے ۔۔۔؟ کیا بات ہے طارق جی! ''شیطانی سحر'' شہر سلطان کے مدثر بخاری لائے۔ Story مختصر مگر اچھی رہی۔ ''رداوکا'' اے وحید صاحب کی دلچسپ ناولٹ 121 ویں قسط میں بڑی چابک دستی سے آگے بڑھ رہی ہے۔ خوب صورت تحریر کچھ خوب صورت لکھنے والے، ویلڈن، A وحید صاحب! ''دوسری مخلوقات'' بشرا بلوچ جھکانی، کوٹری جامشورو سے لائیں، Story واقعی ہی ہے محنت کی ضرورت ہے۔ ''چمکدار آنکھیں'' سیدہ عطیہ زاہرہ ''لاہور'' سے لائیں۔ لکھنے کا خوب صورت انداز ۔۔۔ خوب لکھتی ہیں آپ ۔۔۔ خدا کرے اور زور قلم زیادہ ۔۔۔ ''آسیبی گھر'' الیس امتیاز احمد یعنی ہماری Story ہے، اب آپ کو بتانا ہے کہ Story اچھی ہے یا ۔۔۔؟ ''بوگی مین'' ناصر محمود فرہاد، فیصل آباد کی خوب صورت تخلیق ۔۔۔ آپ نے تو ہمیں بھی خوف کی دنیا میں پہنچا دیا۔۔۔۔ اچھا لکھتے ہیں۔ دور دور تک جائیں گے ۔۔۔ ''زندہ صدیاں'' M.A راحت کی اچھوتی تخلیق کی نویں قسط عمدہ رہی، راحت کی تعریف کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ وہ اپنی ذات میں ایک اکیڈمی ہیں۔ ''خونی مخلوق'' ضرغام محمود کراچی سے لائے کیا بات ہے، آپ کی تحریریں پختہ ہوتی جارہی ہیں، سسپنس اور خوف کا حسین امتزاج، زبردست۔ ''خبیث روح'' فلک زاہد لاہور آپ کو ہم ''ڈر'' کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں۔ بہت عمدہ Story لکھی ہے۔ جواب نہیں۔ امید ہے ہر ماہ اپنی خوب صورت Storys سے ''ڈر'' کی محفل سجاتی رہیں گی۔ ''خونی کہانی'' رضوان علی سومرو کراچی سے لائے، آپ نے Story مسٹری لکھی ہے، بہت اچھی ہے مگر تھرلرز اور ہاررز میں فرق ہوتا ہے۔ ''بوسیدہ ڈائری'' ملک N.A کاوش سیانوالی، سرگودھا سے ہارر اسٹوری لائے، دلچسپ کہانی کا بے مثال اختتام کیا بات ہے۔ اچھی Story بہت دن بعد پڑھنے والوں کو ملی، اگلے ماہ بھی Story کا انتظار رہے گا۔ ''انوکھی دوستی'' ساجدہ راجہ ہنڈوال، سرگودھا، ماورائی اسٹوری لائیں ۔۔۔ کہانی عمدہ رہی ۔۔۔ گڈ۔ ''عشق ناگن'' ایم الیاس کی محبت اور سسپنس سے بھرپور ناولٹ 21 ویں قسط میں داخل ہوگئی، بہت عمدہ اور خوب صورت انداز تحریر دل موہ لینے والے خوب صورت انداز کیا بات ہے، ویلڈن الیاس جی! ''اجنبی قدم'' ساحل دعا بخاری ''بصیر پور'' سے لائیں۔ کہاں غائب ہوجاتی ہیں، آپ! آپ کی Story کا جواب نہیں۔ خدا کرے اور زور قلم زیادہ۔ ''قوس قزح'' ''ڈر'' کے خوب صورت ویورز کے خوب صورت اشعار بہت خوب اور دل میں اتر جانے والے ''غزل'' جن کے مصرعے غزل کی جان آ جاتا ۔۔۔ خوب صورت غزل خوب صورت انتخاب، ہم سب کے لئے ''خناس'' ''وجیہہ سحر'' کی خوف و ہراس میں ڈوبی تحریر 5 ویں قسط میں پہنچ گئی۔ لکھنے کا دلفریب انداز سطر سطر سسپنس، ویلڈن وجیہہ جی ۔۔۔۔ آپ بہت اچھا لکھ رہی ہیں ۔۔۔ گڈ۔ ڈر کے اسٹاف اور ''ڈر ڈائجسٹ'' کے تمام خوب صورت لکھنے والے رائٹرز اور تمام خوب صورت پڑھنے والے ویورز کو دعا سلام۔ ڈر کے تمام قارئین سے درخواست ہے کہ میرے لئے پلیز دعا کریں کیونکہ میرے ''بچے'' کا آپریشن ہونے والا، میں جلد صحت یاب ہوجاؤں، شکریہ۔

☆☆ امتیاز صاحب: ہماری اور تمام قارئین کی قلبی دعا ہے کہ آپریشن کے بعد آپ جلد از جلد صحت یاب ہوجائیں اللہ تعالیٰ آپ پر اور آپ کے تمام اہل خانہ پر اپنا فضل و کرم رکھے اور ڈھیروں خوشیوں سے نوازے۔ (آمین)

اسحاق انجم قصور سے، السلام علیکم! امید ہے سب خیریت سے ہوں گے! فون پر رابطہ ہوا، یاد آوری کا بہت بہت شکریہ! صحت کبھی خراب اور کبھی ٹھیک! اب تو یہ سلسلہ ہی چل نکلا ہے، اب کیا کیا جائے! آپ کی اور دوستوں کی دعاؤں کا بہت بہت شکریہ! دوست یاد رکھتے ہیں مگر کچھ ہمارے ''باوفا دوست بے وفائی کی حد کو چھو کر ہمیں موت کی منزل کی جانب بھیج چکے ہیں اب سنو انشا جی'' کے کہنے پر جہاں زندگی کے 40، 50 سال گزارے وہاں سے کوچ کرلیا ہے اور وہ شہر چھوڑ دیا ہے، جہاں وفا کا چہرہ لئے بے وفا لوگ بس رہے ہیں! ہمیں کسی سے کوئی شکوہ نہیں، کوئی شکایت نہیں، بس خدا سب کو سلامت رکھے۔ سب سے بڑی بات آپ ہر نئے لکھنے والے سے تعاون کرتے ہیں، ان کی تحریروں کو سنوارتے ہیں، نوک پلک اور ان کو ردی کی ٹوکری میں نہیں جانے دیتے۔۔۔! اچھا احباب مجھے اپنی نگارشات دے جاتے ہیں اور جس ڈائجسٹ میگزین میں وہ کہتے ہیں میں انہیں بھیج دیتا ہوں۔ کبھی صحت کی خرابی کی وجہ سے دیر ہوجائے تو پھر بھی حاضری ہوتی رہے گی! آصف شہزاد الہ آباد، محسن عزیز، یاسر وکی، ایم ریاض قیصر راولپنڈی سے جناب خالد تبسم

صاحب آپ سب کا شکریہ آپ ڈر ڈائجسٹ پڑھتے ہیں اور مجھے اپنی دعاؤں میں یاد رکھتے ہیں! سب کا شکریہ!

☆☆ اسحاق صاحب: آپ کی چاہت ڈر ڈائجسٹ سے واقعی قابل دید ہے، ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ آپ کو اللہ تعالیٰ کلی صحت عطا کرے اور خوشیوں سے نوازے، بے وفا لوگوں کو بھول جانا ہی بہتر ہوتا ہے، کیونکہ ابھی بھی بہت سے لوگوں کو آپ کی ضرورت ہے، اللہ کو یاد رکھیں اللہ آپ کو اپنی رحمتوں سے نوازے گا۔

یاسر وکی دیپالپور سے، سارے قارئین کو محبت بھرا اسلام قبول ہو، میرا یہ ڈر ڈائجسٹ میں پہلا خط ہے، امید ہے کہ ادارہ مایوس نہیں کرے گا میں کافی پرانا رائٹر ہوں، ایک زمانہ تھا کہ قریباً ہر ڈائجسٹ میں لکھتا تھا لیکن تین چار سال سے یہ کام چھوڑ چکا ہوں، کافی عرصے بعد اپنے کزن سرفراز کے پاس تھنگ موڑ گیا تو وہ گھر میں ڈر ڈائجسٹ نئے لیٹ کے پڑھ رہا تھا، آنکھوں میں آنسو آ گئے کہ کبھی وقت تھا کہ میں خود بھی لکھتا تھا اور اسی طرح سے پڑھا بھی کرتا تھا، خیر حالات کی تنگ دستی نے سب چیزوں سے دور کر دیا، میرے کزن نے ڈیٹھنے کو کہا اور ساری بات پوچھی تو میں نے بتایا کہ یہ معمہ ہے اس نے حوصلہ دیا کہ یہ ڈائجسٹ میں دل سے پڑھتا ہوں، اس میں لکھو، وہ لوگ آپ کو مایوس نہیں کریں گے خیر اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو کہانیوں سے کر حاضر ہوتا رہوں گا، پلیز شائع کر دینا آپ کی نوازش ہوگی۔

☆☆ یاسر صاحب: ہمت مرداں اور مدد خدا، جواں ہمت والے ہی سرخرو ہوتے ہیں، آپ اپنی تحریریں بھیجیں ضرور حوصلہ افزائی ہوگی، حالات کا مقابلہ کرنے والے کامیاب ہوتے ہیں، امید ہے آئندہ ماہ خیر بھیج کر شکریہ کا موقع ضرور دیں گے۔

ظہور احمد صائم لاہور سے، السلام علیکم: ڈر کی محفل میں ڈرتے ڈرتے حاضری دینے کی کوشش کر رہا ہوں، امید ہے کہ خوش آمدید کہا جائے گا، ڈر کے ساتھ رابطے کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ میں ایک نیا اور جدوجہد کرتا ہوا شاعر ہوں، آپ کے رسالے کی پالیسی مجھے بہت پسند آئی ہے کہ آپ نئے لوگوں کی حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ میری یہ کوشش ہے کہ میں نئی نسل کی مشکلات، ان کی ذمہ داریوں اور ان کی نمائندگی کے لئے اپنی شاعری کو استعمال کروں، لیکن میری اس کوشش کو پایہ تکمیل تک پہنچنے کے لئے آپ کے تعاون کی اشد ضرورت ہے۔ میں بہ ہوش و حواس اس بات کا اقرار کرتا ہوں کہ میں نے آپ کے ادارہ کی پالیسیوں کو مکمل طور پر سمجھ لیا ہے اور یہ کہ میری شاعری میں کسی قسم کی فرقہ واریت، صوبائیت، لسانیت اور اخلاقی گراوٹ، ادبی تھکاوٹ، مصنوعی بناوٹ نہیں ہوگی۔ امید کرتا ہوں کہ آپ کی طرف سے مناسب حوصلہ افزائی کی جائے گی۔

☆☆ ظہور صاحب: چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی اور اب امید ہے کہ آئندہ سے حسب وعدہ اپنی تحریریں اور تجزیہ ضرور ارسال کرتے رہیں گے۔

سید محمود حسن کراچی سے، السلام علیکم! ماہ جون کا ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ کی طرح بہترین تحریریں لئے ہوئے تھا، خاص طور پر ردولوکا، دوسری مخلوقات، چمکدار آنکھیں بہت متاثر کن تھیں، عشق نا گن وہی رومانوی انداز لئے ہوئے ہے، اور اپنے اندر سحر انگیزی کا تاثر رکھتی ہے، آپ نے پہلے بھی میری کہانیاں ''شراب اجل'' اور ''خونی مسیحا'' شائع کی تھی جس کے لئے شکر گزار ہوں، اس مرتبہ بھی ایک چھوٹی سی کاوش بنام ''سرخ بگولے'' ارسال کر رہا ہوں۔ امید ہے کہ پذیرائی ملے گی۔ ڈر ڈائجسٹ کی دن دگنی اور رات چوگنی ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔

☆☆ محمود صاحب: چلئے دوبارہ حوصلہ افزائی ہوگئی تحریر ابھی پڑھی نہیں، اگر اچھی ہوئی تو ضرور شائع ہوگی، فکر نہ کریں، بس تحریریں ہر ماہ بھیجتے رہیں۔ شکریہ۔

محسن عزیز حلیم کوٹھا کلاں سے، السلام علیکم! جون کا شمارہ حسب توقع تھا، آپ ہر ماہ ہمیں شمارے میں جگہ دیتے ہیں، اس کے لئے Thanks آتما کا انتظار رہے گا آصف کی اچھی کہانی تھی اور عطیہ زاہرہ آپ کو چھوٹی کہانی زیب نہیں دیتی، لمبی کہانی لکھا کریں کیونکہ آپ اچھی رائٹر ہیں، ساجدہ آپی کی ہر کہانی اثر انگیز ہوتی ہے، ساحل دعا بخاری اپنے قلم کے جادو سے سب کو جکڑ لیتی ہیں، ویسے دعا عالم بخاری نہ جانے کہاں غائب ہیں۔ شگفتہ ارم درانی پلیز! ڈر میں انٹری دیں! خونی مخلوق، ضرغام محمود ویری فی، خبیث روح جو کہ فلک زاہد نے لکھی مجھے تو بہت اچھی لگی، بشریٰ بلوچ جسکانی نے دوسری مخلوقات لکھی، مختصر تھی لیکن اچھی تھی۔ بوسیدہ ڈائری ملک این اے کاوش نے بہت اچھا لکھا، قسط وار کہانیوں میں میری پسندیدہ کہانی عشق ناگن ہے۔ خناس بھی اچھی لگی۔ خطوط اور قوس قزح میں سب نے بہت اچھا لکھا، تو لیجئے یہ تھا جون کے شمارے کا نچوڑ، زندگی رہی تو پھر ملاقات ہوگی، ایک نئے تجزیہ کے ساتھ۔

☆☆ محسن صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے Thanks اور ہاں آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

شوکت علی بلوچ سینٹرل جیل کراچی سے، السلام علیکم! بعد سلام میری خالق کائنات سے دعا ہے کہ میرے پیارے ڈر ڈائجسٹ و اسٹاف اور میرے ڈر ڈائجسٹ کی پوری فیملی کو سدا خوش و سلامت رکھے اور انہیں تا قیامت ترقی و کامران عطا فرمائے، آمین، جناب ماہ جون 2015ء کا پیارا ڈر ڈائجسٹ 24 مئی کو موصول ہوا، جسے پاکر دل بے حد خوش ہوا۔ سب سے فرسٹ اپنی پیاری سسٹر صبا محمد اسلم کے والد صاحب کی وفات کا بے حد افسوس ہوا، اناللہ وانا الیہ راجعون، میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ مرحوم کو اپنے جوار رحمت میں جگہ عطا فرمائے اور مرحوم کے اہل و عیال کو صبر جمیل عطا فرمائے، اب آگے ماہ جون کے ڈر ڈائجسٹ کے بارے میں کہ سب سے پہلے قرآن کی باتیں پڑھ کر دل و روح کو نور سے منور کیا، پھر بزم خطوط کا مطالعہ کیا، خطوط میں بھائی سید مدثر شاہ بخاری صاحب اور بھائی محسن عزیز حلیم صاحب کا شکریہ، جنہوں نے مجھے میرے پیارے ڈر کے فیملی ممبر ہونے پر ویلکم کیا۔ میں پہلے بھی عرض کر چکا ہوں کہ مجھے قسط وار کہانیاں بہت ہی زیادہ پسند ہیں۔ قسط وار کہانیوں کے علاوہ مدثر بخاری صاحب کا شیطانی سحر، سیدہ عطیہ زاہرہ صاحبہ کی چمکدار آنکھیں اور اے ایس امتیاز احمد صاحب کا آسیبی گھر بھی اچھی تحریریں ہیں، اس کے علاوہ بھی تمام رائٹرز بھی خوب صورت لکھتے ہیں۔ بزم قوس قزح بھی لاجواب ہے۔

☆☆ شوکت صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس، امید ہے کہ آئندہ ماہ بھی خلوص نامہ ضرور ارسال کریں گے۔

منعم اصغر ڈیرہ غازی خان سے، السلام علیکم! ڈر کے تمام اسٹاف، لکھاری اور قاری کو میرا سلام، دعا کرتا ہوں کہ آپ سب جہاں بھی ہوں خوش اور سلامت ہوں، میری طرف سے رمضان سب کو بہت بہت مبارک، ڈر 22 تاریخ کو مل گیا، ڈر کو دیکھ کر اس قدر خوشی ہوئی کہ جون کے بجائے اپریل کا شمارہ اٹھا لیا۔ گھر آکر کھولا تو ایسا لگا کہ یہ تو پڑھا ہوا لگ رہا ہے۔ پھر ٹائٹل پر اپریل 2015ء دیکھ کر سر پیٹ لیا، خیر 23 کو ڈر مل گیا۔ ٹائٹل بے حد خوب صورت تھا۔ خطوط میں آپ کی باتوں نے بہت متاثر کیا، پلیز ہر شمارے میں لکھا کریں، باقی سب کے خط بہت خوب صورت تھے۔ میرا خط بھی شامل تھا دل خوشی سے باغ باغ ہوگیا اور بہت خوشی ہوئی کہ آپ کے آفس میں ردی کی ٹوکری نہیں ہے۔ سب سے پہلے "آتما کا انتظار" پڑھا۔ ویلڈن طاہرہ آصف خوب صورت لکھا آپ نے۔ اس کے بعد ناشکرا پڑھی، خیر شیطانی سحر بھی اچھی کہانی تھی۔ بوسیدہ ڈائرہ بھی بہت پسند آئی۔ دوسری مخلوقات، آسیبی گھر، بوگی مین، خبیث روح، انتہائی قدم، انوکھی دوستی، خونی کہانی اچھی رہیں، خونی مخلوق بھی مزے کی تھی، عشق ناگن اور رلوکا کی یہ قسط بھی زبردست رہی۔ خناس بھی خوب صورتی سے آگے بڑھ رہی ہے، زندہ صدیاں اچھی نہیں لگیں، باقی پورا رسالہ بھی اچھا تھا، ایک کہانی "خطرناک سائے" ارسال کر رہا ہوں، امید ہے اچھی ہوگی، اب میں چلتا ہوں، اس دعا کے ساتھ کہ ڈر ڈائجسٹ ہمیشہ یوں ہی ترقی کی منازل طے کرتا رہے۔ آمین۔

☆☆ منعم صاحب: ڈر ڈائجسٹ اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈھیروں شکریہ قبول کریں، آئندہ ماہ بھی نوازش نامہ بھیجنا بھولئے گا نہیں۔

ایم طاہر عباس شجاع آباد سے، آتی ہے یاد تیری لیتا ہوں نام تیرا، اے دل میں رہنے والو سب کو سلام میرا، امید کرتا ہوں کہ رائٹرز اور ڈر کا پورا اسٹاف خیریت سے ہوگا، میرا خط شائع کرنے کا شکریہ، اپنا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی لیکن دکھ بھی ہوا۔ دکھ اس بات کا کہ اس بار بھی میری اسٹوری شائع نہیں ہوئی، مئی کا شمارہ بہت ہی دلکش تھا۔ کہانیاں بھی بہت ہی اچھی ہیں۔ پہلی زندہ صدیاں، خناس، رلوکا اور روح کا انتقام بیسٹ اسٹوریاں تھیں، ساحل دعا بخاری کی اسٹوری اچھی تھی اور شاعری اور غزلیں اچھی تھیں۔ بھائی خالد شاہان کی اسٹوری نہ پاکر بہت دکھ ہوا، پلیز ان کی اسٹوری جلدی شائع کریں۔ آخر میں تمام پیارے دوستوں کو میرا محبت بھرا سلام۔

☆☆ طاہر صاحب: فکر نہ کریں، آپ کی کہانی بھی شائع ہوگی، ایک دو ذرا اچھی کہانیاں ارسال کر دیں، جو کہانی موجود ہے وہ اصلاح طلب زیادہ ہے اور اصلاح طلب کہانیاں التوا کا شکار ہو جاتی ہیں۔

قیصر جمیل پروانہ ماموں کانجن سے، 30 مئی 2015ء کو اچانک ہم سارے گھر والے قیامت صغریٰ سے دوچار ہوگئے، ہم تمام گھر والوں کو اپنے تن من اور کھانے پینے کا ہوش نہ رہا، کیونکہ ہمارے والد صاحب ہم سب کو روتا بلکتا چھوڑ کر خالق حقیقی

سے جا ملے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ برسوں کا ساتھ پلک جھپکتے ہی ختم ہو گیا، ہمارے سروں سے سایہ اٹھ گیا اور ہم بے یار و مددگار ہو گئے، والدین کا بدل نہیں ہو سکتا، قارئین سے التجا ہے کہ میرے والد صاحب کے لئے اللہ سے دعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ان کی غلطیوں اور کوتاہیوں کو درگزر کر کے انہیں اپنی جوار رحمت میں جگہ دے۔

☆☆ قیصر صاحب: ہماری اور قارئین کی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ آپ کے والد کو اپنی جوار رحمت میں جگہ دے کر جنت الفردوس میں اعلیٰ مقام عطا کرے اور آپ تمام گھر والوں اور تمام قلبی رشتوں کو صبر جمیل عطا کرے۔ (آمین)

مدثر بخاری شہر سلطان سے، محبت، خلوص اور چاہتوں کے بے پناہ جذبوں میں گندھا نیا تبصرہ حاضر خدمت ہے...!مزاج کیسے ہیں جناب؟ امید واثق ہے حال بہت اچھے ہوں گے دعا ہے رب ذوالجلال سے آپ سب کو حفظ و امان میں رکھے آمین جون کا زبردست رسالہ حاضر ہوا 20 مئی کو، ہمیشہ کی طرح بہترین ٹائٹل سے سجا...!قرآن کی باتیں پڑھیں، دل کو خوشی ملی...!خطوط سارے اچھے تھے، امتیاز بھائی اپنی پرانی روٹین پر لوٹ آئے، مطلب بقول ساحل بخاری کے، تبصرہ ختم...!اچھا جی جیسے آپ کی مرضی...!طاہرہ آصف کی تحریر تما کا انتظار زبردست رہی، ویری گڈ طارق محمود کی ناشکرا سبق آموز تحریر رہی، عطیہ زاہرہ نے بھی خوب لکھا، چمکدار آنکھیں، اچھی رہی۔ ایس امتیاز احمد نے آسیبی گھر پر اچھا مضمون دیا، ناصر محمود کی بوگی مین، ویری نائس، ساحل دعا کی کہانی بس ٹھیک رہی...!این اے کاوش کی بوسیدہ ڈائری بھی اچھی رہی !تمام لوگ بہتر سے بہتر لکھ رہے ہیں۔ اللہ پاک ان کو ہمت دے، تاکہ مزید اچھا لکھ سکیں، آمین۔ اور ویری ویری تھینکس شیطانی سحر کو جگہ دینے کا اور ان شاء اللہ یہ سلسلہ جاری رہے گا۔

☆☆ مدثر صاحب: نوازش نامہ ارسال کرنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ویری ویری تھینکس اور معذرت کہ آپ کی اس ماہ کی تحریر بھول چوک کی وجہ سے رہ گئی، پلیز ڈونٹ مائنڈ۔

ضرغام محمود کراچی سے، تسلیمات! ماہ جون 2015 کا ڈر ڈائجسٹ محبتوں کے ساتھ ملا، آپ کی یہی محبتیں تو ہیں جو ہمیں گرویدہ کئے ہوئے ہیں اس مادیت پرست دور میں ایسی محبتیں اب کہاں رہ گئیں، اللہ کا شکر ہے جو آپ جیسے لوگ معاشرے میں موجود ہیں جن کی وجہ سے نام وفا زندہ ہے۔ ماہ جون کا شمارہ ہاتھ میں آتے ہی دو دن میں پڑھ لیا۔ سب سے پہلے ان تمام قارئین کا شکر گزار ہوں جنہوں نے اس ناچیز کی تحریروں کو پسند کیا، خاص طور پر فلک ناز صاحب اور مدثر بخاری صاحب کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے نہایت اچھے الفاظ میں مجھ جیسے کم سخن کو یاد کیا۔ اب آتے ہیں تحریروں کی جانب پہلے محترمہ طاہرہ آصف صاحبہ کی کہانی آتما کا انتظار تھی، کہانی بہت اچھی تھی، مگر اختتام پر ایک جھٹکا کہ اس طرح کے اختتام کی امید نہیں تھی بہر حال کہانی بہت اچھی تھی۔ طارق محمود صاحب کی ناشکرا نواب اور حقیقت کی عمدہ تحریر تھی۔ مدثر بخاری کی شیطانی سحر نے اپنے سحر میں جکڑے رکھا۔ دوسری مخلوقات بشرا بلوچ جسکانی کی اچھی تحریر تھی۔ سیدہ عطیہ زاہرہ کی چمکدار آنکھیں کی چمک نے سچ مچ ہماری آنکھیں خیرہ کر دیں۔ ایس امتیاز احمد کے آسیبی گھر میں تو ہم بالکل قیدی ہی ہو گئے، بہت خوب امتیاز بھائی، بوگی مین ناصر محمود فرہاد کی کہانی کا نام دیکھ کر ہمیں بوگی مین نام کا ریسلر یاد آ گیا تحریر اچھی تھی۔ خونی مخلوق کے بارے میں کچھ نہیں کہہ سکتا، یقیناً اس تحریر پر دوسرے تبصرہ کریں تو زیادہ بہتر ہوگا، فلک زاہد صاحبہ کی خبیث روح نے واقعی اپنی خباثت کا ثبوت دیا اور مرنے کے بعد بھی اپنی حرکتوں سے باز نہیں آئی خونی کہانی رضوان علی سومرو اس کہانی میں جاسوسی کالی تھی مگر خوف نہیں تھا، بوسیدہ ڈائری ملک این اے کاوش نے اپنے الفاظ سے ہمیں اپنے سحر میں جکڑے رکھا بوسیدہ ہونے کے باوجود ڈائری نے نیا مزا دیا۔ انوکھی دوستی ساجد راجہ واقعی انوکھی دوستی انوکھی ثابت ہوئی، انجانی قدم ساحل دعا بخاری کا ایک عمدہ قدم ثابت ہوئی، دوسروں کے کام آنا ہے اصل زندگی ہے یا زندگی کا اصل مقصد ہے۔

وہ ہی لوگ ہیں جہاں میں اچھے
آتے ہیں جو کام دوسروں کے

سلسلے وار کہانیاں رولوکا، عشق ناگن، زندہ صدیاں اور خناس عمدگی کے ساتھ آگے بڑھ رہی ہیں۔ آخر میں اس دعا کے ساتھ خط کا اختتام کروں گا کہ اللہ تعالیٰ ڈر ڈائجسٹ کو مزید کامیابیاں عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین۔

☆☆ ضرغام صاحب: بہت بہت شکریہ کہ آپ قلبی لگاؤ کے ساتھ تحریریں بھیج رہے ہیں، اور قوی امید ہے کہ یہ محبت اور لگاؤ مضبوط سے مضبوط تر رہے گا۔ Thanks

ایم نادر شجاع آباد سے۔ السلام علیکم! امید ہے کہ ڈر کے تمام لکھنے اور پڑھنے والے خیریت سے ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ سب کو خوش رکھے۔ (آمین) مئی کا شمارہ پڑھا بہت اچھا لگا۔ میں ڈر کی قسط وار کہانیاں بڑے شوق سے پڑھتا ہوں۔ مئی میں آپی ساحل دعا بخاری کی خاموشی بہت پسند آئی، ملک این اے کاوش کی کہانی روح کا انتقام نے بہت مزہ دیا۔ اس کے علاوہ خوف کا شکار، دلہن کی روح، سکتے کی موت، زہریلی حسینہ بہت اچھی کہانیاں تھیں۔

☆☆ نادر شاہ صاحب: آدمی لکھتے لکھتے لکھاری بن جاتا ہے۔ ڈر ڈائجسٹ پاکستان کا وہ واحد رسالہ ہے جو اپنے لکھنے والوں کو قدر کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ آپ خود بتائیں کہ بے ربط کہانی ہو، اصلاح طلب بہت زیادہ، درمیان میں کوئی لائن خالی نہیں اور پھر دو تین کہانیاں لکھ کر بیٹھ جانا، کیا یہ ٹھیک ہے۔ آپ کوشش کریں اپنی تحریر کسی اور سے اصلاح کرا کے ارسال کریں۔ آپ کی تحریر بھی ضرور شائع ہوگی۔

ابن شمشاد کراچی سے۔ سب سے پہلے ڈر کے تمام لکھنے والوں اور پڑھنے والوں کو میرا سلام، ڈر ڈائجسٹ کو پہلی مرتبہ پڑھ رہا ہوں، نام تو پہلے بھی سنا تھا لیکن اس کو پڑھنے کی وجہ یہ نہیں کہ میں جو رسالہ لینے گیا تھا وہ مجھے ملا نہیں تو اس کو لے آیا۔ پڑھ کر بہت اچھا لگا اور دل نے مجبور کیا کہ میں بھی اس کا حصہ بنوں، سو خط لکھ دیا، امید کرتا ہوں کہ مجھے بھی خوش آمدید کہا جائے گا۔ قسط وار کہانیوں کے علاوہ تمام کہانیاں پڑھ ڈالی ہیں۔ سب ہی اچھی لگیں، لیکن سب سے زیادہ جس کہانی نے متاثر کیا، وہ ''عشق کے اسرار'' سیدہ عطیہ زاہرہ صاحبہ کی تھی۔ انشاء اللہ آئندہ بھی حاضری دوں گا۔ اگر حوصلہ افزائی ہوئی تو۔

☆☆ ابن شمشاد صاحب! ڈر ڈائجسٹ میں خوش آمدید، چلئے حوصلہ افزائی ہوگئی، اور اب امید ہے کہ آپ ضرور آئندہ بھی خط لکھیں گے۔

طارق محمود کامرہ کلاں اٹک سے۔ السلام علیکم! جون کا ڈر 21 مئی کو بذریعہ ڈاک ملا۔ (جس کے لئے بہت شکریہ) سرورق دیکھنے کے بعد کہانیوں پر نظر ڈالی اور اپنی کہانی پر نظر پڑتے ہی اتنی خوشی ہوئی کہ بتا نہیں سکتا۔ قرآن کی باتیں اور پھر خطوط کی محفل سب سے پہلے اداریہ پڑھا، ہمارے آج کل کے حالات مذہبی زندگی اور معاشرے کے بارے میں بہت اچھا تجزیہ تھا۔ آتما کا انتظار طاہرہ آصف کی کہانی بہت اچھی تھی۔ شیطانی سحر مدثر بخاری کی چھوٹی سی لیکن اچھی تحریر تھی، دوسری مخلوقات بشیر بلوچ کی اچھی کوشش تھی۔ چمکدار آنکھیں عطیہ زاہرہ واہ کیا خوب کہانی لکھی اچھی لگی۔ ویسے سانپ کی آنکھوں میں واقعی سحر ہوتا ہے۔ امتیاز احمد صاحب کی آسیبی گھر ایک تحقیقی اچھی تحریر تھی۔ خونی مخلوق ضرغام صاحب آپ نے اس دفعہ واقعی کمال کر دیا، بہت اچھے، ملک زاہد صاحب کی خبیث روح اچھی لگی۔ رولوکا، یوگی تین، زندہ صدیاں، خونی کہانی، انوکھی دوستی ساجدہ راجا صاحبہ کی اچھی تحریر تھی، سانپ اور انسان کی دوستی، عشق ناگن اچھی جا رہی ہے۔ انتہائی قدم ساحل دعا بخاری، خیر اور شر کے موضوع پر دل کو موہ لینے والی تحریر، خیر اور شر کی لڑائی میں ہمیشہ فتح خیر کی ہی ہوتی ہے۔ بوسیدہ ڈائری ملک این اے کاوش جس وقت پہنچی تھی بہت ہی اچھی تحریر تھی، خاص طور پر لکھنے کا انداز بہت ہی اچھا تھا۔

☆☆ طارق صاحب: خط لکھنے اور کہانیوں کی تعریف کے لئے ڈھیروں شکریہ، اچھی اچھی کہانیاں بھیجتے رہیں، کیوں ٹھیک ہے نا اور تجزیہ بھی، انوکھا آئیڈیا کمپوز ہو چکی ہے، آئندہ ماہ ضرور شامل اشاعت ہوگی۔

قاسم رحمان ہری پور سے۔ السلام علیکم! مئی کا ڈر بہت لیٹ ملا، ٹائٹل بہت زبردست تھا، اس مرتبہ ناصر محمود فرہاد شکر ہے آپ واپس آئے، آپ کی تحریریں لاجواب ہوتی ہیں، صبا محمد اسلم آپ کے والد کی وفات کا پڑھ کر بہت دکھ ہوا، یہ سچ ہے کہ ہر کسی کو ایک نہ ایک دن دنیا سے جانا ہے۔ مگر جانے والے اپنے پیچھے بہت سے لوگوں کو رنجیدہ کر جاتے ہیں۔ اللہ آپ کو صبر جمیل عطا فرمائے۔ مدثر بھائی کا تبصرہ جاندار اور کہانی زبردست تھی۔ کہانیوں میں اس ماہ کی ٹاپ اسٹوری منگنی پیا ان تھی۔ رائٹر کی گرفت کہانی پر بہت مضبوط تھی۔ خاموشی، آدم خور پودے اور عشق کے اسرار زبردست تحریریں تھیں۔ قسط وار میں رولوکا اور زندہ صدیاں زبردست طریقے سے آگے بڑھ رہی ہیں۔ میں اس خط کے ہمراہ ایک نئی کہانی پراسرار درخت ارسال کر رہا ہوں، اگر یہ کہانی بھی نہ چھپی تو پھر میں دوبارہ خود میں لکھنے کی ہمت نہ پیدا کر پاؤں گا۔ خط لمبا ہو رہا ہے، لیکن کوئی بات نہیں، آپ کی قینچی چھوٹا کر دے گی۔ ڈر کی مزید ترقی کے لئے دعا گو ہوں۔ اب اجازت، خدا حافظ۔

☆☆ قاسم صاحب: خوش ہو جائیں، آپ کی ''روح کی مدد'' شامل اشاعت ہے، یاد رکھیں۔ ''ہمت مرداں مدد خدا'' حوصلہ ہمت والے ہی کامیاب و کامران ہوا کرتے ہیں۔ آئندہ ماہ خط لکھنا بھول نہ جائیے گا نہیں۔

☆☆

تماشۂ فطرت

طاہرہ آصف۔ساہیوال

ایک جن کا حیرتناک شاخسانہ جو کہ پیدائش کے وقت سے ہی ایک وجود کے ساتھ جوانی تک رہا اور پھر ایک وقت آیا کہ اسے اپنے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر اپنا فیصلہ بدلنا پڑا اور پھر وہ ہوگیا جس کا تصور بھی نہ تھا

اچھی کہانیوں کے متلاشی لوگوں کے لئے خراماں خراماں دل کو موہ لینے والی ایک شاہکار کہانی

ہندوستان بنیادی اور مجموعی طور پر ہندو اکثریتی خطہ تھا لیکن یہ ماضی کی بات ہے زمانہ حال میں یہ ہندوؤں کے علاوہ مسلمان عیسائی سکھ اور آتش پرست، مذہب کی بھی سرزمین ہے جو کہ پاکستان بنگلہ دیش کی صورت میں ٹکڑوں میں تقسیم ہو چکا ہے، لیکن ماضی میں یہ صرف ہندوستان تھا۔ 1857ء کے بعد انگریزوں کا تسلط مکمل طور پر اس خطے میں ہوگیا، انہوں نے حکومت سنبھالی تو یہ خیال آیا کہ اگر وہ مختلف مذاہب کی اقوام پر اقتدار رکھتے ہیں تو کبھی بھی بغاوت کے خدشے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکے گا تو کیوں نا انہیں عیسائیت میں داخل کرلیا جائے تاکہ حاکم و محکوم کے مابین مذہبی فرق مٹ جائے۔

حکمہ برطانیہ نے اس نظریے کی بھرپور تائید کی اور انگلستان سے تبلیغ کے لئے سینکڑوں عالم اور مبلغ مشنری کی صورت روانہ کئے۔ انگریزوں نے اپنی ترغیب میں کشش پیدا کرنے کے لئے بہت سارے اسکول اسپتال اور فلاحی ادارے ان لوگوں کے لئے مختلف شہروں میں بنائے جو ان کے دین کو اختیار کریں، نیز مراعات اور روزگار کا بھی سنہرا جال ڈالا۔ ہندو ایک پیچیدہ سوچ کی حامل قوم ہے ابتدا میں برہمنوں نے مذہب کو رسوم کا گورکھ دھندہ بنائے رکھا اور تمام ہندو قوم کو گروہوں میں تقسیم کر کے ذات پات بنا دیں تاکہ مذہب پر ان کی ہی اجارہ داری رہے، مذہب ایک انفرادی چیز نہ تھی بلکہ ہر طبقہ مذہب کے لئے برہمنوں کا مرہون منت تھا اس کے پیچھے یہ سوچ تھی کہ عزت اور احترام کے ساتھ ساتھ انہیں ہاتھ پاؤں ہلائے بغیر مال و زر ملتا رہے تاکہ وہ سماج کی اہم ترین اکائی بنے رہیں۔

باقی طبقات کے ساتھ کسی حد تک خیریت گزری لیکن جو طبقہ صحیح معنوں میں پورے سماج کے زیر عتاب آیا وہ اچھوتوں کا تھا جو برہمنوں کے مطابق برہما کے پاؤں سے پیدا ہوئے ہیں۔ اچھوت کالے کلوٹے اور بہت حد تک کم صورت افراد تھے جو معاشرے کی ذلالت سہہ کر مزید کم صورت اور بدحال دکھائی دیتے تھے۔ یہ وہ پسے ہوئے لوگ تھے وہ ہندو آبادیوں سے دور رہتے، انہیں معاشرے میں کوئی مقام حاصل نہ تھا۔

وہ مذہباً تو ہندو تھے لیکن نہ تو عبادت گاہوں کا رخ کرنے کی اجازت تھی نہ ہی کسی تعلیم خصوصاً مذہب سے کوسوں دور رکھا جاتا، یہ آبادیوں کا رخ کرتے بھی تو باقی بالا طبقات کے گھروں میں صفائی کرنے اور غلاظت اٹھانے کے لئے، معمولی معمولی خطاؤں پر

بھی نہ ظلم کا نشانہ بنایا جاتا تا کہ کبھی یہ دوسرے طبقات کے سامنے سر اٹھانے کے قابل ہی نہ رہ سکیں، کھانے کے لئے انہیں وہی ملتا جو بالا طبقات کا پس خوردہ ہوتا کڑی محنت کے بعد بھی اتنا ہی ملتا کہ جسم و جان کا رابطہ رہ سکے۔

اب بات کرتے ہیں انگریزوں کے تبلیغی مشنری کی جو یہاں آکر عیسائیت کے پرچار پر لگ گئے لیکن پر اثر تبلیغ پر کشش مراعات اور دیگر پیشکشوں کے باوجود انہیں خاصی ناکامی ہوئی۔ کسی نے بھی عیسائیت میں دلچسپی ظاہر نہ کی۔

ہاں ایک طبقہ ضرور مائل ہوا وہ اچھوتوں کا تھا۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ ہندو تو کہلاتے ہیں مگر مذہب سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں اور انہیں معاشرے میں کوئی اہمیت نہیں دیتا تو عیسائی مبلغین کی دعوت پر ایک کثیر تعداد نے عیسائیت قبول کر لی۔ جس کے بعد وہ بلا امتیاز گرجا جاتے مشنری شفا خانوں سے مفت علاج کرواتے اور ان کے بچے اسکولوں میں جانے لگے۔

بہر حال عیسائیت ان کے لئے جائے پناہ ثابت ہوئی، مگر یہ اہمیت صرف انگریز سرکار کی جانب سے تھی ہندوؤں نے ان کی نئی حیثیت کو کوئی گھاس نہ ڈالی بلکہ انہیں بدستور اسی نظر سے دیکھتے۔ بہر حال انگریزوں کی فرمانروائی کا سب سے بہترین فائدہ ان اچھوتوں کو حاصل ہوا کیونکہ فوری طور پر نا سہی مگر کچھ دہائیوں کے بعد رفتہ رفتہ کچھ بہتر پوزیشن میں آگئے۔

غالباً 1880ء کے بعد ایک مشن جنوبی پنجاب کے دیہاتوں میں پہنچا جس نے ہر سطح کے لوگوں کے سامنے اپنی دعوت رکھی حسب معمول یہاں بھی اچھوتوں کے ایک پورے قبیلے نے ان کی دعوت سے زیادہ ان دیگر پیشکشوں کو دیکھ کر عیسائیت قبول کر لی۔ اس قبیلے کا ایک فرد بوڑھا مرلی چرن اپنے ایک بیٹا اور دو بیٹیوں کے ہمراہ عیسائیت میں آ گیا۔

تمام قبیلہ آبادی سے کچھ فاصلے پر جھونپڑیوں میں رہتا تھا مرلی نے اپنی زندگی دکھوں میں گزاری تھی اسے متعدد بار پیٹا گیا اس کی بیوی کو بھی حمل کے دوران ایک پنڈت کی بیوی نے محض شک ہونے پر تشدد کر کے ہلاک کر دیا تھا۔ واقعہ کچھ یوں تھا کہ مرلی کی بیوی اگر چہ اپنے قوم کے لوگوں کی طرح پکے رنگ کی تھی مگر جسمانی طور پر بھرپور اور پر کشش تھی۔ مقامی پنڈت جو وہاں کے بڑے مندر کا کرتا دھرتا تھا اس کے گھر صفائی اور کوڑا اٹھانے جاتی تھی۔

ایک روز پنڈت کی بیوی گھر سے باہر گئی ہوئی تھی اور وہ مقررہ وقت پر صفائی کرنے آ گئی اس کے حمل کے ابتدائی مہینے تھے، بظاہر وہ حمل سے نظر نہیں آتی تھی کام کے دوران پنڈت آ کر صحن میں بیٹھ گیا اور سرلا کو گہری نظروں سے دیکھنے لگا وہ بے خبر اپنے کام میں لگی رہی یہاں تک کہ پنڈت اٹھ کر اس کے قریب آ گیا اور بیہودگی کرنے لگا وہ بیچاری بھاگ جانا ہی چاہتی تھی کہ پنڈت کی گھر والی اچانک سے وارد ہوگئی اور یہ منظر دیکھ لیا اس سے قبل کہ وہ کچھ سمجھتی پنڈت نے جھٹ ساری بات سرلا پر ڈال دی اور کہا کہ ”یہ خود مجھے پھسلا رہی تھی۔“

پنڈت کی بیوی نے اس کی وضاحت سنے بغیر اسے پیٹنا شروع کر دیا۔ وہ بیچاری چیختی رہ گئی مگر اس نا معقول عورت نے اسے دھنک کر رکھ دیا وہ روتی گرتی پڑتی اپنی بستی میں آ گئی اس کی حالت دیکھ کر جو عورتیں موجود تھیں بھی آ گئیں، ممکن حد تک اس کی دیکھ بھال کی لیکن تشدد کے باعث نہ صرف اس کا حمل ضائع ہوا بلکہ زیادہ خون بہہ جانے کی وجہ سے اس کا انتقال ہو گیا۔

بیچارہ مرلی روتا پیٹتا رہ گیا لیکن اس کی سننے والا بھلا کون ہوتا رو دھو کر چپ ہو رہا مگر دل میں عناد اور بڑھ گیا اس نے اپنے تین بچوں کے ساتھ زندگی کی گاڑی دھکیلنی شروع کر دی، بیوی کے بغیر تو اکیلا آدمی ادھورا ہے اس کے ساتھ تو تین بچے تھے مگر بری بھلی گزرتی رہی یہاں تک کہ کڑی محنت اور فاقہ کشی نے اسے قبل از وقت بوڑھا کر دیا اب وہ بیماریاں بھی جھیل رہا تھا کہ یہ عیسائی مبلغ اس کی زندگی میں تبدیلی بن کر داخل ہوئے۔

باقی قبیلہ اور وہ خود بچوں سمیت عیسائی ہو گئے،

یہاں سے اس کی کہانی تو ختم ہوئی مگر اس کے بچوں کا مستقبل سنورنا شروع ہوگیا کیونکہ جب وہ اس خوشگوار دور میں داخل ہوا تو بیماریوں نے تقریباً اسے ختم کردیا تھا اس نے اپنے تینوں بچوں کا ذمہ دار فادر پیٹر کو ٹھہرا دیا اور سرکاری علاج معالجہ کے باوجود دنیا سے سدھار گیا۔ فادر پیٹر وہ شخصیت تھے جن کے ایما پر مرلی اور اس کے بچے عیسائی ہوئے تھے۔

بہرحال اس کی تدفین کے بعد اب فیصلہ فادر پر آ گیا۔ مرلی کی ایک بیٹی جو سب سے بڑی تھی فادر نے اسے سارا کا نام دیا وہ اٹھارہ برس کی تھی، اس کی شادی کا فیصلہ کیا گیا مگر پہلے اسے ایک سال تک چرچ کے تحت دینی تعلیم حاصل کرنا تھی پھر جہاں فادر مناسب سمجھتے اس کی شادی کروا دیتے اس سے چھوٹا بھائی جوزف اسے اس کی خواہش پر اسکول بھیجا گیا اگرچہ اس کی عمر پندرہ برس تھی۔ لیکن وہ خود تعلیم حاصل کرنے کا شوق رکھتا تھا اس کے بعد سب سے چھوٹی چودہ سالہ جو اب کیتھرین بن چکی تھی اسے فی الحال بہن کے ساتھ دینی تعلیم کے لئے رکھا گیا۔ یوں ان کو ہندوؤں کے سینکڑوں سال پرانے نظام استبداد سے نجات مل گئی۔ جوزف اسکول میں آ کر بہت خوش تھا۔ اگرچہ عمر کے لحاظ سے بڑا تھا مگر ابتدائی نصاب اس نے بہت تیزی سے پڑھ لیا، اسکول سے ملحق ہوسٹل میں رہائش تھی اس اسکول میں اکثریت انہی بچوں کی تھی جو نئے مذہب میں آ کر یہاں پڑھ رہے تھے۔

دوسری جانب سارا اور کیتھرین بے سہارا بچوں کے ادارے میں رہ رہی تھیں یہاں انہیں کسی حد تک انگریزی کی تعلیم اور مذہبی کتب پڑھائی جاتیں۔ ایک سال کا عرصہ پلک جھپکتے میں گزر گیا، سارا کی شادی اسی برادری کے ایک لڑکے سے کردی گئی۔ لڑکے کو نوکری بھی دی گئی اور وہ اپنے شوہر کے ہمراہ شہر جا کر بس گئی کیتھرین کو بھی اسکول بھیجنا چاہا مگر اس نے انکار کردیا، اسے تعلیم سے بالکل دلچسپی نہیں تھی البتہ کام کاج میں خاصی مستعد تھی۔

فادر پیٹر نے کسی حد تک اس کی طبیعت کو سمجھ لیا تھا وہ ابھی کم سن تھی، شادی بھی نہیں ہوسکتی تھی، انہوں نے اسے علاقے کے کمشنر کے گھر شہر بھجوا دیا۔ کمشنر کی بیوی کو ذاتی ملازمہ کی ضرورت تھی وہ گھریلو کام کے لئے تنخواہ دار ملازمہ بن گئی۔

سانولی کمزور سی کیتھرین جو شہر آئی تو سڑکیں اور پختہ مکانات دیکھ دیکھ کر حیران ہوتی رہی اس نے اپنی مختصر سی زندگی جھونپڑیوں میں گزاری تھی خاص طور پر جب وہ کمشنر کے بنگلے پر آئی تو اتنا بڑا پرآسائش گھر وسیع سبزہ زار اور مالکوں کا جاہ و حشم دیکھ کر تو سکتے کی کیفیت میں آ گئی۔ بہرحال وہ سب سے پہلے کمشنر کی بیوی روزلین سے متعارف ہوئی اسے مقامی زبان کم ہی آتی تھی لیکن کیتھی نے ایک سال میں انگریزی کی خاصی شد بد حاصل کرلی تھی تو گزارہ چل جانے کی امید تھی، ویسے تو بنگلے میں بہت سارے ملازم تھے مگر روزلین شوہر کے زیادہ مصروف رہنے کی وجہ سے تنہائی کا شکار تھی پھر اسے ایسی ملازمہ درکار تھی جو ہر وقت اس کے ساتھ مستقل رہے اور اس کی ہم مذہب بھی ہو یہ مسئلہ کیتھی کے آنے سے بخوبی حل ہوگیا۔

کمشنر کے دو بیٹے تھے جو انگلستان میں رہتے تھے، وہاں تعلیم حاصل کررہے تھے، روزلین صرف شوہر کی وجہ سے ہندوستان میں رہ رہی تھی ورنہ اس کا سارا خاندان وہیں تھا بیٹے بھی صرف چھٹیوں میں ملنے آتے پھر چھٹیوں کے اختتام پر واپس چلے جاتے۔

کیتھی بے شک ملازمہ کے طور پر رہ رہی تھی لیکن صحیح معنوں میں جنت میں آ گئی تھی کے دو چار کام زیادہ وقت روز کا دل بہلانا اچھا کھانا اچھا لباس اور رہتی بھی وہ بنگلے کے اندر ہی تھی بقیہ ملازمین کے کوارٹر تھے، شب و روز بہت سہل گزرنے لگے، روزلین باقی ملازمین کے ساتھ تو سخت رویہ رکھتی مگر کیتھی کے ساتھ نرمی برتتی خود کیتھی نے اس کی ملازمہ کے ساتھ دوست کی ضرورت بھی پوری کردی۔ دراز قامت اور خوش اندام روز صرف شوہر کی محبت میں ہندوستان میں رہ رہی تھی ورنہ اسے

اپنے بیٹے خاندان اور وطن سب بہت عزیز تھا۔

کیتھی اس عمر میں کمشنر کے بنگلے میں آئی جو کسی بھی انسان کے سیکھنے اور شخصیت بننے کی ہوتی ہے یہاں کے ماحول اور مالکوں کے دوستانہ رویے سے اس کے اندر کی غلامانہ سوچ مٹنے لگی وہ آہستہ آہستہ پر اعتماد ہونے لگی مہذب طور اطوار، وہاں آنے والے اعلیٰ افسران کی میزبانی اور طبقہ بالا کے اسلوب سے آشنائی ہونے لگی۔

دو سال میں وہ خاصی طاق ہوگئی۔ سونے پر سہاگہ کہ اچھی خوراک اور ذہنی مسرت نے اسے بہت نکھار دیا وہ بچی سے لڑکی بنتی گئی گویا چنگاری سے شعلہ ہوگئی، کالی رنگت سلونی ہوگئی اور جسم بھر کر آتش فشاں ہوگیا۔ پہلے تو وہ لڑکی بچی جاتی تھی اب تو بنگلے کے مرد ملازمین اسے بطور خاص تکنے لگے مگر وہ اپنی کھال میں مست رہتی، آتے شباب سے بے خبر اور مگن رہتی اسے اپنی مالکن بہت پسند تھی، کمشنر سے اس کا سامنا ہمیشہ کم کم ہوتا، ایڈورڈ کی موجودگی میں رہ روز سے دور رہتی تاکہ وہ مخل نا ہو، کیونکہ وہ خاصا مصروف بندہ تھا گھر میں آنے کے بعد اس کا سارا وقت صرف روز کے لئے ہوتا۔

بیتے عرصے میں وہ دوبار اپنی بہن کے پاس رہنے کے لئے گئی جب بھی اس کی بہن کے ہاں ننھے مہمان کی آمد ہونے والی ہوتی اس کا بہنوئی لینے آجاتا وہ بہن کا خیال رکھنے کے لئے چلی جاتی اور ایک ماہ رہ کر آجاتی اس کا بھائی بھی کبھی کبھی ملنے آجاتا وہ پڑھائی کے معاملے میں بہت سنجیدہ تھا تاکہ جلد از جلد تعلیم مکمل کر کے اچھے عہدے پر جاسکے، اس کی عمر اس کے لئے اگرچہ مسئلہ بنی تھی مگر وہ اس فرق کو اپنی محنت سے پورا کرنے میں جی جان سے لگا ہوا تھا، والدین وہ اکائی ہوتے ہیں جو پورے گھر کی سالمیت بنائے رکھتے ہیں وہ تینوں بن ماں باپ کے تھے اس لئے الگ رہ کر بھی مطمئن تھے۔

کیتھی کی بہتے پانی جیسی رواں زندگی میں پہلا پتھر تب آیا جب روز نے انگلینڈ جانے کا فیصلہ کیا، وہ دو تین ماہ کے لئے جارہی تھی تاکہ بچوں اور میکے والوں سے مل سکے کچھ وقت ان کے ساتھ گزار سکے اتفاق سے ایڈورڈ کو بھی ایک طویل مدت کے بعد مختصر رخصت ملی تھی وہ بھی ہمراہ جارہا تھا ایک ماہ بعد وہ واپس آجاتا لیکن روز چھٹیاں ختم ہونے پر ہی آنے والی تھی، اس کی غیر موجودگی میں اسے یہاں کوئی مسئلہ یا خطرہ تو نہیں تھا لیکن پھر بھی روز نے کہا کہ وہ اس عرصہ میں بہن کے ہاں رہ لے بہتر یہی ہوگا اس کا دل آمادہ تو نہیں ہوا لیکن اس کے علاوہ صورت کوئی نہیں تھی روز نے معقول رقم دے کر بہن کے پاس بھجوادیا۔

کافی عرصہ کے بعد بہن کے ہاں جانا ہوا تو وہ بہت خوش ہوئی بہنوئی نے بھی بہت خاطر مدارت کی، ابتداء کے چار چھ روز کے بعد وہ بیزار ہونے لگی سارا اور اس کا شوہر ایک قصبے میں رہتے تھے بہنوئی اپنی سائیکل پر قریبی شہر جاتا جہاں وہ ایک پولیس ہیڈ کوارٹر میں خاکروب تھا۔ بہن سارا دن گھر کے کاموں اور بچوں میں لگی رہتی یہاں کی زندگی میں جمود سا تھا بہن کے گھر میں وہ سہولیات بھی نہ تھیں جن کا وہ دو برسوں میں عادی ہوگئی، نتیجتاً وہ جلد اکتانے لگی۔ جبکہ سارا اس کی قسمت پر رشک کرتی کہ وہ سرکاری افسر کی بیوی کی منظور نظر بن کر نہ صرف بہت اچھی زندگی گزار رہی ہے بلکہ اس کی شخصیت اور رکھ رکھاؤ بھی بدل گیا ہے۔

بہر طور روز کے آنے تک یہ عرصہ تو اسے گزارنا ہی تھا سارا نے اس کی بے دلی کو محسوس کیا تو اسے آس پڑوس میں لے جانے لگی جہاں زیادہ تر مسلمان اور کچھ عیسائی خاندان تھے جوں توں کر کے ایک ماہ گزر گیا لیکن کیتھی نے اپنے بہنوئی کے رویے میں کچھ عجیب سی تبدیلی محسوس کی پہلے پہلے تو وہ ٹھیک رہا کچھ روز سے اس کی نگاہوں کا زاویہ بدل گیا جب بھی سارا قریب نہ ہوتی وہ کیتھرین کو بغور مسلسل دیکھے جاتا یوں جیسے آنکھوں سے جکڑ لینا چاہتا ہو بلاضرورت اس کے قریب جانے اور چھونے کی کوشش کرتا، پہلی بار کیتھرین نے اپنا جائزہ لیا تو اسے احساس ہوا کہ اس میں اور اس کی بہن میں

بہت کچھ مختلف ہے جو اسے بہکا رہا ہے وہ کچھ وقت احتیاط کرتی رہی اس کے سامنے ہی نہ جاتی اور اگر جاتی تو دور رہتی بات چیت بھی محدود کردی لیکن اس کے گریز نے اسے اور شیر کردیا۔

اب وہ موقع کی تلاش میں رہتا کہ وہ تنہا ہو تو وہ بلاوجہ جاکر بے باکی دکھاتا کیتھی پریشان ہوگئی کہ کیا کرے اگر بہن کو بتاتی تو دونوں کے بیچ جھگڑا ہوتا لیکن بہت سوچنے کے بعد یاد آگیا کہ وہ اتنی اہم بات بھول کیسے گئی اب وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ موقع ملے تو وہ اس کا مزاج درست کرے۔

ایک روز اس کی بہن کسی کام سے پڑوس میں گئی تو حسب معمول جیکسن باچھیں پھیلائے اس کے قریب آگیا۔ کیتھی خود منتظر تھی وہ اس کے سامنے بالکل قریب جاکر کھڑی ہوگئی اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا۔ ''جیکسن تم بھول رہے ہو کہ میں کون ہوں، سالی کے رشتے کو تو تم نے بگاڑ دیا مگر یہ بھی بھول گئے کہ میں کمشنر ایڈورڈ کی بیوی کی ذاتی ملازمہ ہوں، میری شکایت پر تم کہاں جاؤ گے یہ تو معلوم نہیں لیکن میری بہن کو تم سے بہتر شوہر مل جائے گا۔ یہ بات ذہن میں بیٹھالو۔'' کیتھی کی اس بات نے اسے گویا اس کی اوقات یاد دلادی وہ فوراً وہاں سے ہٹ گیا اس کا رویہ اب یکسر بدل گیا وہ اب کیتھی سے کترانے لگا۔

انگریزوں کے دور حکومت میں قانون کا وقار اور دبدبہ بہت زیادہ تھا ایک عام تھانیدار سے لوگ ملک الموت کی طرح ڈرا کرتے تھے۔ یہاں بات خود آقاؤں کی تھی۔ اب معاملات تو ٹھیک ہوگئے مگر مزید رہنا کیتھی سے دوبھر ہوگیا، اس نے خط لکھا کہ اسے بلوالیا جائے اسے معلوم تھا کہ روز ابھی نہیں آئی مگر کمشنر یقیناً ہوگا۔ اس کا خط ملتے ہی ملازم اسے لینے آگیا سارا اس کے جانے کا سن کر بہت اداس ہوئی کیونکہ بہن کی صورت میں میکہ مل گیا تھا مگر وہ روز کی دی ہوئی رقم بہن کو تھما کر چلی آئی۔

شام کا وقت ہونے والا تھا جب وہ وہاں پہنچی لیکن دیکھتے ہی نہال ہوگئی اسے اس جگہ سے ایسی وابستگی ہوگئی تھی کہ گویا اس کا اپنا گھر ہو کمشنر حسب معمول گھر پر نہیں تھے مگر وہ ستانے کے بعد نہائی، کپڑے بدلے اور اپنے چھوٹے سے کمرے کو درست کرنے لگ گئی، پھر کچن میں آکر خانساماں سے پوچھا کہ صاحب کے آنے کی کوئی خبر ہے تو اس نے لاعلمی ظاہر کی، کیتھی نے اسے کھانا پکانے کو کہا اور پھر روز اور ایڈورڈ کے مشترکہ خواب گاہ میں آگئی کچھ بے ترتیبی نظر آئی اسے درست کیا اور پھر باہر آکر بیٹھ گئی، رات گئے کمشنر صاحب آگئے کیتھی منتظر تھی اس نے فوراً بڑی چادر جسم پر ڈالی اور پانی لے کر ان کے لئے لے جانے لگی، بہنوئی والے تجربے نے اسے بہت محتاط کردیا تھا اب یہ شکایت وہ روز کے لئے نہیں پیدا کرنا چاہتی تھی کیونکہ وہ اسے بہت محبوب تھی۔

ایڈورڈ نے اسے دیکھا تو مسکرادیا اسے سلام کیا اور ان کا حال احوال پوچھنے لگی روز کی واپسی کے بارے میں پوچھا پھر ایڈورڈ نے اس سے جلدی آنے کی وجہ پوچھی تو اس نے کہا کہ ''میرا وہاں دل نہیں لگ رہا تھا مادام کی بہت یاد آرہی تھی اس لئے آگئی ہوں۔ اب جب تک وہ نہیں آتیں میں آپ کی خدمت کروں گی، کھانا لاؤں گی۔'' ایڈورڈ نے اثبات میں سر ہلادیا۔

واپس آکر کیتھی نے عجیب سا سکون محسوس کیا اب بس وہ دن گن گن کر روز کا انتظار کررہی تھی۔ صبح کمشنر کو کھانا لباس دینے اور رات کے معمولات کے علاوہ تمام دن فارغ ہوتی اس نے روز سے بنائی سیکھ لی تھی اون اور سلائیاں لئے وہ جرسی بنتی رہتی کہ اپنے بھائی کو دے گی۔ ایک دن کمشنر نے اسے روز لین کی واپسی کی خبر دی تو اس کا دل مسرت سے بھر گیا اس نے تمام ملازمین اکٹھے کرکے بنگلے کی صفائی کروائی گھر کے سامان کی ترتیب بدلی، صاحب سے کہہ کر کچھ نیا سامان منگوایا۔ کچن میں روز کی پسند کے کھانوں سے متعلق سامان منگوایا اور پھر آمد کے روز اس کے کمرے کو پھولوں سے آراستہ کردیا۔ نہا دھو کر نیا لباس پہنا، بال کھولے خوشبو لگا کر انتظار کرنے لگ گئی کہ جیسے وہ محب

ہے اور آنے والی محبوب دوپہر سے قریب ایڈورڈ روزلین کو لے کر آ گیا کیتھی زمین پر بیٹھی ہوئی تھی سر جھکا کر گہری سوچ میں غرق تھی کہ اسے کمرے کے دروازے پر روز کی آواز سنائی دی۔

وہ بجلی کی تیزی سے اٹھی اور بھاگتی ہوئی ان کے قریب چلی گئی، ایڈورڈ نے غالباً اس کی بے تابی کے بارے میں پہلے سے بتایا تھا کہ اس نے بازو اس کی طرف بڑھایا وہ بھاگ کر اس کے پہلو سے جا لگی، اس کی آنکھیں نم ہو گئیں روز نے اس کا شانہ تھپتھپایا، کچھ لمحوں میں وہ سنبھل گئی، اور سب اندر داخل ہو گئے جذبات سے نکل کر کیتھی نے دیکھا کہ ایڈورڈ کے پیچھے ایک نہایت خوبرو اور حسین مرد کا بھی چلا آ رہا ہے۔

روز نے کیتھی کو اس کی جانب دیکھتا پایا تو کہا۔

''کیتھی یہ میرا بیٹا جیمز ہے۔''

سب لوگ صوفوں پر بیٹھ چکے تھے جیمز نے کہا۔

''لگتا ہے یہ آپ کی وہ خاص خادمہ ہے جسے آپ بہت یاد کرتی تھیں۔'' کیتھی یہ سن کر کچھ خفیف سی ہو گئی۔ ''ہاں ڈیئر یہ میری خادمہ ہی نہیں دوست بھی ہے ورنہ اس کے آنے سے پہلے وقت جیسے رکا ہوا تھا۔'' کیتھی اپنی اتنی پذیرائی پر اتنے دنوں کی کوفت جیسے بھول ہی گئی۔ پھر جیسے ہی وہ حقیقی دنیا میں آئی فوراً آنے والوں کی خاطر مدارات میں لگ گئی۔

دن معمول پر آتے گئے روزمرہ کے بندھے کام لوٹ آئے، کیتھی کو سوائے جیمز کی موجودگی کے کسی تبدیلی کا احساس نہیں ہوا مگر جیمز انگلستان کے ماحول کا پروردہ تھا، اور ہر چیز کو اپنے انداز میں دیکھنے اور برتنے کا عادی تھا کچھ روز ملنے ملانے سیر شکار اور پارٹیوں میں گزر گئے، اس کے بعد وہ زیادہ تر گھر پر پایا جانے لگا روز نے کیتھی کو محض کم تر ہندوستانی سمجھتے ہوئے اپنے باذوق اور جوان بیٹے کی خدمات پر لگا دیا اسے کیتھی ایسی خاص نہیں لگی کہ کوئی اہم بندہ اس پر توجہ دے اس نے کیتھی کو کہہ دیا کہ وہ جیمز کی ہر ضرورت کا خیال رکھے جبکہ کیتھی جیمز کو اپنا آقا زادہ سمجھتے ہوئے مستعدی سے ہر کام کرتی۔

جیمز ایک نوعمر لڑکا تھا آتی جوانی سوچنے اور دیکھنے کے زاویے بدل دیتی ہے۔ بعض اوقات یہاں ابھرتی ہوئی ترنگ نئی نئی آشنائیاں جنم دیتی ہے۔ کیتھی اور جیمز عمر کے اس دور سے گزر رہے تھے وہ اس کی وجاہت سے متاثر تھی اور جیمز اس کے سیاہ حسن سے۔

وہ جب بھی کام کرنے کے لئے اس کی خواب گاہ میں جاتی، جیمز کی نگاہوں کے حصار میں رہتی، اس نے اب تک یورپ کا سفید بے کشش حسن دیکھا تھا لیکن ہندوستان کے اس سلونے حسن کی کشش ہی الگ تھی اوپر سے اس نے قیامت خیز جسمانی خطوط پائے تھے۔

جیمز نے بہت جلد محسوس کر لیا کہ وہ اس سے متاثر ہے یہ وہ نقطہ تھا جس کے بعد اسے مائل کرنا چنداں مشکل نہ ہوتا اور یہی ہوا کیتھی نے آقا زادے کو مائل بہ کرم دیکھا تو محبت سمجھ لیا اور لمحوں میں اس کے قریب ہوتی اور پھر ہوتی ہی گئی اس نے کبھی اتنے وجیہہ اور شاندار انسان کا تصور بھی نہیں کیا تھا وہ چاہتی تھی کہ وقت آنے پر اس کی شادی اس کی برادری کے کسی لڑکے سے ہوتی مگر یہ آقا زادہ کوئی انہونی بن کر اس کی زندگی میں آ گیا جبکہ دوسری جانب یہ معاملہ بالکل مختلف تھا۔

جیمز نے کیتھی کو صرف نئی دریافت کے طور پر برتنا شروع کیا تھا یہ وہ چند روزہ محبت تھی جو اس کی رخصتی کے ساتھ ہی رخصت ہو جاتی لیکن کیتھی نادان اور کم عمر تھی دنیا کے بے مہر اصولوں سے بے خبر اس نے جیمز کو دل میں بٹھا لیا۔

اس کا التفات پا کر اپنے اور اس کے درمیان کا طبقاتی سماجی اور حاکم و محکوم کا فرق بھول گئی۔

کمشنر کا خاندان مختصر تھا لیکن بنگلہ اتنا وسیع کہ وہاں رازوں اور گناہوں کو چھپانے کے لئے جگہ کی کمی نہ تھی۔ کیتھرین دن میں روز روز کی خدمت اور مصاحبت کرتی اور رات کو جیمز کے تصرف میں آ جاتی، وہ اس کی چاہت میں بہت دور آ چکی تھی لیکن یہ سفر زیادہ دور نہ چلا کہ اس کی واپسی کی گھڑیاں آ گئیں۔

جیمز اپنی تعلیم مکمل کر چکا تھا، ایڈورڈ نے اسے یہاں اس لئے بلایا تھا کہ اگر وہ پسند کرے تو وہ اسے بھی افسر شاہی میں داخل کر لے مگر وہ یہاں مستقل رہنے پر آمادہ نہ ہو سکا موسم گرما کے آغاز کے ساتھ ہی وہ واپسی کے لئے تیار ہو گیا کیتھرین کا خیال تھا کہ وہ اسے بھی ساتھ لے کر جائے گا مگر اس نے ایسی کوئی بات نہیں کی، کیتھی نے خود اس سے یہ بات کی لیکن اس نے انکار کر دیا یہ سب کچھ اس کی توقعات کے خلاف تھا لیکن اس نے احتجاج نہیں کیا اور بالکل خاموش ہو گئی۔

جانے سے قبل آخری شب میں وہ معمول کے مطابق آخری بار اس کی خلوت میں گئی، بہت خاموش تھی، کسی بے روح متحرک جسم کی طرح جبکہ جیمز نے ایسے برتاؤ کیا کہ جیسے بھوکے کو دنوں کے بعد کھانا ملا ہو وہ بس بار بار یہی بات کہتا رہا کہ ”تم وہاں مجھے بہت یاد آؤ گی تم جیسی وہاں کوئی لڑکی نہیں۔“

رات کے بعد دن آیا جیمز رخصت ہو گیا لیکن وہ ہمیشہ کے لئے اندھیروں میں رہ گئی وہ بات جو روز اپنے بیٹے کی موجودگی میں نہ جان سکی وہ اسے اس کے جانے کے بعد جان گئی، کیتھرین کی روشنی بے دلی اور اجڑے پن نے سب کچھ سمجھا دیا لیکن اس نے کیتھی کے سامنے کچھ نہ کہا بلکہ ایڈورڈ کو کہا کہ ”وہ اس کی شادی کا انتظام کرے۔“

جوزف کو خط لکھ کر بلوایا گیا اس کے آنے پر کیتھی کی شادی کا معاملہ اس کی رائے پر چھوڑا گیا۔ جوزف نے کیتھی سے تنہائی میں بات کی کہ اب شادی کے لئے اس کی اپنی کوئی پسند ہے یا وہ خود ہی فیصلہ کرلے۔“

مگر کیتھی نے کہا کہ ”وہ اسے اپنے ساتھ لے جائے وہ شادی نہیں کرنا چاہتی۔“

جوزف نے کہا۔ ”میں ابھی اس قابل نہیں ہوا کہ خود اپنا بوجھ اٹھا سکوں تمہیں کہاں لے کر جاؤں گا بہتر یہی ہے کہ تمہاری شادی ہو جائے اپنے بڑے ماما کا لڑکا آج کل فوج میں اردلی کی نوکری کر رہا ہے۔ میں جب چھٹیوں میں گاؤں گیا تھا تو ماما بار بار تمہارا پوچھتے تھے انہوں نے تمہارے رشتے کی بات بھی ڈالی تھی اب جب صاحب لوگ خود تمہاری شادی کر رہے ہیں تو تمہیں کاہے کا انکار میں تمہارا بھائی ہوں میں نے فیصلہ کر لیا ہے کہ اب تم ماما کی بہو ہو گی۔“

کیتھی آہ بھر کے خاموش ہو گئی، بے وفائی کا زخم ایسا گہرا تھا کہ اس نے خود کو حالات پر چھوڑ دیا وہ تو بس یہاں سے جانا چاہتی تھی، اب وہ جیسے کسی صورت میں ہوتا ویسے بھی آگے جا کر جو ہونے والا تھا اس کا بہترین حل صرف شادی ہی تھا۔ روز لین اور اس کے شوہر نے مالی تعاون سے کیتھرین کی شادی ہو گئی اور ماما مامی کے ہاتھ اچھی رقم بھی آ گئی انہوں نے کیتھی کا بہت چاؤ کیا اور بہت پذیرائی دی مگر کیتھی بظاہر خوش ہونے کا دکھاوا کرتی مگر اندر سے وہ بری طرح مجروح تھی بہت جلد اس کی ساس نے تاڑ لیا کہ وہ امید سے ہے اس بات نے اس کی عزت میں بہت اضافہ کر دیا اس کا شوہر تو اس کا دیوانہ تھا۔ عام حالات میں کیتھی شاید ان سب چیزوں کو پا کر اپنی قسمت پر نازاں ہوتی مگر وہ خود ٹوٹ چکی تھی اس کا شوہر اسے ساتھ رکھنا چاہتا تھا مگر ساس سسر نے خیال رکھنے کی غرض سے منع کر دیا وہ نوکری پر واپس چلا گیا اور کیتھی اپنے شب و روز پورے کرنے لگی۔

اسے دکھ اس بات کا تھا کہ اس نے اپنے آقا زادے کو کیا سمجھا اور وہ کیا نکلا اس کی آغوش بھرنے والا بھی وہی تھا مگر اس بات کا کیا ذکر اسے معلوم بھی نہیں ہو گا کہ وہ اپنی بے وفائی کے ساتھ اپنے وجود کا حصہ بھی چھوڑے جا رہا ہے، بظاہر یہ بات بہت بڑی نہیں تھی کہ وہ روگ بنا لیتی مگر ملنے والی خوشیاں اس کے غم کا مداوا نہ ہو سکیں، یہاں تک کہ ولادت کے دن آ گئے۔

وہ بہت کمزور اور ناتواں ہو چکی تھی اس کی حالت ایسی تھی کہ کوئی چھوٹا سا بھی حادثہ اسے بہا لے جاتا ایک شام اس کی طبیعت بہت خراب تھی، دائی نے آ کر معائنہ کیا تو کہا کہ ”چند گھنٹوں کی بات رہ گئی ہے۔“

وہ جاتی سردیوں کے دن تھے، دن خوشگوار مگر راتیں خنک چاندنی بالکل آخری تاریخ تھی، اسے کافی

دیر سے تکلیف ہو رہی تھی کہ اسے حوائج ضروریہ کے لئے جانا پڑا گھر میں یہ سہولت بالکل نہیں تھی، ان دنوں سارے گھر والے گھر سے باہر جاتے تھے اس نے ساس کو بتایا تو وہ ساتھ جانے کے لئے کھڑی ہو گئی۔ وہ دونوں گھر سے نکل کر اس جگہ آگئیں جو عموماً اسی مقصد کے لئے استعمال ہوتی تھی وہاں کچھ عورتوں کے باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں کیتھی نے کہا۔ ''ماں یہاں گاؤں کی عورتیں ہیں جو مجھے دیکھیں گی اور الٹے سیدھے سوال بھی کریں گی آپ مجھے کہیں اور لے جائیں۔'' وہ اسے مخالف سمت میں خاصی ویران سی جگہ پر لے گئی کیتھی کچھ دیر کے بعد فارغ ہوئی تو واپسی کے لئے قدم اٹھائے ابھی چار قدم ہی چلی ہوگی کہ تیز ہوا کا جھونکا آیا اور گھور اندھیرے کے باعث وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھ سکی اس کا اگلا قدم نسبتاً نیچی زمین پر پڑا تو وہ لڑکھڑا کر گر پڑی۔ وہ ایک چیخ کے ساتھ زمین پر آپڑی۔

ایک لمحہ ایسا تھا کہ کسی نادیدہ وجود نے اسے اپنی گرفت میں لے لیا اس کی ماں نے فوراً اسے اٹھایا اور جیسے تیسے سنبھالتی ہوئی گھر کی طرف لانے لگی وہ بھی کیتھی کی طرح لمحوں میں ہونے والی اس واردات سے بے خبر تھی جو اس اماوس رات کے اس پہر کیتھی کی کوکھ میں وقوع پذیر ہوئی۔

گھر تو آگئی مگر بالکل نڈھال ہو چکی تھی اور تکلیف شدت اختیار کرنے لگی ممانی نے اس کی حالت دیکھتے ہوئے اپنے شوہر کو باہر کو دوڑایا تو وہ جھٹ پٹ دائی لے آیا وہ اسے لے کر اپنے کام میں مشغول ہوگئی بلکہ سب گھر والے بے چینی سے باہر نومولود کا انتظار کرنے لگے، کیتھی کو غم کھا چکا تھا وہ جسمانی طور پر اتنی بے حال تھی کہ ولادت کی تکلیف نہ سہہ سکی، جیسے ہی نئے مہمان کی آمد ہوئی وہ اکھڑے اکھڑے سانس لینے لگی، دایہ نے جو اس کی یہ حالت دیکھی اس کے ہاتھ پاؤں پھول گئے، اس نے ہاتھ میں پکڑی بچی کو دیکھا اور ساتھ ہی آواز دی۔

سائی جھٹ پٹ اندر آگئی دایہ نے گھبرائے ہوئے لہجے میں بتایا کہ ''اس کی بہو بچتی نظر نہیں آرہی۔''

وہ بے تابی سے اس کی جانب بڑھی اسی لمحے اس نے آخری سانسیں لیں اور پھر......

یہ سب کچھ بہت جلدی جلدی ہو گیا، کسی کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کیتھی مر جائے گی، اس کی عمر ہی کیا تھی، بامشکل انیس برس مگر وہ اپنی ماں کی تاریخ دہرا گئی، دوسرے انداز میں وہ جسمانی زخم کھا کر مر گئی اور کیتھی روح اور دل مجروح ہونے سے مر گئی۔ ایک کی انتہا ہی اور ایک کی ابتدا کیونکہ اس سارے ماتمی غبار میں پیدا ہونے والی بچی کو ٹھیک سے کسی نے دیکھا ہی نہیں کیونکہ وہ...... بالکل جیمز کا عکس تھی بلکہ اس سے بھی کہیں حسین۔

جب اہل خانہ نے نومولود کو دیکھا تو گویا سانپ سونگھ گیا، اچھوتوں کے ہاں ان کے آقاؤں جیسی بچی ایک سوالیہ نشان تھی جس کا جواب دینے والی اب نہیں رہی تھی۔ بہرحال سب عزہ اور گھر والوں کو خبر کر دی گئی کہ کیتھی اب نہیں رہی، سارا، جوزف اور باقی رشتہ دار اکٹھے ہوئے اس کی ناگہانی موت نے سب کو ہلا کر رکھ دیا تھا، ماما، ماں اور کیتھی کا شوہر کیتھی کی تدفین تک خاموش رہے مگر تدفین کے بعد جب ابھی ساری برادری اکٹھا تھی، اس کے شوہر اور جوزف کو بٹھا کر بچی کی بابت فیصلہ کرنے کو کہا گیا کیونکہ ان سب کا متفقہ فیصلہ یہی تھا کہ ''بچی ان کے بیٹے کی نہیں کیونکہ وہ انتہائی سفید سرخ سنہرے بالوں سبز آنکھوں والی بچی ان کی ہو ہی نہیں سکتی، یہ تحفہ یقیناً وہیں کا ہے جہاں وہ خادمہ تھی۔''

اس کی تائید ان تمام برادری والوں نے کی جنہوں نے بچی کو بار بار بغور دیکھا وہ دونوں بہن بھائی خاموش تھے بالآخر وہ خاموشی سے بچی کو اٹھا کر وہاں سے نکل آئے اور سارا کے گھر آگئے، جوزف بہت متفکر تھا ایک چھوٹی بہن کی موت کا غم اور تہمت، وہ بچی کو پھینک بھی نہیں سکتے تھے کہ جیسے بھی اس نے ان کی بہن کی کوکھ سے جنم لیا تھا۔

جوزف کی اس مشکل کو سارا نے حل کیا اس نے کہا۔ ''وہ اس بچی کو پال لے گی کیونکہ وہ بھی بہن ہونے کے ناطے کیتھرین سے بہت پیار کرتی تھی۔'' اس کا شوہر اس کا ہم خیال نہیں تھا مگر سالے کے سامنے کچھ نہیں کہہ سکا، سارا نے بھائی کو یہ بھی کہا کہ ''جو ہونا تھا وہ ہو چکا اس کی تلافی تو ممکن نہیں مگر ہم اگر احتجاج نہیں کر سکتے تو ان کو مطلع تو کیا جا سکتا ہے جن کی وجہ سے یہ سب ہوا'' جوزف تم کمشنر صاحب کے بنگلے پر جانا اور یہ ساری بات بتا دینا کیونکہ انہیں معلوم ہونا چاہئے کہ ہماری بہن ہی دنیا سے نہیں گئی بلکہ ان کی دی جانے والی عنایت بھی چھوڑ گئی ہے۔''

جوزف نے کہا۔ ''وہ ایسا ضرور کرے گا۔'' پھر وہ اگلے روز کمشنر صاحب کے بنگلے پر جانے کے لئے رخصت ہوا اور شام کو وہاں پہنچا نوکر کے ذریعے اطلاع بھجوائی کہ وہ ملنا چاہتا ہے روز نے فوراً اسے بلوالیا وہ لان میں چلا آیا وہاں روز ایک کرسی پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے قریب جا کر سلام کیا اور نگاہیں جھکا کر کھڑا ہو گیا۔

''روز نے پوچھا۔ کیسے آنا ہوا؟''

جوزف نے اب تک خود کو سنبھالا ہوا تھا مگر اب ضبط ٹوٹ گیا اور وہ خاموش آنسو بہانے لگا روز کو کسی سنگینی کا احساس ہوا تو اس نے کھڑے ہو کر کیتھی کی خیریت دریافت کی۔ جوزف نے بہت رنجیدہ لہجے میں مسلسل نگاہیں نیچی رکھتے ہوئے کہا۔ ''مادام پرسوں میری بہن بچہ جنم دیتے ہوئے مر گئی۔''

روز کو اچانک سے شاک لگا۔

جوزف مزید بولا۔ ''مادام میری بہن کے ساس سسر نے بچی بھی رکھنے سے انکار کر دیا کیونکہ...... وہ بچی ان کے مطابق ان کے بیٹے کی نہیں'' یہ کہہ کر وہ پلٹ گیا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا بنگلے سے نکل گیا اور ٹرین پکڑ کر اپنے ہاسٹل واپس آ گیا۔

روز طبعاً ایک اچھی عورت تھی صرف وہ نسلی تفاخر میں مبتلا تھی اور خود کو برتر قوم سے سمجھتی تھی۔ لیکن دل ہی دل میں وہ کیتھی کی جانب سے احساس جرم میں مبتلا ہو گئی وہ جوزف کے دیئے ہوئے اشارے کو بخوبی سمجھ چکی تھی کہ اس نے اس کے بیٹے جیمز کی عنایت کو جنم دیا ہے مگر اب وہ اس معاملے کو قطعی ایڈورڈ کے سامنے لانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی اپنی جانب سے اس نے یہ معاملہ اسی وقت ختم کر دیا کہ اس کا مسئلہ نہیں ہے۔

لیکن قدرت کے فیصلے انسان کی عقل اور منصوبوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں بظاہر یہ کہانی ختم ہو گئی لیکن یہ اختتام صرف کیتھرین کا تھا مگر آغاز اس کی بچی کا تھا جو دنیا میں آنے سے پہلے ہی اپنے ساتھ اپنا نادیدہ محب بھی لے آئی تھی اور اس کی ماں نے اپنے مادی جسم کو تو چھوڑ دیا تھا مگر دنیا کو نہ چھوڑ سکی کیونکہ محبوب کو ساتھ لئے بغیر اس کا جانا آسان نہ تھا۔

سارا کی گود میں بچی آئی تو وہ خاصے مخمصے میں پڑ گئی کیونکہ اس بچی کے معمولات عام بچوں سے بہت مختلف تھے کیونکہ وہ بہت کم روتی مگر جب روتی تو چپ ہی نہ ہوتی، زیادہ تر خاموش لیٹی رہتی، اپنی بڑی بڑی سبز آنکھوں سے ایک ہی جانب دیکھے جاتی اور جب سارا اسے گود میں لے کر بہلاتی یا پیار کرتی تو بعض اوقات اس کی جانب یک ٹک دیکھے جاتی پر اس کے دیکھنے سے غیر معمولی پن کا احساس ہوتا اور اسے جھرجھری آنے لگتی مگر یہ صرف ابتدائی معمول تھے جیسے جیسے وہ بڑی ہوتی گئی سارا اس کے رویے سے پریشان رہنے لگی، کیونکہ چھ ماہ کی ہونے پر وہ اسے لٹا کر گھر کے کام کر رہی ہوتی تو وہ نجانے کس کی جانب دیکھتے ہوئے کھلکھلاتی، اوں آں کرتی رہتی پھر مزید کچھ مہینوں کے بعد وہ رات اسے اپنے ساتھ سلاتی تو رات کے کسی پہر احساس ہوتا کہ وہ اس کے ساتھ نہیں ہے وہ پریشان ہو کر اٹھتی پورا کمرہ دیکھتی اور کبھی پورا گھر دیکھ لیتی مگر جیسے ہی بستر کی طرف واپس آتی وہاں پڑی سو رہی ہوتی۔

سارا دن سب باتوں سے پریشان تو ہوتی مگر جیکسن سے ذکر تک نہ کرتی کیونکہ وہ اس بچی کے وجود

سے بہت نالاں رہتا اور اکثر اسے چرچ میں دینے کو کہتا۔" سارا یہ بچی ہماری ذمہ داری نہیں تم اسے چرچ کو دے دو یہ جہاں کی خاک ہے اسے وہیں پہنچنا چاہئے، جانتی ہو جب یہ بڑی ہوگی تو لوگوں کو کیسے بتاؤ گی کہ یہ تمہاری بھانجی ہے۔"

سارا اسے ہر بار کچھ نہ کچھ کہہ کر خاموش کرا دیتی مگر اندر ہی اندر وہ آنے والے وقت سے خائف رہتی جب اس بچی کا غیر معمولی پن سب کے سامنے آجاتا۔

ادھر جیمز کو بھی قدرت کی جانب سے زیادہ ڈھیل نہ مل سکی وہ کیتھی کو ایک رات کا سہانا خواب سمجھ کر بھول گیا انگلینڈ آ کر فوج میں افسر ہوگیا اور زندگی کے سارے مزے کشید کرنے لگا مگر یہ سب کچھ کیتھی کی موت تک ہی چل سکا۔ ہندوستان سے آنے کے بعد وہ اتنا مصروف ہوا کہ دوبارہ والدین سے ملنے نہ جا سکا کیونکہ ٹریننگ کے دوران اور دیگر ملازمتی امور میں اسے سال بھر سے زیادہ لگتا تھا مگر ابھی اس کی ٹریننگ پوری ہوئی تو اس نے بھائی کو تفصیلی خط لکھ کر دیا جو چھٹیاں گزارنے ہندوستان جا رہا تھا کہ وہ کیا کیا کامیابیاں سمیٹ رہا ہے اور کب ملنے آسکے گا۔

کیتھی کے مرنے کا اسے بالکل علم نہیں تھا، نہ ہی وہ اتنی اہم تھی کہ وہ اس کی خبر رکھتا لیکن اب ایسا ہونے لگا کہ تنہائی میں اسے کیتھی دکھائی دینے لگی۔ ایک روز وہ دن بھر کی مصروفیات کے بعد شام میں گھر آ کر آرام کر رہا تھا اس کا ارادہ تھا کہ وہ رات کو نہا دھو کر تیار ہو کر نئی بننے والی دوست سے ملنے جائے گا اور ایک بھرپور رات گزار کر آئے گا وہ بیڈ پر لیٹا خوب صورت خیالوں میں گم تھا کہ اچانک اسے بے حد خنکی کا احساس ہوا اور ساتھ ہی کمرے میں کسی کی موجودگی بھی محسوس ہوئی، وہ لیٹے لیٹے ہی ادھر ادھر دیکھنے لگا کہ نظر کھڑکی کی طرف گئی وہاں کوئی لڑکی کھڑی تھی وہ جلدی سے اٹھا اور کھڑکی کے پاس گیا اور کہا۔ "کون ہو تم؟"

لڑکی نے پلٹ کر دیکھا تو اس کی آنکھوں سے اداسی جھلک رہی تھی۔ جیمز ایک دم رک گیا کیونکہ اس کے سامنے کیتھی تھی مگر اگلے ہی لمحے وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔

وہ تذبذب میں پڑ گیا کہ "کیا جسے اس نے دیکھا وہ کیتھرین ہی تھی۔ اس کا وہم مگر وہ سر جھٹک کر معمول پر آنے لگا، فوجی تربیت کا اثر اس پر بہرحال تھا۔ یہ پہلی بار ہونے والی بات اب اکثر ہونے لگی وہ اسے بار بار دکھائی دینے لگی وہ ڈرا تو نہیں لیکن سوچنے پر مجبور ہوگیا کہ وہ اسے کیوں دکھائی دیتی ہے اور اگر وہ انگلینڈ آ ہی چکی ہے تو سیدھے اسے آ کر کیوں نہیں ملتی بلکہ کسی سناٹے کی طرح نظر آنے کے بعد اگلے لمحے نہیں ہوتی۔

جیمز نے تنگ آ کر ماں کو خط لکھا کہ "کیتھرین کہاں ہے کیا پاپا نے اسے انگلینڈ تو نہیں بھیج دیا کیونکہ وہ اسے اکثر دکھنے لگا ہے؟"

پھر یہ سوچ کر ماں اس کی ایک معمولی خادمہ کے بارے میں پوچھنے پر متعجب ہوئی، مختصر اور دبے لفظوں میں اس کے اور اپنے تعلق کی سادہ سی وضاحت بھی کردی۔ یہ وہ دور تھا جب ابھی فون کی سہولت بھی پوری طرح نہیں آئی تھی اور زیادہ تر خط و کتابت سے کام لیا جاتا تھا وہ بھی بہت دن لگ جاتے۔ اس کے خط کا جواب جب آتا تو تب آتا مگر کیتھرین اب اس کے حواسوں پر بھی چھانے لگی وہ رات میں تنہا ہوتا تو اس کے قریب آ کر سرگوشیاں کرتی، کبھی آنسو بہاتی اور جب وہ کسی کے ساتھ ہوتا اور اپنے خوب صورت لمحات گزار رہا ہوتا، وہ تب بھی آجاتی اور سارا منظر بگڑ جاتا۔

رفتہ رفتہ وہ جھنجھلانے لگا اسے اپنی زندگی میں اس کی مداخلت ناگوار لگتی، اسی الجھن سلجھن کے دوران روز کا جوابی خط آ گیا۔ اس نے لکھا کہ "تمہارے جانے کے بعد کیتھی کی کیفیت بہت بری رہنے لگی تھی مجھے اسی سے اندازہ ہوگیا کہ تمہارے اور اس کے درمیان کچھ چلتا رہا ہے اس سے قبل کہ اس کی وجہ سے کوئی بات بنتی ہم نے اسی کی فیملی میں اس کی شادی کروا دی لیکن کچھ مہینوں کے بعد اس کا بھائی آیا وہ بہت دکھی تھا اس نے

بتایا کہ ''وہ ولادت کے موقع پر انتقال کر گئی جبکہ پیدا ہونے والی بچی کو گھر والوں نے نہیں رکھا کیونکہ وہ ان کی نہیں تھی، تو یقیناً وہ تمہاری ہی ہوگی لیکن یہ تمام باتیں میں نے تمہاری تسلی کے لئے لکھی ہیں۔ وہ مر چکی ہے تو تمہیں اس کا نظر آنا صرف تمہارے دل میں اس کی یاد ہے۔ بہتر ہے کہ تم صرف اپنی ذمہ داریوں اور کام پر توجہ دو ان غیر ضروری چیزوں پر سے دھیان ہٹاؤ، تمہاری عمر کے بچوں سے ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں۔ یہ ایسی بات نہیں کہ تم توجہ دو بھول جاؤ اور تمہارے ڈیڈ کو اس بات کا علم بالکل نہیں اور ہونے بھی نہیں چاہئے۔''

جیمز پہلے تو کیتھی کی موت کا جان کر افسردہ ہوا لیکن اس کی کوئی جذباتی وابستگی نہیں تھی اس لئے یہ افسردگی بھی کچھ وقت کے بعد کافور ہوگئی لیکن اس سے ہونے والی بچی نے اس کی ذہنی کیفیت ضرور منتشر کردی۔

ایک شام آرمی کے ایک بڑے افسر کے ہاں پارٹی تھی جہاں تقریباً سبھی اہم شخصیات شاہی گھرانے کے منتخب افراد اور فوج کے اعلیٰ افسران مدعو تھے، جیمز اس پارٹی میں جانے کے لئے بہت پرجوش تھا ویسے بھی کیتھرین نے بہت دنوں سے اس کی رنگین زندگی کے رنگ پھیکے کر رکھے تھے وہ وہاں جا کر بھرپور مزہ لینا چاہتا تھا ساتھ ہی یہ موقع تھا کہ اہم شخصیات سے مل کر وہ اپنے تعلقات وسیع کرے۔

وہ شام کو تیار ہو کر وقت پر پارٹی میں آیا۔ وہ رنگ و بو اور روشنیوں کا حسین سماں تھا، خوب صورت چہروں کی بہتات تھی وہ سوچنے لگا کہ کاش اس کے مام اور پاپا بھی یہاں ہوتے۔

بہر حال اس نے اس تقریب کو شروع سے آخر تک خوب مزے میں گزارا، ایک بہت خوش اندام حسینہ نے وعدہ کیا کہ اگلی شب اس کے ساتھ ہوگی، پھر وہ جھومتا گاتا واپس آ گیا، گھر آ کر وہ سیدھا اپنی خواب گاہ میں آیا کہ لباس بدل کر کے سو جائے۔

مگر کمرے میں داخل ہوتے ہی اسے اپنے بیڈ پر کوئی بیٹھا دکھائی دیا وہ روشنی کم ہونے کے باعث قریب آ گیا اور مقابل بیٹھ گیا دیکھا تو کیتھرین تھی۔

وہ بوکھلا کر اٹھنے ہی لگا تھا کہ اس نے اس کا بازو پکڑ لیا اور کہا۔ ''جیمز میں تمہاری بے وفائی کا روگ لے کر مر گئی مگر تم زندہ ہو میں تمہیں ساتھ لے کر جانے آئی ہوں، تم اپنے اور میرے درمیان کے فرق کی وجہ سے چھوڑ آئے تھے لیکن اب ہم جہاں جائیں گے وہاں کوئی فرق ہمارے درمیان نہیں آئے گا یہ دنیا ہے بہت بری آؤ ہم چلیں۔''

جیمز نے گھبرا کر کہا۔ ''دیکھو مجھے معلوم ہے کہ تم زندہ نہیں ہو مگر میں زندہ ہوں اور رہنا چاہتا ہوں تم یہاں سے چلی جاؤ اور بار بار آ کر مجھے پریشان مت کرو۔''

جیمز کی بات سن کر وہ سسکنے لگ گئی۔ ''مگر تمہاری ایک بیٹی بھی ہے وہ وہاں اکیلی ہے تم اسے تو اپنا لو وہ مجھ سے محروم ہو چکی ہے۔ تم خود سے محروم نہ کرو وہ بالکل تمہاری جیسی ہے میں جانتی ہوں کہ صرف میں تم سے محبت کرتی ہوں تم نہیں کرتے تھے لیکن وہ بچی کوئی گناہ نہیں محبت کا انجام ہے اگر وہ وہاں رہی تو میں بے سکون رہوں گی۔''

جیمز کے دل کی دنیا بدلنے لگی، کیتھی کی جذباتی باتوں نے اسے بھی بے سکون کر دیا، وہ تو چلی گئی مگر وہ تمام رات سو نہ سکا، اسے خود بھی لگنے لگا کہ اس کے وجود کا حصہ کہیں ہے جسے وہ نظر انداز کر کے کبھی مطمئن زندگی نہیں جی سکے گا پھر اس کے دل نے فیصلہ دے دیا اور وہ صبح کے قریب سو گیا۔

اب جیمز نے ہندوستان جانے کے لئے تگ و دو شروع کردی، مہینوں کے بعد اسے بامشکل چھٹی ملی اور وہ پہلی فرصت میں روانہ ہو گیا۔ وہ بغیر اطلاع کے جب والدین کے ہاں پہنچا تو وہ بہت حیران اور خوش ہوئے، اس نے کہا کہ ''وہ ان سے ملا نہیں تھا تو ملنے آ گیا۔''

ادھر سارہ کو فکر لاحق تھی کہ بچی کا نام اس نے مقامی چرچ کے فادر سے پوچھ کر اینا رکھا، اینا ہر دن کے ساتھ مزید خوب صورت اور مزید پراسرار ہوتی جا رہی تھی اس نے ایک روز اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں چرچ جا کر

فادر سے اس پر بات کی، انہوں نے تسلی دی کہ وہ کسی وقت آ کر بچی کو دیکھیں گے اس امر نے قدرے مطمئن کر دیا وہ سال بھر کی ہو چکی تھی اور چلنے لگی تھی۔

ایک روز اتوار کی عبادت کے بعد فادر نے کہا کہ وہ اگلے دن اس کے گھر آئیں گے وہ شکریہ ادا کر کے آ گئی۔ اگلے روز فادر اپنے ساتھ ایک اور شخصیت کے ساتھ وارد ہوئے، سارہ نے انہیں کمرے میں بٹھایا اور اینا کو لے آئی، اینا نے کمرے میں آتے ہی دونوں کو بغور دیکھنا شروع کر دیا، اس کی خوب صورت سبز آنکھیں انگارہ بن گئیں، بشپ نے اٹھ کر اسے گود میں لینا چاہا تو اس سال بھر کی بچی نے انہیں بہت زور سے دھکا دیا۔

سارہ یہ دیکھ کر سہم گئی اینا کے یہ تاثرات ہی بہت خوفناک تھے کچھ دیر زیر لب پڑھنے کے بعد بڑے فادر نے کہا کہ ”سارا اینا کو باہر چھوڑ آؤ۔“ وہ اسے دوسرے کمرے میں بٹھا کر واپس آئی تو بشپ نے کہا۔ ”سارہ یہ بچی تمہاری بھانجی تو نہیں لگتی صاف صاف بتاؤ کیا معاملہ ہے؟“

سارہ نے مختصراً ساری بات بیان کر دی، اس کی بات کے بعد فادر نے کہا۔ ”یہ بچی آسیب زدہ ہے یہ آسیب تب سے اس کے ساتھ ہے جس وقت اس کی ماں دردِ زہ میں مبتلا تھی اسے اس بچی سے الگ کرنا ناممکن کی حد تک مشکل ہے، ویسے یہ اینا کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا کیونکہ یہ اس پر عاشق لگتا ہے بہتر ہوگا کہ تم اسے مت چھیڑو کیونکہ دوسری صورت میں تم کو بھی کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے، میں اس معاملے میں ابھی کچھ مشورہ کرتا ہوں جب تک ہم کوئی ٹھوس حل نہیں تلاش کر لیتے تم خاموش رہو کیونکہ اس میں کافی وقت لگے گا۔“ فادر یہ کہہ کر رخصت ہو گئے اور سارہ بہت سارے اندیشوں میں گھر گئی۔

وہ اینا سے پیار تو کرتی تھی لیکن اس سے خوفزدہ بھی تھی وہ چاہنے لگی تھی کہ کاش اینا ان سے الگ ہو جائے یہ قبولیت کی گھڑی تھی کہ وہ جو چاہ رہی تھی قدرت اسی کے اسباب بنا رہی تھی۔

جیمز آنے کو تو ہندوستان آ گیا مگر اب وہ سوچنے لگا کہ وہ جو کرنے جا رہا ہے وہ صحیح بھی ہے کہ نہیں کیونکہ بچی کو تحویل میں لینے کے بعد وہ والدین اور دیگر لوگوں کو کیا وضاحت دے گا خصوصاً اس کے ڈیڈ ایڈورڈ بہت سخت اور با اصول آدمی تھے ان کی جانب سے کوئی بھی ردعمل متوقع تھا۔

گھر آنے کے بعد ایک شب رات کو سونے سے قبل وہ لاشعوری طور پر ٹہلتا ہوا اس کمرے کی جانب جا نکلا جہاں وہ کیتھرین کے ساتھ خلوت گزین ہوا کرتا تھا اسے دو سال قبل کی خوب صورت راتیں یاد آ گئیں، جب کیتھرین اپنی محبت اس پر لٹاتی تھی اسے اس کا سیاہ حسن اس کی بے مثال محبت یاد آ رہی وہ سوچنے لگا کہ جو بات کیتھرین میں تھی وہ اور کسی لڑکی میں نہیں ملی، جو باتیں وہ فراموش کر چکا تھا وہ سب اس کے دل نے محسوس کرنا شروع کر دی۔

پھر اسے لگا کہ اس کے قریب کوئی ہے اس نے اپنے پہلو کی جانب دیکھا تو کیتھرین حزن و ملال کی تصویر بنی نظر آئی اس نے اسے اپنے ساتھ لپٹانا چاہا تو کیتھی نے کہا۔ ”تم اب یہ سب کچھ کھو چکے ہو میں ایک آئینے میں نظر آنے والا عکس ہوں جسے تم دیکھ تو سکتے ہو مگر چھو نہیں سکتے کاش! تم نے مجھے ٹھکرایا نہ ہوتا یا پھر تمہاری ماں نے مجھے اس جگہ سے دربدر نہ کیا ہوتا تو میں اب بھی تمہاری بے وفائی کے باوجود یہیں ملتی لیکن اب بہت جلد میں تمہیں پالوں گی لیکن اس سے پہلے اپنی بیٹی کو اس کا حق دلا دو، بتا دو اپنے باپ کو کہ وہ تمہارا خون ہے اسے اپنی ماں کے حوالے کر دو تاکہ وہ اسے دیکھ کر تمہارا غم بھول جائے کیونکہ یہ غم تو اسے سہنا ہی ہے، وہ میری بہن سارا کے پاس ہے۔ جاؤ خود جا کر اسے لاؤ کیونکہ یہ زمین اب تمہاری مدفن ہے۔“

پھر اس نے پہلی بار کیتھرین کو مسکراتے دیکھا کسی فاتح جیسی مسکراہٹ، جیمز کو اپنی موت کا یقین اس کی مسکراہٹ سے ہونے لگا وہ فوراً اٹھا اور باہر جانے لگا،

اپنے کمرے میں آکر وہ پلنگ پر بیٹھ گیا۔ "میری بچی کہاں ہے مجھے اس بارے میں کھوجنا نہیں پڑا، کیتھی نے یہ معمہ حل کردیا ہے اب بس میں اسے جاکر لے آؤں گا اسے ان تیسرے درجے کے انسانوں کے ساتھ نہیں رہنا چاہئے۔" وہ یہ سوچ رہا تھا اور نجانے کب سوگیا۔

اگلی صبح وہ جانے کے لئے تیار ہوا، بنگلے کا ایک نوکر سارا کے گھر سے واقف تھا وہ اسے ساتھ لے کر روانہ ہوا، اب وہ سارا کے گھر کے پاس تھا وہ ایک محفوظ جگہ پر رک گیا اور ساتھ آنے والے ملازم سے کہا کہ "وہ سارا کے گھر جائے اور بچی لے آئے وہ یہاں پر اس کا انتظار کررہا ہے۔"

وہ بھاگا اور سارا کے گھر کا دروازہ بجایا، جیکسن باہر آیا تو اس نے جیمز کا پیغام دیا وہ فوراً اندر گیا سارا کو بتایا اور اس کا ردعمل جانے بغیر اینا کو اٹھایا اور دروازے پر آگیا سارا اس کے پیچھے آئی اور ملازم کے ساتھ چل پڑی۔ یوں جانے پوچھے بنا وہ اسے کسی کے حوالے نہیں کرنا چاہتی تھی کچھ دور چلنے کے بعد نوکر اس مقام پر آگیا، جہاں جیمز اس کا منتظر تھا، سارا نے جیسے ہی جیمز کو دیکھا تو ٹھٹک گئی، جیمز کو دیکھ کر ہی اندازہ ہوگیا کہ وہ اینا کا باپ ہے ایسی مماثلت اس نے اس سے قبل کہیں نہیں دیکھی تھی۔

جیمز نے بھی اسے دیکھا مگر فوراً اینا کی طرف متوجہ ہوگیا، اس کی جانب ہاتھ بڑھایا تو وہ لپک کر ایسے گئی کہ جیسے ہمیشہ سے مانوس ہو ورنہ اینا سارا کے سوا نہ تو کسی کے قریب جاتی اور نہ ہی کسی کی گود میں بیٹھتی۔ باپ کے پاس آتے ہی اس کی سبز آنکھیں روشن سی ہوگئیں اور سارا بنا کچھ کہے پلٹ گئی کہ امانت امانتدار کے ہاتھوں پہنچ گئی۔

جیمز کے بغیر بتائے جانے پر روز بہت پریشان تھی، بنگلے کا نوکر بھی اس سے اجازت لئے بغیر ساتھ گیا ہوا تھا۔ اس کی چھٹی حس کسی خاص بات کا اشارہ کررہی تھی وہ بہت بے چینی سے اس کے آنے کا انتظار کررہی تھی۔

رات میں کمشنر گھر آیا تو بیوی کو فکرمند دیکھ کر وجہ معلوم کی تو اس نے بتادیا کہ "جیمز صبح سے ملازم کے ساتھ کہیں گیا ہوا ہے اور ابھی تک نہیں آیا۔"

وہ بھی فکرمند ہوگیا اور ساتھ ہی اس کی تفتیشی حس بھی بیدار ہوگئی وہ سونے کے بجائے انتظار کرنے لگا بہت رات گئے جیمز کی واپسی ہوئی مگر تنہا نہیں اس کی گود میں بچی بھی تھی۔ ایڈورڈ چیتے کی سی پھرتی سے اٹھا اور بیٹے کے سامنے آگیا مگر اینا کے چہرے کو دیکھتے ہی وہ بہت کچھ سمجھ گیا۔

جیمز جانتا تھا کہ چھپے راز کھلنے کی گھڑی آگئی ہے اس نے بچی ماں کو دی اور خود صوفے پر جاکر بیٹھ گیا، ایڈورڈ ابھی تک خاموش تھا، روز اس کی مزاج شناس تھی، اس نے بھی کوئی بات نہ کی، صرف بیٹے کے کھانے کے بارے میں پوچھا اور ملازم کو کھانا لانے کا کہا۔

جیمز نے خود ہی آغاز کیا اور ہندوستان سے انگلینڈ ہونے والی ساری بپتا بیان کردی اور ہر ردعمل کے لئے تیار ہوگیا، روز تو بہت کچھ جانتی تھی ماسوائے کیتھرین کی روح اور بچی کے لانے کے فیصلے کے۔

ایڈورڈ نے بیٹے کو دیکھا اور کہا۔ "تم نے جو کچھ کیا یہ میرے لئے کوئی خاص بات نہیں مگر اس بچی کی تحویل کا فیصلہ تمہیں ہم سے مشورہ کرکے کرنا چاہئے تھا لیکن چونکہ تم نے یہ بھی کرلیا ہے تو تم اگلی بات ہم پر چھوڑ دو۔"

جیمز نے کہا۔ "ڈیڈ آپ مجھ سے ناراض نہیں ہوئے میرے لئے یہ بہت ہے۔ اب آپ جو بھی فیصلہ کریں۔"

اس دوران ملازم کھانا لے کر آگیا اور گفتگو موقوف ہوگئی۔ پھر کھانے کے دوران ایڈورڈ نے کہا کہ "تم نے برٹش آرمی کو جوائن کیا ہے تمہارا کیریئر سب باتوں سے اہم ہے، تم چھٹی پوری کرنے کے بعد واپس جاؤ گے اور پوری توجہ سے کام کروگے اور یہ بھول جاؤ کہ یہاں تمہاری کوئی بھول اس بچی کی شکل میں موجود ہے اس کو ہم یہاں پال لیں گے کیونکہ کسی کم تر لڑکی سے ہی

کسی یہ ہمارا ہی خون ہے اسے قبول کرنا ہی پڑے گا۔"

جیمز نے سکون کی ایک طویل سانس لی، اسے اس مسئلے کے ایسے حل کی توقع بالکل نہیں تھی وہ سوچ رہا تھا کہ اس کے والدین اینا کو چرچ میں دے دیں گے۔

ان تمام جھمیلے میں سب سے خلاف معمول اینا کا رویہ تھا، اتنے چھوٹے بچے اجنبی لوگوں اور ماحول میں آ کر روتے ہیں مگر وہ رونے کے بجائے کچھ وقت کھیلتی رہی پھر ملازمہ نے اسے کچھ کھلا پلا دیا تو سو گئی، رات گزر گئی صبح ایڈورڈ تیار ہو کر ڈیوٹی پر چلا گیا اور گھر میں روز اور جیمز رہ گئے، روز اینا کو سنبھالنے لگی تھی، نہ چاہتے ہوئے بھی اس نے روز کی توجہ اپنی جانب کر لی تھی جبکہ جیمز اسے جب بھی دیکھتا وہ اسی کی جانب دیکھ رہی ہوتی جیسے چاہتی ہو کہ وہ اسے پیار کرے۔

روز نے جیمز سے کہا۔ "بعض انسان خواہ کتنے ہی کمتر ہوں یا کم صورت اپنے اندر بلا کی کشش رکھتے ہیں جیسے کہ کیتھرین، پہلے وہ میری منظور نظر رہی پھر تم مائل ہوئے اور اب وہ مر گئی مگر اپنی کشش اس میں منتقل کر کے چھوڑ گئی، اینا نے بہت جلد مجھے مسحور کر لیا ہے، اب میں اپنے بڑھاپے کے دن اس کے ذریعہ خوب صورت بناؤں گی۔"

جیمز نے کوئی جواب نہیں دیا بلکہ اسے اٹھا کر پیار کرنے لگا اور کہا۔ "مما یہ کتنی زیادہ مجھ جیسی کیوں ہے، جیسے میں خود کو دیکھ رہا ہوں۔"

روز نے مسکرا کر کہا۔ "بیٹا اوپر والے نے جیسا کیا ٹھیک کیا، اب میں اتنی بھی بوڑھی نہیں کہ اس کی ماں نہ کہلا سکوں اور میں نے سوچا ہے کہ اب سے یہ ہماری بیٹی ہے۔ سب مانیں گے کیونکہ یہ تم سے ملتی جو ہے۔" جیمز اپنے والدین کا بہت شکر گزار تھا کہ انہوں نے دانشمندی اور نرمی کا مظاہرہ کر کے اس کی الجھن رفع کر دی۔

اس نے واپسی کی تیاری شروع کر دی۔ ان دنوں ہوائی جہاز ابھی نہیں آئے تھے اور بحری جہازوں سے سفر کا کام لیا جاتا تھا۔ جیمز جلد ہی رخصت ہو کر سفر پہ روانہ ہوا۔ وہ جس جہاز سے سفر کر رہا تھا وہ ابتداء کے دو دن کے سفر میں ہی حادثے کا شکار ہو گیا۔ عجیب بات یہ ہوئی کہ حادثہ بہت شدید نہیں تھا جہاز اور مسافروں کا بہت کم نقصان ہوا مگر جیمز حادثے کے وقت جہاز کے کھلے حصے میں تھا جہاز کا توازن بگڑنے سے وہ کھلے سمندر میں جا گرا، وہ تیراکی جاننے کے باوجود پانی میں ڈوب کر ہلاک ہو گیا، جہاز کے عملے نے اس کو بچانے کی کوشش کی مگر صرف اس کی لاش ہی دستیاب ہو سکی اور بیشتر مسافر زندہ بچا لئے گئے چونکہ جہاز ابھی ہندوستان کی حدود سے زیادہ دور نہیں گیا تھا اس لئے ایک کشتی کے ذریعے جیمز کا جسد اور سامان واپس ہندوستان لایا گیا۔

ایڈورڈ کو اطلاع ملتے ہی وہ خود آیا مگر جوان بیٹے کی لاش دیکھ کر ڈھے گیا، جب وہ بیٹے کو اس حال میں لے کر گھر آیا تو روز صدمے سے پاگل ہو گئی اس سانحے سے گزرنا دونوں کے لئے محال تھا مگر اپنے حصے کے دکھ اٹھانے ہی پڑتے ہیں۔

بہت دنوں تک ماتم کرنے کے بعد وہ آہستہ آہستہ سنبھلنے لگے، اس میں بہت زیادہ ہاتھ اینا کے ننھے وجود کا تھا جس نے انہیں دوبارہ جینے کی راہ پر ڈال دیا وہ ایڈورڈ کی دیوانی تھی، جتنی دیر وہ گھر پر ہوتا اس سے الگ نہ ہوتی ویسے بھی وہ رونے اور ستانے والی بچی نہیں تھی، اپنی آنکھوں اور مسکراہٹ سے سب کو مسحور کرتی رہتی، ایڈورڈ کے ساتھ تو ایسا ہونے لگا کہ وہ گھر پہ ہوتا تو روز کو دینے کے لئے وقت نہ ملتا اینا اس کی تمام تر توجہ کی مالک بن چکی تھی، روز نے بھی اپنا غم اس کی وجہ سے کم ہوتا محسوس کیا۔

کیتھرین کی کہی بات پوری ہوئی کہ "جیمز کا غم اینا کی وجہ سے دور ہوگا اور یہ سرزمین جیمز کا مدفن بنے گی۔" وہ واقعی سارے فرق مٹا کر اسے اپنے ساتھ لے گئی۔

کچھ سال مزید کام کرنے کے بعد روز اور ایڈورڈ نے واپسی کا فیصلہ کر لیا، ویسے بھی روبن کی تعلیم مکمل ہو چکی تھی، وہ چاہتا تھا کہ ڈیوڈ خود اس کے مستقبل کا

فیصلہ کریں۔ روز بھی اپنی سرزمین پر رہنا چاہتی تھی، یہاں اس نے اپنا ایک بیٹا کھو دیا تھا وہ روبن کو یہاں نہیں رکھنا چاہتی تھی سو اس نے اعلیٰ افسران سے بات کرکے واپسی کے لئے رخت باندھ لیا۔

اینا اب پانچ برس کی ہو رہی تھی اب تک وہ ایڈ اور روز سے گھر پر ہی پڑھ رہی تھی واپس جا کر ان دونوں کا ارادہ اسے شاہی افراد کے اسکول میں بھیجنے کا تھا ویسے بھی کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ ان کی پوتی ہے، سبھی اسے ان کی بیٹی کے طور پر ہی جانتے تھے حتیٰ کہ روبن بھی۔ وہ زندگی کے سترہ طویل برس ہندوستان میں گزار کر اب اپنے مادر وطن آئے تو خوشی ان کے روم روم سے ٹپک رہی تھی، روبن بھی ننھی بہن کو دیکھ کر بہت خوش ہوا! اسے معلوم تھا کہ اس کی کوئی بہن بھی دنیا میں آچکی ہے مگر مل کر بہت مسرور تھا، اسے اپنا بڑا بھائی یاد آ گیا کیونکہ جیمز کی اینا کاربن کاپی تھی۔ پہلے پہل ملنے ملانے دعوتوں میں کافی وقت گزرا پھر انہوں نے اپنے گھر کو از سر نو ترتیب دیا اور ایڈورڈ نے یہاں کی پولیس میں خدمات دینا شروع کر دی، اس کی ریٹائرمنٹ میں ابھی کچھ عرصہ باقی تھا اینا لندن کے رئیس اسکول میں پڑھنے لگی۔

انگلستان آ کر اینا کی مقبولیت کا دور شروع ہو گیا، اتنی کم عمر میں اس کا حسن اور پراسراریت کو سب ہی محسوس کرنے لگے وہ ہر ایک کی منظور نظر بننے لگی، ہر عمر اور حیثیت کے لوگ اس کی جانب مائل ہوتے بڑے پیار کرنے کے لئے اور چھوٹے کھیلنے اور دوستی کے لئے مگر اینا بہت مختلف ثابت ہوئی وہ تو ہم عمر بچوں سے کھیلتی نہ بات کرتی، اور نہ ہی بڑوں کے قریب جاتی، بس اپنے کام سے کام رکھتی، یا پھر خالی وقت میں کسی تنہا گوشے میں جا کر بیٹھ جاتی اردگرد سے لاتعلق ہو کر کسی نادیدہ وجود سے باتیں کرتی مسکراتی۔

ایڈورڈ اور روز چونکہ مستقل اس کے ساتھ تھے، انہوں نے بھی اس کی ان پراسرار سرگرمیوں کو نوٹ کیا مگر اسے اس کی انفرادی طبیعت سمجھ کر نظر انداز کر دیا، وہ پڑھائی میں ناقابل یقین حد تک ذہین تھی اس کے آنے کے بعد اس کی کلاس میں کوئی بھی اس کے مقابل نہ آ سکا۔ یہ بات ایڈورڈ اور روز کو فخر میں مبتلا کرتی، انہیں اکثر اسکول کی تقریبات میں تعریف سمیٹنے کے لئے جانا پڑتا۔

روبن نے آرمی میں کمیشن لیا، فوج میں چلا گیا، روبن بھی خوش شکل تھا مگر اپنے مرحوم بھائی کی طرح وجیہہ اور بہت خوب صورت نہیں، وقت اپنی رفتار سے گزرتا رہا، اینا نو برس کی تھی جب روبن کی شادی اس کے ایک اعلیٰ افسر کی بیٹی سے ہونا قرار پائی وہ شادی کے بعد کچھ عرصہ والدین کے ساتھ رہا پھر نئی جگہ پوسٹ ہونے پر بیوی کو ساتھ لے کر چلا گیا۔

ایڈورڈ اور روز کی زندگی کا محور اب اینا ہی ہو کر رہ گئی، وہ دونوں اکثر سوچتے کہ اگر خدا نے اینا ان کی زندگی میں نہ بھیجی ہوتی تو وہ دونوں کتنے تنہا ہوتے، ان کی زندگی کتنی بے کیف ہوتی مگر اینا نے اپنے وجود سے ان کی زندگی بھرپور بنا رکھی تھی۔

اینا پوری دنیا میں اگر کسی سے بات کرتی یا تعلق رکھتی تو وہ صرف ایڈ اور روز ہی تھے جنہیں وہ ممی پاپا کہتی ورنہ وہ ہر ایک سے کتراتی، اسکول اور گھر کے علاوہ اس کی کوئی مصروفیت نہ تھی، نہ ہی وہ کہیں جاتی تھی کہ ایڈ اور روز اگر کہیں مدعو ہوتے تو وہ گھر پر رہنے پر اصرار کرتی اس نے سب کو مسحور کر رکھا تھا جبکہ وہ خود اس وجود کے سامنے مسحور ہو کر رہ جاتی جو روز اول سے اس کے ساتھ تھا کسی کو نظر آنے والی ہستی ہر وقت اس کی نگاہوں کے سامنے ہوتی حتیٰ کہ رات کو سوتے ہوئے جب تک اس کی موجودگی کا یقین نہ ہوتا وہ نہ سوتی مگر یہ محبت بہت پاکیزہ تھی معصوم بھی۔

بہرحال وہ بڑی ہوتی رہی ایڈورڈ کی ریٹائرمنٹ کا وقت آ گیا وہ محکمہ سے فارغ ہو گیا روز بھی صرف گھر شوہر اور بیٹی پر توجہ دیتی وقت سبک خرامی سے گزرتا رہا اور اینا بڑی ہوئی وہ اسکول سے فارغ ہو کر کالج آ چکی تھی ساتھ ساتھ اس کا حسن بھی بہت سرکش ہو چکا تھا وہ

باپ کے دلکش حسن اور ماں کی قیامت خیز کشش کا مرقع تھی پھر اس کی لہو جما دینے والی پراسراریت نے اسے ہر دل کی دھڑکن بنا دیا مگر وہ نہ کسی کی جانب دیکھتی اور نہ بات کرتی۔

کئی سر پھروں نے اس کے ساتھ زبردستی تعلق بنانا چاہا تو یہ عمل انہیں بہت مہنگا پڑا۔

اس کے ساتھ رہنے والا وجود کسی کی ذرا برابر گستاخی معاف نہ کرتا اور اس کی ایسی درگت بنتی کہ سامنے والا ہمیشہ کے لئے اس کا نام اپنے دماغ سے نکال دیتا۔

ایڈ اور روز کے لئے اینا کا رویہ بہت خلاف معمول تھا۔ اس کی عمر کی لڑکیاں دوست بناتیں گھر سے باہر جاتیں مگر وہ کسی بھی لڑکے سے بات تک نہ کرتی اور نہ ہی گھر سے باہر جانا گوارا تھا اس کا ہر تعلق صرف ان دو بوڑھوں کی ذات سے جڑا تھا وہ دونوں کا حد سے زیادہ خیال رکھتی اور محبت کرتی مگر وہ نہیں جانتے یا کسی اچھے لڑکے سے ملنے کو کہتے تو وہ انکار کر دیتی۔ وہ فطرت سے ہٹ کر نہیں تھی مگر اس عمر کے جو بھی تقاضے تھے وہ الگ تھے، آخر تھک ہار کر دونوں نے اسے اس کے حال پر چھوڑ دیا۔

اب اس کی کالج کی تعلیم بھی ختم ہوئی تو اس نے مزید پڑھنے سے منع کر دیا، باوجود اس کے کہ وہ ٹاپ کر چکی تھی مگر انہوں نے بھی اصرار نہ کیا، روبن اور اس کی بیوی چھٹیوں میں آتے تو گھر میں رونق ہو جاتی اس عرصہ میں اس کے تین بچے ہو چکے تھے وہ دادا دادی کو پیار تو کرتے مگر اینا جیسی محبت کوئی نہیں دے سکا۔

روز تنہائی میں اکثر اب کیتھرین کو یاد کرتی، اس کی شکر گزار ہوتی کہ وہ اینا کا تحفہ دے گئی، کیتھرین کی یاد نے تو اب مستقل صورت اختیار کر لی تھی۔

ایڈورڈ اب کچھ کچھ بیمار رہنے لگا، لندن کی سردی بڑھاپے میں اثر انداز ہونے لگی۔ روز بھی پہلے جیسے سرگرم اور پھرتیلی نہ رہی تھی۔ ایک سرد رات میں جب برف باری ہو رہی تھی تو اینا روز اور ایڈ کے پلنگ پر ان دونوں کے درمیان بیٹھی اپنے وجود کی گرمی دے رہی تھی اور ساتھ ہی اپنی باتوں سے ان کا دل بہلا رہی تھی کہ باتوں کے دوران ایڈ نے کہا۔ ''اینا تم ہم بوڑھوں کی وجہ سے کب تک اپنی زندگی ضائع کرو گی تم بیس برس کی ہو چکی ہو۔ بہتر ہے کہ ہمارے سامنے شادی کر لو ورنہ ہمارا کیا پتہ۔''

اینا نے کہا۔ ''پاپا میں شادی کروں گی اور میرے بچے بھی ہوں گے مگر اپنی سرزمین پر جہاں کا میرا خمیر ہے مگر آپ کو چھوڑ کر کبھی نہیں۔''

اس بات نے دونوں کو بری طرح چونکا دیا وہ دونوں ہی سیدھے ہو کر اسے دیکھنے لگے۔

روز نے کہا۔ ''بیٹا تم ہندوستان میں پیدا ضرور ہوئی ہو مگر ہماری بیٹی ہو اور ہماری مٹی یہ ہے پھر اس بات کا کیا مطلب؟''

اینا نے کہا۔ ''مام مطلب تو میں بھی نہیں جانتی مگر وہ کہتا ہے کہ مجھے میری مرضی سے لے کر جائے گا اور پھر ہم گھر بسائیں گے۔''

''وہ کون ہے ہم سے ملواؤ ہم خود فیصلہ کریں گے تمہاری زندگی کا۔'' وہ بہت پریشان ہو گئے تھے۔

اینا نے کہا۔ ''پاپا پہلے تو میں جانتی کہ وہ کون ہے؟ بس میں نے آنکھ کھولتے ہی اسے دیکھا پھر وہ میرے وجود کا حصہ بن گیا، مجھے کوئی لمحہ ایسا یاد نہیں کہ جب میں نے خود کو اس کے بغیر پایا ہو مگر اب جب میں سمجھدار ہو چکی ہوں اور سمجھنے لگی ہوں کہ وہ انسان نہیں ہے مگر جو بھی ہے بہت ضروری ہے وہ نہ ہوا تو شاید میں بھی نہیں رہوں گی۔''

روز نے گھبرا کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ''ایسا نہ کہو میری جان ہم تو تمہارے دم سے جی رہے ہیں۔''

پھر روز نے کہا۔ ''ہم بہت بوڑھے ہو چکے ہیں کیا اب وقت نہیں آ گیا کہ ہم اینا کو ماضی بتا دیں۔''

ایڈ نے سر ہلایا اور کہا۔ ''میں بھی بہت دنوں سے سوچ رہا تھا مگر ہمت نہیں ہو رہی تھی کیونکہ ہم نے اینا سے اپنے دونوں بیٹوں سے زیادہ محبت کی ہے۔'' پھر اس نے اینا کا سر اپنے سینے پر رکھا اور نیم دراز ہو گیا۔

آہستہ آہستہ ماضی کی کتاب کا ورق ورق بیان کر دیا، آخر میں کہا۔ ''میری جان اینا یہ سچ ہے کہ تم ہماری بیٹی نہیں پوتی ہو، وہ بھی ناجائز، ہم نے اپنے جوان بیٹے کو کھو کر بھی جی لیا کیونکہ تم اس کی جگہ پہلے ہی لے چکی تھی، ہم تمہاری ماں کے احسان مند ہیں کہ اس نے ہمیں ہماری امانت لوٹا دی ورنہ اگر وہ جیمز کو مجبور نہ کرتی تو ہم......'' اس سے آگے اس کا گلا رندھ گیا اور آنکھیں بہنے لگیں۔ وہ بیٹے کی موت کے بعد آج رو رہا تھا۔

اینا نے اپنی ہتھیلیوں سے اس کے آنسو پونچھے اور کہا۔ ''پاپا اس سے کیا فرق پڑتا ہے کہ میں آپ کی بیٹی نہیں پوتی ہوں، خون تو آپ ہی کا ہوں، آپ کو آغوش ملی ہے ورنہ ماں یا باپ تو مجھے دنیا میں لا کر چلے گئے تھے، آپ نے مجھے قبول کرلیا، یہ کیا کم ہے۔''

پھر وہ رات تینوں نے ایک ساتھ بسر کی صبح معمول کے مطابق اٹھے تو ایڈ خاصا ہشاش بشاش تھا وہ بار بار اینا کو پیار کرتا پھر اس نے بھاگ بھاگ کر گھر کے بہت سارے کام کیے لکڑیوں کا ذخیرہ منگوایا، کچن کی اشیاء لا کر دیں روز اور اینا کی پسند کی کتابیں لے کر آیا، غرض وہ سب کام ایسے کر رہا تھا۔ جیسے اسے کہیں جانا ہو اور اس کی مستعدی پر حیران ہوتی منع بھی کرتی مگر وہ ہنستا رہتا اور کام کرتا رہتا پھر وہ تیسرے روز سردی لگ جانے سے بیمار ہو گیا، اینا اور روز کی جان پر بن آئی، انہوں نے جی جان سے تیمارداری کی، ڈاکٹر کو گھر بلا کر دکھایا دوائیں دیں مگر ایڈورڈ تو جیسے بہانہ ڈھونڈ رہا تھا ہر طرح کی خدمت اور علاج کے باوجود وہ ایک صبح انتقال کر گیا۔

روز اور اینا دونوں قریب ہی تھیں، جب وہ رخصت ہوا، روز تو ڈاکٹر کی تصدیق کے بعد بیہوش ہوگئی، وہ ایڈ کو ٹوٹ کر چاہتی تھی، اس کی جدائی سہہ نہ سکی اور بیمار ہوگئی۔

اینا بھی اگرچہ بری طرح صدمے کا شکار تھی مگر روز کے لئے خود کو سنبھالے رکھا ایڈ کے بعد اس کی خدمت پر لگ گئی۔

روبن باپ کی وفات پر آیا مگر صرف تین روز ٹھہر سکا، اس کی بیوی اور بچے رک گئے تھے، یہ لوگ بھی ان کے غم کو اپنی کوشش سے کم کر رہے تھے، روبن کی بیوی لیزا اچھی عورت تھی اس نے بھی روز کو سنبھالنے کی پوری کوشش کی مگر آثار سے لگ رہا تھا کہ روز اب ایڈ کے بعد زیادہ عرصے نہیں جی پائے گی۔

جب روز کی حالت میں کچھ بہتری آئی تو لیزا بچوں کے ہمراہ روبن کے پاس چلی گئی، اب صرف اینا اور روز رہ گئے، روز اینا کے سامنے خود کو ٹھیک ظاہر کرتی لیکن اندر سے دیمک زدہ لکڑی کی طرح تھی، اینا نے روز کو ماں کے روپ میں پایا تھا اس کی محبت بھی خالصتاً بیٹی والی ہی تھی مگر حقیقی والدین کا وجود بھی کسی گمشدہ خزانے کی طرح ہوتا ہے جبکہ انہیں دیکھا ہی نہ ہو۔

رفتہ رفتہ روز کا کھوکھلا پن ظاہر ہونے لگا وہ صاحب فراش ہو کر رہ گئی اینا بدستور اس کے ساتھ جڑی ہوئی تھی ایک رات اس نے روز سے پوچھا۔ ''مام مجھے میری ماں کے گھر والوں کے بارے میں بتائیں کہ ان کی فیملی تھی اور وہ سب کہاں ہیں؟''

روز نے کہا۔ ''ہمیں واپس آئے پندرہ برس ہو چکے ہیں معلوم نہیں کون کہاں ہوگا لیکن جو کچھ جانتی ہوں وہ بتا دیتی ہوں۔'' پھر وہ بتاتی چلی گئی، اپنی ماں کیتھرین کی ساری کہانی اینا بہت دلچسپی سے سنتی رہی، باتیں کرتی رہی۔

روز سو گئی اینا نے اس پر کمبل پھیلایا اور اس کے ساتھ ہی لیٹ گئی، وہ جاگ رہی تھی اور مستقل ان لوگوں کے یادوں میں کھوئی ہوئی تھی جنہیں کبھی دیکھا ہی نہیں تھا، پھر اسے ایک مانوس سا احساس ہوا اس نے سامنے دیکھا تو وہی تھا۔ ''اب تم تیار ہو جاؤ وہیں جانے کے لئے جہاں ہماری منزل ہے اور تمہارا اصل۔''

اینا نے روز کی جانب دیکھ کر کہا۔ ''میرا اصل یہ بھی ہیں، معلوم نہیں یہ ساتھ کب چھوٹ جائے اور میں تنہا رہ جاؤں۔''

''تم مجھے فراموش کر رہی ہو یا خود سے الگ کہ تنہا

رہ جانے کی بات کہہ دی۔‘‘

’’نہیں تم محسوس نہ کرو صرف میرے دکھ کو سمجھو۔‘‘ اس کے بعد وہ بھی نیند کے عالم میں جانے لگی تو وہ بھی ہوا میں تحلیل ہو گیا۔

اگلی صبح اینا جلدی ہی بیدار ہو گئی اس نے روز کو دیکھا کہ اگر وہ بھی بیدار ہو تو اسے حوائج ضروریہ کے لئے لے جائے جب سے روز علیل تھی اینا اسے پکڑ کر حاجت کے لئے لے جاتی اور لے کر آتی کیونکہ وہ خود سے چل نہیں پاتی تھی مگر اس وقت جب اینا نے اسے آواز دی اور ہاتھ پکڑ کر ہلایا تو روز نے جواب نہیں دیا وہ بالکل ساکت پڑی تھی، اینا کو کسی انہونی کا احساس ہوا اس نے اسے اچھی طرح ہلایا آواز دی مگر جواب ندارد، اس کا جسم البتہ کچھ گرم تھا، اینا جان گئی کہ کچھ لمحے قبل ہی روز اسے چھوڑ کر جا چکی ہے، وہ روز کے بے جان وجود سے لپٹ کر رونے لگی، پھر گھر تمام جاننے والوں اور رشتہ داروں سے بھر گیا، روبن کو بھی اطلاع ہو گئی، اینا نے روز کو جی بھر کے پیار کیا اور روبن سے لپٹ کر روتی رہی، روبن بھی ماں کے بچھڑ جانے پر خود کو بے سائبان محسوس کر رہا تھا، وہ روز کی تکلیف سمجھ رہا تھا مگر موت کا علاج تو کوئی بھی نہیں جان سکا پھر وہ کیا کر سکتے تھے۔

آنسو کے درمیان روز کو ایڈ کے پہلو میں لٹا دیا گیا اور مٹی کی چادر اوڑھا دی گئی، وہ دونوں زندگی بھر ساتھ ساتھ رہے تھے اور شوہر بیوی کی محبت اور تعلق کو خوبی سے نبھایا، اب بھی وہ ساتھ ساتھ تھے، روبن اینا کو سینے سے لگائے واپس گھر آ گیا کیونکہ آہستہ آہستہ تمام لوگ رخصت ہو گئے تھے۔

روبن نے اینا سے کہا کہا۔ ’’میرے ساتھ چلو، اب تم کیسے تنہا رہو گی۔‘‘

اینا نے کہا۔ ’’بھائی میں ہندوستان جا رہی ہوں۔‘‘

روبن نے چونک کر پوچھا۔ ’’لیکن کیوں وہاں کون ہے تمہارا؟‘‘

اینا نے کہا۔ ’’بھائی میں مام اور پاپا کی بیٹی نہیں پوتی ہوں، آپ کے بھائی جیمز کی ناجائز بیٹی یہ سب باتیں پاپا نے مجھے بتائی تھیں، انہوں نے اس حقیقت کو سب سے چھپایا حتیٰ کہ آپ سے بھی لیکن اب میرا جانا طے ہے آپ فکر مند نہ ہوں میں اکیلی نہیں ہوں۔‘‘

روبن یہ جان کر بہت حیران ہوا لیکن یقین کرنا پڑا اس نے اینا سے کہا۔ ’’اینا تمہاری باتوں نے مجھے پریشان کر دیا ہے مگر اس سب سے میری تم سے محبت کو کوئی فرق نہیں پڑنے والا، بہتر ہے کہ یہ راز صرف ہم دونوں کے درمیان ہی رہے، لیزا یا باقی لوگوں سے یہ حقیقت چھپی رہے تو بہتر ہے، ورنہ مام اور ڈیڈ کی روح کو تکلیف ہو گی، لیکن تم گمشدہ رشتوں کی تلاش میں نہ جاؤ تو بہتر ہے، میں جانتا ہوں کہ کسی کو بھی تم سے مل کر خوشی نہ ہو گی۔‘‘

اینا نے کہا۔ ’’بھائی رشتوں کی کھوج تو اپنی جگہ لیکن ایک سچ ہے جو صرف آپ جاننے والے ہیں اس سچ کو مام اور پاپا بھی نہیں جانتے تھے میری تقدیر کے فیصلے اب اس کے ہاتھ میں ہیں، جس سے میں وابستہ ہوں، بہت جلد آپ بھی جان لیں گے، بس اب آپ کوئی بات نہ کریں۔‘‘ اس کے بعد لیزا کمرے میں کھانا لے کر آ گئی تو گفتگو موقوف ہو گئی۔

تدفین کے تیسرے روز روبن نے اپنی فیملی کے ساتھ جانے کی تیاری کر لی، لیزا کا خیال تھا کہ اینا ان کے ساتھ جائے گی مگر روبن نے بہانہ کر دیا پھر جانے سے قبل روبن نے گھر کے پچھواڑے باغیچے میں اینا سے بات کرتے ہوئے دفعتاً کسی کو ظاہر ہوتے دیکھا تو ٹھٹک گیا، اینا نے اس کا ہاتھ دبا کر تسلی دی، روبن نے اپنے سامنے ایک بہت خوب صورت جوان کو دیکھا، اس نے مسکرا کر اپنا ہاتھ روبن کی جانب بڑھایا، روبن نے جھجکتے ہوئے مصافحہ کیا، وہ آ کر اس کے سامنے بیٹھ گیا اور کہا۔ ’’محترم میرا نام عبدالرحمن ہے اور میں مسلمان ہوں، میں پیدائش کی گھڑی سے اب تک اینا کے ساتھ ہوں۔ اینا بے شک نصرانی ہے لیکن ہمارے ہاں اہل کتاب عورت سے شادی جائز ہے میں اینا کی خواہش پر

آپ سے ملاقات کررہا ہوں، ہوسکتا ہے کہ مستقبل میں اینا برضا ورغبت مسلمان ہوجائے آپ ان کے ولی ہیں، میں اس رشتے سے آپ سے اخلاقاً ان سے شادی کی درخواست کرتا ہوں، اس سے قبل ہم دونوں ایک دوسرے کو قبول کرچکے ہیں اور بہت جلد یہاں سے جانے والے ہیں کیونکہ وہاں میرے خاندان کے لوگ ہمارا انتظار کررہے ہیں۔''

روبن نے اینا کی جانب دیکھا اور کہا۔''اینا اب معلوم ہوا کہ تم اس قدر پراسرار کیوں تھیں لیکن میرے لئے تمہاری خوشی مقدم ہے اگر یہ تمہیں حفاظت سے رکھیں تو مجھے تمہارا فیصلہ قبول ہے۔''

عبدالرحمن نے کہا۔''یہ جب جب بھی آپ سے ملنے آئیں گی آپ کو اندازہ ہوتا رہے گا کہ ان کا فیصلہ قبول کرکے آپ نے کچھ غلط نہیں کیا۔'' پھر وہ الوداعی کلمات کے بعد رخصت ہوگیا۔ اینا روبن، لیزا اور بچوں کو چھوڑنے دروازے تک آئی اور گھر کی چابیاں چپکے سے روبن کو دے دیں، وہ سب محبت سے ملنے کے بعد چلے گئے اور اینا اپنے سفر پر روانہ ہوگئی۔

اینا کسی ظاہری وسیلے کی محتاج نہ تھی، بس عبدالرحمن کا ہاتھ پکڑا اور لمحوں میں سات سمندر عبور کرلئے ورنہ تو خود وہ چند قدم کا فاصلہ بھی اپنے بھروسے سے چلنے کے قابل نہ تھی مگر بھروسے کی طاقت نے اسے اپنی ماں کے وطن کی مٹی تک پہنچادیا لیکن لندن کی فضاؤں سے ہندوستان کی آغوش میں آنا ایک الف لیلوی کیفیت تھی جس میں گمشدہ رشتوں کا سحر بھی شامل تھا، عبدالرحمن نے سب سے پہلے اس کی ماں کی قبر دکھائی، قبر کو دیکھ کر ایسا لگا جیسے کوئی آتا رہتا ہو ورنہ تو قبر محض مٹی کا ڈھیر ہوتی ہے یا پھر کسی اپنے کی یاد، وہ بہت دیر تک اپنی ان دیکھی ماں کو سوچتی رہی پھر جیمز کی قبر پر آگئی، سفید پتھر کی سلوں سے پختہ قبر اپنے اندر والے کی ذی حیثیت کا مظہر تھی، سیاہ حرف سے اس کے باپ کا لکھا نام اس کی آنکھوں میں ٹھہر گیا، اس کی آنکھیں ویسے ہی روشن ہوگئیں جیسے ایک سال کی عمر میں اسے پہلی بار دیکھنے پر ہوئی تھیں مگر ایک دلاسہ تھا خود کو دینے کے لئے کہ وہ خود کو دیکھ کر اپنے باپ کو دیکھ سکتی ہے۔ ماں باپ کی محبت دنیا کی تمام محبتوں سے زیادہ مضبوط اور مقدس ہوتی ہے۔ ماسوائے خدا کی محبت کے۔ اور وہ اس محبت کی طاقت کو محسوس کررہی تھی۔

جب تک ایڈورڈ اور روز زندہ رہے جان لینے کے باوجود وہ اپنے حقیقی والدین کو اتنا نہ سوچ سکی جتنا اب سوچ رہی تھی پھر بہت دیر گزر جانے پر عبدالرحمن نے اسے چلنے کو کہا تو وہ اٹھ کھڑی ہوئی اور بنا کچھ پوچھے ساتھ چل پڑی، پھر اگلی منزل عبدالرحمن کا قبیلہ تھی، وہ اسے اپنے گھر لے گیا، وہاں اسے بہت عزت اور محبت سے قبول کیا گیا مگر نجانے کیوں اینا کا دل اندر سے اتنا خوش نہیں تھا جتنا اس موقع پر ہونا چاہئے تھا۔

چند روزہ قیام کے بعد اس نے عبدالرحمن سے اپنے ننھیال والوں سے ملانے کو کہا۔

عبدالرحمن نے اسے پہلے نکاح کرلینے کی تجویز دی مگر اس نے کہا۔''میں اب تمہاری تحویل میں ہوں۔ جب چاہوگے نکاح ہوجائے گا مگر پہلے اپنوں سے مل لوں تو کیا برا ہے۔'' عبدالرحمن فوراً ہی تیار ہوگیا سب سے پہلے اسے کلکتہ لے گیا جہاں اس کا ماموں جوزف خوب پڑھ لکھ لینے کے بعد محکمہ تعلیم میں بطور افسر خدمات دے رہا تھا۔

عبدالرحمن اسے وہاں لاکر منظر سے ہٹ گیا۔

اینا نے دستک دی کچھ دیر بعد دروازہ کھلا اور ایک فربہ اندام سخت چہرے والی عورت نے پوچھا۔''کس سے ملنا ہے؟'' وہ اینا کو دیکھ کر سمجھی کہ اس کے شوہر کے محکمے کی کوئی اعلیٰ افسر آئی ہے وہ فوراً باآداب ہوکر کھڑی ہوگئی۔

اینا نے کہا۔''مجھے مسٹر جوزف سے ملنا ہے۔'' وہ غالباً انگریزی کو نہیں سمجھتی تھی مگر جوزف کا نام سن کر اسے اندر لے آئی۔ اندر بچوں کا مدھم سا شور بھی سنائی دیتا تھا وہ اسے ایک صاف ستھرے کمرے میں لے آئی اور بیٹھنے کو کہا اور خود جوزف کو بلانے کا کہہ کر چلی گئی، اینا دھڑ

دھڑکتے دل کے ساتھ آنے والے لمحوں کے لئے خود کو تیار کرتی رہی، اس کا اعتماد متزلزل ہورہا تھا اس نے ابھی تک محبت کرنے والوں کے ساتھ زندگی گزاری تھی، یہ کیا برتاؤ کرتے ہیں اسی اثناء میں کوئی نشست گاہ میں آیا، اینا اٹھ کر کھڑی ہوگئی، ایک بیالیس تا تینتالیس سالہ بھاری جسامت اور انتہائی معمولی شکل وصورت کا مرد اندر آیا اور بہت مہذب انداز سے اینا کو سلام کیا، اس کی بیوی اس کے پیچھے پیچھے آئی تھی، اس کا تجسس اس کی شکل سے ہی ہویدا تھا۔

اینا کو ہندوستانی زبان نہیں آتی تھی، اس نے رسمی گفتگو کے بعد اصل موضوع کی طرف آتے ہوئے کہا۔

''مسٹر جوزف کیا آپ کو اپنی مرحوم بہن کیتھرین کی بچی یاد ہے؟'' اسے محسوس ہوا کہ جوزف کی بیوی انگریزی نہیں سمجھتی اس لئے وہ بے فکر ہوکر بات کررہی تھی۔

اس بات پر جوزف بری طرح سے مضطرب ہوگیا۔ ''آپ خود کون ہیں اور یہ بات کیوں پوچھ رہی ہیں؟'' جوزف نے جواب میں سوال کردیا۔

''میں ضرور بتاؤں گی لیکن پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو وہ بچی یاد ہے اور اگر ہے تو کبھی رابطہ کرنے کی کوشش کیوں نہیں کی؟''

جوزف کے چہرے پر ناگواری آگئی۔ ''دیکھئے مادام میں اس بچی کو کیوں یاد رکھتے اور رابطہ کرنے کی کوشش کرتا جبکہ وہ ہمارے منہ پر طمانچہ تھی، ہمارے آقاؤں کی طرف سے کہ ہم ان کے احسانمند ضرور ہیں، مگر انہیں کسی نا سمجھ محکوم کے تمام حقوق پامال کرنے کا حق نہیں تھا۔ اس کی وجہ سے ہمارے ماما بھی ہم سے قطع تعلق کرگئے۔''

اینا کی خوبصورت آنکھیں ڈبڈبانے لگیں مگر وہ ضبط کرکے اٹھ کھڑی ہوئی، اس تلخ گفتگو کے دوران جوزف کو میزبانی کا خیال نہیں رہا، وہ جانے لگی تو جوزف نے کہا۔ ''رکئے کہاں جارہی ہیں میری بات تو سنئے۔''

اینا رک گئی، مگر خاموش رہی۔

جوزف نے کہا۔ ''آپ بیٹھئے میں نے تو کچھ کھانے پینے کا پوچھا بھی نہیں۔''

اینا نے رکنا مناسب نہ سمجھا اور شکریہ ادا کرکے جانے لگی پھر بھی جاتے جاتے جوزف نے سوال کیا۔ ''آپ کون ہیں؟''

اینا نے ایک لمحہ رک کر کہا۔ ''میں کیتھرین اور جیمز کی بیٹی ہوں۔'' اور دروازہ پار کرگئی۔

جوزف کا چہرہ تاریک ہوگیا اور اس کے کندھے جھک گئے جبکہ اس کی بیوی ان تمام باتوں سے نابلد اپنے شوہر کے تاثرات دیکھے جارہی تھی۔ اینا بجھے دل کے ساتھ گھر سے نکل کر چلنے لگی اس لمحے اس نے عبدالرحمن کی موجودگی یا غیر حاضری کو بھی فراموش کردیا تھا، اسے ایڈ، روز اور روبن بہت یاد آئے کہ وہ سب کچھ جانتے ہوئے بھی اس نے محبت کی عزت دی اور یہ اس کا ماموں اسے اپنے آقاؤں کا طمانچہ قرار دے رہا تھا، اس نے سوچا کہ وہ اپنی آنٹی سارہ سے نہ ملے تو بہتر ہے ہیں اس کی سوچ بھی ایسی ہوئی تو وہ شاید ہندوستان میں رہ بھی نہ سکے گی، بے مروتوں کے درمیان رہ کر دل جانے کا گیا نہ وہ اپنے خیالات میں غلطاں بے سمت چلی جارہی تھی، اس کی نگاہیں زمین پر تھیں، کہ وہ سامنے سے آتے ہوئے کسی سے ٹکرا گئی، وہ گرنے والی تھی کہ ٹکرانے والے نے اس کا بازو پکڑلیا اور وہ سنبھل کر سیدھی ہوئی اور سامنے دیکھا۔

ایک سفید ریش سرگلیں چمکتی آنکھوں اور مرعوب کن چہرہ والے بزرگ سے نگاہیں ٹکرائیں اور جھک گئیں۔ وہ انگریزی میں مخاطب ہوئے۔ ''بیٹا کن تکلیف دہ سوچوں میں تھی کہ گردوپیش سے بے خبر ہوگئی۔''

اینا نے چونک کر دوبارہ ان کی جانب دیکھا۔ ایک آنسو آنکھ سے پھسل گیا۔ انہوں نے کہا۔ ''بیٹا میرے ساتھ چلوگی شاید ہم تمہارے کسی کام آجائیں۔'' تو وہ خاموشی سے ان کے ہمراہ چل پڑی۔ یہ سب وہ لاشعوری طور پر کررہی تھی۔

ابھی کچھ قدم ہی چلی تھی کہ عبدالرحمن نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''اینا مت جاؤ ان کے ساتھ

میرے ساتھ چلو۔"

اسی لمحے وہ بزرگ بولے۔ "بیٹا ضروری نہیں کہ تم صرف اس کی مانو، کبھی اپنے دل کی بھی بات مان لینی چاہئے۔"

اینا کے دل سے آواز اٹھی کہ "یہ عام انسان نہیں ہوسکتے۔"

وہ عبدالرحمٰن کو پہلی بار نظر انداز کرگئی جبکہ اس کی کرب میں ڈوبی آوازیں دیر تک اس کے کانوں میں آتی رہیں، وہ کچھ دیر کے بعد ایک مختصر سی حویلی کے سامنے کھڑی تھی بزرگ نے ہاتھ بڑھا کر دروازہ دھکیلا تو کھلا، وہ ان کے پیچھے اندر داخل ہوئی۔

ایک بہت خوب صورت خاتون ڈیوڑھی سے آگے صحن میں کھڑی تھیں وہ بڑے میاں بولے۔ "زبیدہ دیکھو بیٹی آئی ہے اندر لے کر چلو کچھ خاطر مدارت کرو۔" بات انہوں نے اردو میں کہی وہ خاتون اینا کے قریب آئیں اور بنا پہچان کے بہت گرم جوشی سے گلے لگایا اور پیشانی پر بوسہ دیا۔ اینا کو سمجھ نہیں آیا کہ کبھی کوئی سرراہ ملنے والا بھی اپنوں جیسا برتاؤ کرسکتا ہے، وہ دراز قد خاتون اسے لے کر اندر چلی گئیں، پوری حویلی سادہ مگر بہت صاف ستھری اور نفاست کی آئینہ دار تھی۔

اندر ایک نشست گاہ میں دو لڑکیاں بیٹھی ہوئی تھیں دونوں نے بڑی بڑی چادریں اس طرح سے اوڑھ رکھی تھیں کہ ہاتھ پاؤں اور چہرے کے سوا کچھ باہر نہ تھا وہ بھی بڑی بی کی آواز پر لپک کر آئیں اور محبت سے گلے لگا کر ملیں اس حویلی کی فضا ایسی تھی کہ داخل ہوتے ہی اینا کو اپنے دل کے بوجھ ہلکے ہوتے ہوئے محسوس ہوئے، دل سکون میں آگیا۔

دوپہر کا وقت تھا غالباً کچن میں کھانا بن رہا تھا کچھ چھوٹے بچوں کی آوازیں بھی سنائی دیں ان دونوں لڑکیوں میں سے ایک نے انگریزی میں اس سے کہا کہ وہ غسل خانہ میں جاکر منہ ہاتھ دھولے پھر کھانا لگنے والا ہے وہ حیران کن تاثرات لئے اس کی رہنمائی میں غسل خانہ تک گئی وہاں دیر تک ہاتھ منہ دھوتی رہی پھر باہر آکر ہاتھ منہ پونچھ کر دوبارہ اس کے ہمراہ چل پڑی وہ اسے نشست گاہ میں بیٹھا کر چلی گئی وہ وہاں اطمینان سے بیٹھ گئی، باہر سے ہلکی ہلکی آوازیں آرہی تھیں۔

پندرہ منٹ کے بعد وہی لڑکی دوبارہ آئی اس کے ہاتھ میں ایک چادر تھی، اس نے کہا۔ "آیئے کھانے پر آپ کا انتظار ہورہا ہے، لیکن پہلے یہ چادر اوڑھ لیجئے، بابا کو بیٹیاں بے پردہ اچھی نہیں لگتیں۔"

اس نے اس سے چادر لے کر اوڑھ لی اور ہمراہ چل پڑی، وہ چند کمروں کے بعد ایک وسیع کمرے میں لے آئی، وہاں زمین پر دسترخوان بچھا تھا اور بہت سارے افراد بیٹھے تھے جن میں دو لڑکے بھی تھے مگر سب سے حیران کردینے والی بات یہ تھی کہ اینا جیسے مرد تو مرد عورتیں بھی اگر دیکھ لیں تو بار بار دیکھتیں مگر ان دو لڑکوں نے بالکل بھی نگاہ نہیں اٹھائی اور نہ ہی اس کی جانب دیکھا۔

لڑکی نے اسے بابا کے پہلو میں بیٹھا دیا۔ انہوں نے بہت محبت سے اسے دیکھا اور کہا۔ "بیٹا کھانا اچھی طرح سے کھانا تکلف قطعی نہیں کرنا، مگر پہلے سب سے تعارف ہوجائے۔"

اینا پہلی بار مسکرائی، بابا بولے۔ "چادر میں ہماری بیٹی کتنی اچھی لگ رہی ہے۔" پھر تعارف شروع ہوا۔ "بیٹا ہمارا نام ہے حافظ تقی الدین، یہ ساتھ ہماری زوجہ زبیدہ بیگم، یہ آپ کے ساتھ ہماری بہو خدیجہ اور ان کے ساتھ ہماری بیٹی آمنہ، دوسری جانب میرا بڑا بیٹا حافظ محمد علی اور ان سے چھوٹا بیٹا حافظ عثمان علی ادھر جو بیٹھی ہیں وہ ہیں تو گھر کی خادمہ مگر گھر کی فرد کی طرح ہیں یہ دونوں ہمارے پوتے محمد علی کے بیٹے۔"

اینا کی آنکھوں میں حیرانی سمٹ آئی کہ اتنے کم عمر میاں بیوی کے اتنے بڑے بچے پھر کھانے کا آغاز ہوا، کھانا ذائقے کے لحاظ سے گرچہ اینا کے لئے نیا تھا مگر تھا بہت سادہ اور لذیذ اس نے سیر ہوکر کھایا پھر آمنہ اسے ساتھ لے کر تیلو لے کے لئے چلی گئی، دوپہر میں اینا کو بہت آسودہ سی نیند آئی اور وہ دیر تک سوتی رہی۔

تین دن خاطر مدارت اور محبت میں گزر گئے اینا یہاں آنے کے مقصد سے بھی لاعلم تھی، بس گھر والوں کے رویے سے ایسا لگتا کہ جیسے وہ بہت خاص ہستی ہے جسے لمحہ لمحہ محبت اور عزت دینا ضروری ہو۔

سب سے اہم کہ تین دنوں سے اس نے ایک بار بھی عبدالرحمن کی موجودگی محسوس نہ کی، گھر میں صرف خدیجہ اور بابا انگریزی میں بات کر سکتے تھے جن سے وہ تھوڑی بہت بات کر لیتی۔

آخر تیسری شب سونے سے قبل اس نے خدیجہ سے کہا۔ ''مجھے بابا سے علاوہ تنہائی میں کچھ کہنا ہے۔''

خدیجہ نے مسکرا کر انتظار کرنے کو کہا پھر کچھ دیر بعد آکر اسے بابا کے کمرے میں چھوڑ گئی، اس وقت وہ خواب گاہ کے بجائے حجرے میں تھے اینا اجازت لے کر اندر آئی اور ان کے قریب بیٹھ گئی اس نے چادر بھی گھر کی خواتین کے انداز سے اوڑھ رکھی تھی۔

''بابا آپ مجھے لے تو آئے ہیں مگر بتایا نہیں کہ آپ میرے بارے میں کیا اور کیسے جانتے ہیں اور آئندہ کے لئے کیا سوچا ہے؟''

محی الدین نے اپنا انداز نشست بدلا اور کہا۔ ''اینا میری بیٹی میں آپ کے بارے میں ایک ایک لفظ جانتا ہوں کیسے جانتا ہوں تو یہ صرف اللہ کریم کی کرم نوازی ہے، دراصل میرے دادا ایک عام انسان تھے، شادی شدہ اور بچوں والے کہ انہیں عشق مجازی ہو گیا۔ ان کی زندگی بدلی اور وہ احکام شریعت کے پابند ہوتے چلے گئے، انہوں نے اپنی بیوی اولاد اور دیگر گھر والوں کو احکام شرع کی طرف راغب کرنا شروع کیا، یہاں تک کہ وہ اپنا روحانی ورثہ بیٹے کو منتقل کر کے رحلت فرما گئے، پھر ان سے لے کر مجھ تک صرف اللہ و راس کے حبیب کی محبت اور احکام کی بجا آوری کا سلسلہ چلتا آرہا ہے، میں نے بھی اپنے تئیں کوشش کی ہے خود کو اور اپنے گھر والوں کو احکام خداوندی کے رنگ میں رنگنے کی اس کے علاوہ کوئی بات نہیں سب میرے مالک کائنات کی عطا ہے۔

جس روز آپ مجھے ملیں اس سے قبل میں اپنے حجرہ میں بیٹھ کر بچوں کو کلام پاک کی تعلیم دے رہا تھا اور ساتھ ساتھ ملنے والوں کا سلسلہ بھی تھا کہ میرے مرشد کریم اور والد گرامی تشریف لائے اور حکم دیا کہ ''محی الدین، بیٹی کو جا کر لے آؤ۔'' وہ دونوں دنیا سے پردہ کر گئے ہیں مگر بوقت ضرورت ملاقات ہو جاتی ہے، میں ان کے حکم پر بھاگا، مجھے خود معلوم نہیں تھا کہ آپ کہاں ملو گی مگر گھر سے نکلا تو ملاقات ہو گئی اور میں آپ کو لے آیا۔

آپ کو دیکھتے ہی مجھے آپ کے ساتھ موجود دوسری ہستی کا بھی علم ہو گیا مگر کہنا ہے کہ میرے گھر میں نامحرم کا آنا منع ہے اس لئے وہ آپ کے ساتھ نہیں آ سکتا، البتہ وہ کئی بار میرے حجرہ میں آکر آپ کی خواستگاری کر چکا ہے لیکن فیصلہ آپ نے کرنا ہے۔'' اینا ان کی گفتگو کسی طلسم ہوش ربا کی داستان کی طرح سنتی رہی، وہ بولی ذہین اور ذکی تھی لیکن پھر بھی نہ جان سکی کیا اسے کیا فیصلہ کرنا ہے۔

اینا نے کہا۔ ''بابا مجھے کیا فیصلہ کرنا ہے ابراہام کھل کر بتائیں، میں اندر سے ٹوٹ چکی تھی مگر آپ کے گھر میں آکر ماضی تو جیسے بھول گیا ہوں۔ آپ یہ تجسس ختم کیجئے۔''

محی الدین نے کہا۔ ''میں آپ یہ بتاؤں کہ آپ کو اپنے والد کے گھر والوں کی طرف سے تو بہت محبت ملی اور مقام بھی مگر آپ کا وجود آپ کی ماں کے خاندان والوں کے لئے قابل قبول نہیں یہ بات آپ کو دکھی کرتی ہے جبکہ آپ کی ماں کے خاندان کی درحقیقت کوئی سماجی حیثیت بھی نہیں تھی اب آپ ایک فیصلہ کرنے جارہی ہو۔ عبدالرحمن سے عقد کا، آپ کو تو عبدالرحمن اور اس کے قبیلے والے خوش دلی سے قبول کر لیں گے مگر آپ کی اولاد کیا کہلائے گی، انسان یا آتشی مخلوق، اس بارے میں سوچا۔

پھر آپ اسلام بھی قبول کرنے جارہی ہیں تو اسے اپنے لئے قبول کریں نا کہ شوہر کے لئے، میرا مشورہ ہے کہ آپ یہاں میری بیٹی بن کر رہیں، پہلے اسلام کا مطالعہ کریں اگر سچائی دل میں گھر کرے تو پہلے

دائرہ اسلام میں آئیں پھر اگلا فیصلہ کریں۔

اینا کے سر سے بہت بڑا بوجھ اتر گیا، وہ تائید کرنے کے بعد اٹھنے لگی تو بابا نے کہا۔ ''خدیجہ آپ کو کل سے کتابیں دے گی اور مزید بھی منگوالیں گے نقطہ سمجھ میں نہ آئے مجھ سے یا خدیجہ سے سمجھ لیجئے گا۔''

اگلا دن بہت نیا اور مختلف طلوع ہوا۔ سب سے پہلے زبیدہ بیگم نے کہا۔ ''بیٹی تمہارے بال کیسے روکھے ہو رہے ہیں بیٹھو مالش کردوں، دیسی دوائیں والے تیل سے۔''

وہ وہاں نہ سمجھتے ہوئے بھی فوراً ان کے آگے بیٹھ گئی۔ انہوں نے بہت دل سے لگا کر چوٹی گوندھ دی، آمنہ دوپہر میں نئے لباس تیار کرکے لے آئی جو کہ ویسے ہی تھے جیسے وہ خود استعمال کرتی، اینا نے وہ بھی خوش دلی سے لے لئے، خدیجہ نے انگریزی میں لکھی اسلامی کتب لادیں۔

اینا نے یکسوئی اور توجہ سے مطالعہ شروع کردیا، محی الدین اپنے احباب اور شاگردوں سے اسلامی انگلش لٹریچر وقتاً فوقتاً منگوا کر اینا کو دیتے رہے، رات کے کھانے کے بعد اینا کی بابا کے ساتھ اسلامی مسائل پر طویل نشست ہوتی اور یوں محض ڈھائی ہفتوں کے بعد اینا قبول اسلام پر آ گئی۔

محی الدین نے کلکتہ کے اہم مذہبی شخصیات کو مدعو کرکے ایک چھوٹی سی تقریب رکھی اور اینا کو امت مسلمہ میں شامل کرلیا۔

اینا ذاتی طور پر اس اس فیصلہ پر بہت خوش تھی، بہت سارے لوگوں نے اسے تحائف اور زر و نقد دیا اور اسے خوش آمدید کہا، خود زبیدہ بیگم نے اپنا عروسی کنگن اسے تحفہ میں دیا اور حافظ محمد علی نے خدیجہ کے ہاتھ سے مجموعہ احادیث دیا۔

غرض ہر ایک نے بھرپور پذیرائی کی، اس تقریب کے دو دن بعد اینا جو کہ اب مریم بن چکی تھی، اس نے رات میں بابا سے ملاقات کی اور اپنے مستقبل کا فیصلہ ان پر چھوڑا کہ اب وہ جیسا کریں گے تو وہ بہت خوش ہوئے اور کہا کہ ''بیٹا اگرچہ آپ بالغ اور خود مختار ہیں مگر بہر حال آپ کے گھر والوں میں سے ایک رشتہ بہر حال موجود ہو تو بہت بہتر ہوگا۔''

اور پھر محی الدین نے اپنے چھوٹے صاحبزادے حافظ عثمان علی کے لئے پیام دیا اگرچہ مریم نے اسے قریب سے نہیں دیکھا تھا اور نہ ہی بات چیت ہوئی، اس کے باوجود اس نے ان کی بات قبول کرلی اور صرف محی الدین صاحب پر چھوڑا کہ وہ روبن کو خط لکھ کر تمام حالات سے آگاہ کریں اور ولی کی حیثیت سے رشتہ کی بات بھی کرلیں۔

عبدالرحمن کو مایوس کرتے ہوئے اس کا دل بہت دکھ رہا تھا لیکن وہ اپنے جیسے انسانوں کے ساتھ رہنے کو فطری رشتوں کو ترجیح دینا چاہتی تھی۔

بابا نے اسے بتایا کہ ''جنات سے شادی جائز ضرور ہے مگر مکروہ تحریمی ہے یعنی جائز مگر ناپسندیدہ۔''

بحیثیت مسلمان وہ مکروہ اعمال کی مرتکب نہیں ہونا چاہتی تھی سو عبدالرحمن سے بات کرنے کی بھی ذمہ داری بابا ہی کو دی اور اپنی خواب گاہ میں آ گئی جو کہ آمنہ کی تھی مگر اب مشترکہ استعمال ہو رہی تھی وہ آمنہ سے اور بھی بہت کچھ سیکھ رہی تھی تاکہ سب سے با آسانی بات کرسکے خصوصاً زبیدہ بیگم سے جنہیں سب امی جان کہتے تھے۔ خدیجہ کے دونوں بیٹے اسکول کے ساتھ ساتھ دادا سے دینی تعلیم بھی حاصل کررہے تھے اور مریم سے تو بہت مانوس ہو چکے تھے۔ کھیلنے کے اوقات میں وہ مریم کے پاس آ کر کھیلتے۔

حافظ محی الدین نے اپنے بڑے بیٹے کی موجودگی میں عبدالرحمن کو طلب کرکے مریم کی نئی حیثیت اور فیصلے سے آگاہ کردیا اور درخواست کی کہ وہ اس کی خواہشات کا احترام کرے۔ اس بات نے عبدالرحمن کی حالت برسوں کے بیمار جیسی کردی، وہ جو برسوں سے اینا کی ذات کا حصہ بن کر رہا، اب نہ صرف وہ اس سے دور ہوگئی، بلکہ ہمیشہ کے لئے اس سے آزادی چاہ رہی تھی، وہ محبوب کی بات سے انکار نہیں کرسکتا اور نہ ہی مجبور کیونکہ وہ اب ایک محفوظ قلعے میں تھی ناچار وہ حافظ صاحب کو خدا حافظ کہہ کر پلٹ گیا۔

ساتھ ہی حافظ صاحب نے روبن کو تفصیلی خط لکھا اور ان کی رضامندی مانگی۔ روبن کو خط ملا تو وہ بہت حیران ہوا کیونکہ ان کے معاشرے میں ہر بالغ لڑکی لڑکا اپنے فیصلوں کے لئے آزاد ہوتا تھا سرپرستوں کی حیثیت ثانوی ہوتی وہ اپنا سے بہت دور بیٹھا تھا اس کے باوجود وہ اس کے ہونے والے سسر اس سے رضامندی مانگ رہے تھے، وہ مسلمانوں کے خاندانی نظام کا قائل ہوگیا جہاں رشتوں کو اہمیت دی جاتی ہے اس نے بھی تفصیلی خط لکھا، پہلے تو نئے مذہب اور رشتے پر مبارکباد دی پھر اپنی جانب سے حافظ صاحب کا شکریہ ادا کیا کہ پردیس میں انہوں نے اس کی بہن کی حفاظت کی اور اب اپنی بہو کا درجہ دے رہے ہیں، آخر میں شادی پر آمادگی کا اظہار کرکے اپنا کو نکاح کے بعد شوہر کے ہمراہ آنے کی دعوت دی۔

چونکہ حافظ صاحب کو روبن کی جانب سے اثبات کی توقع تھی۔ سو انہوں نے اپنے گھر والوں سے شادی کی تیاری مکمل رکھنے کو کہا، اب ان کے گھر میں عبادت معمولات کے ساتھ ساتھ شادی کے انتظامات بھی ہورہے تھے۔

مریم نے مکمل طور پر حافظ صاحب کی خواتین کے اطوار اختیار کرلئے اور ان دنوں کلام پاک کی تعلیم لے رہی تھی، خط ملتے ہی حافظ صاحب نے مریم کو بلا کر روبن کا خط دیا اور اسے عثمان علی سے روبرو مل لینے کی تجویز دی کیونکہ اسلام میں لڑکی کو ملنے اور دیکھنے کی اجازت ہے اگر وہ رشتے کے لئے اطمینان چاہیں۔

مگر مریم نے اپنی جانب سے انکار کردیا، لیکن عثمان علی چاہیں تو اس کی طرف سے اجازت تھی۔

اس کے بعد حافظ صاحب نے چند خاص بزرگوں اور احباب کو مدعو کرکے نکاح کی تاریخ مقرر کردی۔ پھر آنے والے جمعہ کے روز بعد نماز ظہر نکاح ہوگیا، آمنہ اور خدیجہ نے اسے نہ صرف مہندی لگائی تھی، امّاں ملا بلکہ باقاعدہ دلہن بھی بنایا۔

عثمان کی عمر پچیس برس تھی اور مریم کی اکیس برس،

زبیدہ بیگم نے بہت اچھے زیورات تیار کروائے تھے، وہ ساس کی جگہ ماں بن کر مریم کی شادی میں شامل ہوئیں، پہلی بار محمد علی نے رخصتی کے وقت قریب آکر دعائیں دیں اور سر پر ہاتھ رکھ کر محبت کا اظہار کیا۔

رخصتی کے کچھ دیر بعد عصر کا وقت ہوگیا اور حافظ عثمان والد اور بھائی کے ہمراہ مسجد چلے گئے اور مغرب کے بعد آئے کھانا تیار تھا سب نے مل کر کھانا کھایا، کچھ دیر بیٹھ کر باتیں ہوئیں اور پھر سب عشاء کے لئے مشغول ہوگئے، مریم نے بھی عشاء کی نماز ادا کی۔

آمنہ نے دوبارہ اسے تیار کردیا اور اسے اس کی عروسی کمرے میں چھوڑ آئی وہ آمنہ کے کمرے سے عثمان علی کے کمرے میں آئی تو انہوں نے مقدور بھر تکلف کا اہتمام کررکھا تھا۔ کمرے کی آرائش میں سادگی تھی کچھ دیر کے بعد عثمان علی کمرے میں آئے اور آکر مریم کے قریب بیٹھ گئے، نگاہیں بدستور نیچی تھیں کہ والدین نے خواتین کی حرمت کی تعلیم دی وہ رگ و پے میں بس گئی تھی۔

بیوی کے قریب بیٹھ کر بھی نگاہیں اٹھانے کا خیال نہ آیا مریم کو عثمان کی یہ معصومانہ حرکت بہت بھائی اس نے کہا۔ ”صاحب آج ہمارا عقد ہوا ہے، آپ نے مجھے اور میں نے آپ کو نہیں دیکھا میرا خیال ہے اب دیکھ لینے میں حرج نہیں۔“ اس بات پر عثمان علی مسکرائے اور مریم کو دیکھا تو والد کے فیصلے پر نازاں ہوگئے انہوں نے دنیا میں ہی حور کی مثل بیوی ڈھونڈ کردی تھی اور پھر ان دونوں کی خوب صورت زندگی کا آغاز ہوا۔

مریم اور عثمان ایک دوسرے کی رفاقت پر رب تعالیٰ کا شکر بجا لاتے۔ شادی کے دو ماہ بعد مریم شوہر کے ہمراہ انگلستان گئی جہاں روبن اور لیزا نے بھرپور استقبال کیا، ایک ماہ کے قیام کے بعد وہ واپس آگئے۔

واپس آنے کے بعد مریم، بابا اور عثمان علی کی دینی خدمات کا حصہ بن گئی اور بھرپور زندگی بسر کرنے لگی۔

زندہ روح

ایس امتیاز احمد۔کراچی

کمرے میں دیکھتے ہی دیکھتے سناٹا چھاگیا! اور کمرے میں موجود تین افراد کے سانس لینے کی آواز تھی کہ اچانک ایک بھاری بھرکم دل کو ہولاتی آواز سنائی دی، یعنی کمرے میں روح کی آمد ہوگئی تھی پھر اچانک

نوجوان روحوں سے باتیں کرنے پر اعتقاد نہیں رکھتا تھا لیکن یقین آیا تو، حیرتناک کہانی

ٹونی کو پراسرار علوم سے قطعاً کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ ان علوم کا مذاق اڑایا کرتا تھا۔ ان علوم میں وہ ستارہ شناسی، پامسٹری، حاضرات اور قیافہ شناسی سب کو شامل کرتا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ساری باتیں ڈھکوسلا تھیں۔

اس کا کہنا تھا کہ ''زیادہ عقلمند لوگ اپنے سے کم عقل رکھنے والوں کی حماقتوں سے پورا فائدہ اٹھاتے ہیں۔''

ٹونی کا کوئی دوست اگر کسی ماہر پامسٹ کو ہاتھ دکھا کر آتا اور پامسٹ کی مہارت پر تبصرہ کرتا تو ٹونی ایک قہقہہ لگاتا۔

''بیچارے پامسٹ کو اپنے ہاتھ کی لکیروں کا علم نہیں ہے۔ وہ تمہارے حالات کیا بتائے گا۔ بات یہ ہے کہ ہر معاشرے میں اسی فیصد لوگوں کی طبعیتیں اور حالات ایک سے ہوتے ہیں۔ بس پامسٹ وہ باتیں بتا دیتا ہے۔''

اگر کوئی دوست کسی ستارہ شناس کے پاس سے آتا تو ٹونی خوب ہنستا۔ ''ارے بھئی ستارہ کسی کے مقدر کا حال کیسے بتا سکتا ہے۔''

اس کی یہ باتیں ٹونی کے ان دوستوں کو بری لگتی تھیں۔ جن کو پراسرار علوم کی صداقت پر یقین تھا۔ مگر ٹونی کو ان کے برا لگنے کی کبھی پروا نہیں رہتی تھی۔ وہ اکثر اس

بات کی کوشش کرتا تھا کہ اخلاقاً ہی سہی ان مسائل پر کوئی تبصرہ نہ کرے۔ مگر معلوم نہیں کون سی طاقت تھی۔ جو اسے ان علوم کا مذاق اڑانے پر مجبور کرتی تھی۔

ٹونی کو سب سے دلچسپ اطلاع ایک دن اس کے گہرے دوست جمی نے دی۔ ''ٹونی تم پراسرار علوم پر یقین نہیں رکھتے ہوناں۔'' اس نے پوچھا۔

''نہیں!! یقین کرنا تو دور کی بات ہے۔ میں تو ان کو ڈھکوسلا اور اعلیٰ قسم کی حماقت قرار دیتا ہوں۔''

''مگر ٹونی۔'' جمی نے کہا۔ ''آج میں تمہیں اپنے ساتھ لے کر چلوں گا، اور مجھے یقین ہے کہ تم ضرور یقین کرنے لگو گے۔''

کوئی اور ہوتا تو ٹونی کبھی جانے کی حامی نہ بھرتا۔ مگر جمی اس کا بہترین دوست تھا اور اس کی بات نا ماننا اس کا دل دکھانا ٹونی کے لئے ممکن نہیں تھا۔

ٹونی اس دن جمی کے ساتھ گیا۔ مگر اس پراسرار ماحول میں اسے پہلی دفعہ ایسا لگا۔ جیسے وہ تنہا ہے۔ حالانکہ جمی اس کے برابر بیٹھا ہوا تھا لیکن ٹونی یوں محسوس کر رہا تھا کہ فرشی نشست پر صرف وہی اکیلا ہے اور کوئی بھی نہیں۔

کمرے میں نیم تاریکی چھائی ہوئی تھی۔ جس میں فرش پر بیچ میں رکھی ہوئی میز نظر آ رہی تھی اور اس کے قریب ایک معمر خاتون بیٹھی ہوئی تھیں۔ مگر تاریکی کی وجہ سے ان کے نقوش واضح نہ تھے۔ جب ٹونی کی نظریں اندھیرے کی عادی ہوئیں تو اس نے دیکھا کہ معمر خاتون کسی گہرے رنگ کا لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔

''بیٹے تم میز کے قریب آ جاؤ۔'' خاتون نے کہا تو ٹونی کھسک کر میز کے کنارے پہنچ گیا۔ اب اس نے غور سے میز پر رکھے سامان کو دیکھا اس کی نگاہیں اب بھی پہچاننے سے قاصر تھیں کہ میز پر کیا ہے۔

''کھٹاک۔'' اور اس کے ساتھ ہی سرخ رنگ کا چھوٹا سا بلب روشن ہو گیا۔ میز پر ایک گول کاغذ بچھا ہوا تھا جس کے بیچوں بیچ ایک بڑی سی سوئی لگی تھی۔ جیسے قطب نما میں ہوتی ہے۔ دائرے میں چاروں طرف حروف تہجی لکھے ہوئے تھے۔ سوئی نیچے کے ایسے خانے پر رکی ہوئی تھی۔ جس میں کچھ بھی نہیں لکھا ہوا تھا۔ اسے دیکھ کر ٹونی کو ایسا لگا۔ جیسے جوئے خانوں میں دائروں میں سوئی گھومتی ہے۔ داؤ لگانے والے کوئی نمبر بولتے ہیں اور سوئی تیزی سے گھمائی جاتی ہے۔ اور جب تک سوئی نہیں رکتی، داؤ لگانے والے بے چینی سے انتظار کرتے ہیں۔ پھر سوئی آہستہ آہستہ کسی خانے پر رک جاتی ہے۔ جوئے خانے والا اس خانے کا نمبر بولتا ہے اور کسی ایک کا چہرہ خوشی سے گلنار ہو جاتا ہے۔ کچھ اس قسم کا دائرہ اس میز پر بنا ہوا تھا۔ فرق یہ تھا کہ قسمت آزمائی کے دائرے میں مختلف نمبر لکھے ہوتے ہیں۔ اور اس دائرے میں حروف تہجی لکھے ہوئے تھے۔ ٹونی کو عجیب سی کیفیت کا احساس ہوا۔ مگر اس نے اس کیفیت کو پراسرار ماحول کے اثر پر محمول کیا۔

''بیٹے تمہارا کیا نام ہے۔'' خاتون نے پوچھا۔

''ٹونی۔''

''ٹونی بیٹے۔ میں خود کچھ نہیں کرتی میں تو بس روح بلاتی ہوں اور وہ روح جواب دیتی ہے۔''

''تو کیا روح خود جواب دیتی ہے؟'' ٹونی نے پوچھا۔

''نہیں جب روح آتی ہے تو یہ سوئی زور سے حرکت کرتی ہے۔ اور سائل اپنا سوال کر دیتا ہے تو۔'' یہ کہتے کہتے وہ رک گئی۔ ''مگر تم یہ کیوں پوچھتے ہو ابھی سب تمہارے سامنے ہوگا۔ تم جو پوچھنا چاہتے ہو سوچ لو۔ اور جب میں کہوں تو اپنا سوال دہرا دینا اور اگر تم چاہو تو اپنے دوست کو باہر بھیج دو۔''

''نہیں۔'' ٹونی نے کہا۔ وہ جمی کو باہر نہیں بھیجنا چاہتا تھا۔ وہ بڑے دل گردے کا مالک تھا۔ مگر معلوم نہیں ماحول کی پراسراریت اس پر غالب کیوں آ رہی تھی۔

''تم کس کی روح بلوانا چاہتے ہو۔''

''میں۔'' ٹونی نے کچھ دیر سوچا۔ ''میں اپنے والد کی روح بلوانا چاہوں گا۔''

کمرے میں سناٹا چھا گیا۔ اب کمرے میں صرف تین افراد کے سانس لینے کی آواز تھی۔ چاروں طرف اندھیرا تھا اور روشنی صرف اس خانے پر مرکوز تھی۔ جہاں روح آ کر سوئی کو حرکت دیتی۔ پھر معمر خاتون نے کچھ

پڑھنا شروع کیا۔ وہ چند جملے سی اور زبان میں بار بار دہرا رہی تھیں۔ ٹونی پر غنودگی سی طاری ہونے لگی۔

''ٹونی تم روح کو آواز دو۔'' خاتون کی آواز آئی۔

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

سناٹا۔ ''پھر آواز دو۔''

''میں اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔ ان کا نام تھا۔ رابرٹ۔''

''تھا نہیں ہے کہو۔''

''میں مسٹر رابرٹ کو یعنی اپنے والد کی روح کو بلانا چاہتا ہوں۔''

اس بار کمرے میں ایک دم روشنی کا جھماکا ہوا۔ جیسے فوٹو گرافی فلیش گن کا ہوتا ہے۔ پھر بلب کی روشنی سرخ سے اچانک سبز ہوگئی۔ اور دائرے میں بنی ہوئی سوئی تیزی سے حرکت کرنے لگی مگر یہ حرکت خالی خانے ہی میں محدود تھی۔

''تمہارے والد کی روح کمرے میں موجود ہے۔'' خاتون نے کہا اور یہ جملہ سنتے ہی ٹونی پسینے سے نہا گیا۔ اس نے اچھی طرح سنا کہ کمرے میں قدموں کی چاپ آرہی تھی۔ وہ اس چاپ کو اچھی طرح پہچانتا تھا۔ جب کبھی اس کے والد کسی بات سے بے چین ہوتے تھے تو وہ اسی طرح کمرے میں چہل قدمی کرتے تھے۔ یہ مانوس چاپ تھی۔

''ٹونی!'' ٹونی ایک دم اچھل پڑا۔ وہ سمجھا کہ شاید یہ اس کے والد کی آواز ہے۔ مگر دوسرے ہی لمحے اسے اندازہ ہوا کہ معمر خاتون نے اسے آہستہ سے آواز دی تھی۔ ''ٹونی اپنے والد کی روح کو زیادہ پریشان مت کرو۔ سوال کرو اور پھر جلد از جلد انہیں رخصت کرو۔''

''گڈ نائٹ ڈیڈی۔'' ٹونی کی آواز لرزی۔

''سوئی نے حرکت کی، سوئی مختلف خانوں تک جاتی اور خالی خانے تک واپس آتی۔ اور جب سارے حروف اس نے ملائے تو اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ مسٹر رابرٹ کبھی ٹونی کے سلام کے جواب مارننگ یا نائٹ نہیں کہتے تھے۔ بلکہ او کے کہتے تھے۔ اس بار بھی سوئی ''او'' اور ''کے'' پر جانے کے بعد واپس خالی خانے میں لرزنے لگی تھی۔

''کیا آپ کو میری والدہ کا نام۔ میرا مطلب ہے۔ کیا آپ کو اپنی بیوی کا نام یاد ہے؟''

سوئی حروف پر جا جا کر خالی خانے تک واپس آنے لگی۔ روح نے نام لکھ دیا تھا۔ ''جولیا۔''

ٹونی اس تجربے سے نڈھال سا ہوگیا تھا۔ اس کے والد کی روح اس کے قریب موجود تھی۔ اور اس کے سوالوں کا جواب دے رہی تھی۔

''آپ کا انتقال کس وجہ سے ہوا؟'' یہ وہ سوال تھا۔ جو مدتوں سے ٹونی کے ذہن میں تھا اور جواب نے اس کے شک کو یقین میں تبدیل کردیا۔

سوئی نے حرکت شروع کی اور ٹونی سناٹے میں رہ گیا سوئی کی حرکت نے زہر کا لفظ بنایا تھا۔

''زہر کس نے دیا تھا؟'' ٹونی نے کانپتی آواز میں سوال کیا تو سوئی نے اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ حرف پھر خالی خانے میں واپسی پھر حرف، واپسی پھر حرف، واپسی، حرف پھر واپسی ٹونی نے حروف کو دہرانا شروع کیا۔ ''بی، اے، آر، ٹ، آر'' سوئی اب خالی خانے میں لرز رہی تھی۔

''بارٹر!''

ٹونی یہ نام بنا کر ساکت وصامت رہ گیا۔ اب اس کے اعصاب جواب دینے لگے تھے۔

خاتون کی آواز ابھری۔ ''ٹونی مسٹر رابرٹ کی روح کو واپس بھیج دو۔''

''روح واپس جائے۔''

''روح واپس جائے۔''

''روح واپس جائے۔''

سوئی خالی خانے میں تھوڑی دیر لرزی پھر ساکت ہوگئی اور معمر خاتون نے کمرہ روشن کردیا۔ کمرے میں چاروں طرف مختلف قسم کے تصویری خاکے آویزاں تھے۔ کھڑکیوں پر گہرے رنگ کے دبیز پردے پڑے ہوئے تھے۔ فرش پر قالین تھا۔ دائیں طرف ایک میز پر بڑا سا گلوب رکھا ہوا تھا۔ مگر اس پر دنیا کے نقشے کے بجائے مختلف حروف لکھے ہوئے تھے۔

''بس اب آپ دونوں جائیں۔'' خاتون نے کہا اور

ٹونی خواب کی سی حالت میں جمی کے شانے پر ہاتھ رکھ کر باہر کھلی ہوا میں نکل گیا لیکن بہت دیر تک اس کے حواس بحال نہ ہوئے۔

''میرے والد کی روح نے صحیح بتایا۔ میرا بھی یہی خیال تھا۔ مگر اس وقت میں بہت چھوٹا تھا۔'' ٹونی نے جمی کو بتایا۔ ''تمہاری والدہ۔''

''نہیں جمی۔ ایسا مت سوچو میرے والد کو زہر دیئے جانے میں میری والدہ کا کوئی ہاتھ نہیں ہوسکتا۔ وہ تو والد کے انتقال سے ایک سال قبل مرچکی تھیں۔''

''بارٹر کون ہے۔''

''بارٹر! میں جانتا ہوں کہ بارٹر کون ہے۔ اور وہ اس وقت ملک کے کس حصے میں رہتا ہے۔''

جمی نے ٹونی سے مزید کچھ دریافت کرنا مناسب خیال نہیں کیا اور اسی دن سے ٹونی پراسرار علوم میں دلچسپی لینے لگا۔ اس کا دلچسپ مشغلہ روحیں بلانا ہوگیا۔

ٹونی کو کبھی کبھی خود پر حیرت بھی ہوتی تھی۔ وہ اچانک تبدیل ہوگیا تھا۔ اپنے ان دوستوں سے وہ پراسرار علوم کے سچے اور صحیح ہونے پر بحث کرنے لگا تھا جن کا وہ کبھی مذاق اڑایا کرتا تھا۔ اس کے مزاج کی اس تبدیلی پر حیران سب تھے۔ مگر یہ بات صرف جمی کو معلوم تھی۔ کہ ٹونی میں اس تبدیلی کی اصل وجہ کیا ہے۔ مگر یہ بات جمی کو بھی معلوم نہیں تھی کہ ٹونی روحیں بلانے کے مشغلے میں منہمک ہوگیا ہے۔ اور مسز روتھ کا باقاعدہ شاگرد بھی ہو چکا ہے۔

مسز روتھ نے ابتداء میں تو روحوں کو بلانے کا عمل سکھانے سے انکار کیا۔ مگر ٹونی کے بے حد اصرار پر آخرکار اُسے راضی ہونا پڑا۔ ویسے یہ بات ٹونی کو اچھی طرح معلوم تھی کہ اس سلسلے میں مسز روتھ نے کسی روح کو بلا کر مشورہ کیا تھا۔ اور اس کی اجازت کے بعد ہی وہ ٹونی کو اپنا علم سکھانے پر تیار ہوئی تھی۔

ٹونی نے آہستہ آہستہ تجربات کرنے شروع کردیئے۔ اس دن وہ خوشی کے مارے ساری رات نہ سو سکا۔ جس دن اس نے پہلی بار خود روح بلائی تھی۔ اس نے روح بلائی، سوئی لرزی اور ٹونی نے روح کو واپس بھیج دیا۔ اس سے زیادہ خطرہ وہ مول لینے پر تیار نہ تھا۔

دوسری دفعہ اس نے روح بلا کر اس سے صرف سلام و عا پر اکتفا کیا اور اسے واپس بھیج دیا۔

تیسری دفعہ اس نے شیکسپیئر کی روح کو بھی خدا حافظ کہہ دیا۔ اس کی ان مسلسل کامیابیوں سے مسز روتھ بہت خوش ہوئیں مگر جب ٹونی نے کہا کہ ''وہ زندہ آدمی کی روح کو بلانا چاہتا ہے تو مسز روتھ حیرت سے اچھل پڑیں۔ زندہ آدمی کی روح؟''

''ہاں میں چاہتا ہوں کہ اب زندہ آدمی کی روح بلواؤں۔''

''مگر زندہ آدمی کی روح کیسے بلواؤ گے۔ میں نے تو کبھی ایسا تجربہ نہیں کیا۔'' مسز روتھ نے حیرت سے کہا۔

''مسز روتھ میں یہ تجربہ ضرور کروں گا۔''

''نہیں ٹونی بیٹے ایسے تجربات نہیں کرتے جن کا حکم ہمیں نہ ملا ہو یہی اس عمل کے آداب ہیں۔''

''تو کیا یہ ناممکن بات ہے۔''

''یہ میں نہیں کہہ سکتی مگر اتنا ضرور جانتی ہوں کہ اس علم میں زندہ لوگوں کی روحیں بلانے کی ممانعت ہے اور کسی نے اس اصول کو توڑنے کی کوشش نہیں کی ہے۔'' یہ کہتے ہوئے مسز روتھ نے محسوس کیا کہ ٹونی کچھ کہنا چاہتا ہے مگر کہہ نہیں رہا۔

دوسرے دن مسز روتھ اور جمی دونوں نے ریڈیو، اخبار، ٹیلی ویژن سے یہ خبر سنی کہ ملک کے مشہور سرمایہ دار اور صنعتکار مسٹر بارٹر اچانک بیہوش ہوگئے۔ اور ان کی یہ بیہوشی ان کی موت پر ختم ہوئی۔

اس دن شام کو ٹونی نے جمی کو تو صرف اسی قدر بتایا کہ ''مسٹر بارٹر نے ہی کاروباری رقابت کے سبب اس کے والد کو زہر دے کر ہلاک کیا تھا۔''

مگر مسز روتھ کو معلوم تھا کہ ''ٹونی نے مسٹر بارٹر کی روح کو بلانے کے بعد دائرے کی سوئی توڑ دی تھی اور اسے واپس نہیں بھیجا تھا۔''

اماوس کی رات

ساحل ابڑو- ڈیرہ اللہ یار بلوچستان

رات کے اندھیرے میں سحر زدہ سا نوجوان بے سدھ پڑا تھا کہ اچانک چمگادڑیں اس پر حملہ آور ہوئیں اور نوجوان کا خون چوس کر رفو چکر ہوگئیں مگر نوجوان کو اپنے ساتھ پیش آنے والے واقعات کا پتہ نہ چلا اور جب پتہ چلا تو......

زبان خلق کو نقارہ خدا سمجھنا چاہئے اس کے مصداق پرتا ثیر دل ہولاتی روداد

بارش زوروں پر تھی۔ موسم میں خاصی خنکی پیدا ہوچکی تھی۔ دھند کا سماں تھا۔ وائپر گاڑی کے شیشے کو صاف کرنے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ سورج غروب ہونے والا تھا اور وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ لیکن بارش کی وجہ سے بڑی دشواری پیش آرہی تھی۔

وہ ایک نوجوان شخص تھا۔ جسے سیر و سیاحت کا بڑا شوق تھا۔ اور اسی شوق کی وجہ سے وہ اس گاؤں میں آیا تھا۔ اس گاؤں میں صاف و شفاف ندیاں اور سبزہ تھا۔ خوب صورت پرندے اور آبشاروں سے گرتا پانی بڑا ہی حسین منظر پیش کرتا تھا۔ وہ اس علاقے کی خوب صورتی میں اس قدر کھو گیا کہ اسے وقت گزرنے کا احساس بھی نہ ہوا، اچانک بادلوں کی گرج چمک سے اس کا ذہن حاضر ہوا اور اس نے گھبرا کر ادھر ادھر

دیکھا اور کہا۔

''او میرے خدا۔'' وقت گزرنے کا تو پتہ ہی نہ چلا۔ آسمان کی طرف دیکھا تو سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے اور بجلی چمک رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوا چل رہی تھی۔ وہ اپنے آپ سے مخاطب ہوا۔ اگر بارش ہوئی تو بڑا مسئلہ ہو جائے گا۔ وہ بڑی تیزی سے گاڑی کی طرف بڑھا۔ اور اسٹارٹ کرکے روانہ ہونے ہی والا تھا کہ اچانک ایک شخص نے اسے اشارے سے روکا جس نے سر پر اونی ٹوپی پہن رکھی تھی اور جسم پر لمبا کوٹ پہنے ہوئے تھا۔ اس نے کہا۔ ''لگتا ہے اجنبی ہو بابو۔''

اس نے جھنجلاہٹ اور پریشانی کے باعث کوئی جواب نہ دے سکا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتا۔ وہ شخص بولا۔

''رات کے وقت مت جاؤ بابو جی، یہ علاقہ آسیب زدہ ہے، بڑا خطرناک ہے، ہم یہاں کے باشندے بھی رات کے وقت کہیں نہیں جاتے۔ بہتر یہی ہے کہ یہیں کہیں رات بسر کرلو ورنہ نقصان اٹھانا پڑے گا۔''

اسے پہلے بھی کافی پریشانی تھی۔ الٹا یہ بھی اسے پریشان کررہا تھا۔ اسے یکدم غصہ آیا اور کہا۔

''بھائی آپ کی مہربانی، اب آپ جاسکتے ہیں۔'' اور گاڑی آگے بڑھا دی۔ اب بھی اس کے چہرے پر غصہ واضح تھا اور وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ''دنیا کہاں پہنچ گئی ہے اور ان کی عقل دیکھو۔ وہی دقیانوسی خیالات۔''

اس سے پہلے کہ وہ اس علاقے سے نکل جاتا۔ بارش شروع ہوگئی۔ اس نے گاڑی کی رفتار تیز کردی۔ وہ جلد از جلد اس علاقے سے نکل جانا چاہتا تھا۔ یہ گاؤں اور یہاں کے لوگ اس کے لئے بالکل اجنبی تھے کہ جہاں وہ رات بسر کرتا اور نہ ہی یہاں کوئی مسافر خانہ تھا۔ ایک چھوٹا سا بازار تھا۔ جو سرشام ہی بند ہوجاتا تھا۔ لوگ بارش اور سردی سے بچنے کے لئے اپنے گھروں میں دبکے بیٹھے تھے۔ رات نے ڈیرے جما لئے تھے۔ ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا اور گاؤں کی بستیاں بھی دھندلی میں نظر آرہی تھیں۔ وہ مسلسل آگے بڑھنے کی کوشش کررہا تھا۔

اچانک ایک جھریوں سے بھرپور بھیانک چہرہ اس کے سامنے آگیا۔ اسے اچانک جھٹکا لگا اور پوری قوت سے بریک لگائی۔ کیچڑ میں بریک لگنے سے گاڑی تھوڑی سی ایک طرف کو سلپ ہوئی۔

اتنے میں وہ بھیانک شکل والا بوڑھا شخص شیشے کے قریب آچکا تھا۔ وہ اسے بغور دیکھ رہا تھا۔ اس کے چہرے پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔ اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ حلق خشک ہوچکا تھا۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔

''مسافر ہو نوجوان اس علاقے میں اجنبی ہو۔ میری بات مانو تو آگے مت جاؤ اور میری جھونپڑی میں رات بسر کرلو۔ صبح چلے جانا۔ رات کے وقت جانا خطرے سے خالی نہیں ہے۔ یہاں آسیبوں کا راج ہے۔'' اس کی آنکھوں میں انجانی چمک تھی۔ اس کے بولنے کا انداز بھی بڑا عجیب تھا۔

اب اسے ڈر لگنے لگا تھا۔ اس نے لرزتے ہاتھوں سے گیئر بدلا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

''پچھتاؤ گے نوجوان۔'' اس نے قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔ خوف اس پر چھاتا جارہا تھا۔ عجیب عجیب خیالات آرہے تھے۔ وہ بدحواس ہوچکا تھا۔ اس کا بس چلتا تو وہ اڑ کر نکل جاتا۔ اس نے ایکسی لیٹر پر پیر رکھا ہوا تھا۔ اسے کوئی خبر نہ تھی کہ گاڑی کہاں جارہی ہے اور کیسے جارہی ہے۔

وہ بہت خوفزدہ تھا اور خوف کے مارے آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔

اچانک اس کی نظر سامنے ایک عالیشان محل نما مکان پر پڑی۔ جو روشنی میں نہایا ہوا تھا۔ ایسا لگتا تھا کہ جیسے کسی امیر کبیر کا مکان ہو۔ ڈوبتے ہوئے کو تنکے کا سہارا۔ اس مکان کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ شاید یہاں رات بسر کرنے کو جگہ مل جائے اور پریشانی و مصیبت سے چھٹکارا حاصل ہو۔ اب گاڑی کا رخ اس مکان کی طرف تھا۔ بارش مسلسل برس رہی تھی اور وائپر بھی شیشے کو

صاف کر رہے تھے۔ گاڑی کو بڑی دشواری پیش آ رہی تھی۔ مکان کے گیٹ پر پہنچتے ہی وہ حیران رہ گیا۔ گیٹ کھلا ہوا تھا۔ نہ کوئی پہرے دار نہ کوئی محافظ۔ وہ پریشان سوچوں میں کھویا ہوا تھا۔ اسے جب پچھلا واقعہ یاد آیا تو اس پر لرزہ طاری ہو گیا اور فوراً ہی گاڑی سے اتر کر گیٹ کی طرف بڑھنے لگا۔ وہ گھبرائے ہوئے جیسے ہی اندر داخل ہوا تو یکدم گیٹ خود بخود بند ہو گیا۔

اس نے ایک جھٹکے سے پیچھے دیکھا۔ مگر وہاں تو کوئی نہیں تھا۔ یہ دیکھ کر اس کا خوف خشک ہونے لگا۔ وہ آنکھیں پھاڑے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اب تو اس سے ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھا جا رہا تھا۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی آزاد پنچھی کو ایک دم پنجرے میں قید کر دیا گیا ہو۔

اب اسے بوڑھے شخص کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔ زندگی میں پہلی بار اسے پچھتاوا ہوا۔ کاش اس کی بات مان لی ہوتی۔ وہ پریشان بت سا بنا کھڑا تھا۔

اچانک اس کی نظر برآمدے میں کھڑی ایک حسین و جمیل نوجوان عورت پر پڑی۔ جس کے سیاہ لمبے بال بکھرے کمر سے نیچے تک چلے گئے تھے۔ وہ اسے دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس عورت کو دیکھتے ہی وہ ہکا بکا رہ گیا۔

ہونٹ خشک ہو چکے تھے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ خوف اس کے چہرے پر واضح تھا۔ اچانک وہ عورت بولی۔

''تمہیں خوش آمدید کہتے ہیں اجنبی، تمہیں یہاں رات گزارنے کے لئے جگہ بھی مل جائے گی اور طعام بھی۔ تم یہاں آرام سے رات گزارنے کے بعد صبح اپنی منزل کی طرف روانہ ہو جانا۔ یہ ہمارا محل ہے اور یہاں پر ہمارا راج ہے۔ ہمارے پیچھے پیچھے چلے آؤ۔'' عورت مسکراتی ہوئی آگے کو بڑھی اور وہ نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے پیچھے چل پڑا۔ جیسے کوئی انجانی کشش اسے کھینچ رہی ہو۔

محل جتنا باہر سے خوب صورت تھا۔ اس سے کہیں زیادہ وہ اندر سے خوب صورت تھا۔ وہ مختلف راہداریوں سے گزرتے بڑے ہال نما کمرے کے دروازے پر آ کر رک گئے، عورت نے عجیب انداز میں مسکرا کر اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں چمک تھی۔ نوجوان پر اب بھی خوف طاری تھا۔

''گھبراؤ نہیں اجنبی۔'' عورت نے پراسرار مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

جب وہ اندر داخل ہوا تو مزید حیران ہوا۔ کمرہ اندر سے بہت سجا ہوا تھا۔ کمرے کے وسط میں ایک بہت بڑی میز رکھی ہوئی تھی۔ جو بہت ہی خوب صورت تھی، میز پر انواع و اقسام کے کھانے چنے ہوئے تھے۔ جن کی خوشبو سے پورا کمرہ مہکا ہوا تھا۔ میز کے سامنے عالیشان کرسی پر نہایت ہی خوب صورت ایک عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ میز کی دوسری طرف ایک اور حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔ ان کے بھی سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے۔ ان کے لبوں پر بھی پراسرار مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔

''آؤ نوجوان، یہاں بیٹھو! ہم تمہارے انتظار میں ہیں۔ تم ہمارے مہمان ہو۔ تمہاری خاطر تواضع کرنا ہمارا فرض ہے۔'' میز کے سامنے بیٹھی ہوئی خوب صورت عورت نے بڑی دلکش آواز میں کہا۔ اس کی آنکھوں میں بڑی چمک تھی۔

وہ اس عورت کی سامنے والی کرسی پر بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ آنے والی عورت میز کے دوسری طرف بیٹھ گئی۔ تھوڑی دیر خاموش رہنے کے بعد تینوں عورتوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور کھانا، کھانا شروع کر دیا اور اس نوجوان کو بھی کھانا کھانے کی دعوت دی۔ پورے محل میں ایک خاموش حصار چھایا ہوا تھا۔ ہر طرف پراسرار خاموشی تھی۔ کمرے میں روشنی ہی روشنی تھی۔ ہر چیز صاف نظر آ رہی تھی اور وہ چاروں خاموش کھانے میں مصروف تھے۔ بڑا ہی سحر انگیز منظر تھا۔ وہ تینوں بڑے شوق سے کھانا کھا رہی تھیں۔

لیکن نوجوان کے حلق سے نوالہ نیچے جانے کو تیار نہ ہو رہا تھا۔ وہ سوچوں میں پریشان کھویا ہوا تھا۔ اسے

ایسے لگ رہا تھا کہ یہ سب کچھ اس کی مرضی کے تحت ہو رہا ہے۔ اور وہ بے بس ہو۔

کھانے سے فارغ ہو کر اس عورت نے جو اسے ساتھ لے کر آئی تھی کہا۔ ''آؤ، میں تمہیں تمہارے کمرے تک چھوڑ آؤں۔ بے فکر ہو کر پرسکون نیند سو جانا۔ ساری تھکاوٹ ختم ہو جائے گی۔''

نوجوان ان عورتوں کی طرف دیکھتے ہوئے روانہ ہوا۔ اس کی آنکھوں میں خوف بھرا ہوا تھا اور عورتوں کے لبوں پر مکروہ مسکراہٹ رقصاں تھی۔ ان کی آنکھوں میں خاصی چمک تھی۔

وہ عورت اس کمرے میں چھوڑ کر واپس اسی کمرے میں آ گئی اور دونوں عورتوں کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس نے ان کی نظروں سے نظریں ملائیں اور مسکراہٹ بکھیر دی۔

کمرہ بڑا اور روشن تھا۔ ہر سہولت موجود تھی۔ لیکن پھر بھی اسے وہاں خوف سا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ بے دم ہو کر بیڈ پر گر پڑا۔ اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ یہ خواب ہے یا حقیقت۔ اس نے اپنی انگلی کاٹی تو درد ہوا۔ اسے یقین آیا کہ یہ خواب نہیں بلکہ حقیقت ہے۔ تو اسے جھرجھری سی آ گئی۔ سوچ سوچ کر وہ پریشان ہو رہا تھا کہ ''یہ سب کیا ہو رہا ہے۔ اس کی چھٹی حس بتا رہی تھی کہ ''خطرہ ضرور ہے۔'' اسی سوچ و بچار اور پریشانی میں آدھی رات بیت گئی۔ لیکن اسے آرام کہاں۔

آخر اس نے فیصلہ کیا کہ اسے کسی نہ کسی طرح یہاں سے نکل جانا چاہئے۔'' اس نے اپنا دل مضبوط کیا اور وہاں سے بھاگنے کا پکا ارادہ کر لیا۔ آہستہ سے دروازہ کھول کر باہر ادھر ادھر جھانکا تو دور دور تک ہیبت ناک سنسانی کے سوا کچھ نہ تھا۔ وہ لرز کر رہ گیا۔ لیکن تھوڑی دیر بعد ہمت کر کے باہر نکلا اور دبے پاؤں آگے بڑھنے لگا۔ وہ تینوں عورتیں اسے کہیں بھی نظر نہ آئیں۔

وہ دل تھامے آنکھیں پھاڑے کھا جانے والی خاموشی میں آگے بڑھنے لگا۔ ہال نما کمرے کے قریب پہنچ کر وہ رک گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ یہاں کوئی ہے۔

جب اس نے اندر جھانک کر دیکھا تو پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ خون خشک ہونے لگا۔ یکدم دل کی دھڑکن تیز ہو گئی، آنکھیں جھپکائے بغیر دیکھے جا رہا تھا۔ تھوڑی دیر پہلے جہاں حسین و جمیل عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اب وہاں بدصورت اور خوفناک شکل والی عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ الجھے ہوئے بال، سیاہ چہرہ اور دہکتے انگاروں جیسی آنکھیں، لمبے لمبے ناخن، بڑے بڑے ڈراؤنے دانت، بہت خوفناک لگ رہی تھیں۔ ایسا دل ہلا دینے والا منظر دیکھ کر وہ دم بخود رہ گیا۔ دل کی دھڑکن تیز ہو گئی تھی اور زبان خشک ہو چکی تھی۔

وحشت ناک منظر دیکھ کر اس کی سانسیں رک گئیں۔ لیکن موت کا تصور کرتے ہی اسے جھرجھری آ گئی اور جان بچانے کے لئے سرپٹ دوڑ لگا دی۔

اسے دوڑتا دیکھ کر وہ بوکھلا گئیں اور چیخ اٹھیں۔

''پکڑو شکار جا رہا ہے۔'' وہ خطرناک آوازیں نکالتے ہوئے اس کے پیچھے دوڑ پڑیں۔

دل ہلا دینے والی چیخوں سے پورا محل گونج اٹھا۔ زندگی سب کو پیاری ہوتی ہے۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے ایسے دوڑ رہا تھا کہ جیسے اس میں بجلی بھر دی گئی ہو۔ دروازہ بند تھا لیکن وہ رکا نہیں۔ اس میں انجانی قوت آ گئی تھی اور اس کا رخ دیوار کی طرف تھا۔ دیوار پھلانگ کر اگلے ہی لمحے وہ دیوار کی دوسری طرف کھیت میں چھلانگ لگا چکا تھا۔ گرتے ہی وہ اٹھا اور ہانپتے ہوئے پھر دوڑ لگا دی۔

جیسے ہی اس نے دیوار سے نیچے چھلانگ لگائی۔ محل میں یکدم اندھیرا چھا گیا اور عالیشان محل کی جگہ وہاں ایک پرانا کھنڈر نظر آنے لگا۔ وہ تینوں بدصورت عورتیں کھنڈر سے باہر نہ نکل سکیں اور وہ خوفناک آوازوں سے چیختی چلاتی رہ گئیں۔

نوجوان کو گاڑی کا ہوش بھی نہ رہا تھا۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے پیچھے دیکھے بغیر گرتا پڑتا ہوا بھاگ رہا تھا۔ ہلکی ہلکی بارش برس رہی تھی۔ اماوس کی راتیں شروع ہو چکی تھیں، اچانک بجلی چمکی وہ رک گیا۔ اس

کے سامنے وہی بھیانک شکل والا بوڑھا شخص کھڑا تھا۔ جس کے ہونٹوں پر پراسرار مسکراہٹ تھی۔ بارش اور سخت سردی کے باوجود نوجوان پسینے میں شرابور تھا۔ بھاگنے سے اس کی حالت بگڑ چکی تھی اور خوف بھری نظروں سے اسے دیکھ رہا تھا۔

"دیکھا نوجوان، ہماری باتوں کا نتیجہ، سامنے آ گیا ناں، ہم نہ کہتے تھے یہ علاقہ آسیب زدہ اور خطرناک ہے۔ شکر کرو کہ تمہاری زندگی بچ گئی۔ اگر چاہو تو آج اس کی یہ رات ہمارے ساتھ گزار سکتے ہو۔ یہاں کوئی خطرہ نہیں۔ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ ہمارا یہاں راج ہے۔" بوڑھے شخص نے خوفناک انداز میں قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

دونوں جھونپڑی میں داخل ہوئے۔ وہاں رکھی ہوئی ایک پرانی سی چارپائی کی طرف بوڑھے نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

"تم اس پر سو جاؤ، اجنبی، میں یہاں نیچے سو جاتا ہوں۔ گھبراؤ نہیں، یہاں ڈرنے کی ضرورت نہیں۔"

نوجوان خوفزدہ نظروں سے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے چارپائی پر لیٹ گیا۔ خوف اب بھی اس پر چھایا ہوا تھا۔ وہ واقعہ یاد کر کے اس کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے۔ اس بے چارہ کو نیند کہاں آتی۔ خوف سے آنکھیں بند کیے دل میں یہی دعا کر رہا تھا کہ جلد صبح ہو جائے اور مصیبتوں سے چھٹکارا حاصل ہو۔

رات کے کسی پہر اس نے اپنے چہرے پر گرم سانسیں محسوس کیں اور بدبو کا جھونکا اس کے نتھنوں سے ٹکرایا۔

فوراً آنکھیں کھولیں تو خوف سے آنکھیں باہر نکل آئیں اور چیخ مارتے ہوئے چھلانگ لگا دی۔ وہ بھیانک شکل والا بوڑھا شخص اس کی گردن کاٹنے والا ہی تھا کہ اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے چھلانگ لگا دی وہ بوڑھا شخص اب اور بھی ہیبت ناک لگ رہا تھا۔ اس کا پورا وجود گوشت کے لوتھڑے کی طرح ہو چکا تھا اور پورے جسم سے بلبلے سے ابل رہے تھے۔ جیسے گرم پانی میں بلبلے اٹھتے نظر آتے ہیں اور وہ بدبو بھی ان ہی سے آ رہی تھی۔

نوجوان بھاگنے ہی والا تھا کہ بوڑھے نے اسے پکڑ لیا۔ نوجوان خوفناک انداز میں چیخ رہا تھا جبکہ وہ بوڑھا کسی درندے کی طرح غرا رہا تھا۔ نوجوان جہاں سے بھی اسے پکڑتا اس کی انگلیاں اس کے جسم میں دھنستی چلی جاتیں۔ ایک جان لینے کی اور دوسرا جان بچانے کی جنگ لڑ رہا تھا۔

اچانک بوڑھے شخص نے نوجوان کے ہاتھ پر چک مارا اور گوشت کا ٹکڑا جسم سے الگ کر دیا۔

نجانے کیا چیز نوجوان کے ہاتھ میں آ گئی کہ اسے اٹھا کر اس بوڑھے شخص کے سر پر دے ماری تو بوڑھے کا سر تربوز کی طرح دو حصوں میں بٹ کر رہ گیا اور وہ بے جان ہو کر گر پڑا۔ اب اس بوڑھے کے جسم سے اٹھتے بلبلے آہستہ آہستہ ختم ہوتے جا رہے تھے۔

نوجوان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ بوڑھا مر چکا ہے۔ وہ آنکھیں پھاڑے اسے دیکھ رہا تھا۔ بادل گرج رہے تھے۔ بجلی چمک رہی تھی اور بارش کی پھوار پڑ رہی تھی۔

اچانک نوجوان کو اپنے جسم میں سرسراہٹ سی ہوئی، وہ گھبرا گیا اور اپنے جسم کو دیکھنے لگا۔ سرسراہٹ سی بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے بڑی کراہیت لگ رہی تھی۔ جب اپنے جسم کو چھوا تو دم بخود رہ گیا۔ اس کا گوشت نرم ہو چکا تھا۔ نوجوان نے اپنے زخم کو دیکھا تو وہ کالا ہو چکا تھا۔ اور اس میں سے چھوٹے چھوٹے سے بلبلے اٹھ رہے تھے۔

نوجوان نے چیخنا چلانا شروع کیا۔ اس کا جسم بھی گوشت کا لوتھڑا بن رہا تھا اور بلبلے ابل رہے تھے۔ اب وہ بھی بوڑھے کا روپ اختیار کر چکا تھا۔ وہ بھی بھیانک لگ رہا تھا۔ بارش برس رہی تھی اور وہ بے بس کیچڑ میں لوٹ پوٹ چیخ رہا تھا اور اس کی چیخیں فضا میں گونج رہی تھیں اور وہ سرپٹ آگے ہی آگے بھاگے جا رہا تھا۔

تحریر: اے وحید

قسط نمبر:122

وہ واقعی پراسرار قوتوں کا مالک تھا، اس کی حیرت انگیز اور جادوئی کرشمہ سازیاں آپ کو دنگ کر دیں گی

گزشتہ قسط کا خلاصہ

صبح کا سورج کیا طلوع ہوا کہ چاند پور کے سارے لوگ حیران و پریشان ہو گئے کیونکہ سورج طلوع ہونے کے آدھا گھنٹہ بعد پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا، اس سے پہلے بستی کے بڑے بوڑھے لوگوں نے اپنی زندگی میں کبھی ایسا وقت نہ دیکھا تھا کہ سورج طلوع ہوا اور گھنٹہ بھر بھی نہ گزرا کہ پھر پورا علاقہ اندھیرے میں ڈوب گیا، اچانک مٹی کا گرد و غبار والا طوفان اٹھا جس سے سارے لوگ اپنے اپنے گھروں میں دبک گئے پھر یہی نہیں بلکہ موسلا دھار بارش نے لوگوں کو ہلکان کر دیا، بجلی کڑکتی تو پورا چاند پور روشنی میں نہا جاتا، بستی سے ہٹ کر ایک حویلی تھی اور اس حویلی کے مکین کچھ زیادہ ہی خوفزدہ تھے، سارے اہل خانہ ہال کمرے میں بیٹھے تھے اور اللہ اللہ کر رہے تھے کہ اچانک روشن دان سے ایک روشن ہیولہ اندر داخل ہوا، جسے دیکھتے ہی سارے لوگ انگشت بدنداں ہو گئے اور ساتھ ہی کپکپانے لگے اور کئی کے منہ سے تو چیخیں نکل گئیں، ہال میں دو بلب شمار ہے تھے کہ اچانک بجھ گئے، پورا ہال اندھیرے میں ڈوب گیا، پھر وہ روشن ہیولہ روشندان سے نیچے ہال میں اتر آیا، اسے دیکھ کر سارے اہل خانہ کی گھگھی بندھ گئی، ہیولہ سب کے سامنے باری باری جا کر سب کی آنکھوں میں بغور دیکھتا اور پھر سب سے آخر میں سلیم الزماں کی بیوی درشہوار کے سامنے آیا اور قریب تھا کہ درشہوار بے ہوش ہو جاتیں، ہیولہ کے لب ہلے اور کھر کھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ قتل کی سزا... موت اور صرف موت ہے اور ہیولہ کا قہقہہ بلند ہوا، اور پھر ہیولہ روشن دان سے باہر کو نکل گیا۔ اس کے بعد حویلی میں خونی کھیل شروع ہو گیا، آئے دن کوئی نہ کوئی موت کے منہ میں چلا جاتا، اور مرنے والے درشہوار کے بیٹے بیٹیاں ہوتی تھیں، حویلی کا ہر فرد حیران و پریشان تھا اور یہی نہیں بلکہ چاند پور کے سارے لوگ بھی جو حویلی میں جو موتیں ہو رہی تھیں اس وجہ سے پریشان تھے کہ ایسا کیوں ہو رہا ہے، اور ان حالات کے پیش نظر سلیم الزماں کے بڑے بھائی خلیق الزماں نے رولوکا سے رابطہ کیا، رولوکا نے پوری تفصیل سننے کے بعد اپنی آنکھیں بند کر لیں اور منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہا، پھر رولوکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور اس کے منہ سے نکلا۔

''اوہ گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

(اب آگے پڑھیں)

''**گھر** کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

رولوکا کے یہ الفاظ سنتے ہی خلیق الزماں جو کہ سوچ کی عمیق گہرائی میں ڈوبے پڑے تھے اور ان کے دماغ میں رولوکا کے الفاظ گونج رہے تھے۔ ''گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔''

اچانک خلیق الزماں کے پورے وجود کو رولوکا کے اس الفاظ نے لرزا کر رکھ دیا۔

خلیق الزماں نے ایک لمبا سانس کھینچا اور رولوکا پر اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔

خلیق الزماں کے برابر میں بیٹھے ان کے دوست صداقت حسین بھی چونک پڑے اور پھر رولوکا کو ٹکر ٹکر دیکھنے لگے تھے کیونکہ رولوکا نے بہت گہری بات کہہ دی تھی۔

خلیق الزماں اور صداقت حسین کو بے چین دیکھتے ہوئے رولوکا بولا۔ ''خلیق الزماں صاحب، میرے الفاظ نے یقیناً آپ کو چونکا دیا ہے مگر یہ حقیقت ہے۔''

خلیق الزماں بولے۔ ''میں ان الفاظ کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔''

''یقیناً ہوں گے! خیر اب آپ کے سامنے سامنے چند جھلکیاں آنے والی ہیں۔ آپ انہیں دیکھ کر زبان نہیں کھولئے گا.... اور نہ ہی ان باتوں کا ذکر گھر جاکر کیجیے گا۔ جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا.... مگر جو کچھ بھی ہوا اچھا نہیں ہوا۔''

اچانک جس کمرے میں خلیق الزماں، صداقت حسین اور رولوکا بیٹھے تھے، کمرے میں اندھیرا ہوگیا تو رولوکا نے کچھ پڑھ کر دیوار پر پھونک ماری تو چشم زدن میں دیوار روشن ہوگئی، اور پھر ایک عجیب الخلقت مخفی سا بوڑھا نظر آیا، جو کہ ہیولہ کی صورت میں تھا، اس کی آنکھیں سرخ انگارہ ہورہی تھیں۔

اندھیرے کمرے میں رولوکا کی آواز گونجی۔ ''اوئے تیرا نام کیا ہے....؟''

ہیولہ کی کھرکھراتی ہوئی آواز سنائی دی۔ ''سرکار میرا آپ کو پرنام.... میرا نام جمنا ہے.... سرکار میں تو بے قصور ہوں.... ہم غلام آتمائیں ہیں، ہم جس کے وش میں ہوتے ہیں.... اس کے حکم کے غلام جو زیادہ طاقتور ہوتا ہے، وہ ہمیں اپنا غلام بنالیتا ہے۔''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''تجھے کس نے اپنے وش میں کر رکھا ہے اور تیرے لئے اس کا حکم کیا ہے....؟''

ہیولہ بولا۔ ''سرکار.... جس نے مجھے وش میں کر رکھا ہے.... اس کا نام شنکر داس ہے۔''

''اس نے تیرے ذمہ کیا کام لگا رکھا ہے....؟'' رولوکا نے پوچھا۔

ہیولہ بولا۔ ''سرکار.... اس نے حکم دے رکھا ہے کہ میں سب کو نشٹ کردوں۔''

''کیا تو اپنا کام بہتر طریقے سے انجام دے رہا ہے۔'' رولوکا نے پھر پوچھا۔

''سرکار.... جس کام پر مجھے لگا گیا ہے.... وہ تو اپنے انجام کو نہیں پہنچا بلکہ اس کا الٹ ہوتا رہا اور یہ تو آپ کو بھی معلوم ہے کہ جب سیدھا کام اپنے انجام کو نہیں پہنچتا تو کام الٹا ہونا شروع ہوجاتا ہے پنڈت شنکر اپنی جگہ مجبور ہے اور میں اپنی جگہ مجبور۔''

''تیرے کام میں کسی نے کوئی رکاوٹ ڈالی ہے کیا.... کہ تو اپنا کام انجام نہ دے سکا۔''

ہیولہ کچھ سوچتا رہا پھر گویا ہوا۔ ''سرکار.... میرے راستے میں ایک محافظ آتما کھڑی ہوجاتی ہے اور مجھے اپنا کام نہیں کرنے دیتی۔ لہٰذا میں اس سے تنگ آکر ادھر ادھر ہاتھ پیر مارنے لگتا ہوں۔''

''کیا تیرے کام کے بارے میں شنکر داس کو علم ہے۔'' رولوکا بولا۔

''سرکار یقیناً ہے.... اور اس لئے وہ بھی اپنی جگہ جیسے آگ پر لوٹ رہا ہے.... اس نے کئی بار کوشش کرچکا ہے کہ محافظ آتما کو نشٹ کردے۔ مگر اس آتما پر اس کا زور نہیں چلتا۔''

''کیا شنکر داس محافظ آتما کے سامنے کمزور پڑجاتا ہے....؟'' رولوکا نے پوچھا۔

''سرکار.... محافظ آتما ہر وقت روشن جنتر منتر اپنے منہ سے نکالتی رہتی ہے۔ جس کی وجہ سے شنکر داس کا منتر کمزور پڑجاتا ہے۔'' ہیولہ بولا۔

''جمنا اب تیرا معاملہ سامنے ہے.... اب تو بتا کہ تیرے ساتھ میں کیا عمل کروں.... اور تیرا انجام کیا ہے....؟''

''سرکار میں تو غلام ہوں.... میری تو دونوں طرف سے اب مرن ہے اور میں مانتا ہوں کہ آپ کا علم شنکر داس کے مقابلے میں زبردست ہے.... آپ مجھے ہی نہیں بلکہ شنکر داس کو بھی نشٹ کرسکتے ہیں.... سرکار غلام تو بس غلام ہوتا ہے۔ اپنے مالک کے سامنے ایک لفظ بھی نہیں بول سکتا.... آپ مجھ پر دیا کریں.... اور مجھے اب دوبارہ شنکر داس کے وش میں جانے سے بچائیں.... اور اگر ایسا آپ نے نہ کیا تو شنکر داس مجھے جلاکر ختم کردے گا۔

میری آپ سے بنتی ہے کہ آپ میری باتوں پر غور کریں.... اور مجھے مکتی دلادیں۔'' ہیولہ اب

گڑگڑانے لگا تھا۔

پھر رد لوکا کی آواز سنائی دی۔ ''ٹھیک ہے جمنا.... میں تیری بات مانتے ہوئے تجھے شنکرداس کی پکڑ سے بہت دور کردیتا ہوں.... اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی شنکرداس کے دیگر بیر تجھ تک نہیں پہنچ سکیں گے۔

خیر یہ بھی حقیقت ہے کہ کوئی بھی غلام روح اپنے مالک یا آقا کے سامنے بے بس ہوتی ہے.... اب تو جتنی جلدی ہوسکے.... یہ علاقہ چھوڑ دے اس میں تیری بھلائی ہے.... اور دیکھ اگر تو نے یہاں سے نکلنے کے بعد دیر کردی یا پھر تیرے ذہن میں کوئی اور بات آئی تو.... تو میری طاقت اور پکڑ سے واقف ہوچکا ہے.... میرے کارندے تیرا صفایا کرنے میں بالکل بھی نہیں ہچکچائیں گے۔'' اور پھر رد وکا نے اپنی انگلی کا اشارہ کیا اور جمنا کا ہیولہ غائب ہوگیا۔

ہیولہ کے غائب ہوتے ہی دیوار پر ایک ہستی کا وجود ابھرا جسے دیکھ کر خلیق الزماں ششدر رہ گئے، ان کی نظریں یک ٹک جیسے پتھرا گئیں.... دماغ میں سائیں سائیں ہونے لگا.... رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا اور پھر جسم کے سارے مسام سے ٹھنڈے پسینے کے سوتے پھوٹ پڑے.... لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ فرط غم یاس و محرومی اور حیرت سے پلکیں بار بار بند ہونے اور کھلنے لگیں حال سے بے حال ہونے لگے۔ ایسا لگا کہ دونوں کانوں میں کسی نے گرم پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا ہو۔

اتنے میں ردلوکا کی آواز سنائی دی.... ''خلیق الزماں صاحب.... خود کو قابو میں رکھیں اور حقیقت کو دیکھتے رہیں۔ مطلب پرستی اور خودغرضی میں ایسا بھی ہوتا ہے بلکہ اس سے بھی کچھ بڑھ کر ہوتا ہے.... دھن دولت اور شہرت انسان کو ہوش سے بیگانہ کردیتا ہے انسان اکثر انسانیت سے بہت دور چلا جاتا ہے جب ایک انسان مطلب پرستی کے شکنجے میں جکڑ جاتا ہے تو وہ اپنے پرائے کا لحاظ بھول جاتا ہے.... اس کی نظروں میں کسی کی بھی عزت نہیں ہوتی.... اور ایسا انسان لمحہ لمحہ پل پل خودغرضی کی آگ میں جلنے لگتا ہے.... اپنی طاقت کا غلط استعمال شروع کردیتا ہے۔

اس کی نگاہوں میں لوگوں کا خون ارزاں ہوجاتا ہے.... وہ کانوں سے بہرا اور آنکھوں سے اندھا ہوجاتا ہے۔ اٹھتے بیٹھتے سوتے جاگتے اس کے دماغ میں صرف اور صرف اپنی خواہش کی تکمیل گردش کرنے لگتی ہے.... وہ سارے رشتوں کو بالائے طاق رکھ دیتا ہے اور خونی رشتوں کا خون کرنے میں بالکل بھی نہیں ہچکچاتا۔

خیر جو ہونا تھا وہ تو ہوگیا

اب آپ فکر نہ کریں.... آج کے بعد حویلی میں اب کوئی بھی جانی نقصان نہیں ہوگا۔

مگر یاد رکھیں اوپر والے کی لاٹھی بے آواز ہوتی ہے۔

اب آپ وقت پر نظر رکھیں۔

یہ تو حقیقت ہے کہ برے کا انجام ہمیشہ برا ہوتا ہے۔

اور یہ بھی اوپر والے کی مہربانی اور کرم نوازی ہے کہ کوئی شفیق مہربان اور ہمدرد روح آپ لوگوں کی حفاظت کررہی ہے۔

میں فی الوقت یہ تو نہیں بتا سکتا کہ وہ محافظ اور مہربان روح کون ہے.... لیکن بہت جلد اس کی حقیقت اور اصلیت بھی سامنے آجائے گی۔

آپ آرام وسکون سے حویلی تشریف لے جائیں.... مگر ایک احتیاط ضرور کیجیے گا کہ جو حقیقت اور باتیں آپ کے سامنے آئی ہیں ان کا ذکر کسی سے بھی نہیں کرنا۔

اور ہاں ایک بات بتادوں.... وقت ضرورت بہت جلد میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہوجاؤں گا.... اور جو کچھ ہوگا وہ سب آپ لوگوں کے سامنے آجائے گا۔

اس معاملے کو میں آج ہی ختم کردیتا مگر دراصل شنکرداس کی کارستانی کو بھی لگام دینا ہے۔ آج رات کا

اندھیرا پھیلتے ہی جب اس کا بیر جمنا اس کے سامنے حاضر نہیں ہوگا تو پھر وہ بلبلا اٹھے گا..... پھر غم و غصے اور طیش کے عالم میں اپنے کئی بیر جمنا کی تلاش میں روانہ کردے گا..... مگر جب چند لمحے بعد وہ سب ناکام واپس آئیں گے اور جمنا کے غائب ہونے کی خبر دیں گے تو شنکر داس کے ہوش اڑ جائیں گے۔

اور پھر شنکر داس تلملاتا ہوا..... اپنے گرد و پیش اور قرب و جوار کی تلاشی لے گا کہ اس کا بیر غائب ہوا تو کیوں ہوا......؟ گیا تو کہاں گیا...... ؟ اور ایسا ہوا تو کیوں ہوا؟

اور پھر ایسا ہونے میں یقیناً کسی اور کا ہاتھ ہے ورنہ اس طرح کوئی بھی بیر..... غلام روح یا پھر موکل غائب نہیں ہوتا۔

اور چند پل کی کوشش سے شنکر داس یہ معلوم کرنے میں کامیاب ہو جائے گا کہ وہ کون ہے جس نے ایسا قدم اٹھا کر جمنا کو اس سے دور کرکے اسے غائب کر دیا ہے۔

اور آنا فاناً وہ میری طرف دوڑ پڑے گا۔

شنکر داس کوئی عام پنڈت اور عامل نہیں بلکہ بہت پہنچا ہوا ہے..... اس کی شکتی بہت بڑا مقام رکھتی ہے۔

خیر اس کے دانت کھٹے ہو جائیں گے..... اسے بھی پتہ چل جائے گا کہ اس کے مدمقابل جو ہے وہ بھی کوئی عام نہیں۔

وہ مجھے نیچا دکھلانے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کردے گا۔

اور پھر طیش کے عالم میں یقیناً حویلی کی طرف بھی اپنے بیر بھیجے گا تاکہ زیادہ سے زیادہ جانی نقصان پہنچا سکے..... لیکن وہ اپنے مقصد میں کسی صورت بھی اب کامیاب نہیں ہوگا۔

کیونکہ اس نظریہ کے پیش نظر میں نے اپنے کارندے ابھی سے حویلی کے چاروں طرف لگا دیئے ہیں۔ وہ کسی صورت بھی شنکر داس کے بیروں کو حویلی کے نزدیک پھٹکنے نہیں دیں گے۔

خیر آج کی رات ہوسکتا ہے کہ کچھ زیادہ ہی اودھم پچھاڑ ہو..... آپ لوگ گھبرایئے گا نہیں..... اور یہ کوشش کیجیے کہ رات کا اندھیرا پھیلتے ہی حویلی سے کوئی باہر نہ نکلے۔

ویسے زیادہ گھبرانے والی باتیں نہیں۔

میں نے احتیاط بتا دی ہے۔

شنکر داس پر قابو پاتے ہی میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر حقیقت سامنے لے آؤں گا۔

اور پھر اسی دن تمام فکر و تردد، پریشانی، اور نقصانات کا خاتمہ ہو جائے گا۔

اب آپ لوگ تشریف لے جائیں..... میں نے شنکر داس کے لئے مزید تیاریاں کرنی ہیں۔

کیونکہ یہ تو سب کو معلوم ہے کہ زخمی سانپ بہت زیادہ بپھرا ہوا ہوتا ہے اور اپنے دشمن پر اپنی پوری طاقت سے حملہ آور ہوتا ہے۔"

پھر خلیق الزماں اور صداقت حسین اپنی اپنی جگہ سے اٹھے اور رودالا سے مصافحہ کرنے کے بعد کمرے سے نکلتے چلے گئے۔

اس کے بعد اپنی گاڑی میں بیٹھ کے دونوں صداقت حسین کے گھر آگئے۔

خلیق الزماں بولے۔"صداقت حسین تمہارا بہت بہت شکریہ کہ تم نے اتنے قابل پہنچے ہوئے عامل سے ملوایا..... میں تمہارا یہ احسان تاحیات نہیں بھولوں گا۔

تمہارا احسان میری ذات پر ہی نہیں بلکہ میری آنے والی نسلوں پر بھی رہے گا۔"

یہ سن کر صداقت حسین بولے۔"خلیق الزماں یہ میرا کوئی احسان نہیں، بلکہ میں نے تو انسانیت کے ناطے یہ سب کچھ کیا ہے..... اور اس میں میرا کوئی کمال نہیں۔

میں نے بھی کئی لوگوں سے سنا تھا کہ حکیم وقار کے مطلب میں ایک بہت پہنچے ہوئے برگزیدہ شخصیت ہیں..... اور اس بہانے میں نے بھی چشم دید ان کا دیدار کرلیا۔

جتنی باتیں بھی انہوں نے کی ہیں وہ سب

حقیقت پر مبنی ہیں اور پھر سب سے کمال یہ کہ انہوں نے دیوار پر جن واقعات کا مشاہدہ کرایا اس سے کسی صورت بھی انکار نہیں...... خیر میری اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ تمہارے مصائب فوراً ختم ہو جائیں اور تمہارا خاندان سکھ کا سانس لے۔''

خلیق الزماں بولے۔''عامل صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ کس روز تشریف لائیں گے اور اگر پتہ چلتا تو میں ڈرائیور کے ساتھ آجاتا یا صرف ڈرائیور کو ہی بھیج دیتا۔''

یہ سن کر صداقت حسین بولے۔''بات تو تمہاری ٹھیک ہے، خیر کوئی بات نہیں...... کل میں نے مطب کے قریب ہی ایک صاحب سے ملنے جانا ہے...... میں خود جا کر عامل صاحب سے مل لوں گا اور ان سے وقت معلوم کر لوں گا اور پھر تمہیں اطلاع کر دوں گا۔ فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔

اس وقت دن کے ڈھائی بج رہے ہیں...... تم ہاتھ منہ دھولو تاکہ آرام سے کھانا کھائیں۔'' صداقت حسین بولے۔

یہ سن کر خلیق الزماں بولے۔''بھئی زیادہ تکلف کی ضرورت نہیں...... میں گھر جا کر کھانا کھالوں گا اور ویسے اس وقت بھوک بھی محسوس نہیں ہو رہی ہے۔''

''خاموشی سے ہاتھ منہ دھولو...... جاتے وقت میں نے بیگم سے کہہ دیا تھا کہ...... ہمیں واپس ہوتے ہوتے یقیناً دوپہر کا وقت ہو جائے گا...... تو آپ کھانا تیار رکھنا۔

ارے چلو دو وقت کا نہ سہی ایک وقت کا تو کھالو'' صداقت حسین بولے تو خلیق الزماں ہنسنے لگے اور منہ ہاتھ دھونے کے لئے غسل خانے میں گھس گئے۔

خیر دونوں نے کھانا کھایا...... اور کھانے کے بعد چائے کا دور چلا، چائے پینے کے کوئی آدھا گھنٹہ بعد خلیق الزماں اٹھے اور صداقت حسین سے بغلگیر ہو کر اپنی حویلی کی طرف چل پڑے۔

حویلی میں خلیق الزماں کا بڑی بے چینی سے انتظار ہو رہا تھا۔

حویلی میں قدم رکھتے ہی تمام گھر والوں نے خیر خیریت معلوم کی اور یہ بھی پوچھا کہ ''آپ جن صاحب کے پاس گئے تھے انہوں نے کیا جواب دیا؟''

یہ سن کر خلیق الزماں بولے۔''عامل صاحب سے میری بڑی تفصیلی بات ہوئی ہے، عامل صاحب کا کہنا ہے کہ'' آپ لوگ گھبرائیں نہیں۔ چند دن میں ہی پوری حویلی اور حویلی کے افراد ہر طرح کی پریشانی و نقصانات سے فراغت پائیں گے۔''

خیر میں عامل صاحب کی باتوں سے کافی حد تک مطمئن ہو گیا ہوں...... اور مجھے قوی امید ہے کہ اب حویلی میں وہ کچھ نہیں ہوگا جو کہ ہو رہا تھا۔ آپ سب اللہ کی ذات پر بھروسہ رکھیں...... اللہ بہتر کرے گا...... اور بہت جلد ہمارا خوشیوں سے واسطہ پڑے گا۔

اب آپ سب بھی آرام کریں...... میں بھی اپنے کمرے میں جا کر آرام کرتا ہوں۔

جب خلیق الزماں اپنے کمرے میں جا کر بستر پر لیٹ گئے تو ان کی بیگم مہر النساء نے پوچھا'' آپ کے لئے کھانا لگاؤں؟''

یہ سن کر خلیق الزماں بولے۔''صداقت حسین کے ساتھ کھانا کھالیا تھا...... بہت ضد کر کے اس نے کھلائے بغیر چھوڑا نہیں۔''

بیگم بولیں......''آپ کی باتوں سے مجھے تو بہت ڈھارس بندھی ہے اور میرا دل بھی کافی مطمئن ہو گیا ہے۔ کیا عامل صاحب خود تشریف لائیں گے یا پھر اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے مسائل کا حل نکال دیں گے؟''

''مہر النساء...... پریشان نہ ہو...... اللہ نے چاہا تو چند دنوں میں تمام پریشانیوں سے ہم سب کی جان چھوٹ جائے گی۔

بہت جلد ساری حقیقت ہم سب کے سامنے آجائے گی۔

ویسے میں اندر تک ڈر گیا ہوں۔

عامل صاحب نے ایک بات کی تھی کہ ''گھر کو آگ لگ گئی گھر کے چراغ سے۔'' اور اس بات نے مجھے ہلکان کر کے رکھ دیا ہے۔

خیر جو حقیقت ہے وہ ہر صورت میں سامنے آ جائے گا اور ہاں تم اس بات کا ذکر کسی اور کے سامنے نہ کر دینا..... کیونکہ عامل صاحب نے اس کے لئے منع کیا ہے سختی سے۔''

ادھر رات کا اندھیرا پھیلتے ہی شنکر داس کو بے چینی نے گھیر لیا تھا کیونکہ ہر روز کے مطابق اس کا بیر جمنا اسکے سامنے حاضر نہیں ہوا تھا..... اور پھر اس انتظار میں کوئی دو گھنٹے ہو گئے۔

اب تو شنکر داس کی بے چینی قابل دید تھی.... وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا..... ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے منتر پر منتر پڑھنے لگا۔ اور پھر جیسے وہ آگ پر لوٹنے لگا۔

کیونکہ آج سے پہلے کبھی ایسا نہ ہوا تھا کہ وہ منتر پڑھے اور اس کا کوئی بیر حاضر نہ ہو۔

وہ جس بیر کے لئے بھی منتر پڑھتا پلک جھپکتے ہی وہ بیر اس کے سامنے سرنگوں حاضر ہو جاتا۔

اس نے اپنے سامنے دہکتی آگ میں چندن، ہرمل، دھوپ اور لوبان مٹھی بھر کر ڈالا تو دھوئیں کا زبردست مرغولہ اٹھا اور پورے کمرے میں سفید گاڑھا گاڑھا دھواں پھیل گیا۔

اور پھر بلند آواز سے منتر پڑھنے لگا ایسا لگتا تھا کہ جیسے وہ جنونی ہو گیا ہے، جیسے جیسے وہ منتر پڑھتا جاتا تھا اس کی اندرونی کیفیت بدلتی جا رہی تھی مگر بے سود اس کا منتر پڑھنا کار آمد نہ ہوا تو اس نے طیش میں آ کر یکے بعد دیگرے چیختے ہوئے کئی بیروں کو آواز دے ڈالی۔

پھر تو جیسے بیروں کی ڈھیر لگ گئی۔

ایک دو تین، بلکہ سات بیر آ دھمکے۔

ساتوں بیر سرنگوں اسکے سامنے کھڑے تھے۔

اور پھر جیسے ہی اس کی نظر بیروں پر پڑی تو وہ خود بدحواس ہو گیا۔

کیونکہ آج سے پہلے کبھی بھی ایسا نہ ہوا تھا کہ اس نے کئی بیروں کو ایک ساتھ حاضر کیا تھا ورنہ طریقہ تو ہوتا ہے کہ کوئی بھی عامل اپنے بیر، روحیں، آتمائیں، ہمزاد یا پھر موکلات میں سے ایک ایک کر کے حاضر کرتا ہے اور ان سے حال احوال معلوم کرتا ہے۔

مگر آج تو شنکر داس نے حد کر دی تھی، ایک ساتھ سات بیر اس کے سامنے موجود تھے۔ شنکر داس کی آواز گونجی ''جمنا نہیں آیا۔''

''مجھے جمنا چاہئے۔

تم سب فوراً جاؤ اور جمنا جس حال میں بھی ہو اسے لے کر آؤ۔

جمنا نے میری توہین کی ہے۔

میرے لاکھ بلانے پر وہ حاضر نہیں ہوا۔

میں جمنا کی اس غلطی کو کسی صورت معاف نہیں کر سکتا۔

یہ میری زندگی میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا کہ شنکر داس بیر کو بلائے اور وہ حاضر نہ ہو، میں جمنا کو جلا کر راکھ بنا دوں گا۔

میرے سامنے جمنا کی یہ غلطی ناقابل معافی ہے۔

شنکر داس کی زندگی کا اہم اصول جمنا نے توڑا ہے۔

جمنا نے جان بوجھ کر یہ قدم اٹھایا ہے۔

جمنا کی غلطی کسی صورت بھی بھلانے والی نہیں۔

جمنا کو دیکھ کر دیگر تمام بیر عبرت حاصل کریں گے۔

جمنا پر مجھے بہت ناز تھا۔

جمنا کو میں نے تمام بیروں پر فوقیت دی۔

جمنا ہر حال میں مجھے اپنے سامنے چاہئے۔

جمنا کا وجود اب میرے لئے بے کار ہو گیا ہے۔

جمنا کا وجود میں ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دوں گا۔

جمنا جمنا..... تو نے میرے مان کو توڑا ہے۔

جمنا میں تجھے ایسی سزا دوں گا کہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔

جمنا چاہے تو پاتال میں ہی کیوں نہ ہو میری پکڑ
سے چھپ نہیں سکتا۔
جمنا کل تک تو نے میرا پیار دیکھا تھا۔
جمنا آج تجھے میری آتش فشاں شخصیت بھی نظر
آجائے گی۔
جمنا آج تیرا میرے قہر سے بچنا ممکن نہیں بلکہ
ناممکن ہو جائے گا۔''
پھر وہ دھاڑا اپنے بیروں کو۔''جاؤ..... اور جمنا
کو فوراً میرے سامنے حاضر کرو۔''
اور پھر شنکر داس کی دھاڑ سنتے ہی ساتوں کے
ساتوں بیر دھوئیں میں تحلیل ہو کر غائب ہو گئے اور شنکر
داس اپنی جگہ موجود بلند آواز سے منتر پڑھتا رہا۔
اور شنکر داس منتر کیوں نہ پڑھتا۔
کسی بھی بیر آتما یا نادیدہ قوت کو قابو میں رکھنے کے
لئے ضروری ہوتا ہے کہ عامل اپنا جنتر منتر پڑھتا رہے۔
منتر یا عمل پڑھنے سے اس کے معمول کے جسم
میں حرارت بڑھتی رہتی ہے اور پھر اس عمل کا معمول
اپنے عامل کے طابع رہتا ہے۔
شنکر داس منتر پڑھتا رہا اور منتر پڑھتے
پڑھتے وہ عاجز آ گیا۔
پھر اکتاتے ہوئے اس نے ایک زبردست اگنی
منتر پڑھنا شروع کر دیا۔
اگنی منتر تھک ہار کر پڑھا جاتا ہے اس کا اثر یہ
ہوتا کہ اس کے معمول میں آگ کے شعلے بھڑک اٹھتے
ہیں۔
اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ اگنی منتر پڑھتے
پڑھتے بھی تھک گیا تو اسے تشویش ہونے لگی کہ ایسا
تو کسی صورت بھی نہیں ہو سکتا۔
عامل اگنی منتر پڑھے اور اسکا معمول بحفاظت
رہے۔
اب تو اس کی چھٹی حس پھڑکی اور وہ خوف زدہ
ہو گیا کہ اس کا فرمانبردار بیر جمنا اس کی دسترس میں رہا
نہیں۔ وہ یہی سوچ رہا تھا کہ۔

اتنے میں اس کے ساتوں بیر ایک ایک کر کے
حاضر ہو گئے سب کے منہ لٹکے ہوئے تھے اور پھر سب
نے یک زبان ہو کر آواز لگائی۔
''مہاراج ..... جمنا کا کہیں بھی پتہ نہیں چلا۔
ہم سب نے ساتوں آسمان، ساتوں زمین کے
پرت، ساتوں ستارے، ساتوں اور، دیکھ ڈالے مگر جمنا
کا پتہ نہیں چل سکا۔
مہاراج لگتا ہے کہ جمنا کا وجود اب اس دھرتی
بلکہ کہیں بھی رہا نہیں۔
مہاراج..... یا پھر ایسا لگتا ہے کہ جمنا کسی
اور شکتی شالی مہاپرش کے شرن میں آ گیا ہے۔''
پھر ان میں جو مہابیر تھا وہ بولا۔''مہاراج.....
لگتا ہے وہ شکتی شالی آپ سے بھی زیادہ طاقت ور ہے
اور آپ کی پہنچ اس تک نہیں۔
یہ سنا تھا کہ شنکر داس کے ماتھے پر بل پڑ گئے
اور زخمی سانپ کی طرح پھنکارا۔
''زمہابیر تیری جرأت اور ہمت کیسے ہوئی کہ
تو میرے سامنے کسی اور کی تعریف کرے۔ میں تجھے
نشٹ کر کے رکھ دوں گا۔''
یہ سن کر مہابیر مزید آگے کو جھک گیا اور گلوگیر
آواز میں بولا۔''مہاراج آپ خود اندازہ لگائیں
کہ ہم تمام بیر جو کہ اپنی شکتی میں مثال نہیں رکھتے۔ ہم
سب جمنا کو ڈھونڈ نہ سکے بلکہ اس کا پتہ بھی نہ لگا سکے
تو اس کا مطلب کیا ہے۔''
ہم آپ کے غلام ہیں..... آپ چاہیں ہمیں سزا
دے سکتے ہیں مگر یہ وقت ایسی باتوں کا نہیں بلکہ یہ
سوچنے کا ہے کہ جمنا کا پتہ کیسے لگایا جائے؟''
مہابیر کی بات سن کر شنکر داس سوچ میں پڑ گیا
کیونکہ مہابیر نے بات تو ٹھیک کی تھی۔
شنکر داس نے طیش میں آ کر تمام بیروں
کو جانے کا حکم دیا..... اور پھر ساتوں بیر پلک جھپکتے اس
جگہ سے غائب ہو گئے۔
اور پھر شنکر داس دہکتی ہوئی آگ کے سامنے بیٹھ

کر منتر پڑھتے ہوئے آگ میں لوبان اور صندل ڈالنے لگا چند منٹ بعد اس کے سامنے گاڑھا گاڑھا سفید دھواں اٹھنے لگا۔

پھر اس دھوئیں نے ایک عفریت کا روپ دھار لیا۔

وہ عفریت عجیب الخلقت تھی۔ جسے اگر عام آدمی دیکھ لے تو لرز کر رہ جائے۔

اس عفریت کی کھرکھراتی ہوئی بھاری بھرکم آواز سنائی دی۔ ''مہاراج کلمنی حاضر ہے۔''

اس آواز کو سنتے ہی شنکرداس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور بولا۔ ''کلمنی میرا ایک مہابیر جمنا نہ جانے کہاں غائب ہوگیا کسی صورت بھی اس کا پتہ نہیں چل رہا۔

میرا حکم ہے کہ تو جمنا کا پتہ کرکے بتا کہ وہ کہاں ہے؟ کس حال میں ہے؟ کس کے شرن میں ہے...... اور میری پکڑ سے باہر ہے......؟''

یہ سن کر کلمنی بولی۔ ''مہاراج میں ابھی جاکر پتہ کرتی ہوں کہ جمنا کہاں ہے بلکہ اس کی ساری حقیقت آپ کے سامنے لاکر رکھتی ہوں......

مہاراج آپ چنتا نہ کریں۔ کلمنی ہمیشہ آپ کے حکم پر پورا اتری ہے کلمنی سے آپ کو ناامیدی کی ضرورت نہیں، اچھا اب میں چلتی ہوں۔'' اور یہ بولتے ہی کلمنی دھوئیں میں تحلیل ہوکر غائب ہوگئی کلمنی کے جاتے ہی شنکرداس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوگئی۔ اور اس کے منہ سے آواز نکلی۔ ''جمنا اب میں دیکھتا ہوں تو کہاں اور کس بل میں چھپ کر بیٹھ گیا ہے اور اگر کوئی تیرا حمایتی ہے تو میں اسے بھی دیکھ لوں گا۔''

اور پھر طیش و جنون کے عالم میں منتر پڑھنے لگا۔

کوئی ڈھائی تین منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ کمرے کے کونے میں گاڑھا گاڑھا سفید دھواں اٹھنے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے دھوئیں نے کلمنی کا وجود اختیار کرلیا۔

پھر کلمنی کی آواز سنائی دی۔ ''مہاراج...... اب جمنا آپ کے شرن میں سے نکل چکا ہے۔

مہاراج...... آپ برا نہ مانیں...... ایک آپ سے بھی شکتی شالی نے جمنا کو بہت دور بھیج دیا ہے اور اب آپ یا آپ کا کوئی بیر بھی جمنا تک نہیں پہنچ سکتا۔

وہ شکتی شالی دلی میں حکیم وقار کے مطب میں موجود ہے۔

اور اس شکتی شالی کا نام رولو کا ہے...... اسے حکیم کامل بھی کہتے ہیں۔

وہ سب کے کام آتا ہے...... کسی کو اپنے در سے مایوس نہیں لوٹاتا...... آنے والا اس کے در پر آنسو بہاتا آتا ہے اور ہنستے ہوئے جاتا ہے۔

وہ ایک پائی پیسہ لئے بغیر سب کے کام کرتا ہے۔

مہاراج میرا تو مشورہ ہے کہ آپ اس سے بیر نہ لیں۔

آپ کی اسی میں بھلائی ہے کہ آپ جمنا کو بھول جائیں۔

اور آپ نے جمنا کو جس کام پر لگایا تھا اب وہ کام آپ کا کوئی اور بیر نہیں کرسکتا۔

آپ کے کسی بھی بیر کا اس علاقے میں جانا ممکن نہیں۔

وہاں جانے والا آپ کا ہر بیر جل کر نشٹ ہوجائے گا۔

اور پھر شنکرداس کی غراتی ہوئی آواز اس کے منہ سے نکلی۔ ''کلمنی میں نے تیری بات سن لی یہ بہت ہے۔ ورنہ تجھے میرے مزاج کا معلوم ہے...... میں کسی بھی صورت اس مورکھ کو نہیں چھوڑوں گا اس نے شیر کے کچھار میں ہاتھ ڈالا ہے۔

میں اس سمیت حکیم وقار کے مطب کا بھی نشٹ کرکے رکھ دوں گا۔'' اور پھر طیش میں آکر اس نے ایک منتر پڑھا اور اپنے اوپر پھونک ماری۔

پھونک مارتے ہی اس کا وجود تحلیل ہونے لگا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔

ادھر رولوکا اپنے کمرے میں موجود بستر پر بیٹھا تھا اور اس کی آنکھیں بند تھیں۔

کہ اتنے میں ایک کرخت آواز پورے کمرے میں گونجی۔ ''مورکھ تو نے مجھے پہچانا نہیں... ارے اگر شکتی شالی ہے تو کم از کم میری شکتی کا تو اندازہ کرلیا ہوتا۔

تو نے میرے ساتھ پنگا لے کر اچھا نہیں کیا۔

ارے پاپی میرے نام سے تو بڑے بڑے کانپتے ہیں۔ تو مجھے سمجھتا کیا ہے... میں تو تجھے مچھر کی طرح مسل کر رکھ دوں گا۔

تو نے میرے بیر جمنا کو نہ جانے کہاں چھپا رکھا ہے۔

اب تو دیکھتا رہ کہ میں تیرا کیا حشر کرتا ہوں۔

میں تیرا اور اس مطب کا ملیا میٹ کردوں گا۔

تو اس دھرتی سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے مٹ جائے گا۔''

شنکر داس رولوکا کو صرف گیدڑ بھبکی دے رہا تھا۔

وہ کمرے میں نہیں آیا تھا بلکہ کمرے سے باہر موجود تھا اور کھڑکی کے راستے اس کی آواز سنائی دے رہی تھی اور رولوکا اپنی جگہ بستر پر خاموش بیٹھا تھا۔

پھر رولوکا نے اپنی آنکھیں کھولیں اور مسکراہٹ اس کے ہونٹوں پر جھلکنے لگی پھر رولوکا کی آواز سنائی دی۔

''شنکر داس مورکھ میں نہیں بلکہ تو مورکھ ہے۔

ارے اگر تو اتنا ہی طاقتور ہے تو جس طرح میں تیرے سامنے موجود ہوں اس طرح تو بھی ٹھوس جسم میں میرے سامنے آتا کہ تجھے معلوم ہو کہ شکتی شالی کون ہے...

تو بزدلوں کی طرح غائب ہو کر کیوں چیخ رہا ہے۔

ارے جو بہادر ہوتے ہیں وہ تو آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر باتیں کرتے ہیں، لیکن میری نظر میں تو، تو بزدل سے بھی بڑھ کر ہے۔ تو شکتی شالی نہیں بلکہ بے وقوف بھی ہے۔''

اور ساتھ ہی ایک زبردست کان پھاڑ دھماکہ اور چیخ سنائی دی۔ پھر ایک شعلہ سا لپکا اور وہ شعلہ بڑی تیزی سے شمال کی جانب بڑھتا چلا گیا۔

اس کے فوراً بعد رولوکا بیٹھے بیٹھے اپنی جگہ سے غائب ہوگیا۔ غائب حالت میں رولوکا اپنے کمرے سے نکل کر پورے مطب کا جائزہ لیا... مگر مطب کا کچھ بھی نقصان نہ ہوا تھا۔

جب رولوکا پوری طرح مطمئن ہوگیا تو اس نے فضا میں پرواز کرتا جاگتے الو کو چند ہدایات دیں اور اس کے بعد وہ ایک سمت کو بڑھتا چلا گیا۔

پھر پلک جھپکتے ہی رولوکا چاندپور میں پہنچا، پورا چاندپور چاندنی کی روشنی میں نہایا ہوا تھا کیونکہ ان دنوں چاند کی روشن تاریخیں تھیں یعنی چاند کی تیرہویں تاریخ تھی۔

حویلی کے چاروں طرف رولوکا منڈلاتا رہا...

رولوکا کے کارندے بھی حویلی کے گرد چوکس تھے۔ رولوکا روپوشی کی حالت میں کافی دیر تک حویلی کا جائزہ لیتا رہا... اور جب وہ مطمئن ہوگیا تو ایک مرتبہ پھر اس نے جاگتے الو سے رابطہ کیا اور اپنے خفیہ اشاروں سے ہدایات دینے کے بعد ایک اور سمت بڑھتا چلا گیا۔

رولوکا نے اپنے دل میں تہیہ کرلیا تھا کہ ہر صورت میں اب شنکر داس کو اطمینان سے کہیں ٹکنے نہیں دینا ہے۔

ویسے شنکر داس بھی بہت کائیاں تھا اس کی بھی اپنی کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح رولوکا کے دانت کھٹے کردے تاکہ رولوکا کو ہمیشہ ہمیشہ کے لئے سبق مل جائے۔

اور رولوکا اس قابل نہ رہے کہ کسی اور کو نیچا دکھا سکے۔

وہ بھاگتا رہا، اسے کسی ایسی جگہ کی تلاش تھی جہاں کہ رولوکا یا پھر اس کا کوئی کارندہ وہاں تک نہ پہنچ سکے۔

اگر رولوکا کسی طرح اس جگہ پہنچ بھی جائے تو اس کی واپسی ممکن نہ ہو۔

پھر رولوکا اس جگہ پوری زندگی کے لئے قید ہوکر رہ جائے اور تھک ہار کر اس کا خاتمہ ہوجائے، نہ رہے بانس نہ بجے بانسری، یعنی رولوکا کا وجود ختم ہوجائے۔

شنکر داس غائب حالت میں پرواز کرتا رہا، اس

نے ٹھان لی تھی کہ میں رولوکا کے ناکوں چنے چبوادوں گا شنکر ایک پل کے لئے بھی ٹک کر نہیں بیٹھ رہا تھا۔

اور پھر اسے ایک ایسی جگہ نظر آ گئی جو کہ اسے بہت اچھی لگی اور وہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو سکتا تھا اسے ایک آتش فشاں پہاڑ نظر آ گیا وہ پہاڑ یقیناً کسی زمانے میں لاوا اگل چکا تھا۔

اس پہاڑ کا دہانہ اوپر سے کھلا پڑا تھا اور نیچے سے بھی بہت بڑا شگاف اس میں موجود تھا۔

شنکر داس اس پہاڑ پر اترا اور بہت باریک بینی سے اس کا جائزہ لیا اور پھر اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ نمودار ہوئی پھر اس کے منہ سے نکلا۔ ”رولوکا تیری تو ایسی کی تیسی اب میں تیرا کروں گا حشر نشر، تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کس شکتی شالی سے واسطہ پڑا ہے۔“

اس نے بھرپور طریقے سے اپنے منصوبے کا جائزہ لیا۔

اور پھر اس پہاڑ کے اندر بیٹھ کر جنتر منتر پڑھنے لگا اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میرا منصوبہ ہر صورت کامیاب رہے گا تو اس نے اپنے منصوبے کو آخری شکل دے ڈالی۔

اس پہاڑ میں کوئی بھی نچلے سائیڈ سے اندر جا سکتا تھا اور پھر اوپر کھلے دہانے سے باہر نکلنا ممکن تھا۔

اپنی ہر طرح کی پوری تیاری کرنے کے بعد وہ اس گپھا سے باہر نکلا اور آناً فاناً ایک سمت کو آگے ہی آگے بڑھنے لگا۔

شنکر داس نے زبردست منتر سے خود کو غائب کر رکھا تھا تا کہ کسی کو نظر نہ آسکے، رولوکا کے کارندے بھی اس پر نظر ڈالنے سے قاصر تھے۔

اور پھر آخر کار شنکر داس رولوکا کے حدود میں داخل ہوا تو اس کی خبر فوراً رولوکا کو ہو گئی، اور ایسا ہوتے ہی رولوکا اپنی جگہ سے باہر نکلا۔ شنکر داس کے پیچھے لگ گیا۔

لیکن شنکر داس تو پہلے ہی چوکنا تھا اور منصوبے کے تحت رولوکا کے حدود میں داخل ہوا تھا۔

رولوکا بڑی تیزی کے ساتھ اس کا پیچھا کرنے لگا۔

لیکن شنکر داس اس سے کہیں تیز رفتاری سے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

رولوکا کے دماغ میں بس یہ تھا کہ میں کسی طرح بھی اس کو اپنے شکنجے میں جکڑ لوں اور پھر اسی سوچ کے تحت شنکر داس کے پیچھے آگے ہی آگے بڑھتا رہا۔

اور ایک وقت آیا کہ شنکر داس منصوبے کے تحت مردہ آتش فشاں پہاڑ میں داخل ہو گیا، پھر شنکر داس کے پیچھے ہی رولوکا بھی پہاڑ میں داخل ہو گیا۔ اور یہی رولوکا کی فاش غلطی تھی۔

شنکر داس پہاڑ میں داخل ہوتے ہی منصوبے کے تحت اوپر کے کھلا حصہ سے باہر نکلتا چلا گیا اور پھر اس نے ایک زبردست منتر کے ذریعے کھلا حصہ بند کر دیا۔

اور جب رولوکا پیچھے کی جانب مڑا تو شگاف سے باہر نکلنے کا راستہ بھی منتر کے ذریعے بند ہو چکا تھا پھر رولوکا کے ذہن میں فوراً شنکر داس کا منصوبہ آ گیا۔

اور یہ محسوس ہوتے ہی رولوکا کے پسینے چھوٹنے لگے۔

رولوکا ایک جگہ مایوس ہو کر بیٹھ گیا اور اپنا سر پکڑ لیا۔

اسے اپنی غلطی اور شنکر داس کی چالاکی سمجھ میں آ گئی تھی۔

پلک جھپکتے ہی وہ پسینہ پسینہ ہو گیا، دونوں راستے بند ہو چکے تھے۔

کافی دیر تک رولوکا ایک ہی جگہ بیٹھا رہا کیونکہ اس کا دماغ کسی طور کام نہیں کر رہا تھا بلکہ یوں کہنا زیادہ مناسب ہو گا کہ اس کا دماغ ایک طرح سے مفلوج ہو کر رہ گیا تھا۔

پہاڑ کے غار میں ہر طرف گھپ اندھیرا مسلط تھا ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دیتا تھا۔

خیر جب رولوکا کے حواس کچھ بحال ہوئے اور اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت کو تقویت ملی تو اس نے خود کو ہی برا بھلا کہنا شروع کیا۔

اور پھر اس کے منہ سے نکلا۔ ”شنکر داس تو نے دھوکے سے اچھا نہیں کیا۔۔۔ خیر میں تیرے

منصوبے کی داد دیتا ہوں ۔۔۔۔۔ یہ میری اپنی کم عقلی ہے کہ میں بغیر سوچے سمجھے تیرے پیچھے لگ گیا۔

اس کے بعد رولو کا اپنی روحانی قابلیت کے متعلق سوچنے لگا مگر اس کی ہر سوچ ایک جگہ جا کر ٹھہر جاتی تھی...... اسے کوئی بھی راستہ نظر نہیں آ رہا تھا۔

جب رولو کا اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے تھک گیا تو اس نے اپنا سیدھا ہاتھ بائیں ہاتھ پر زور سے مارا، اور ایک بہت لمبا سانس کھینچتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب وہ لمبے لمبے سانس لے رہا تھا۔

اس نے کئی منتر پڑھے اور کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح بھی اس کا رابطہ اپنے کارندوں سے ہو جائے مگر بے سود لاکھ کوشش کے باوجود بھی اس کا رابطہ اپنے کارندوں سے ہو کر نہیں دے رہا تھا۔

پھر اس کے دماغ میں آیا کہ کیوں نہ میں اپنے استاد کا صدری عمل شروع کردوں اور اس خیال کے آتے ہی اس نے اپنے استاد کا مخفی اور ناقابل تسخیر عمل پڑھنا شروع کیا۔

اور کافی دیر تک وہ عمل کی تکرار کرتا رہا مگر یہ کیا....

اس کے منہ سے نکلا مخفی عمل بھی بے اثر ہو رہا تھا۔

اور یہ دیکھتے ہوئے اس کے چھکے چھوٹنے لگے۔

ہر لمحے کے ساتھ ساتھ اس کی تشویش میں اضافہ ہونے لگا۔

پھر اس کے ذہن میں آیا کہ کیوں نہ کوئی اپائے کر کے سب سے پہلے غار میں روشنی کروں اور اس خیال کے تحت اس نے اپنے اردگرد ٹٹول کر ایک بڑا سا پتھر اٹھا کر اپنے قریب رکھ لیا، پھر اس کے بعد اس نے ایک چھوٹا پتھر اٹھایا اور اس پتھر پر ایک عمل پڑھ کر جب پھونکا تو وہ چھوٹا پتھر خود بخود روشن ہو گیا اس پتھر میں سے سفید دودھیا روشنی منعکس ہونے لگی۔

اس روشنی کو دیکھ کر اس کے دل کو کچھ ڈھارس ہوئی۔ ''چلو ایک کام تو ہوا۔'' اس کے بعد رولو کا کوشش

رازق کون......؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا معمول تھا کہ آپ علیہ السلام اس وقت تک کھانا تناول نہ فرماتے جب تک دستر خوان پر مہمان نہ ہوتا۔

ایک دن کوئی مہمان نہ آیا تو آپ علیہ السلام ایک راہ گیر کو پکڑ لائے۔ جب آپ کھانا کھانے لگے تو اس نے اللہ کا نام نہ لیا۔ آپ علیہ السلام نے فیصلہ کیا کہ اس شخص چونکہ اللہ کا نام لئے بغیر کھانا شروع کر دیا ہے اس لئے اب کبھی اسے کھانے پر نہیں بلاؤں گا۔ غیب سے آواز آئی اے ابراہیم اس شخص نے ایک دفعہ میرا شکر ادا نہ کیا تو تو نے آئندہ اسے کھانا نہ کھلانے کا عزم کر لیا۔ میری فیاضی دیکھ اس نے زندگی میں ایک دفعہ بھی میرا نام نہ لیا۔ لیکن میں نے اس کا رزق بند نہ کیا۔ اس واقعہ سے صاف ظاہر ہے کہ ہمارا رازق اللہ ہے وہ جس حالت میں جس مقام پر چاہتا ہے اسی قسم کا رزق دے دیتا ہے۔ کوئی اس کا نام لے یا نہ لے۔ بقول شاعر:

ہلانے سے روزی کی گر ڈور ہلتی
تو روزی نکموں کو ہرگز نہ ملتی

لیکن پھر اللہ کا دیا ہوا رزق کھا کر ہم کیا کرتے ہیں۔ اس لئے غور کریں کہ ہمیں کیا کرنا چاہئے۔

(الیس امتیاز احمد۔ کراچی)

پر کوشش کرنے لگا کہ کسی طرح اس کا رابطہ اپنے بڑوں یا پھر کسی غیبی کارندہ سے ہو جائے مگر بے سود، ساری کوشش بے کار ثابت ہوتی نظر آنے لگی۔

اور یہی نہیں رولوکا کے کئی کارندوں نے بھی رولوکا سے رابطہ کرنا چاہا۔ مگر وہ بھی کامیاب نہ ہوئے اب تو باہر سارے کارندے بے چین و پریشان کہ رولوکا گیا تو کہاں گیا اور ادھر غار کے اندر رولوکا ہاتھ ملتا رہا کہ اب کروں تو کیا کروں ''کاش کہ میں نے جھونک میں آ کر غلطی نہ کی ہوتی۔''

جاگتے الو نے چند پل میں سارا علاقہ چھان مارا تھا... بلکہ سینکڑوں میل دور تک کا چپہ چپہ اپنی غیبی قوت سے دیکھ ڈالا تھا مگر کہیں بھی رولوکا کا نام و نشان نہ تھا۔

جب جاگتے الو نے غیبی قوت کی بینائی نیچے زمین پر ڈالتا تو سارا علاقہ بالکل روشن نظر آتا مگر ایک جگہ اسے تاریک نظر آتی اور وہ جگہ پہاڑ والی تھی جہاں رولوکا قید ہو چکا تھا۔

اچانک جاگتے الو کے ذہن میں آیا کہ آخر کیا وجہ ہے کہ ساری جگہ روشن نظر آ رہی ہے اور یہ دو میل میں پھیلا علاقہ تاریک نظر آ رہا ہے اور کہیں ایسا تو نہیں کہ رولوکا اس جگہ موجود ہو لیکن ایسا ہونے میں رولوکا کی اپنی مرضی قطعی شامل نہ ہو۔

''کہیں ایسا تو نہیں کہ کسی دشمن نے رولوکا کے گرد کوئی مضبوط اور نا قابل تسخیر حصار قائم کر دیا ہو۔'' یہ خیال جاگتے الو کے ذہن میں آیا تو اس نے اپنی نہایت مضبوط قوت کو بروئے کار لاتے ہوئے آسمان کی وسعتوں سے نیچے کو آیا۔

لیکن وہ اپنی حد سے زیادہ نیچے بھی نہیں آ سکتا تھا کیوں کہ اس کی بھی ایک حد مقرر تھی، جب وہ کافی نیچے آیا تو اسے غیبی قوت سے پتہ چل گیا کہ اس جگہ ایک پہاڑ ہے اور اس پہاڑ کے اردگرد مضبوط حصار قائم کر دیا گیا ہے۔

پھر جاگتا الو کو یقین ہو گیا کہ ہو نہ ہو، رولوکا کو اس جگہ قید کر دیا گیا ہے اس کا یقین ہوتے ہی جاگتا الو نے اپنے زیر اثر چند اور کارندوں کو اپنے قریب کیا اور پھر ایک اشارہ ملتے ہی سب نے مل کر اپنی غیبی قوت کی روشنی کو پہاڑ پر پھیلایا تو یہ انکشاف ہو گیا کہ واقعی مضبوط حصار اس پہاڑ پر قائم ہے اور ایک وجود ہے جو کہ اس پہاڑ پر موجود ہے اور وہی اس حصار کی حفاظت کر رہی ہے۔

اس حقیقت کے انکشاف ہوتے ہی سارے کارندوں نے مل کر خفیہ پیغام رولوکا تک پہنچایا مگر بے سود ان کا پیغام رولوکا تک نہ پہنچ پایا اور نہ ہی ان تک رولوکا کا کوئی پیغام پہنچا۔

پھر جاگتا الو نے آناً فاناً ایک پروگرام مرتب دیا وہ یہ کہ جو وجود پہاڑ پر موجود ہے اسے ہر طرف سے کیوں نہ تنگ کیا جائے اور پھر سب نے مل کر پہاڑ پر موجود شنکر داس کو غیبی طاقت کے ذریعہ تنگ کرنا شروع کر دیا۔

ادھر اندر سے متواتر رولوکا شنکر داس کو تنگ کر رہا تھا ایسا ہوتا تھا کہ جب رولوکا اپنا منتر پڑھ کر باہر اوپر کی جانب منتر کو بھیجتا تو وہ منتر ایک مضبوط کیل کی شکل میں شنکر داس کے کولہے میں چبھتا اور اس طرح شنکر داس ایک پل کے لئے بے چین ہو جاتا۔ اور اب تو نیچے اوپر دونوں طرف سے شنکر داس بے چین ہونے لگا لیکن وہ بھی زیادہ شقی القلب اور ضد کا پکا تھا۔ وہ کسی صورت بھی پہاڑ کے دہانہ سے ہٹ کے نہیں دے رہا تھا۔

ادھر اندر رولوکا کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں اور ایک وقت آیا کہ اندرونی طور پر رولوکا کی بے چینی، پریشانی اور اذیت نا قابل برداشت ہو گئی۔

ویسے بھی جنتر منتر اور عمل جو کہ زیادہ طاقتور ہوتا ہے اس کی خصلت ہوتی ہے کہ جب عامل اسے اپنی طرف سے آگے بھیجتا ہے تو وہ تیزی سے آگے کو بڑھتا ہے اور پھر اس کا جو ہدف ہوتا ہے اس پر جا پڑتا ہے اور پھر ہدف والی ہستی متاثر ہوتی ہے۔

لیکن جب سامنے والا طاقتور ہوتا ہے یا پھر کسی

اور وجہ سے وہ منتر یا عمل اپنے ہدف تک نہیں پہنچ پاتا تو وہ منتر یا عمل واپس لوٹ کر اپنے عامل کے سر پر آ جاتا ہے اور پھر اس طرح وہ عامل اس کے زیر اثر اذیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور یہی حالت اس وقت رولوکا کی تھی کیونکہ رولوکا کا بھیجا ہوا عمل آگے کو بڑھنے سے قاصر تھا اس نے وہ عمل رولوکا کے گرد منڈلا رہا تھا جس کی وجہ سے رولوکا کی حالت غیر سے غیر ہوتی جا رہی تھی۔

ادھر پہاڑ کے اوپر رولوکا کے کارندوں نے مل کر ایک ساتھ شنکر داس پر حملہ کیا اور حملہ اتنا زوردار تھا کہ شنکر داس بوکھلا گیا ایک پل کے لئے۔

اور یہی وہ پل تھا رولوکا کے لئے ...... رولوکا ناقابل برداشت اذیت سے متاثر ہو کر پہاڑ کے اندر جہاں کہ موجود تھا...... اس جگہ بے سدھ ہو کر گر پڑا اور بالکل ساکت ہو گیا جیسے کہ اس کی روح قفس عنصری سے پرواز کر گئی ہو۔

اچانک شنکر داس کو ایک زبردست جھٹکا لگا۔ کیونکہ اوپر سے نیچے کو (جہاں کہ رولوکا موجود تھا) آتے آتے منتر یکدم رک گیا اس لئے کہ وہ منتر جو کہ اپنے ہدف کو نشانہ بنانے کے لئے نیچے کو لپکا تھا، اب اس کا ہدف اندر موجود نہ تھا۔

کیونکہ رولوکا نے پہلے ہی پورے پہاڑ کے اندر اپنا حصار قائم کر دیا تھا۔

پھر شنکر داس کے منہ سے نکلا۔ ''مورکھ تو نے مجھے کمزور سمجھا تھا دیکھ لیا اپنا انجام...... اب تیرا وجود ختم ہوا...... اور ساتھ ہی ساتھ میں امر ہو گیا ...... کیونکہ اب تیری شکل میں میرا دشمن اپنے انجام کو پہنچ گیا۔''

پھر اچانک شنکر داس کے دماغ میں آیا کہ ایسا تو نہیں کہ مورکھ نے مجھ سے کوئی چھل کیا ہو، لہٰذا مجھے کچھ وقت تک اس زمانہ پر موجود رہنا چاہئے ویسے تو میں نے اپنے منتروں سے اوپر اور نیچے کے دونوں کھلے راستوں کو کنڈل کے ذریعے بند کر دیا ہے اور لاکھ کوشش کے باوجود بھی اندر قید رولوکا باہر نکل نہیں سکتا ...... خیر اب تو باہر نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ...... مورکھ نے تو اپنا وجود ہمیشہ ہمیشہ کے لئے کھو بیٹھا ہے۔

اس نے میرے ہی نہیں بلکہ مجھ جیسے بے شمار عاملوں کے بیروں کا خاتمہ کیا، اور یہی نہیں بلکہ بہت سارے جنتر منتر کرنے والے بھی اس کی ذات کی وجہ سے اپنے بھیانک انجام کو پہنچے۔

''ہاہا ...... ہاہاہا...... میں شکتی شالی ہوں ...... کوئی میری طاقت کا نہیں ...... کوئی میرا مقابلہ نہیں کر سکتا، میں ہی مہا شکتی والا ہوں ...... کیونکہ میرے ہاتھوں مورکھ رولوکا کا خاتمہ ہو گیا۔'' اور پھر وہ خوشی سے جیسے ناچنے لگا اس کی خوشی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔

اس کے منہ سے نکلا۔ ''مورکھ رولوکا تو نے میرے مہابیر ہمنا کے ساتھ اچھا نہیں کیا میری برسوں کی تپسیا نشٹ کر دی ...... تو نے ہمنا کو مجھ سے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے دور کر دیا ...... اور پھر تو نے دیکھ لیا اپنا انجام۔'' اس کے بعد وہ مزید قہقہہ لگانے لگا۔

☆......☆......☆

اس پہاڑ سے جہاں کہ شنکر داس براجمان تھا کئی میل دور زمین کی تہہ سے اچانک تیز روشنی کی ایک لکیر نکلی اور آناً فاناً اس پہاڑ کی جانب بڑھنے لگی جہاں کہ شنکر داس خوشیوں سے سرشار قہقہے لگا رہا تھا۔

پلک جھپکتے وہ روشنی پہاڑ کے نزدیک پہنچی اور پہاڑ کے چاروں طرف گردش کرنے لگی اور پھر پہاڑ کے چاروں طرف روشنی کا ایک ہالہ سا بن گیا۔

جب پورا پہاڑ روشنی کے ہالہ میں گھر گیا تو اچانک جیسے شنکر داس کو ہوش آیا اور اس کی دونوں آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

شنکر داس کف افسوس ملنے لگا، اس کی خوشیوں پر جیسے اوس پڑ گئی اسکے ہوش ٹھکانے نہ رہے وہ اپنی جگہ حواس باختہ ہو گیا وہ لمبے لمبے سانس لینے لگا، اس کی آنکھیں جیسے پتھرا کر رہ گئیں، وہ اپنی ساری چوکڑی بھول چکا تھا، وہ تصور بھی نہیں کر سکتا تھا کہ پلک جھپکتے آناً فاناً اس کی خوشیاں ملیامیٹ ہو کر رہ جائیں گی، اپنی

ذات کو شکتی شالی کروانے والا بے بس و مجبور ہو کر رہ جائے گا خود کو امر سمجھنے والا یاس و محرومی کے پہاڑ تلے دب کر رہ جائے گا۔

اور ایسا ہو گیا تھا۔

اب اس کا اپنا وجود ملیا میٹ ہوتا نظر آ رہا تھا۔

اس نے تو رولوکا کا خاتمہ کر دیا تھا۔

مگر خود کے ساتھ کیا ہونے والا تھا، اس سے وہ بالکل بے خبر ہو کر رہ گیا تھا وہ بھول گیا تھا کہ ہر سیر پر سوا سیر بھی ہوتا ہے۔

دوسروں کو اذیت دینے والا دوسروں کی خوشیوں کو ملیا میٹ کرنے والا وقت کے ہاتھوں مجبور ہو کر کہیں کا نہیں رہتا، ہمیشہ برے کا انجام برا ہوتا ہے اور برا کرنے والے جب اذیت کے شکنجے میں جکڑے جاتے ہیں تو ان کے سکھ شانتی کا کوئی راستہ نہیں بچتا اور یہی کچھ اب شنکر داس کے ساتھ ہونے والا تھا۔

اب شنکر داس کے لئے بچاؤ اور فرار کے سارے راستے مسدود ہو کر رہ گئے تھے اب اس کے دماغ میں صرف اور صرف ایک ہی بات تھی کہ میں کسی طرح یہاں سے فرار ہو جاؤں۔ اب اس کا جنتر منتر اس کا ساتھ نہیں دے رہا تھا وہ بڑے سے بڑا منتر با بلند آواز پڑھ پڑھ کر اپنے چاروں کرد پھونکنے لگا تھا مگر بے سود، اس کا ہر منتر بے کار ہو رہا تھا۔

اب وہ نئی مصیبت میں گرفتار ہو گیا تھا، چند پل پہلے خوشیاں منانے والا اب مگر مچھ کے آنسو بہا رہا تھا. ایک خیال اس کے دماغ میں آیا کہ ”کیوں نہ میں پہاڑ کے دہانہ پر موجود کنڈل کو توڑ دوں اور میں خود اب پہاڑ کے اندر داخل ہو جاؤں۔

اندر تو رولوکا اب موجود نہیں رہا کیونکہ اس کا تو خاتمہ ہو چکا ہے۔“ اس سوچ کے آتے ہی اس نے فوراً اپنا قائم کنڈل توڑ دیا۔

مگر یہ کیا اس کے کنڈل کے نیچے رولوکا کا قائم کردہ حصار موجود تھا کیونکہ اندرونی طور پر رولوکا نے بھی اپنا ایک حصار قائم کر دیا تھا۔

یہ دیکھ کر شنکر داس اور زیادہ پریشان ہو گیا۔

کیونکہ وہ دیکھ چکا تھا کہ پہاڑ کے گرد قائم روشنی کا ہالہ آہستہ آہستہ سکڑتا جا رہا تھا یعنی اس روشنی کا گھیرا کم سے کم ہوتا جا رہا تھا جو کہ شنکر داس کی ذات کے لئے اچھا نہیں تھا۔

اب شنکر داس کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی، اس نے اپنے منتروں کے ذریعے اپنے بڑے بڑے بیروں کو آواز دی مگر کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں آیا، پھر اس نے اپنے مہا گرو کو آواز دی مگر بے سود مہا گرو کی طرف سے بھی کوئی جواب موصول نہیں ہوا۔

اور یہ دیکھ کر وہ اپنا سر پیٹنے لگا۔ اب اسے احساس ہو گیا تھا کہ واقعی ہر سیر پر سوا سیر ہوتا ہے۔

جوں جوں روشنی کا ہالہ سکڑتا جا رہا تھا یعنی اس کا گھیرا یا پھیلاؤ کم ہو رہا تھا ویسے ویسے شنکر داس کی پریشانیوں میں اضافہ ہو رہا تھا۔

پھر ایک وقت آیا کہ روشنی کا وہ ہالہ سکڑ کر شنکر داس کے بالکل قریب آ گیا تو شنکر داس کو اپنی موت یقینی نظر آنے لگی۔

وہ بدحواس ہو کر اپنا سر پیٹتے ہوئے چیخنے لگا ”ارے بچاؤ... بچاؤ... کوئی ہے جو میری مدد کو آئے... مہا گرو میری سہایتا کرو... میں آئندہ کسی کے ساتھ بھی انیائے نہیں کروں گا، گرو جی مجھے بچالو... گرو جی جلدی کرو... گرو... و... ج...“

اور پھر شنکر داس کی آواز اس کے حلق میں گھٹ کر رہ گئی۔

کیونکہ روشنی کا ہالہ سکڑ کر شنکر داس کو اپنے شکنجے میں جکڑ چکا تھا۔ شنکر داس کا جسم شعلوں میں گھر چکا تھا۔

اور چند لمحے میں ہی شنکر داس کا جسم جل کر راکھ ہو گیا۔

پھر ایک آواز سنائی دی۔ ”خس کم جہاں پاک۔“

اس آواز کو سنتے ہی رولوکا کے کارندوں میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی... کارندوں نے جان لیا تھا کہ یہ آواز یقیناً رولوکا کی ہے۔

پھر چشم زدن میں واقعی رولوکا نے اپنے کارندوں سے رابطہ کرلیا تھا۔

اب پتہ چلا کہ پہاڑ کے اندر قید رولوکا کا خاتمہ نہیں ہوا تھا۔

دراصل بات یہ تھی کہ جب رولوکا کو پکا یقین ہوگیا کہ اب میرا اس جگہ سے باہر نکلنا ممکن نہیں تو پھر تھک ہار کر اس نے اپنے استاد کا بتایا ہوا ایک خفیہ عمل پڑھا۔

دونوں کھلی جگہوں سے وہ کسی صورت بھی باہر نکل نہیں سکتا تھا۔

پھر رولوکا نے ایک عمل کے ذریعے اپنی ذات کا ایک ڈپلی کیٹ وجود بنایا اور اپنے ڈپلی کیٹ کو اپنی جگہ رکھ کر زمین کی گہرائی میں گھستا چلا گیا۔

زمین کے پاتال میں پہنچ کر اس نے اپنا رخ ایک طرف کو کیا اور پھر بڑی تیزی سے اس طرف بڑھتا چلا گیا جب اسے معلوم ہوگیا کہ میں کئی میل دور پہاڑ سے آگے نکل آیا ہوں تو پھر اس نے پاتال سے زمین کے اوپر نکلنے لگا، اور وہ اس منصوبے میں کامیاب رہا۔

ادھر شنکرداس اپنی خوشی کی کامیابی میں اپنے اردگرد سے بے خبر ہو چکا تھا۔ رولوکا روشنی کی صورت میں زمین سے باہر نکلا اور آناً فاناً پہاڑ کی جانب بڑھنے لگا اور پھر ایک مقررہ حد تک آنے کے بعد پہاڑ کے چاروں گرد اپنا ایک مضبوط ناقابل تسخیر حصار قائم کردیا تو اس طرح شنکرداس اس حصار میں قید ہوگیا۔

اور جب شنکرداس کو ہوش آیا تھا تو اس وقت تک دیر ہو چکی تھی۔

اور پھر پلک جھپکتے میں ''اپنے دام میں صیاد آ گیا۔'' شنکرداس کا خاتمہ ہوگیا اس کا وجود جل کر خاک ہوگیا شنکرداس کے عبرتناک انجام کے بعد رولوکا سیدھا خلیق الزماں کی حویلی میں پہنچا۔

اس وقت رات کا پہر تھا یہی کوئی رات کے بارہ کا وقت ہوگا۔

رولوکا حویلی کی چھت پر پہنچا اور خلیق الزماں کے دماغ سے رابطہ کیا اور انہیں حکم دیا کہ ''خلیق الزماں صاحب آپ جلد از جلد حویلی کی چھت پر آ ئیں۔''

ایسا ہوتا تھا کہ خلیق الزماں صاحب اپنے بستر سے اٹھے اور چپل پہن کر کمرے سے نکل گئے۔

ان کی بیگم نے سمجھ کہ شاید غسل خانہ میں جا رہے ہیں۔

خلیق الزماں ٹرانس کی حالت میں حویلی کی چھت پر پہنچے اور پھر رولوکا کے سامنے جا کر کھڑے ہو گئے، تو ان کی ذہنی کیفیت بحال ہوگئی۔

اپنے سامنے حویلی کی چھت پر رولوکا کو دیکھ کر اچنبھے میں پڑ گئے۔ ان کے منہ سے نکلا۔ ''حکیم صاحب آپ اور اس وقت یہاں...... اور پھر آپ نے کیسے؟......''

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ''خلیق الزماں صاحب دراصل میں آپ کے ہی کام میں مصروف رہا اور اس وقت، وقت ملا۔ خیر آپ گھبرائیں نہیں، میں کیسے اور کیوں کر آیا ہوں...... اس معاملے میں نہ پڑیں بلکہ میری بات غور سے سنیں۔

ایک تو میری آمد کے بارے میں کسی اور سے ذکر نہ کیجئے گا اور اصل بات یہ ہے کہ میں کل شام کے وقت آؤں گا یعنی مغرب کے بعد۔

آپ اپنے تمام اہل خانہ کو حویلی کے بڑے ہال میں جمع کرنا۔ اسی جگہ سب کے سامنے حویلی کی بربادی، تباہی اور جانی نقصانات کا اصل معاملہ کھل کر واضح ہو جائے گا۔

حقیقت سے پردہ اٹھنے پر اپنے اندر حوصلہ رکھے گا اور جو حقیقت ہے وہ تو سامنے آ کر رہے گا۔ اچھا اب میں چلتا ہوں، آپ آرام سکون سے جا کر سو جائیں۔''

خلیق الزماں بولے۔ ''حکیم صاحب آپ اتنی رات گئے کس طرح واپس جائیں گے، اگر مناسب سمجھیں تو میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں، ڈرائیور آپ کو چھوڑ

آئے گا۔''

خلیق الزماں کی بات سن کر رولوکا بولا۔''آپ اس کی فکر نہ کریں، میں جس طرح آیا ہوں۔۔۔۔اسی طرح واپس بھی چلا جاؤں گا، اب آپ جا کر آرام کریں۔''

رولوکا کی بات سن کر خلیق الزماں خاموشی سے چھت سے نیچے اتر گئے اور خراماں خراماں چلتے ہوئے اپنے کمرے میں آ کر بستر پر دراز ہو گئے۔

رولوکا واپس آ کر حکیم وقار کے مطب میں اپنے کمرے میں آرام کرنے لگا۔

صبح ہوئی اور پھر وقت گزرتے گزرتے شام ہو گئی۔

رولوکا وقت مقررہ پر خلیق الزماں کی حویلی سے کچھ دوری پر نمودار ہوا، اور چلتے چلتے حویلی کے گیٹ پر پہنچ گیا۔

حویلی کے مین گیٹ پر لٹھ بردار چوکیدار موجود تھا چوکیدار سے رولوکا ابھی باتیں ہی کر رہا تھا کہ اتنے میں خلیق الزماں وہاں پہنچے اور رولوکا سے بغلگیر ہوئے۔

پھر رولوکا لے کر حویلی میں داخل ہو گئے۔

مغرب کے بعد کا وقت تھا، ہر سو گہرا اندھیرا مسلط ہو چکا تھا خلیق الزماں نے رولوکا کو حسب منشاء ہال کمرے میں بٹھایا، اور پھر اس کے بعد ایک ایک کر کے سارے اہل خانہ آ کر ہال میں جمع ہو گئے۔

رولوکا خلیق الزماں سے مخاطب ہوا۔''کیا گھر کے سارے افراد ہال میں موجود ہیں؟''

خلیق الزماں بولے۔''جی سب حاضر ہیں۔''

اس کے بعد رولوکا کی آواز سنائی دی۔''محترم گھر کے سارے افراد اپنی اپنی جگہ خاموشی سے بیٹھے رہیں، کچھ بھی ہو جائے، کتنی ہی ڈراؤنی اور خوف ناک آوازیں آئیں کسی نے اپنی جگہ سے ہلنا نہیں ہے اور نہ ہی کسی صورت درمیان میں اپنی جگہ سے اٹھ کر کوئی باہر جائے۔

اور اگر کسی نے میری بات سے انحراف کیا تو وہ اپنی ذات کا خود ذمہ دار ہوگا۔ ایسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ اس کا جانی نقصان ہو جائے۔

میں کارروائی جیسے ہی شروع کروں گا تو خود بخود ہال میں روشن بلب بجھ جائے گا اور ہال میں مکمل اندھیرا چھا جائے گا۔'' پھر رولوکا خلیق الزماں سے مخاطب ہوا۔''خلیق الزماں صاحب کیا مجھے اجازت ہے کہ میں کارروائی شروع کروں۔''

خلیق الزماں بولے۔''حکیم صاحب اجازت ہے آپ کارروائی شروع کریں۔''

پھر رولوکا فرش پر بچھی دری پر آلتی پالتی مار کر بیٹھ گیا۔ رولوکا کو بیٹھے ابھی دو ڈھائی منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک ہال میں جلتے بلب یکدم بجھ گئے پورے ہال میں مکمل اندھیرا چھا گیا۔

ہر کوئی اپنی اپنی جگہ دم سادھے بیٹھا تھا اور آنے والے وقت کے متعلق سوچ رہا تھا کہ نہ جانے کیا ہو جائے۔ ہال میں اندھیرا ہوئے ابھی دو منٹ ہی ہوئے تھے کہ اچانک روشن دان سے زبردست ہوا کا جھونکا ہال میں داخل ہوا۔

پھر چند لمحے بعد ایک بھاری آواز سنائی دی۔''السلام علیکم۔''

اس کی آواز پر رولوکا نے جواب دیا۔''وعلیکم السلام۔''

پھر آواز آئی۔''عامل صاحب آپ کے بلانے پر میں حاضر ہوں۔''

اس آواز کا سننا تھا کہ تمام اہل خانہ اپنی اپنی جگہ چونک گئے اور خاص کر خلیق الزماں زیادہ چونکے تھے کیونکہ وہ آواز یقیناً جانی پہچانی تھی۔

رولوکا بولا۔''محترم آپ اپنا نام بتائیں۔''

''یہ سنتے ہی نادیدہ وجود کی آواز سنائی دی۔'' عامل صاحب میرا نام فہیم الزماں ہے۔''

اس آواز کا سننا تھا کہ تمام اہل خانہ اپنی اپنی جگہ دہل کر رہ گئے کیونکہ وہ آواز خلیق الزماں کے بڑے صاحبزادے فہیم الزماں کی تھی اور اب فہیم الزماں اس دنیا میں نہیں تھا۔

رہ وہ بولا۔ ''فہیم الزماں کیا آپ بتا سکتے ہیں کہ آپ کے ساتھ کیا حادثہ پیش آیا؟ کس کی وجہ سے آپ اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور ساتھ ہی یہ بھی بتائیں کہ حویلی میں قتل جو تین قتل ہوئے ان کے پیچھے کیا عوامل کارفرما رہے اور کیا کیا ہوا اور آپ کا کردار ان دنوں میں کب تک رہا ہے؟ امید ہے آپ تفصیل سے ساری باتوں پر روشنی ڈالیں گے۔'' اور یہ بول کر وہ خاموش ہو گیا۔

پھر فہیم الزماں کی آواز سنائی دی۔ ''جناب یہ خونی واقعہ یہاں سے شروع ہوتا ہے۔ ہمارے آباؤاجداد میں ریت رواج ہے کہ جو بڑا بیٹا ہوتا ہے وہی جدی جاگیر اور جدی سارے زمین و جائیداد کا مالک ہوتا ہے۔ اور یہی چیز ہمارے آباؤاجداد کے ساتھ ہوتی آئی۔ اب حضور اپنی جدی خود مختار ہیں تو یہ بات میری چچی کو ایک آنکھ نہ بھائی۔ چچی نے کئی مرتبہ چچا کے حضور اپنی دلی خواہش اور تشنہ زبان کا اظہار کیا کہ ''آپ تو غلام بن کر رہ گئے ہیں اور پھر آپ کے بعد ہماری اولاد بھی بڑے ہونے کے ناطے فہیم کے آگے ہمیشہ سرنگوں رہا کرے گی۔'' چچی کی بات سن کر چچا اکثر چچی کو ڈانٹ دیا کرتے تھے مگر کب تک۔

ایک دن چچا کے دماغ میں بھی یہ بات بیٹھ گئی کہ ''بیوی کہہ تو سچ رہی ہے تو کیوں نہ میں ایسا کوئی قدم اٹھاؤں کہ نہ بانس رہے اور نہ بانسری، میری اپنی اولاد غلام بن کر نہ رہے۔''

اور پھر اپنی اس خواہش کو چچا نے عملی جامہ پہنانے کے لئے اپنا منصوبہ مرتب کیا اور پھر اس پر ہفتوں غور کرتے رہے کیونکہ ان کا یہ منصوبہ ''خونی منصوبہ تھا۔''

پھر ایک اندھیری رات میں میرے سگے چچا سلیم الزماں نے اپنے چند کارندوں کی مدد سے مجھے اغوا کروالیا اور پھر میری زندگی کا خاتمہ کر کے میری لاش کو بڑے میدان کے عقب میں جو جھاڑیاں ہیں وہاں پر موجود برگد کے درخت کے نیچے گڑھا کھود کر اس میں دفنا دیا۔ اور اس خونی واردات کی کسی کو کانوں کان خبر نہ ہونے دی۔ جو کارندے اغوا اور جان لینے میں موث تھے ان لوگوں کو اچھی خاصی رقم دے دی۔

میری گمشدگی پر میرے والدین خون کے آنسو روتے رہے اور پھر وقت کے ساتھ ساتھ سب کو صبر آ گیا اور یہ خونی واقعہ کسی پر ظاہر نہیں ہوا۔

چونکہ چچی جان بھی اپنی جگہ بے چین تھیں کہ ابھی تو خلیق الزماں کا ایک چھوٹا بیٹا بھی موجود ہے اور پھر ریت رواج کے مطابق وہی مالک و مختار ہوگا تو کیوں نہ اسے راستے سے ہٹا دیا جائے اور ساتھ ہی خلیق الزماں ان کی بیوی اور بیٹی کا بھی خاتمہ ہو جائے تو پھر مزہ ہی مزہ۔''

اس کام کے لئے چچی اپنے میکے جانے لگیں اور پھر وہاں موجود پنڈت شنکر داس سے رابطہ کیا ایک بھاری رقم کے عوض۔

اور شنکر داس نے اپنے جادو منتر کا بازار گرم کر دیا تاکہ ہمارے والدین اور بھائی بہن کا خاتمہ ہو جائے۔

لیکن اس کے جادوئی راستے میں میری روح حائل ہوتی رہی اس طرح اس کا جادوئی عمل ہمارے گھر والوں پر اثر نہیں ہو سکا بلکہ چچی کے اپنے بیٹے اور بیٹیاں اس کا شکار ہوتی رہیں۔

جناب عامل! یہ ہے اس حویلی کے خونی منصوبے کی روداد۔

اور اب تو ویسے بھی شنکر داس کا خاتمہ عامل صاحب آپ کے ہاتھوں ہو گیا ہے۔

میں با حضور سے التجا کرتا ہوں کہ جو ہونا تھا وہ ہو گیا، ہو سکتا ہے کہ یہی میری قسمت ہو، میرا اسی طرح مرنا لکھا ہو۔

میری لاش کو نکلوا کر شریعت کے مطابق قبرستان میں دفن کر دیں تاکہ میں اپنی اصلی منزل پر پہنچ جاؤں۔

بس جو حقیقت ہے وہ میں نے بیان کر دی ہے ......اور ہاں عامل صاحب میں آپ کا بھی شکریہ ادا

کرتا ہوں کہ آپ نے حویلی سے خونی منتر کا خاتمہ کر کے دیگر دونوں کی جان بچا لی۔

ابا حضور، امی جان، بھائی، بہن اور دیگر میرے چچیرے بھائی بہن اب میں آپ لوگوں سے اجازت چاہتا ہوں اور التجا ہے کہ میرے حق میں دعائے مغفرت ضرور کر دیا کریں۔“

اور پھر آواز آنا بند ہو گئی۔

پھر اچانک ہال میں موجود بلب جل اٹھے تو سب نے دیکھا کہ سلیم الزماں کی بیگم اور خود سلیم الزماں اپنی اپنی جگہ فرش پر بے سدھ پڑے تھے حرکت قلب بند ہونے کی وجہ سے، ان کی روح قفس عنصری سے پرواز کر چکی تھی۔

لیکن بدقسمتی دونوں میاں بیوی کو ہونی تھی شاید وہ زندہ رہتے تو اپنی موت آپ مر جاتے۔

اتنے میں سلیم الزماں کے ساتھ بیٹھے نعیم الزماں کی آواز گونجی۔ ”تایا ابو، ہم دونوں بھائی بہن اپنے والدین کی ناقص سوچ کے لئے معذرت خواہ ہیں کاش کہ انہوں نے ایسا نہ سوچا ہوتا تو آج ان کی اپنی اور دونوں کی تلے نہ چلی جاتی۔

اب آپ ہمارے والد کی جگہ ہیں اور تائی اماں ماں کی جگہ ہیں۔

میں تاحیات خاندانی رسم و رواج کے تابع رہوں گا اور آنے والی نسلوں کو بھی خاندانی رسم و رواج کو قائم و دائم رکھنے کی تلقین کروں گا۔

میں چھوٹے بھائی رحیم الزماں کی عزت کرتا رہوں گا اور خاندانی رسم و رواج کے مطابق چونکہ بڑے بھائی نعیم الزماں تو اب ہم میں رہے نہیں تو میں ان کی بعد رحیم الزماں کو ہی اپنا بڑا سمجھتا رہوں گا۔ مجھے امید ہے کہ تایا ابو آپ ہمیں تہہ دل کے ساتھ معاف کر دیں گے۔“ اور یہ بول کر نعیم الزماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا اور اپنے والد کی لاش کے پاس بیٹھ گیا۔

خلیق الزماں آگے بڑھے اور نعیم الزماں کو کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور گلے سے لگا کر بولے۔ ”نعیم بیٹا جو ہو گیا اسے بھول جاؤ، میں اپنی ذات سے تاحیات کسی قسم کی کوئی کمی محسوس نہیں ہونے دوں گا۔ اب ہم لوگ سوائے صبر کے اور کیا کر سکتے ہیں۔

اب صبح ہونے کا انتظار کرنا ہے تاکہ صبح ہوتے ہی نعیم کی لاش نکلوا کر اور ان دونوں کی میت کو بھی کفن دفن کرنا ہے، ہم سب کو ان کی مغفرت کے لئے اللہ سے دعا کرنی ہے۔“

اس کے بعد خلیق الزماں رولوکا کی جانب متوجہ ہوئے اور پرنم آنکھوں سے رولوکا کا شکریہ ادا کیا اور ڈھیروں دعائیں دیں۔

اس کے بعد رولوکا نے مصافحہ کیا اور ہال کمرے سے باہر نکلا۔ رولوکا کے ساتھ خلیق الزماں بھی تھے حویلی کے مین گیٹ پر آ کر خلیق الزماں بولے۔ ”حکیم صاحب آپ کا یہ احسان میں تاحیات نہیں بھولوں گا اور آپ کے حق میں شب و روز دعا گو رہوں گا، میں ڈرائیور کو بلاتا ہوں تاکہ وہ آپ کو مطب تک چھوڑ دے۔“

یہ سن کر رولوکا بولا۔ ”خلیق صاحب آپ بالکل فکر نہ کریں، میں چلا جاؤں گا، میں کیسے جاؤں گا یہ بہت اہم معاملہ ہے، خیر آپ جائیں اور اہل خانہ کو صبر کی تلقین کریں اور مرنے والوں کے لئے دعائے مغفرت کریں۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔“ پھر رولوکا نے خلیق الزماں سے مصافحہ کیا اور ایک طرف کو چلنے لگا۔

حویلی سے تھوڑی دور جا کر رولوکا نے اپنی آنکھیں بند کیں اور حکیم وقار کے مطب کا تصور کیا تو پلک جھپکتے ہی اپنے کمرے میں موجود تھا۔

پھر رولوکا نے منہ ہاتھ دھویا اور ایک گلاس ٹھنڈا پانی پینے کے بعد بستر پر لیٹ کر گزرے حالات اور واقعات کے متعلق سوچنے لگا۔

(جاری ہے)

گل حیات

رضوان علی سومرو۔ کراچی

ایک ادھیڑ عمر شخص جو کہ تین صدیوں سے زندہ تھا اور اس کی زندگی کا راز جو کہ کسی کی سمجھ میں نہیں آ کے دے رہا تھا لیکن جب حقیقت سامنے آئی تو عقل دنگ رہ گئی اور پھر وہ راز

کیا یہ حقیقت ہے کوئی درخت بھی انسانی خون پر زندہ رہ سکتا ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

شام کے دھندلکے پھیل چکے تھے، روشنی تیزی سے اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی تھی، تھکا ہوا زرد سورج پورے دن کی مشقت کے بعد آرام کرنے کی خاطر غروب ہوتا جا رہا تھا۔ زمیش کے سامنے دور دور تک کسی آبادی کا نام و نشان نظر نہیں آ رہا تھا، وہ انتہائی پریشانی کے عالم میں اپنی نظریں دوڑا رہا تھا، دور دور تک اونچے نیچے پہاڑوں کا ایک اختتامی سلسلہ تھا، جس طرف سے وہ آ رہا تھا وہاں کے گاؤں والوں نے اس کی اگلی منزل کی نشاندہی کر دی تھی، گاؤں والوں کے مطابق اگر وہ راستہ نہ بھٹکا تو صبح تک کوئی آبادی مل جانی چاہئے، مگر ایسا لگتا تھا کہ پہاڑوں کی پیچ دار پتلی پگڈنڈیوں کی بھول بھلیوں میں وہ کہیں اور نکل آیا تھا، اب آگے بڑھتے ہوئے اندھیرے کے پیش نظر اس نے تاریکی چادر تان لی تھی۔

رمیش کا پورا نام ڈاکٹر رمیش دت تھا، اس نے ڈاکٹری کی ڈگری لے رکھی تھی، اس کا شمار ملک کے چوٹی کے سائنسدانوں میں ہوتا تھا۔ اس کی زندگی کی ایک ہی خواہش تھی، وہ چاہتا تھا کہ وہ سائنس کی دنیا میں کچھ ایسا کام کر جائے جس سے اس کا نام زندہ جاوید ہو جائے۔

وہ گزشتہ کئی سالوں سے ایک ایسی ریسرچ پر کام کر رہا تھا جس کا ہونا شاید ناممکن تھا۔ ہر وقت بلکہ ہر پل وہ اس میں جتا رہتا، اس لئے اس نے اپنا تمام عیش و آرام کو اپنی ریسرچ پر قربان کر دیا تھا۔ وہ اپنی ریسرچ کے سلسلے میں دنیا کے کئی ملک گھوم چکا تھا، مگر اسے کامیابی حاصل نہیں ہو رہی تھی، لیکن وہ مایوس نہیں تھا۔ ناممکنات کا لفظ رمیش کی ڈکشنری میں تھا ہی نہیں، بس وہ چاہتا تھا کہ مقصد پورا ہو جائے۔ انسانی فلاح کے لئے وہ کچھ ایسا کرنا چاہتا تھا جو آج تک کسی نے نہ کیا ہو۔

وہ چاہتا تھا کہ انسان بڑھاپے پر قابو پا لے۔ اس کے اعصاب زوال پذیر نہ ہوں، بلکہ انسان اپنی موت پر بھی قدرت حاصل کر لے۔

بڑھاپے پر قابو پانے کی سائنسی کوششوں سے وہ مطمئن نہ تھا، وہ چاہتا تھا کہ انسان کے قویٰ کمزور ہونے سے بچا سکے، وہ کوئی ایسی خاص جڑی بوٹی کی تلاش میں تھا لیکن اسے خود معلوم نہ تھا کہ وہ ایسی جڑی بوٹی کہاں سے ڈھونڈ پائے گا۔ خیر اس وقت وہ کسی آبادی کے آثار پانے میں مایوس ہو رہا تھا۔ پھر بھی اس وقت وہ ہمالیہ کے عظیم سلسلہ میں بھٹک رہا تھا۔

اندھیرا اس قدر بڑھ چکا تھا کہ ایک غلط قدم بھی اسے ہزاروں فٹ نیچے کھائی میں پہنچا سکتا تھا۔ وہ ٹارچ کی روشنی کے سہارے آہستہ آہستہ قدم اٹھاتا ہوا آگے کی طرف بڑھنے لگا۔

خنکی بڑھتی ہی جا رہی تھی، چھوٹے چھوٹے حشرات الارض اور پہاڑی مچھروں کی مشترکہ بھنبھناہٹ فضا میں گونج رہی تھیں اور شاید وہ رات کی آمد کا اعلان کر رہی تھیں، ہوا کی رفتار معمول کے مطابق بڑھ گئی تھی جو کہ آنے والی بارش کا واضح اشارہ تھا کہ کچھ لمحات کے بعد بارش شروع ہو جائے گی، لیکن اس کی طرح کی اذیت ناک راتیں رمیش کے لئے نئی نہ تھیں، ایسے ہی مواقع پر وہ اپنے سفر کو ملتوی کرنے کا سوچتا مگر شوق و تجسس اسے ان تمام تکلیفوں پر بھاری لگتا۔ قدم بہ قدم ایک پگڈنڈی سے دوسری پگڈنڈی پر بھٹکتے بھٹکتے اس کے پاؤں شل ہو چکے تھے مگر ابھی بھی آبادی کا نام و نشان نہ تھا۔

اس نے ایک موڑ کاٹا تو مسرت و انبساط کی ایک لہر اس کے اندر دوڑ گئی۔ دور دھلان کے نیچے مدھم سی روشنی نظر آنے لگی تھی۔ روشنی دیکھ کر اس کی رفتار تیز ہو گئی اور پھر وہ روشنی قریب سے قریب تر آتی گئی۔ جب وہ قریب پہنچا تو دیکھا کہ چند مکانوں پر مشتمل وہ چھوٹی سی آبادی تھی، سارے مکان اندھیرے میں ڈوبے ہوئے تھے، ماسوا ایک مکان کے جس میں روشنی نظر آ رہی تھی۔

رمیش سوچ میں پڑ گیا کہ سارے لوگ اپنے اپنے مکانات چھوڑ کر کہاں چلے گئے۔ مکانوں میں اس طرح کی خاموشی جیسے وہاں موت کا بسیا تک راج ہو۔

رمیش کو سناٹا غیر فطری سا محسوس ہوا۔ ماحول میں اس کو عجیب سی گھٹن محسوس ہوئی، وہ کسی بھی مکان پر دستک دیئے بغیر اس مکان کی جانب چل پڑا، جہاں سے روشنی آ رہی تھی۔

وہ مکان بہت ہی عجیب سا تھا، اس مکان سے تھوڑا ہٹ کر ایک بڑا سا درخت نظر آ رہا تھا جو کہ رات کے اندھیرے میں انتہائی مہیب اور خوفناک نظر آ رہا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی عفریت ہاتھ پھیلائے کھڑا ہو، درخت کی شاخیں کافی لمبی اور ارد گرد پھیلی پڑی تھیں، رمیش چند لمحے تک کھڑا اس درخت کو دیکھتا رہا، جیسے جیسے اس درخت کو وہ دیکھتا رہا تو نہ جانے کیوں اس کے دل میں خوف و دہشت کے جذبات پیدا ہونے لگے تھے یہ احساس انتہائی شدید اور قوی تھا

اس نے اس احساس سے پیچھا چھڑانے کے لئے آگے بڑھ کر دروازے پر دستک دے دی، دروازہ ایک

جھٹکے سے کھل گیا اور وہ چونک کر پیچھے ہٹ گیا۔

دروازے پر ایک سفید ریش بوڑھا کھڑا تھا۔ اس کی پشت روشنی کی طرف تھی، اس لئے رمیش اس کا چہرہ نہ دیکھ سکا۔

''اندر آجاؤ اجنبی....'' بوڑھے نے سرسراتی ہوئی آواز میں کہا۔

بوڑھے کی آواز سن کر رمیش کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسنی سی دوڑ گئی۔ کیونکہ رمیش کو اس کی آواز کسی بھوکے کتے کی غراہٹ سے مشابہ محسوس ہوئی۔ ''میرا نام رمیش ہے۔'' رمیش نے اندر داخل ہوتے ہوئے اپنا تعارف کروایا۔ سیاحت میرا شوق ہے.... جو کہ اس وقت مجھے آپ کے در دولت پر لے آیا ہے۔''

''میں بخوبی اندازہ لگا سکتا ہوں....'' بوڑھے نے سرد لہجے میں کہا۔

اب بوڑھا روشنی کی زد میں تھا، بوڑھے کا چہرہ دیکھ کر رمیش خوف سے کانپ اٹھا، دہشت کی سرد لہر اسے اپنے اندر دوڑتی ہوئی محسوس ہوئی۔

بوڑھے کی عمر کسی بھی طرح 100 سال سے کم نہ تھی، اس عمر میں بھی وہ انتہائی چاق و چوبند نظر آرہا تھا، اس کا قد 7 فٹ سے کم نہ تھا۔ اور داڑھی کے بال برف کے گالوں کی طرح سفید ہوچکے تھے۔ آنکھیں چھوٹی چھوٹی اندر کو دھنسی ہوئی تھیں جن میں جوانوں والی چمک موجود تھی، ناک طوطے کی طرح آگے کی طرف مڑی ہوئی اور اس کے ہونٹ انتہائی موٹے موٹے اور قدرے سرخ تھے، اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر رمیش کو خون آشام ڈریکولا یاد آگیا تھا۔''

''تم یقیناً تھکے ہوئے ہو.... اور شاید بھوکے بھی....'' وہ مسکرا کر بولا۔

''بھوک کا انتظام تو میرے پاس بھی ہے....'' رمیش نے اپنی کمر سے لٹکے ہوئے بیگ کی طرف اشارہ کیا۔

''پھر کیا چاہئے؟''

''صرف ایک رات کی پرسکون نیند....'' رمیش افسردہ لہجے میں بولا۔

''تم میرے مہمان ہو.... اور اشام اپنے مہمانوں کا خیال رکھنا اپنا فرض سمجھتا ہے.... تم ٹھہرو میں کچھ لاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہوا کمرے سے باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے بعد رمیش سوچ میں پڑ گیا کہ 100 سال کی عمر کا یہ بوڑھا تا حال کتنا پھرتیلا اور چاق و چوبند ہے۔ اسے اپنی ریسرچ یاد آ گئی۔ جو کہ اسی سلسلے میں تھی۔ ''بوڑھے حضرات کے اعصاب کو شکستہ ہونے سے بچایا جائے، بڑھاپے پر قابو پایا جائے اور موت کو روکا جاسکے۔''

وہ بوڑھے سے اس سلسلے میں بات کرے گا تاکہ وہ وجوہات جان سکے جس کی بدولت وہ انتہائی چاق و چوبند ہے۔ اس نے سوچا۔

کچھ ہی لمحات کے بعد وہ بوڑھا اندر داخل ہوا تو اس کے ہاتھ میں سیاہ رنگ کا ایک پیالہ تھا جس میں سرخ رنگ کا کوئی مشروب تھا۔ ''تم اس کے ذائقے سے مانوس نہیں ہوگے....'' بوڑھا بولا۔

''یہ کیا ہے....؟'' رمیش نے پیالے کی طرف اشارہ کیا۔

''یہ بہت مقوی مشروب ہے.... جس سے ہر طرح کی بیماری، تھکن، اعصابی کمزوری دور ہوجاتی ہے....''

رمیش نے پیالے کو ہاتھ میں لیا، اسے مشروب سے انتہائی عجیب سی مہک محسوس ہوئی.... پھر بھی اس نے ہمت کرکے آہستہ آہستہ وہ مشروب پینا شروع کردیا.... مشروب کا ذائقہ نہایت ہی کسیلا تھا۔

واقعی کچھ ہی منٹوں میں رمیش نے اپنے اندر ایک نئی توانائی دوڑتی ہوئی محسوس کی اور ساری تھکن و سستی تیزی سے ناپید ہوتی چلی گئی۔

''یہاں کا ماحول بہت ہی عجیب ہے....'' رمیش بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔

''رات زیادہ ہوچکی ہے، اب تم کو سوجانا

جب اسے ہوش آیا تو درخت کی ٹہنیاں اس کے پاس تک پہنچی تھیں، کھڑکی سے آسمان پر پھیلی ہوئی سرخی نظر آرہی تھی، وہ صبح کی شفق تھی یا غروب آفتاب کا منظر اس کے لئے اندازہ لگانا مشکل تھا، اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن وہ چکرا کر رہ گیا کیونکہ بے انتہا کمزوری کے سبب اس سے اٹھا بھی نہیں جا رہا تھا۔

رات کے تمام واقعات ایک ایک کرکے ذہن کے پردے پر ناچنے لگے تھے، اس نے گھبرا کر آنکھیں کھول دیں، کھڑکی سے باہر موجود درخت بے پروائی سے جھوم رہا تھا۔

رمیش زندگی میں پہلی بار کوئی اس طرح کا درخت دیکھ رہا تھا، جو کہ انسانی خون بے حد شوق سے پیتا ہو۔

وہ درخت دوسرے تمام درختوں سے قطعی مختلف تھا۔ وہ عجیب طرح کا تھا۔

رمیش شاید بہت زیادہ ہی سخت جان تھا کہ رات بھر درخت اس کا خون چوستا رہا پھر بھی وہ زندہ تھا۔

اب درخت کی چھتنار شاخوں پر سرخ سرخ پھول نظر آرہے تھے جو کہ انتہائی بے ہنگم اور بھدے سے تھے۔

رمیش اندازہ کر چکا تھا کہ درخت کی ٹہنیاں رات کو خون کی بو پر چلتی ہیں، بالکل کسی ماہر شکاری کی طرح اور اپنے شکار کو جکڑ لیتی ہیں۔

دفعتاً رمیش کی نظر اس بوڑھے پر پڑی جو کہ اس درخت کے سامنے ایسے جھکا ہوا تھا جیسے کہ اس کی پوجا کر رہا ہو۔ تھوڑی دیر تک جھکے رہنے کے بعد اس بوڑھے نے درخت پر کھلے سارے پھول توڑ لئے اور بڑی عقیدت سے انہیں آنکھوں سے لگایا۔ شاید وہ بوڑھا اس درخت کا پجاری تھا، بوڑھے نے سارے پھول ایک ٹوکری میں رکھ لئے تھے۔

رمیش نے گھبرا کر آنکھیں بند کرلیں۔

دفعتاً رمیش کو آہٹ سی محسوس ہوئی تو اس نے آنکھیں کھول دیں، اس کے سامنے بوڑھا کھڑا اپنی تیز نظروں سے اس کو گھور رہا تھا۔

عقل

☆ عقلمند کے لئے اشارہ ہی کافی ہوتا ہے۔

☆ عقلمند آدمی دوسروں کی مشکلات سے اندازہ لگاتا ہے کہ اسے کن باتوں سے بچنا چاہئے۔

☆ عقلمند آدمی تمام انڈے ایک ہی ٹوکری میں نہیں ڈالتا۔

☆ عقلمند وہ ہے جو سوائے ذکر حق کے کسی کو دوست نہ رکھتا ہو۔

☆ عقلمند اس وقت تک نہیں بولتا جب تک کہ خاموشی نہیں ہوجاتی۔

☆ عقلمند قانون دان خود کبھی قانون کا دروازہ نہیں کھٹکھٹاتا۔

☆ ہر انسان اپنی عقل کو بڑا سمجھتا ہے اور اپنے بچے کو خوب صورت۔

☆ عقلمند وہ ہے جو اپنی زبان کو دوسروں کی مذمت سے بچائے رکھے۔

☆ عقلمند وہ ہے جو اپنے افعال کی تکمیل نیک کرتا ہے۔

☆ اگر آپ عقلمند بننا چاہتے ہیں تو اپنی زبان کو قابو میں رکھیں۔

(انتخاب: رانا حبیب الرحمن۔ سینٹرل جیل لاہور)

''کافی سخت جان ہو۔۔۔'' بوڑھا نخوت سے میں غرایا۔

رمیش کو اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سرسراہٹ محسوس ہوئی۔

''تم۔۔۔ کون ہو۔۔۔ تم؟'' رمیش شدید کمزوری اور نقاہت کے باوجود بولا۔

''میں۔۔۔ ہا ہا ہا۔۔۔ میں پجاری ہوں اس مقدس درخت کا پجاری۔'' وہ پاگلوں کی طرح ہنس کر بولا۔

''تم۔۔۔ مجھے چھوڑ دو۔۔۔'' رمیش گڑگڑا کر بولا۔

بوڑھے نے رمیش کی بات کا جواب دیئے بغیر اسے کسی بچے کی طرح اٹھا کر کندھے پر ڈال لیا اور اسے اپنی بیٹھک میں لے آیا۔ مختصر سا کمرہ جس میں ضروری فرنیچر موجود تھا، کمرے کے درمیان میں ایک ستون کھڑا تھا جو کہ چھت کو سہارا دیے ہوئے تھا۔ بوڑھے نے رمیش کو ستون کے سہارے زنجیروں سے باندھ دیا۔ رمیش چپ چاپ بے بسی سے اسے دیکھتا رہا۔

کمرے کے دوسرے کونے میں میز پر ایک ٹوکری رکھی تھی جس میں اس بوڑھے درخت سے اتارے ہوئے پھول رکھے تھے، اس قسم کے پھول رمیش نے پہلے کبھی نہیں دیکھے تھے۔ بوڑھے نے اس ٹوکری سے ایک پھول اٹھایا، اسے سونگھتے ہوئے بولا۔ ''جانتے ہو۔۔۔ یہ کیا ہے؟''

''نہیں۔۔۔'' رمیش نقاہت سے بولا۔

''انہیں۔۔۔ میں گل حیات کہتا ہوں۔۔۔''

''اس میں تمہارا خون ہے۔۔۔ جو اس درخت نے چوسا تھا۔''

''میرا خون۔۔۔!!'' رمیش حیرت زدہ لہجے میں بولا۔

''ہاں۔۔۔ یہ زندگی کی علامت ہیں ان کی پرورش خون پر ہوتی ہے۔۔۔ یہ اسی درخت کے پھول ہیں۔۔۔ وہ درخت کئی صدیوں سے زندہ ہے۔۔۔ اور نہ جانے کتنی صدیوں تک رہے گا۔۔۔ پھولوں کی جس قدر مقدار تم دیکھ رہے ہو۔۔۔ یہ میرے لئے 10 سال تک کے لئے کافی ہیں۔۔۔ میں شکار پھانس کر لانے کی کئی سالوں کی جدوجہد سے تنگ آ گیا ہوں۔۔۔'' بوڑھے نے پھول واپس ٹوکری کے قریب رکھتے ہوئے کہا، وہ پھولوں کی مہک سے محظوظ ہو رہا تھا۔

٭٭٭

رمیش کو بوڑھے کی قید میں پڑے کافی ٹائم گزر گیا۔ وہ اپنے آپ کو کافی کمزور محسوس کرنے لگا تھا۔ وہ کمرہ جس میں ایک بھی کھڑکی نہ تھی، رمیش کی دنیا بن چکا تھا۔ وہ دن بدن سوکھتا جا رہا تھا اور کمزوری بڑھتی جا رہی تھی، پھر ایک دن وہ بوڑھا آیا تو اس کے ہاتھ میں وہی پیالہ تھا جسے اس نے بڑی بے دردی سے رمیش کے ہونٹوں سے لگا دیا۔

''یہ پیو۔۔۔ تمہارے لئے کسی آب حیات سے کم نہیں۔۔۔ یہ تمہاری زائل شدہ توانائی واپس لوٹا دے گا، ایک بار پھر تم اس درخت کی خوراک بنو گے۔۔۔ پھر دوبارہ سے پھول پیدا ہوں گے جو کہ میری زندگی کو مزید طوالت دیں گے۔'' بوڑھا قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔

''تم کون ہو؟'' ''یہ پھول کیسے ہیں؟'' رمیش کی بات سن کر بوڑھا مسکرایا۔

''تم پہلی بار میرے پاس آئے تھے۔۔۔ تم نے اس بستی کی بابت مجھ سے معلوم کیا تھا۔۔۔ تم ایک تجربے کے چکر میں غلطی سے اس بستی میں آ گئے تھے۔۔۔ دراصل اس بستی کے تمام مکین آہستہ آہستہ اس پیڑ کی بھینٹ چڑھ چکے ہیں۔۔۔ یہ درخت اور اس کے پھول زندگی کی علامت ہیں۔۔۔ میں بھی تمہاری طرح بڑھاپے پر قابو اور طویل العمری کے اسرار میں اس درخت کو پا سکا۔۔۔ اس درخت کی وجہ سے 300 سال سے موت مجھ سے دور ہے۔۔۔ اس درخت کے پھول انسانی خون میں مل کر ایسی غذا پیدا کرتے ہیں جو کہ انسان کے اعصاب کو مضبوط بناتی ہے بڑھاپے کی کمزوری دور کرتی ہے، موت کو روک دیتے ہیں۔

اب چند دنوں میں تم اس قابل ہو جاؤ گے کہ اس

درخت کی خوراک بن جاؤ اور پھر تمہاری موت میری زندگی بڑھا دے گی۔" بوڑھا قہقہہ لگاتے ہوا ہوا اور کمرے سے باہر چلا گیا۔

☆☆☆

انتہائی کمزوری کے باوجود بھی رمیش کو اپنی رگوں میں چیونٹیاں سی رینگتی ہوئی محسوس ہوئیں، موت کا تصور کس قدر بھیانک ہوتا ہے اس سے پہلے رمیش کو معلوم نہ تھا۔

دن گزرتے رہے صبح و شام موتی شروب بخور غذا رمیش کو ملتا رہا اور رمیش کی توانائی حیرت انگیز طور پر تیزی سے بحال ہوتی رہی۔

یہ بات حیرت انگیز تھی جس چیز پر وہ ریسرچ کر رہا تھا وہ جوہر اس پیڑ میں موجود تھا، سب سے انتہائی حیرت انگیز بات یہ تھی کہ بوڑھا تین سو سالوں سے زندہ اور صحت مند تھا۔

پندرہ دن کے بعد رمیش اس قابل ہوگیا تھا کہ وہ فرار ہونے کی جدوجہد کر سکے اور پھر اس نے پوری منصوبہ بندی کرلی، وہ بوڑھے کے آنے کا منتظر تھا کہ کب وہ آئے اور وہ اپنے فرار کی ترکیب کو عملی جامہ پہنا سکے۔

"آج کے بعد تم سورج نہیں دیکھ سکو گے۔" بوڑھے نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔

"میں سمجھا نہیں۔" رمیش نے تشویش بھرے لہجے میں کہا۔

"آج کی رات تمہاری آخری رات ہے۔ آج میں تمہیں اس مقدس پیڑ کی بھینٹ چڑھا دوں گا.... اس کے بعد وہ پھول کئی سالوں تک میری زندگی کو دوام بخشتے رہیں گے....." یہ کہہ کر بوڑھے نے رمیش کی زنجیریں کھول دیں تو رمیش جیسے اسی لمحے کا منتظر تھا، اس نے ایک زوردار لات بوڑھے کے پیٹ پر رسید کردی، لات کی ضرب اتنی شدید تھی کہ بوڑھا تیورا کر دور جا گرا۔

بوڑھے کی منحوس آنکھوں میں ابھرنے والی حیرت رمیش کے لئے باعث مسرت تھی رمیش کے لئے سکون کے لمحات نہایت مختصر تھے، بوڑھے کا جوابی وار انتہائی بھرپور اور کاری تھا گھونسے کی ضرب جبڑے پر کھا کر رمیش کو کمرے میں ہی سورج دکھائی دے گیا تھا۔ رمیش نے اپنے افسوس کرنے کا کوئی موقع نہ تھا، کیونکہ بوڑھے کے ہاتھ کسی مشین کی طرح رمیش پر چل رہے تھے۔

بوڑھا انتہائی پھرتیلا اور طاقتور تھا، چند لمحوں میں رمیش کو بے ہوش ہونے میں عافیت نظر آئی اور پھر بے ہوشی کی دلدل میں دھنستا چلا گیا۔

رمیش کو جب ہوش آیا تو اس نے اپنے آپ کو اسی پلنگ پر بندھا پایا، جس پر پہلی بار اس درخت نے حملہ کیا تھا، اس کے ہاتھ پاؤں رسی کی ڈوریوں سے کسے ہوئے تھے۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جارہی تھی، رمیش کا پورا جسم درد سے دکھ رہا تھا، خوف و وحشت کی فضا اس پر طاری ہوچکی تھی، کسی کھڑکی سے کچھ ہی لمحوں میں خونی درخت کی ٹہنیاں داخل ہونے والی تھیں۔ رمیش نے اپنے آپ کو آزاد کرانے کے لئے زور صرف کرنا شروع کردیا، زور لگانے اور رسیوں کی رگڑ سے اس کے جسم سے خون رسنے لگا، لیکن وہ زور لگاتا رہا یہاں تک کہ گرہ ڈھیلی ہونے لگی پھر اس کا ایک ہاتھ آزاد ہوگیا۔

اسی لمحے رمیش نے دیکھا، درخت کی ٹہنیاں آہستہ آہستہ آگے بڑھ رہی ہیں..... رمیش نے جلدی جلدی اپنے دوسرے ہاتھ کو آزاد کیا..... ٹہنیاں اندر داخل ہوچکی تھیں، رمیش نے چھلانگ لگا کر ان شیطانی ٹہنیوں سے اپنے آپ کو بچایا، دروازہ باہر سے بند تھا، رمیش نے دروازے پر زور آزمائی شروع کردی، اب ٹہنیوں کا رخ دروازے کی طرف تھا۔ جہاں رمیش کھڑا کسی بے بس چوپائے کی طرح ہانپ رہا تھا۔

رمیش اور ٹہنیوں کے درمیان آنکھ مچولی شروع ہوچکی تھیں، ماحول تصور سے کہیں زیادہ خوفناک ہوچکا تھا، کبھی رمیش ادھر بھاگتا، کبھی ادھر بھاگتا، رمیش بے

انتہا تک پہنچ چکا تھا اور پھر تجسس کی وجہ سے وہ دروازے سے پشت ٹیک کر کھڑا ہو گیا۔

دفعتاً دروازے پر آہٹ ہوئی بوڑھا شاید کمرے میں دھمک پہنچی اور دروازے پر زور آزمائی کا سبب جاننے آ رہا تھا اور کمرے میں خونی شاخیں رمیش کو جکڑنے کے لئے آہستہ آہستہ اس کی جانب بڑھ رہی تھیں۔

رمیش دروازے سے چپک کر کھڑا تھا مزید بھاگنے کی ہمت اس میں نہ تھی، اور پھر وہ لمحہ آیا کہ اس نے خود کو موت کے حوالے کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ بوڑھے نے دروازے پر ایک زوردار ٹکر ماری تو زوردار آواز سے دروازہ کھلا اور رمیش منہ کے بل نیچے گر کر بے سدھ ہو گیا۔

بوڑھا اس افتاد سے پریشان ہو گیا اور اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے دروازے سے اندر آ گیا اور وہی لمحہ خطرناک تھا۔

خونی شاخیں تیزی سے آگے بڑھ رہی تھیں۔ بوڑھا ان شاخوں کی گرفت میں آ گیا......

بوڑھے کے منہ سے نکلنے والی چیخ بڑی دلدوز تھی، شاخوں نے بڑی تیزی سے بوڑھے کو اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ بوڑھا مچل رہا تھا چلا رہا تھا...... شاخوں نے بوڑھے کو یوں لپیٹ لیا تھا جیسے کوئی اژدھا اپنے شکار کو اپنے جسمانی بل میں کس لیتا ہے۔ بوڑھے کی چیخیں اب مدھم ہو چکی تھیں۔

رمیش کو ہوش آیا تو بوڑھے کی لاش کمرے میں پڑی تھی، صبح کا اجالا ہر سو پھیل چکا تھا، قرب و جوار کی ہر شے واضح نظر آ رہی تھی کہ جب تک رمیش کی نظر درخت پر ٹک گئی، درخت پر لاتعداد سرخ سرخ پھول کھلے ہوئے تھے۔

پھر رمیش کو یہ بات سمجھنے میں دیر نہ لگی کہ بوڑھے کا خاتمہ اس درخت کے ذریعے ممکن تھا۔ رمیش کمرے سے نکلا اور درخت کے پاس پہنچا، درخت عجیب سرشاری کے عالم میں جھوم رہا تھا۔ رمیش نے تمام پھول چن لئے اور گھر کے اندر آ گیا، اس نے ایک پھول کو ہاتھ میں لے کر مسلا تو اس میں سے سرخ دودھ نکل کر اس [illegible] سونگھا تو اسے خون کی مہک محسوس ہوئی

اب رمیش سمجھ چکا تھا کہ بوڑھا جو شروب اسے پلاتا رہا تھا۔ وہ دراصل اسی درخت کے پھولوں کا رس ہوتا تھا، جس سے توانائی بحال ہوتی تھی

اور یہی وہ جوہر تھا جس کی اسے تلاش تھی، یہی اس کی ریسرچ تھی، لیکن اصل چیز جڑ تھا، جو انسانی خون چوس کر اس میں اپنا جوہر شامل کر دیتا تھا جو کہ طویل العمری کا راز تھا۔ انسانی توانائی بحال رہتی تھی اور بغیر کچھ کھائے پیئے آدمی طویل عرصہ تک چاق و چوبند اور توانا رہتا تھا۔

پھر رمیش ان پھولوں کو لئے گھر سے باہر آیا اور درخت کو تکنے لگا جو کہ تمام فکروں سے بے نیاز ہوئے ہوئے جھوم رہا تھا...... دفعتاً رمیش کے ہونٹوں پر بھیانک مکروہ مسکراہٹ دوڑ گئی اور وہ درخت کے سامنے جھک گیا، شاید وہ بھی بوڑھا شرام کی طرح ذہنی طور پر اس درخت کا پجاری بن چکا تھا، اور آتے دنوں میں بھولے بھٹکے انسانوں کا شکار کرنے کے لئے منصوبہ مرتب دے چکا تھا۔

رمیش درخت کے سامنے جھکا ہوا ہی تھا کہ اسے قدموں کی آہٹ سنائی دی اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے ایک نوجوان کھڑا نظر آیا، جو شکل سے انتہائی بے حال نظر آ رہا تھا، شاید تھکا ہوا بھی تھا۔

رمیش اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ اور بولا۔

''مدد چاہئے......''

نوجوان نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''آؤ...... میرے ساتھ......'' یہ کہہ کر رمیش نوجوان کا ہاتھ پکڑ کر گھر میں اندر کی جانب بڑھ گیا۔

رمیش یہی سوچ رہا تھا کہ اب یہ نوجوان اس درخت کا اگلا شکار ہوگا...... کیونکہ طویل العمری کا راز رمیش کے ہاتھ لگ چکا تھا۔

ظالم آتما

ملک فہیم ارشاد۔ وجکوٹ فیصل آباد

برابر بیٹھی خوبرو حسینہ گاڑی ڈرائیو کرتے نوجوان نے پوچھا کہ محترمہ آپ کا مشغلہ کیا ہے؟ یہ سن کر حسینہ بولی: "میرا مشغلہ لوگوں کا خون پینا ہے۔" جسے سن کر نوجوان نے قہقہہ لگایا اور پھر اچانک ایسا ہوا کہ

نادیدہ قوت کے انتقام کا ایک خوفناک واقعہ جو کہ پڑھنے والوں کو ڈرا کر رکھ دے گا

بارش زوروں سے برس رہی تھی اور آسمان سے چمکتی بجلی اور گرجتے بادل شاہدہ کو خوف زدہ کر رہے تھے، وہ تیز بارش اور گرجتے بادلوں سے بہت خوف زدہ ہو جاتی تھی۔ وہ ایک چھوٹا سا گھر تھا جس میں وہ رہتی تھی کچا مٹی کا فرش دو کمرے اور ایک چھوٹا سا آنگن تھا۔ اس کے بعد گھر کا داخلی اور بیرونی دروازہ تھا۔ باورچی خانے کا سامان اس نے اپنے کمرے میں ہی رکھا ہوا تھا جن کے سامان میں ایک چولہا، چند لکڑیاں اور کھانے پینے کے چند برتن تھے، شاہدہ کے کمرے میں ایک پیلے رنگ کا بلب روشن تھا اور اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کیا ہوا تھا۔

بارش، گرجتے بادل اور چمکتی بجلی تو اسے خوف زدہ کر رہے تھے لیکن ساتھ والے کمرے سے آنے والی پراسرار آوازیں اسے کچھ زیادہ ہی خوف زدہ کر رہی تھیں

وہ آوازیں ایسی تھیں جیسے دوسرے کمرے میں کوئی سرگوشیاں کر رہا ہو اور کبھی ایسا لگتا تھا جیسے کوئی زمین کھود رہا ہو، سرگوشیوں کی آواز پھر آنا بند ہوگئی تھی لیکن زمین کھودنے کی آواز کافی دیر سے آرہی تھی۔

خوف کے باعث شاردا کا دل بڑی تیزی سے دھک دھک کر رہا تھا اس کی اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اٹھ کر دوسرے کمرے میں جا کر دیکھے اس سے پہلے شاردا کو کبھی بھی دوسرے کمرے سے ایسی آوازیں سنائی نہیں دی تھیں۔

زمین کھودنے کی آواز تیز سے تر ہوتی جارہی تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے دوسرے کمرے میں کوئی زمین کو بڑی گہرائی تک کھود چکا ہو۔ ''ہے بھگوان ... یہ ... کک ... کیا ہو رہا ہے؟'' شاردا کے کانپتے ہونٹ ہلے۔

زمین کھودنے کی آواز تیز سے تیز ہوتی جارہی تھی پھر یکدم وہ آواز آنا بند ہوگئی، آواز آنا بند ہوئی تو شاردا کے دل کو کچھ تسلی ہوئی کہ یہ اس کا وہم تھا، اس کے تیز دھڑکتے دل کی رفتار بھی نارمل ہوگئی۔

اچانک شاردا کے کمرے کے دروازے پر زوردار دستک ہوئی ڈر کے باعث شاردا اپنی چارپائی پر زور سے اچھلی اور ہلکی سی چیخ اس کے منہ سے نہ چاہتے ہوئے بھی نکل پڑی۔

''ہے ... بھگوان ... یہ ... کیا ... ہو رہا ہے ...'' شاردا نے پریشان نگاہوں سے اوپر کی جانب دیکھا۔

دستک ایک مرتبہ پھر ہوئی انداز جارحانہ تھا اب خوف کے باعث شاردا کے جسم نے کانپنا شروع کر دیا تھا ... ''کک ... کون ہے ...'' آخر کار اس کے کانپتے ہوئے ہونٹ ہلے۔

''مم ... میں ہوں جی ایک مسافر اور راستہ بھٹک گیا ہوں ... کک ... کچھ دیر کے لئے پناہ چاہتا ہوں ...'' باہر سے ایک مردانہ کانپتی ہوئی آواز شاردا کے کانوں سے ٹکرائی۔

''مم ... مسافر ...'' شاردا بڑبڑائی۔

''... پرنتو ... آپ ... آپ اندر کیسے آئے؟''

''بھئی آپ کا باہر والا دروازہ کھلا ہوا تھا ... دروازہ کھلا دیکھ کر میں اندر چلا آیا کہ شاید اس مکان میں کوئی نہیں رہتا، پرنتو اس کمرے میں روشنی دیکھ کر مجھے لگا کہ اس کمرے میں کوئی ہے اس لئے میں نے دروازہ پہلے کھٹکھٹایا ... اور دیکھیں میرا اندازہ درست نکلا۔''

آخری جملہ باہر کھڑے آدمی نے شوخ لہجے میں ادا کیا تھا۔ ''اچھو ...'' اس آدمی کی باہر سے چھینک کی آواز سنائی دی۔ ''اچھا ... اب کرپا کر کے دروازے کو کھول دیں آپ نے میری چھینک تو سن ہی لی ہوگی اگر میں باہر زیادہ دیر کے لئے کھڑا رہا تو چھینکوں کا سیلاب آئے گا جو میری صحت کے لئے ناتلافی نقصان ہو سکتا ہے۔'' آخری جملہ باہر کھڑے آدمی نے مسکراتے ہوئے ادا کیا تھا۔ ساتھ ہی شاردا کو ایک مرتبہ پھر چھینک کی آواز سنائی دی۔

''پرنتو میں گھر میں اکیلی ہوں۔'' شاردا نے اپنی مجبوری بتائی۔

''تو کیا ہوا ... آپ چنتا نہ کریں میں ایک شادی شدہ مرد ہوں اور بھگوان نے مجھے ایک سندری پتنی دی ہے ... اس لئے آپ بالکل بھی اس چنتا نہ ہوں ... بارش رکتے ہی میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔'' باہر کھڑے آدمی نے کہا ساتھ ہی ایک مرتبہ پھر وہ چھینکا۔

''شاردا بت بنی کافی دیر دروازے کو گھورتی رہی۔''

''دیکھئے بھگوان کے لئے کرپا کیجیے اور دروازہ کھول دیں۔ چنتا نہ کریں میں ایسا ویسا نہیں ہوں ... بھگوان پر وشواس رکھیں اور دروازہ کھول دیں ... مم ... میری حالت بہت خراب ہو رہی ہے۔''

شاردا نے دھڑکتے دل کے ساتھ دروازہ کھول دیا۔ شاردا نے دیکھا باہر ایک خوبصورت نوجوان بارش میں بھیگ رہا تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا اس نے اپنے ہاتھ میں سفید رنگ کا پلاسٹک کا ایک تھیلا پکڑا

ہوا تھا۔ ”کیا میں... میں اندر آ سکتا ہوں؟“ اس نوجوان نے بظاہر اجازت چاہی۔

شاردا نے دروازے سے پیچھے ہٹ کر اندر آنے کی جگہ دی۔ ”جی... جی آئیے۔“

وہ نوجوان اندر آ گیا اور شاردا نے دروازہ بند کر دیا، نوجوان نے اپنا سفید رنگ کا تھیلا ایک طرف رکھا۔ ”کیا کوئی کپڑا مل سکتا ہے جس سے میں اپنے بال خشک کر سکوں؟“ نوجوان نے کہا تو شاردا نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے اسے ایک کپڑا دیا تو اس نے اپنے بال خشک کرنے کے بعد کپڑا واپس کر دیا اور خود کمرے میں رکھی دو چارپائیوں میں سے ایک پر بیٹھ گیا۔ ”...بھگوان آپ کا بھلا کرے... اگر آپ مجھے گھر میں پناہ نہ دیتیں تو میرا برا حال ہو جاتا تھا۔“ نوجوان نے مسکراتے ہوئے کہا۔

شاردا چپ چاپ دوپٹے کا پلو منہ میں لئے نوجوان کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ارے... آپ کھڑی کیوں ہیں... بیٹھیں ناں...“ نوجوان نے شاردا کی طرف دیکھتے ہوئے اپنے سامنے پڑی چارپائی کی طرف اشارہ کیا تو شاردا ہچکچاتے ہوئے چارپائی پر بیٹھ گئی۔

”ویسے میرا نام رمیش ہے...“ نوجوان نے اپنا نام بتانے کے بعد شاردا کی طرف ایسی نگاہوں سے دیکھا جیسے وہ شاردا کا نام جاننا چاہتا ہو لیکن اس معاملے میں رمیش کو ناکامی کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ جواباً شاردا خاموش رہی شاید وہ اپنا نام بتانا نہیں چاہتی تھی۔

”نام نہیں بتانا چاہتیں چلئے آپ کی مرضی... ویسے آپ کا دھنے واد کہ اکیلے ہوتے ہوئے بھی آپ نے میرے لئے اپنے گھر کا دروازہ کھولا۔“ رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”ویسے کیا آپ اس گھر میں اکیلی رہتی ہیں؟“ نوجوان نے پوچھا۔

”جی... جی...“ شاردا نے جواب دیا۔

”آپ کے ماتا پتا... کوئی بھائی بہن؟“ رمیش نے سوالیہ نگاہوں سے شاردا کی طرف دیکھا، رمیش کے اس سوال نے شاردا کی آنکھوں میں آنسو بھر دیئے۔

”میں اپنے ماتا پتا کی اکلوتی سنتان ہوں کئی سال ہو گئے ہیں ماتا پتا کا دیہانت ہوئے۔“ شاردا نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”شما چاہتا ہوں... میری بات کا مطلب ہرگز آپ کا دل دکھانا نہیں تھا...“ رمیش نے ندامت آمیز لہجے میں کہا۔

”کوئی بات نہیں اس میں دل دکھانے والی بات تو کوئی نہیں۔ حقیقت کو جھٹلایا نہیں جا سکتا...“ شاردا نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”ویسے آپ کافی بہادر ہیں... اکیلی ہی جیون کا سامنا کر رہی ہیں...“ رمیش نے تعریفانہ نگاہوں سے شاردا کی طرف دیکھا۔

”سمے کی ٹھوکریں انسان کو بہادر بنا دیتی ہیں“ شاردا نے کھوئے کھوئے لہجے میں جواب دیا۔

”یہ بات تو آپ نے بالکل ٹھیک کہی... سمے کی ٹھوکروں نے آپ کو اتنا بہادر بنا دیا ہے کہ آپ اپنے گھر کا بیرونی دروازہ بھی بند نہیں کرتیں۔“ رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”نہیں ایسی بات تو نہیں میں نے باہر کا دروازہ بند کیا تھا مگر پتہ نہیں وہ کیسے کھلا رہ گیا۔“ شاردا نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

”خیر ایسی کوئی بات نہیں بے دھیانی میں اکثر ایسا ہو جاتا ہے۔“ رمیش نے کہا۔

”آپ کے لئے دودھ گرم کروں؟...“ تھوڑی دیر بعد شاردا نے پوچھا۔

”ویسے موسم کی ضرورت ہے اور میں ویسے بھی بھیگا ہوا ہوں دودھ سے میرے جسم میں گرمائش آ جائے گی... ویسے بھی اندھے کو کیا چاہئے دو آنکھیں۔“ رمیش نے مسکراتے ہوئے کہا تو شاردا اپنی جگہ سے اٹھی اور مٹی کے چولہے کی طرف بڑھی، چولہے میں لکڑیاں رکھنے کے بعد ماچس کی تیلی سے آگ جلائی اور دودھ گرم کرنے کے بعد ایک پیالے میں ڈال

اور تیز بارش میں رہنا ہی مجھے پسند ہے۔“ امرتا نے بدستور مسکراتے ہوئے کہا۔

”ہاں یہ ضرور ہے کہ آپ کا گاڑی چلانا مجھے ضرور ڈرا رہا ہے اتنی تیز بارش میں اتنی تیز گاڑی چلانا ٹھیک نہیں، کوئی ایکسیڈنٹ بھی ہوسکتا ہے۔“

”اصل میں مجھے کسی جگہ جلدی پہنچنا ہے۔“ سنتوش نے وجہ بتائی۔

”جس طرح آپ گاڑی چلا رہے ہیں مجھے تو نہیں لگتا کہ آپ پہنچ جائیں گے؟ سنتوش جی اپنے نام کی طرح سنتوش رہیے۔ منزل پر پہنچنا نہ پہنچنے سے بہتر ہے۔“ امرتا نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ چنتا نہ کریں مجھے اپنی ڈرائیونگ پر پورا وشواس ہے۔“ سنتوش نے پختہ لہجے میں کہا۔

”اندھا وشواس ہی انسان کو لے ڈوبتا ہے سنتوش جی۔“ امرتا نے سنتوش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”انسان کو اپنے اوپر پورا وشواس ہونا چاہیے۔ امرتا جی تبھی تو انسان کچھ کرسکتا ہے۔ اگر انسان ڈرتا رہے تو وہ کچھ بھی نہیں کرسکتا سوائے ڈرنے کے۔“ سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا۔

”آپ کی بات سے میں پوری طرح متفق نہیں ہوں۔“ امرتا اس مرتبہ سنجیدگی سے بولی۔

”وہ کس کارن؟“ سنتوش نے پوچھا۔

”ڈر بھی ہونا چاہیے کیونکہ اندھا وشواس آدمی کو لے ڈوبتا ہے..... اسے اپنے آپ پر پورا وشواس ہوتا ہے اور اسی اندھے وشواس کے کارن گہرائی میں اترتا چلا جاتا ہے اور نتیجتاً وہ ڈوب جاتا ہے جبکہ جو آدمی دل میں خوف رکھتا ہے وہ اپنی حد تک رہتا، اپنی حد پار نہیں کرتا اور محفوظ رہتا ہے۔“ امرتا نے بظاہر سنتوش کو سمجھایا۔

اور پھر سنتوش نے صرف مسکرانے پر ہی اکتفا کیا یعنی وہ اس بارے میں مزید بحث نہیں کرنا چاہتا تھا۔

”ویسے آپ نے بتایا نہیں کہ آپ اتنی تیز بارش میں وہاں کھڑی کیا کررہی تھیں؟“ تھوڑی دیر کی خاموشی کے بعد سنتوش نے پوچھا۔

چھوٹی سی بات

انسان موت سے بھاگنے کی عمر بھر جستجو کرتا رہتا ہے اور جہنم سے بچنے کی تدبیر نہیں کرتا حالانکہ انسان جہنم سے بھاگنے کی تدبیر کرے تو اس سے بچ سکتا ہے۔

وہ جس موت سے بچنے کے لئے عمر بھر بھاگتا ہے وہ اس سے بچ نہیں سکتا..... اس لئے موت سے فرار کے بجائے جہنم سے فرار کی تدبیر کریں..... اس سے پہلے موت بھی آلے اور جہنم سے بھی چھٹکارے کے لئے دامن خالی ہو۔

دُکھ

اللہ تعالیٰ جس کو اپنا آپ یاد دلانا چاہتا ہے، اسے دکھ کا الیکٹرک شاک دے کر اپنی جانب متوجہ کرلیتا ہے، دکھ کی بھٹی سے نکل کر انسان دوسروں کے لئے نرم پڑ جاتا ہے، پھر اس سے نیک اعمال خود بخود اور بہ خوشی سرزد ہونے لگتے ہیں..... دکھ تو روحانیت کی سیڑھی ہے اس پر صابر و شاکر ہی چڑھ سکتے ہیں.....

(انتخاب: شرف الدین جیلانی۔ ٹنڈو الہ یار)

"میں نے آپ کو بتایا تو ہے۔"

"میں آپ سے مذاق نہیں کر رہا۔" سنتوش اس مرتبہ کافی سنجیدہ تھا۔

"تو میں کون سا مذاق کر رہی ہوں، میں پہلے بھی سچ کہہ رہی تھی اور اب بھی سچ کہہ رہی ہوں۔" اس مرتبہ امرتا بھی مرتبہ سنجیدہ نظر آئی۔

"کیا مطلب؟" سنتوش حیران ہوا۔

"مطلب یہ کہ میری ٹانگوں کی طرف دیکھیں۔" امرتا نے اپنی ٹانگوں کی طرف اشارہ کیا تو سنتوش نے ایک حیران کن منظر دیکھا امرتا کے پیر پیچھے کی جانب مڑے ہوئے تھے سنتوش نے دھڑکتے دل کے ساتھ امرتا کے چہرے کی طرف دیکھا تو اسے حیرت کا ایک شدید جھٹکا لگا۔ امرتا کے چہرے کی جگہ وہاں اب ہڈیوں کی ہو چکی تھی، گھبراہٹ کے باعث سنتوش سے گاڑی نہ سنبھل سکی اور وہ روڈ سے اتر کر جھاڑیوں میں جا گھسی اور زوردار انداز میں ایک درخت سے جا ٹکرائی۔

☆ ☆ ☆

"مم... مسافر......" شاردا بڑبڑائی۔

"جی... پرنتو یہ مسافر خانہ تو نہیں۔"

"جی جانتا ہوں... پرنتو مجھے آس پاس کوئی بھی گھر نظر نہیں آیا صرف آپ ہی کا گھر تھا اس لئے مجبوراً مجھے آپ کا دروازہ کھٹکھٹانا پڑا اور ویسے سامنے کمرے میں روشنی دیکھی تھی اسی کارن میں نے یہ دروازہ کھٹکھٹایا......" باہر کھڑے مسافر نے بتایا۔

اب شاردا پریشان نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھتے ہی وہ اٹھ کر دروازے کے قریب آئی اور دروازہ کھول دیا باہر ایک ادھیڑ عمر شخص کھڑا بارش میں بھیگ رہا تھا جسے دیکھ کر شاردا کی آنکھوں میں غصے کی وجہ سے خون اتر آیا۔

"تت... تم......" وہ غصے سے چلائی چارپائی پر بیٹھا رمیش جلدی سے اٹھا اور اس نے زمین پر پڑے سفید رنگ کے پلاسٹک کے تھیلے کو اٹھایا اور اس کا منہ کھول کر وہ تھیلا جلتے ہوئے چولہے میں الٹ دیا۔

تھیلے میں سے انسانی ہڈیاں نکل کر جیسے ہی جلتی ہوئی آگ میں گریں تو شاردا کے منہ سے ایک خوفناک چیخ نکلی اور اس کے چہرے میں جیسے آگ جل اٹھی، وہ چیختی ہوئی پیچھے ہٹی آگ نے شاردا کے پیر سے لپٹنے کے بعد اس کے جسم کو پکڑ لیا اور جلد ہی شاردا آگ میں جلتے ہوئے راکھ بن گئی۔

اب حیرت کی بات یہ تھی کہ شاردا کے جسم کی راکھ کہیں بھی نظر نہیں آ رہی تھی۔ "شکر ہے بھگوان کا یہ مصیبت آتما تو ختم ہوئی......" ادھیڑ عمر آدمی نے رمیش کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"آپ کا بہت بہت دھنیواد کہ آپ نے میری جان اس آتما سے چھڑائی۔"

"میرا تو کام ہی یہی ہے پرتاب بیٹا۔" رمیش جو کہ اصل میں سنتوش تھا اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"پرنتو اس نے تو میری جان ہی لے لینی تھی وہ تو جھاڑیوں کی وجہ سے گاڑی کی رفتار کم ہوئی ورنہ میں تو خود اس کے ساتھ آگ میں جل رہا ہوتا۔"

"یہ تو آپ نے بالکل ٹھیک کہا...... کیونکہ یہ آتما پچھلے کئی سالوں سے میرا پیچھا برباد کرنے پر تلی ہوئی تھی، پرنتو مجھے ایک بات کی حیرت ہے کہ میں بھی تو اپنی گاڑی میں آپ کے کہنے پر آپ کے پیچھے ہی آ رہا تھا پھر اس نے مجھ پر حملہ کیوں نہیں کیا؟" ادھیڑ عمر آدمی جس کا نام پرتاب تھا کی آنکھیں سوالیہ تھیں۔

"وہ اس لئے کہ میں نے آپ پر ایک منتر پھونک دیا تھا، پرنتو مجھ سے یہ غلطی ہوئی کہ میں نے اپنے اوپر وہ منتر نہیں پڑھا اور شاردا میرا ارادہ بھانپ گئی کہ میں اسے انجام تک پہنچانے آ رہا ہوں اس لئے یہ مجھ پر حملہ کرنے میں کامیاب ہوگئی۔ اور ویسے بھی شاردا نے ٹھیک ہی کہا تھا۔" سنتوش کہتے ہوئے مسکرایا۔

"کیا......" پرتاب نے پوچھا۔

"یہی کہ اندھا وشواس والا آدمی ہمیشہ ڈوبتا ہے......" سنتوش نے ہنستے ہوئے کہا تو پرتاب ایک

زوردار قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''اس آتما نے میری پتنی اور میرے بیٹے کی ہتھیا کی اور وہ بھی بڑے دردناک طریقے سے۔'' پرتاب اس مرتبہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''کارن کیا تھا پرتاب صاحب؟'' سنتوش نے پوچھا۔

''ہے.... کارن....'' پرتاب کھوئے کھوئے لہجے میں بولا، شاید وہ بیتے لمحوں کی یادوں میں کھو گیا تھا، جب کافی دیر پرتاب کی طرف سے کوئی ردعمل نظر نہ آیا تو سنتوش نے آگے بڑھ کر پرتاب کو ہلایا۔ ''پرتاب صاحب کہاں کھو گئے؟''

''آں....'' وہ چونکا۔ ''میں بیتے لمحوں کو سمیٹنے کی کوششیں کر رہا تھا.... یہ کہانی تب شروع ہوئی جب میں 20,21 برس کا تھا میرے پتا اس گاؤں کی پنچایت کے سرپنچ ہوا کرتے تھے، شاردا کے ماتا پتا کا دیہانت ہوئے کچھ ہی عرصہ ہوا تھا، ہمارے گاؤں میں ایک بدمعاش ہوا کرتا تھا اس کا دل شاردا پر آ گیا تو وہ گلیوں میں آتے جاتے شاردا پر فقرے کستا تھا، شاردا نے میرے پتا سے شکایت کی، پتا نے مجھے بتایا تو پہلے میں نے اور میرے ساتھیوں نے اس بدمعاش کی خوب ٹھکائی کی اور پھر پولیس کے حوالے کر دیا۔

شاردا اس بات سے بہت متاثر ہوئی اور وہ من ہی من میں مجھ سے پریم کرنے لگی۔

ادھر میری شادی کے دن قریب آنے لگے۔

ایک رات شاردا نے مجھے اس مکان میں بلایا اور اپنے پریم کا اظہار کر دیا، میں نے شاردا کو صاف صاف بتا دیا کہ میں اس سے پریم نہیں کرتا جس سے میں پریم کرتا ہوں اس سے میرا بیاہ ہونے جا رہا ہے۔''

یہ سن کر وہ طیش میں آ گئی اور عجیب حرکتیں کرنے لگی وہ آگے بڑھی اور میرے گلے لگ گئی تو میں اپنے آپ کو چھڑانے لگا اور اسی چکر میں شاردا کا سر زور سے دیوار سے جا ٹکرایا اور اس کی ہتھیا ہو گئی۔

میں بہت پریشان ہو گیا کہ یہ مجھ سے کیا ہو گیا، اس سے اس مکان میں، میں اور شاردا گئے تھے، اس مکان میں آنے سے پہلے میں شاردا کے وچار سے آگاہ نہیں تھا اور گاؤں میں کسی نے بھی میری بات کا وشواس نہیں کرنا تھا۔

کافی سمے پریشانی میں بیت گیا آخرکار میں نے فیصلہ کیا کہ میں اسے اس گھر میں دفنا دوں، گاؤں کے لوگ شاردا کے بارے میں خود ہی کوئی نہ کوئی رائے قائم کریں گے اور میں نے یہی کیا۔

میں نے ساتھ والے کمرے میں شاردا کا شریر دفنا دیا.... یہ حادثہ اچانک میں ہی ہوا تھا، پرنتو پریشانی مجھے بہت سے پریشان کرتی تھی۔

پتا جی کے دیہانت کے بعد میں نے یہ گاؤں چھوڑ دیا، پرنتو شہر میں جا کر بھی اس حادثے نے میرا پیچھا نہ چھوڑا پھر ایک دن پُراسرار طریقے سے میری پتنی کی ہتھیا ہوئی جو انسانی سمجھ سے باہر تھی پولیس اس بارے میں کوئی تحقیقات نہ کر سکی اور پھر میرے بیٹے کی بھی اسی طرح ہتھیا ہوئی.... لاش پر کوئی زخم نہیں ہوتا تھا صرف گردن پر دو سوراخ ہوتے تھے اور شریر کا سارا خون نچڑا ہوتا تھا اس کے بعد میرے چھوٹے بیٹے اور بیٹی کا بھی یہی حال ہوا۔

ایک رات شاردا میرے سپنے میں آئی اور اس نے بتایا کہ ''سب وہی کر رہی ہے اور وہ مجھے بھی نہیں چھوڑے گی۔''

پھر میں آپ سے ملا اور آپ نے میری یہ سمسیا حل کر دی۔'' یہاں تک کہہ کر پرتاب خاموش ہو گیا۔

''میں نے گاؤں والوں سے سنا ہے کہ اس مکان میں جو بھی ٹھہرتا تھا اس کی لاش ہی ملتی تھی، شاردا کی آتما اس کا خون چوس لیتی تھی۔''

''چلو بھگوان کا شکر ہے کہ گاؤں والوں کی اور آپ کی بھی جان اس آتما سے چھوٹ گئی۔'' سنتوش نے مسکراتے ہوئے کہا تو پرتاب بھی مسکرانے لگا۔

نہلے پہ دہلا

ضرغام محمود۔ کراچی

سانپ پر نوجوان کی نظر پڑتے ہی سنسنی کی ایک زبردست لہر اس کی ریزھ کی ہڈی میں سرایت کرگئی، سانپ کی دوشاخہ زبان اور بھی دہشت پھیلا رہی تھی اور آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں کہ اچانک

لفظ لفظ اور سطر سطر خوف و ہراس کے لبادے میں لپٹی ہوئی عجیب وغریب دل دہلاتی کہانی

بادل امنڈ امنڈ کر آ رہے تھے اندھیرا بڑھتا جا رہا تھا میں نے گھڑی میں وقت دیکھا ابھی شام کے چھ بجے تھے مگر اندھیرا کافی پھیل چکا تھا بادلوں نے سورج کو پوری طرح ڈھانپ لیا تھا بارش کسی بھی وقت متوقع تھی میں اپنی سیاہ شیراڈ کار میں بیٹھا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا اسی وقت ونڈ اسکرین پر پانی کی چند بوندیں گریں، میں نے وائپر چلا دیئے، بوندیں غائب ہوگئیں مگر ان غائب ہونے والی بوندوں کی جگہ دوسری بوندوں نے جگہ لے لی اور پھر بارش مسلسل ہونے لگی مجھے اسی بات کا ڈر تھا اس لئے میں اس خطرناک موسم میں سفر نہیں کرنا چاہتا تھا مگر انکل نام کو کون سمجھائے۔ انہوں نے تھوڑی دیر پہلے مجھے فون کرکے اپنے گھر آنے کا کہا تو میں نے لاکھ عذر پیش کیا مگر وہ انکل نام ہی کیا جو کسی کی بات مان جائیں لہٰذا مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق مجھے اس خطرناک موسم میں سفر کرنا پڑ رہا تھا، ویسے بارش سے [illegible] جا رہا ہوں۔

برسات پورے زور و شور سے جاری تھی اندھیرا اتنا نہیں چھایا تھا کہ کار کی ہیڈ لائٹ روشن کی جاتی مگر بارش اتنی تیز اور موسلا دھار تھی کہ کار کی ہیڈ لائٹ میں بھی چند گز دور [illegible] راستہ نظر آ رہا تھا میں نہایت احتیاط کے ساتھ سفر کر رہا تھا حد نگاہ بے حد کم ہوگئی تھی زیادہ فاصلے کی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔

اچانک کار کا اگلا پہیہ کسی گڑھے میں سے گزرا اور کار کو ایک زوردار جھٹکا لگا۔ کار کو لگنے والے جھٹکے نے میرے اوپر بھی زبردست اثر ڈالا اور اسٹیئرنگ وہیل میرے ہاتھ سے چھوٹ گیا، کار سڑک پر لہرانے لگی میں نے جلدی سے اپنے حواس بحال کئے اور اسٹیئرنگ وہیل سنبھالتے ہوئے بریک پر پیر کا دباؤ ڈالا، کار تھوڑی دور تک لہرانے کے بعد سڑک کنارے رک گئی۔

میں نے چند گہری سانسیں لیں اور اپنے حواس بحال کئے۔ پھر میں نے کار کی کھڑکی کا شیشہ نیچے کرکے اپنا ہاتھ باہر نکالا! لمحے بھر میں بارش نے میرا ہاتھ مکمل بھگو دیا۔ میں نے جلدی سے اپنا ہاتھ کار کے اندر کیا اور کھڑکی کا شیشہ اوپر کر دیا پھر میں نے پچھلی سیٹ کے پیچھے سے تولیہ لے کر اپنا ہاتھ خشک کیا پھر میں نے کار اسٹارٹ کی اور اپنا سفر طے کرنے لگا۔

بارش مسلسل ہو رہی تھی چاروں طرف دھند چھائی ہوئی تھی ہر سو گھپ اندھیرا تھا کار کی ہیڈ لائٹ میں بھی بمشکل چند فٹ کا فاصلہ نظر آ رہا تھا۔ میں نے اپنی ٹینشن ہٹانے کے لئے کار میں کار ریڈیو آن کیا، ریڈیو

سے مدھر موسیقی نشر ہو رہی تھی، اور میں نے دھیان بٹانے کی غرض سے سننا شروع کر دیا، کار آہستہ روی سے ساتھ سفر طے کر رہی تھی بارش مسلسل جاری تھی۔

آسمان پر بجلیاں کوند رہی تھیں، بجلی کی کڑک دل دہلا دینے والی تھی ایسا لگ رہا تھا آج خدا کو جلال آ گیا ہو۔ پانی بارش کی صورت میں مسلسل زمین کو بھگو رہا تھا، اسی وقت میں نے دیکھا کہ آسمان سے ایک سفید سی لہر تڑپ کر زمین کی جانب آئی اور زمین سے ٹکرائی، ساتھ ہی مجھے ایک زوردار دھماکے کی آواز سنائی دی، میں دہل کر رہ گیا میں نے جلدی سے کار کے بریک پر اپنے پیر کا دباؤ ڈالا کار سڑک کنارے رک گئی۔ میں بغور سامنے آسمان کی جانب دیکھ رہا تھا جہاں سے ابھی ابھی آسمانی بجلی چمک کر زمین پر کسی جگہ گری تھی میں نے آسمانی بجلی کو اپنی آنکھوں سے گرتے دیکھا تھا یہ میرا پہلا تجربہ تھا کہ میں نے آسمانی بجلی کو گرتے دیکھا، نہ جانے آسمانی بجلی کہاں گری تھی جو اتنا زوردار دھماکا ہوا، میں شش و پنج میں پڑ گیا تھا کہ آگے جاؤں یا نہیں۔

اسی وقت ریڈیو سے موسیقی رک گئی اور اناؤنسر کی آواز ابھری۔

''محترم سامعین ہم آپ کو ایک اہم اعلان سے

رہے ہیں کہ دریائے جہلم پر بنا ڈیم آسمانی بجلی گرنے کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہے اور دریائے جہلم کا پانی تیزی کے ساتھ دیسے نام ہائی وے پر بہتا چلا آ رہا ہے لہٰذا ہائی وے پر سفر کرنے والے مسافر حضرات محتاط رہیں۔''

اس اعلان کے ساتھ ہی موسیقی دوبارہ نشر ہونے لگی اب مجھے کچھ نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں آگے جانا بھی مشکل اور پیچھے ہٹنا بھی مشکل، آخر میں نے خدا کا نام لے کر کار اسٹارٹ کی اور آگے بڑھ گیا بارش ابھی بھی مسلسل ہو رہی تھی اور بجلی بھی مسلسل کوند رہی تھی میں احتیاط کے ساتھ کار چلا رہا تھا ہائی وے پر پانی بڑھتا جا رہا تھا میری کار کے ٹائر تقریباً پانی میں ڈوب چکے تھے میں دل ہی دل میں اس وقت کو کوس رہا تھا جب میں نے انکل ناصر کی بات مان کر ان سے ملنے کے لئے سیکنڈ نیون ٹی جانے کا ارادہ کیا تھا۔

میں سکون سے اپنے گھر میں بیٹھ کر بارش انجوائے کر سکتا تھا مگر انکل ناصر کی بات مان کر میں اس مصیبت میں پھنس گیا تھا۔ اسی وقت مجھے دور ایک روشنی کا نقطہ سا نظر آیا جیسے جیسے میری کار اس روشنی کے نقطے کی قریب ہوتی گئی وہ روشنی کا نقطہ بڑا ہوتا گیا میں اس روشنی کے قریب پہنچا تو میں نے دیکھا کہ ایک شخص سیاہ برساتی

اپنے ہاتھ میں ٹارچ لئے مجھے رکنے کا اشارہ کر رہا ہے میں نے کار اس شخص کے قریب روکی۔ وہ ایک طویل قامت سیاہ فام شخص تھا جس کے ایک ہاتھ میں ٹارچ اور دوسرے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈنڈا تھا میں نے کار اس شخص کے قریب روکی اور کھڑکی کا شیشہ ذرا سا نیچے کیا۔

اس سے پہلے کے میں اس شخص سے کچھ پوچھتا وہ شخص بول اٹھا۔

''میں سارجنٹ فلپس ہوں۔آپ کہاں جا رہے ہیں؟!''

''میں سیکنڈ نیون سٹی جا رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔

''اتنے خطرناک موسم میں۔'' سارجنٹ فلپس کا لہجہ سوالیہ تھا۔

''بس قسمت کی خرابی۔'' میں نے کندھے اچکا کر جواب دیا۔ ''انکل ٹام کو میری یاد آرہی تھی لہٰذا مجھے ان کی بات ماننا پڑی۔''

''انکل ٹام۔۔۔؟'' سارجنٹ فلپس کا لہجہ بدستور سوالیہ تھا۔

''انکل ٹام میری ماں کے دور کے رشتے دار لگتے ہے مگر میرا ان سے محبت کا رشتہ ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''یقیناً بزرگوں کی محبت کا جواب محبت سے ہی دینا چاہئے۔'' سارجنٹ فلپس نے کہا پھر تھوڑا توقف کر نے کے بعد گویا ہوا۔

''دریائے سین پر بنا ڈیم آسمانی بجلی گرنے کی وجہ سے تباہ ہو گیا ہے اور دریا کا پانی ہائی وے پر آ گیا ہے لہٰذا آپ ہائی وے کے بجائے آگے سے بائیں جانب جانے والی سڑک پر گاڑی موڑ لیجیے گا وہ ایک دیہاتی سڑک ہے مگر اچھی حالت میں ہے، وہ سڑک آپ کے لئے موزوں رہے گی اور اس سڑک کے ذریعے آپ سیکنڈ نیون سٹی جا سکتے ہیں۔''

''تھینک یو سارجنٹ۔'' میں نے سارجنٹ فلپس کا شکریہ ادا کیا جواب میں سارجنٹ فلپس نے مسکرا کر میرا شکریہ وصول کیا۔

میں نے سارجنٹ فلپس کا شکریہ ادا کرنے کے بعد اپنی کار کو آگے بڑھایا تھوڑی دور چلنے کے بعد مجھے بائیں جانب ایک سڑک نظر آئی میں نے اس سڑک پر اپنی کار ڈال دی سڑک کی حالت کچھ زیادہ اچھی نہ تھی سڑک پر جا بجا چھوٹے بڑے گڑھے تھے جن میں پانی بھر گیا تھا، میں اپنی کار کو انتہائی احتیاط سے سنبھالتے ہوئے چلا رہا تھا ہر گڑھے پر گزرتے ہوئے میری کار اچھلتی پھر سنبھلتی اور آگے بڑھ جاتی بارش کے ساتھ سردی کی شدت میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

پوری سڑک پر میری کار کے علاوہ کوئی دوسری گاڑی نہ تھی میں احتیاط کے ساتھ کار ڈرائیو کر رہا تھا کار کے ٹائروں سے بچنے کے لئے پانی اچھل اچھل کر سائیڈوں میں ہو رہا تھا کار ایک گڑھے میں جاتی اور کراہ کر باہر نکلتی اور دوسرے گڑھے میں گھس جاتی اسی طرح ہچکولے کھاتے ہوئے کار آگے بڑھ رہی تھی، میں نہایت احتیاط کے ساتھ ڈرائیونگ کر رہا تھا۔

اچانک کار ایک بڑے گڑھے میں گھسی اور ایک جھٹکے کے ساتھ باہر نکل گئی کار کو بڑا زبردست جھٹکا لگا تھا اسی جھٹکے کے ساتھ ہی کار کے انجن نے بھی گھڑ گھڑانا شروع کر دیا۔ آخر کار وہ ہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا کار کے انجن میں پانی آ گیا تھا۔ کار کا انجن اب کسی بھی وقت بند ہو سکتا تھا۔ آخر کار انجن دو تین دفعہ کھانسا اور پھر بند ہو گیا۔ میں نے سیلف مارنے کی بہت کوشش کی مگر انجن ہلکے سے کھانس کر خاموش ہو جاتا کار کا انجن اس وقت اس بوڑھے کی مانند آواز کر رہا تھا جو گھر کے کسی کونے میں کھانس کھانس کر اپنے زندہ ہونے کا احساس دلاتا ہے۔

اب میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔۔۔ کس سے مدد طلب کروں۔ سڑک پر پانی بڑھتا ہی جا رہا تھا چاروں جانب اندھیرا تھا اسی وقت ایک زوردار کڑک کی آواز کے ساتھ بجلی چمکی۔ بجلی کی چمک کے ساتھ میری نظر سامنے اٹھی۔ بجلی کے کڑکنے کی وجہ سے ہونے والی روشنی میں مجھے اپنے سامنے کچھ

فاصلے پر ایک پرانی حویلی نظر آئی۔ اندھیری رات میں برستی برسات میں وہ حویلی کافی ڈراؤنی لگ رہی تھی اگر کوئی اور وقت ہوتا تو میں اس حویلی کی جانب دیکھنا بھی پسند نہیں کرتا مگر ابھی مجبوری تھی لہذا میں نے کار کا دروازہ کھول کر اپنے قدم کار سے باہر نکالے اور کار سے نیچے اترا ساتھ ہی میں نے چھتری بھی کھول لی۔ پھر میں نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹی جیبی ٹارچ نکالی اور ٹارچ کی روشنی میں راستہ دیکھتے ہوئے حویلی کی جانب قدم بڑھائے۔ پانی میرے گھٹنوں تک آ رہا تھا۔

میں نہایت احتیاط کے ساتھ چلتا ہوا حویلی کی جانب بڑھا، میں ٹارچ کی روشنی اردگرد ڈال کر راستہ دیکھ رہا تھا۔

اچانک میں ٹھٹک کر رک گیا پانی میں مجھے کچھ حرکت نظر آئی میں نے ٹارچ کی روشنی اس جانب ڈالی تو سنسنی کی ایک لہر میرے پورے بدن میں دوڑ گئی۔ پانی میں ایک سانپ تیر رہا تھا سانپ کی دوشاخہ زبان بار بار پانی سے باہر لپک رہی تھی وہ پانی کے بہاؤ میں اپنا بیلنس برقرار رکھنے کی کوشش کر رہا تھا اندھیری رات میں سانپ کی آنکھیں ہیروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ میں نے ٹارچ کی روشنی سانپ پر ڈالی سانپ بھی ٹکٹکی باندھے مجھے دیکھ رہا تھا میں جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا تھوڑی دیر سانپ مجھے گھورتا رہا پھر پانی کے بہاؤ کے ساتھ مجھ سے دور ہو گیا سانپ پانی کے ساتھ بہتا ہوا جب مجھ سے کافی فاصلے پر چلا گیا تو میں نے احتیاط کے ساتھ حویلی کی جانب قدم بڑھائے۔

حویلی قدرے اونچی جگہ پر بنی ہوئی تھیں اس لئے حویلی کے اطراف میں پانی زیادہ نہیں تھا۔ حویلی کے قریب پہنچ کر میں نے اپنے کپڑوں اور جوتوں سے پانی صاف کیا اور اپنی چھتری بند کی اور حویلی کے دروازے کی جانب قدم بڑھائے حویلی کا دروازہ بہت بڑا اور مضبوط تھا لکڑی کے مضبوط دروازے پر مختلف اشکال بنی ہوئی تھی اور دروازے کے ٹھیک وسط میں شیر کا بڑا سا کھلا ہوا منہ بنا ہوا تھا اندھیری رات میں شیر کا منہ عجیب ہیبت پیدا کر رہا تھا، دروازے کی درزوں سے باہر آتی روشنی بتا رہی تھی کہ حویلی میں کوئی رہتا ہے۔

مجھے حویلی کے احاطے میں کھڑی ایک پک اپ بھی نظر آئی۔ میں احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا اور حویلی کے دروازے کے قریب پہنچ کر دروازے پر دستک دی میری دستک کے باوجود دروازہ نہ کھلا دوسری بار میں نے دروازے کو زور سے کھٹکھٹایا تو اچانک چرچراہٹ کے ساتھ دروازہ کھل گیا اور میں دروازے سے گزر کر حویلی میں داخل ہو گیا مگر مجھے دروازہ کھولنے والا نظر نہیں آیا، اسی وقت ایک بار پھر چرچراہٹ کی آواز سنائی دی میں نے جلدی سے پلٹ کر دیکھا حویلی کا دروازہ خود بخود بند ہو گیا تھا۔ میں حیران ہونے کے ساتھ تھوڑا سا پریشان بھی ہوا کہ ''الٰہی یہ کیا ماجرا ہے؟''

پھر میں نے سر جھٹک کر پریشان کن خیالات سے پیچھا چھڑایا اور اس کمرے کو بغور دیکھنے لگا جس میں میں اس وقت کھڑا تھا۔ یہ ایک بڑا سا ہال تھا جو بہت عمدگی کے ساتھ آراستہ و پیراستہ کیا گیا تھا ہال میں روشنی کے لئے دو بلب جل رہے تھے مگر وہ بلب اتنے بڑے ہال کو مکمل طور پر روشن کرنے میں ناکام تھے لہذا ہال میں ملگجی سی روشنی تھی۔ اس روشنی میں ہال کافی پراسرار نظر آ رہا تھا میں نے ہال میں بھرپور نظر ڈالی ہال کی دیواروں پر مختلف جانوروں کے کٹے سر لگے ہوئے تھے جیسے عموماً شکاری حضرات جن جانوروں کا شکار کرتے ہیں ان کے سر حنوط کروا کر سجاوٹ کے لئے دیواروں پر لٹکا دیتے ہیں۔

شیر، چیتا، بارہ سینگا، لومڑی غرض کافی جانوروں کے سر دیواروں میں لٹکے ہوئے تھے ان جانوروں کے آنکھیں مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں میں نے ان جانوروں پر سے نظر ہٹائی اور ہال کو چاروں طرف گھوم کر دیکھا ہال کے ایک کونے میں ایک تابوت رکھا تھا میں یہ دیکھنے کی غرض سے کہ تابوت میں کیا ہے تابوت کی جانب بڑھا۔

اسی وقت مجھے عجیب سا احساس ہوا مجھے ایسا لگا جیسے جانوروں کے کٹے ہوئے سر جو دیواروں پر لگے

ہوئے تھے ان کی شکلیں بڑی ڈراؤنی تھیں اور وہ مجھے تابوت کی جانب بڑھتا ہوا دیکھ رہے تھے میں نے چونک کر ان چہروں کی آنکھوں میں دیکھا مگر وہ آنکھیں ویران اور ساکت تھیں صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ مردہ ہیں، میں نے ایک بار پھر اپنے سر کو جھٹک کر پریشان کن خیالات سے چھٹکارا حاصل کیا اور تابوت کے قریب پہنچ گیا۔

جیسے ہی میں تابوت کے قریب پہنچا تابوت کا ڈھکن ایک جھٹکے سے کھل گیا اور تابوت میں سے تیز روشنی باہر نکلی، روشنی اتنی تیز تھی کہ ایک لمحے کو میری آنکھیں چندھیا گئیں اور بے اختیار میرے قدم پیچھے ہٹ گئے تھوڑی دیر بعد جب میری آنکھیں ٹھیک ہوئیں اور مجھے سب کچھ نظر آنے لگا تو میں نے تابوت کے اندر جھانکا اس تابوت میں ایک آدمی لیٹا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں بند تھیں اور اس کے ہاتھ اس کے اپنے سینے پر بندھے ہوئے تھے صاف نظر آ رہا تھا کہ وہ آدمی مر چکا ہے۔

"یہ کیا ماجرا ہے۔۔۔ یہ شخص کون ہے؟" میں بڑبڑایا میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے یہ شخص کون ہے اور یہ کیسے مرا ہے کیا اس حویلی میں کوئی زندہ انسان بھی ہے یا نہیں؟

میں یہ دیکھنے کی غرض سے کہ تابوت میں کس کی لاش ہے میں نے تابوت کے ڈھکن پر لکھی تحریر پڑھنے کی کوشش کی تحریر بہت گرد آلود تھی حالانکہ باقی تابوت انتہائی صاف ستھرا تھا میں نے جیب سے رومال نکالا اور اور تحریر پر سے گرد صاف کی اور اسے پڑھنے لگا۔

"جیمس ایڈورڈ سمرسٹ، تاریخ وفات 17 جولائی 1870ء"

"یا خدایا۔۔۔ اس شخص کو مرے ہوئے تو ڈیڑھ سو سال گزر چکے ہیں" میں خودکلامی کے انداز میں بڑبڑایا۔

اسی وقت مجھے پھڑپھڑاہٹ کی آواز آئی میں نے بے اختیار آواز کی سمت دیکھا ایک بڑی سی چمگادڑ مجھ پر حملہ آور ہو رہی تھی میں جلدی سے پیچھے ہٹا اور چمگادڑ سیدھی تابوت میں آ گری میں نے غصے سے چمگادڑ کی جانب دیکھا وہ عام چمگادڑوں سے بڑے سائز کی تھی اس کی آنکھیں لال انگارہ تھیں منہ پر خون لگا ہوا تھا تھوڑی دیر چمگادڑ مجھے گھورتی رہی پھر نہایت غصے سے آواز نکالتے ہوئے وہ ایک بار پھر مجھ پر حملہ آور ہوئی مگر اب میں پوری طرح ہوشیار تھا میں نے نہایت چابکدستی سے چمگادڑ کا حملہ ناکام کیا اور ایک زوردار ہاتھ چمگادڑ کی پشت پر رسید کیا میرا ہاتھ لگتے ہی چمگادڑ دور فرش پر جا گری پھر جلدی سے اٹھی اور اپنی خونخوار آنکھوں سے مجھے گھورتی ہوئی روشندان سے باہر نکل گئی۔

"یہ سب کیا ہو رہا ہے؟" میں نے سوچا میں مضبوط دل و دماغ کا مالک تھا مگر اس وقت مجھے تھوڑا سا خوف محسوس ہو رہا تھا مگر میں نے اس خوف کو اپنے چہرے سے ظاہر نہ ہونے دیا۔ میں آہستہ آہستہ محتاط قدموں سے چلتا ہوا وہاں سے باہر نکلا اور حویلی کے دوسرے کمرے میں داخل ہوا یہ کمرہ بھی پچھلے کمرے کی طرح بہت بڑا تھا اس کمرے میں بھی روشنی کا انتظام تھا۔ میں نے اس کمرے کا جائزہ لیا اس کمرے کی دیواروں پر بڑی بڑی قد آدم تصاویر لگی ہوئی تھیں ہر تصویر میں خوف کا عنصر پیش کیا گیا تھا میرے سامنے کی دیوار پر ایک تصویر لگی ہوئی تھی اس تصویر میں ایک چڑیل ایک معصوم بچے کا خون پی رہی تھی بچے کے چہرے پر تکلیف کے آثار تھے چڑیل کے لمبے لمبے دانتوں پر تازہ تازہ خون لگا ہوا تھا اور وہ بڑی شادمانی سے اس بچے کا خون پی رہی تھی۔

تصویر میں بچے کی اذیت اور چڑیل کی خوشی کی کیفیت کی بہت عمدہ طریقے سے عکاسی کی گئی تھی مجھے اس تصویر سے بہت کراہیت آئی لہٰذا میں نے اس تصویر سے نظر ہٹائی اور کمرے کی دیگر اشیاء پر نظر ڈالی اسی وقت مجھے پھڑپھڑاہٹ کی آواز آئی میں نے آواز کی سمت دیکھا کمرے میں رکھی آرام کرسی آہستہ آہستہ ہل رہی تھی شاید اس پر کوئی نادیدہ وجود بیٹھا تھا۔

"کون ہے وہاں۔۔۔؟" میں نے پوچھا مگر مجھے کوئی جواب نہ ملا میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا اس آرام کرسی کے قریب پہنچا مگر۔۔۔مگر یہ کیا کرسی ہل رہی تھی مگر۔۔۔مگر اس پر کوئی نہیں بیٹھا تھا کرسی کا کشن اس طرح دبا ہوا تھا جیسے اس پر کوئی بیٹھا ہو مگر۔۔۔مگر وہ مجھے کیوں نظر نہیں آ رہا تھا میں نے آنکھیں مسل مسل کر دیکھا مگر۔۔۔کرسی خالی تھی اسی وقت ایسا لگا جیسے کوئی کرسی سے اٹھا ہو۔۔۔پھر مجھے پائل کی آواز آئی جیسے کسی عورت نے پائل پہنی ہو اور وہ چل رہی ہو۔

"کون ہے۔" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

میرے سوال کے جواب میں مجھے ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا اور ساتھ ہی پائل کی تیز جھنکار سنائی دی جیسے کوئی عورت بھاگ کر گئی ہو ساتھ ہی کمرے کا دروازہ کھلا اور پھر بند ہو گیا ایسا لگا جیسے کوئی کمرے سے باہر نکل کر گیا ہو۔ مجھے خوف محسوس ہو رہا تھا مگر میں نے اپنے چہرے سے خوف کا اظہار نہ ہونے دیا میں نے ایک بار پھر کمرے کا جائزہ لیا۔

اسی وقت مجھے ٹپ ٹپ کی آوازیں سنائی دیں جیسے پانی کی بوندیں گر رہی ہوں میں نے کمرے میں چاروں اطراف نظر دوڑائی کہ یہ آواز کہاں سے آ رہی ہے۔ مگر جو منظر مجھے نظر آیا وہ واقعی کسی کمزور دل آدمی کے لئے جان لیوا ثابت ہو سکتا تھا۔ وہ تصویر جس میں چڑیل بچے کا خون چوس رہی تھی اس تصویر میں بچے کی گردن سے لہو ٹپ ٹپ کر کمرے کے فرش پر گر رہا تھا میں احتیاط کے ساتھ آگے بڑھا اور میں نے فرش پر بیٹھ کر تصویر سے گرنے والے لہو کو اپنی انگلی سے پونچھ لیا۔

"یہ خون ہے۔"

میرے ذہن نے مجھے متنبہ کیا میں نے نظر اٹھا کر تصویر کی جانب دیکھا تو تصویر میں موجود چڑیل خونخوار نظروں سے مجھے گھورتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی ایسا لگ رہا تھا کہ وہ چڑیل تصویر میں نہیں بلکہ حقیقت میں میرے سامنے کھڑی ہو کر مجھے گھور رہی ہو۔

اسی وقت کمرے کی بتیاں جلنے بجھنے لگیں۔ میں بوکھلا کر کھڑا ہوا اور پیچھے کی جانب ہٹا تھوڑی دیر بجلی جلنے بجھنے کے بعد ٹھیک ہوئی بجلی ٹھیک ہونے کے بعد میں نے تصویر پر نظر ڈالی تو میں حیرت زدہ رہ گیا اب اس تصویر میں نہ چڑیل تھی اور نہ ہی بچہ تھا بلکہ وہاں ایک سادہ فریم لگا ہوا تھا فرش پر گرنے والا خون بھی اب نظر نہیں آ رہا تھا۔

"یا الٰہی یہ کیا ماجرا ہے۔" میں نے سوچا۔ "ابھی ابھی میں نے اس تصویر میں چڑیل کو دیکھا تھا مگر اب۔ یہ کیا طلسم ہے۔ کہیں یہ حویلی آسیب زدہ تو نہیں ہے۔" میں سوچ رہا تھا اب مجھے واقعی خوف محسوس ہو رہا تھا سنسنی کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی میں دوڑ گئی۔ میں نے سر کو جھٹک کر اپنے آپ کو تسلی دی۔

اسی وقت کمرے کی کھلی کھڑکی پر میری نظر پڑی کھڑکی کے باہر ایک عورت سفید لباس پہنے گزر رہی تھی۔

"اے۔ اے بات سنو۔" میں چیخا اور میں نے جلدی سے کمرے کا دروازہ کھولا اور کمرے سے باہر نکلا اب میں حویلی کی راہداری میں کھڑا تھا میں نے جلدی سے راہداری کی دوسری جانب دیکھا ایک عورت سفید لباس پہنے ہاتھ میں شمع دان اٹھائے جا رہی تھی میں اسے دیکھ کر پھر چیخا۔ "اے۔ اے بات سنو۔ اے رکو۔"

مگر اس عورت نے میری بات پر کوئی توجہ نہ دی ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ میری بات سن ہی نہ رہی ہو میں اس عورت کے پیچھے لپکا وہ عورت ایک کمرے کے دروازے کے سامنے رکی اور اس نے نظر اٹھا کر میری جانب دیکھا۔

"اف۔۔۔اس عورت کا چہرہ اور اس کی آنکھیں۔" ایک لمحے کو میں ٹھٹک کر رک گیا اس عورت کا چہرہ اتنا سفید تھا جیسے اس میں خون ہی نہ ہو اور اس کی آنکھوں کی پتلیاں بھی مکمل سفید تھیں اس کے چہرے پر کوئی تاثر نہیں تھا ایسا لگ رہا تھا۔۔۔جیسے وہ عورت زندہ ہی نہ ہو۔

میرے ایک لمحے کے تجسس کی وجہ سے وہ عورت

کمرے کا دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوگئی میں پھرتی کے ساتھ اس کے پیچھے لپکا اور میں نے بھی کمرے کا دروازہ کھولا اور کمرے میں داخل ہوگیا۔ مگر یہ کیا۔۔۔ کمرہ خالی تھا اس عورت کا نام و نشان تک کمرے میں نہیں تھا۔ میں نے کمرے کو چاروں طرف گھوم کر دیکھا، کمرے کا کوئی اور دروازہ بھی نہ تھا۔ نہ ہی کمرے میں کوئی کھڑکی تھی، کمرے میں صرف ایک ہی دروازہ تھا جس سے میں اندر آیا تھا۔۔۔۔

''پھر وہ عورت کہاں غائب ہوگئی؟'' خوف سے میرے مساموں سے پسینہ بہنے لگا میرا دل سینہ توڑ کر باہر آنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنے آپ کو پرسکون کرنے کے غرض سے چند لمبی لمبی سانسیں لیں پھر میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کا صرف ایک ہی دروازہ تھا میں سوچ رہا تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے اس عورت کو کمرے میں داخل ہوتے دیکھا تھا پھر۔۔۔ ''پھر وہ عورت کہاں چلی گئی کیا اس کمرے میں کوئی خفیہ راستہ بھی ہے؟'' میں نے کمرے کا جائزہ لینا شروع کیا یہ کمرہ شاید مطالعے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا کیونکہ یہاں کافی کتابیں اور اخبار رکھے ہوئے تھے، میں نے میز پر رکھا ہوا اخبار اٹھایا اخبار بالکل تازہ لگ رہا تھا شاید یہ آج کا اخبار تھا میں نے اخبار کی سرخیوں پر نظر دوڑائی۔

''یہ کیسی خبریں ہیں؟'' مجھے اخبار کی خبریں عجیب سی محسوس ہورہی تھی پھر میں نے اخبار کی لوح پر نظر ڈالی۔

''اوہ میرے خدا!'' اخبار کی لوح پر اخبار کی اشاعت کی تاریخ لکھی تھی 17 جولائی 1870ء

''یہ ڈیڑھ سو سال پرانا اخبار۔ اور اتنی اچھی حالت میں۔'' میں بڑبڑایا۔

حویلی میں ہونے والے واقعات میری سمجھ سے بالا تھے۔ پھر میں نے ساتھ رکھی ایک لوہے کی الماری کا ہینڈل گھمایا اور الماری کے پٹ کھولے پٹ کھلتے ہی کوئی چیز میرے اوپر آ گری، میں بوکھلا کر پیچھے ہٹ گیا۔ وہ ایک لاش تھی جو میرے اوپر گری تھی اور اب اوندھے منہ کمرے کے فرش پر پڑی تھی میں نے دل مضبوط کرکے اس لاش کو سیدھا کیا۔ لاش کسی جوان مرد کی تھی لاش کے چہرے پر اذیت کے آثار تھے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس شخص پر بہت ظلم کیا گیا ہو اور اس نے بڑی اذیت کے ساتھ جان دی ہو۔ ابھی میں لاش کو بغور دیکھ ہی رہا تھا کہ کمرے کے کھلے دروازے سے تیز ہوا کا جھونکا اندر آیا اور اس کے ساتھ ہی لاش کے چہرے کا گوشت گلنے لگا، میں بوکھلا گیا لاش کا سارا گوشت مٹی بن کر ہوا کے ساتھ کمرے سے باہر چلا گیا جہاں تھوڑی دیر پہلے لاش پڑی تھی وہاں اب ایک ڈھانچہ پڑا تھا اب مجھے خوف محسوس ہورہا تھا۔

اسی وقت مجھے چرچراہٹ کی آواز آئی اور کمرے کا اکلوتا دروازہ خود بخود بند ہوگیا۔ میں لپک کر دروازے تک پہنچا اور دروازے کو کھولنا چاہا مگر دروازہ نہ کھلا ایسا معلوم ہورہا تھا جیسے کسی نے باہر سے دروازے کو کنڈی لگادی ہو، میرے زور لگانے کے باوجود دروازہ نہ کھلا۔

''کون ہے۔۔۔ دروازہ کھولو۔۔۔'' میں زور سے چیخا اور دروازے کو پیٹنے لگا۔

''دیکھو تم جو کوئی بھی ہو شرافت سے دروازہ کھول دو ورنہ اچھا نہ ہوگا۔'' میں نے دھمکی دی۔

میری دھمکی کے جواب میں مجھے باہر سے ایک نسوانی قہقہہ سنائی دیا۔ اس قہقہے کی آواز سے میرا غصہ دوچند ہوگیا میں نے دروازے کا جائزہ لیا دروازہ زیادہ مضبوط نہیں تھا میری دو چار ٹکروں سے دروازہ ٹوٹ سکتا تھا۔ یہ سوچ کر میں پیچھے ہٹا تاکہ دروازے کو اپنے کندھے سے ٹکر مار سکوں۔ میں نے مناسب فاصلہ رکھ کر تیزی سے دوڑتے ہوئے دروازے کو ٹکر مارنی چاہی ۔۔۔ مگر اس سے پہلے کہ میں دروازے کو ٹکر مارتا دروازہ آپ ہی آپ کھل گیا اور میں اپنی جھونک میں راہداری کی ریلنگ سے ٹکرا گیا۔

"اوہ۔۔۔" میرے منہ سے ایک تکلیف دہ آواز نکلی راہداری کی ریلنگ سے ٹکرانے کی وجہ سے میرے کندھے میں چوٹ آئی تھی میں نے بازو تھام کر اپنے ہاتھ میں خون رواں کیا پھر میں نے راہداری میں نظر اٹھا کر دیکھا راہداری مکمل طور پر سنسان تھی وہاں کوئی نہیں تھا۔

"آخر یہ دروازہ کس نے بند کیا اور پھر کس نے کھولا؟"

میں سوچنے لگا۔ پھر میں نے راہداری کی ریلنگ کے اوپر سے سر نکال کر آسمان کی جانب دیکھا بارش تھم چکی تھی موسم صاف ہو چکا تھا آسمان پر تارے چمک رہے تھے۔

"موسم بہتر ہوگیا ہے مجھے اس حویلی سے اب چلا جانا چاہیے۔" میں نے سوچا۔ اسی وقت میری نظر دروازے پر پڑی تو میری آنکھیں حلقوں سے باہر نکل آئیں۔ وہ ڈھانچہ جو تھوڑی دیر پہلے فرش پر پڑا تھا اب اپنے دونوں ہاتھوں میں تلواریں لئے دروازے میں کھڑا تھا اور مجھے گھور رہا تھا میں آنکھیں پھاڑ کر اس ڈھانچے کو دیکھا۔ "یہ۔۔۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔" میں سوچ رہا تھا۔

"کک۔۔۔ کون ہو تم؟" میں ہکلایا۔

"طوطخ۔۔۔ ماٹن۔۔ طوطخ۔" وہ ڈھانچہ بولا۔

"یہ۔۔۔ یہ کونسی زبان ہے؟" میں نے بوکھلا کر پوچھا۔

"طوطخ۔۔۔ ما۔۔ اٹن۔۔ طوطخ۔" ڈھانچہ پھر بولا اور اس کے ساتھ ہی اس نے ایک تلوار میری جانب اچھال دی۔ میں نے جلدی سے ہاتھ بڑھا کر اس تلوار کو کیچ کرلیا۔ پھر وہ ڈھانچہ اطمینان کے ساتھ قدم اٹھاتے ہوئے میرے مقابل آکھڑا ہوا اور اپنی تلوار لہراتے ہوئے کہنے لگا۔ "طوطخ اٹن۔۔۔ طوطخ۔۔۔ شاٹا ٹن ٹی۔۔ آنی۔" اتنا کہتے ہی اس ڈھانچے نے تلوار سے مجھ پر حملہ کردیا۔

"یہ۔۔۔ یہ کیا کررہے ہو۔۔۔؟" میں جھکائی دے کر اس کے وار سے بچا۔

"طوطخ۔۔ طوطخ۔۔۔ شاٹا ٹن ٹی۔۔"

ڈھانچہ زور سے چیخا اور بڑے وحشیانہ انداز میں اس نے مجھ پر حملہ کیا وہ میری گردن پر وار کرنا چاہتا تھا مجبوراً مجھے اس کا مقابلہ کرنا پڑا میں اس کے وار مسلسل اپنی تلوار پر روک رہا تھا تو ساتھ ساتھ میرا ذہن بھی تیزی کے ساتھ کام کررہا تھا۔

میں مسلسل سوچ رہا تھا کہ "اس حویلی میں یہ سب کیا ہورہا ہے کیا یہ حویلی آسیب زدہ ہے یا کوئی میرے ساتھ کوئی کھیل کھیل رہا ہے۔"

بہرحال جو بھی ہو اب میں اس حویلی سے جلد از جلد نکل جانا چاہتا تھا مگر یہاں سے جانے کے لئے مجھے اس ڈھانچے کو ہرانا ہوگا۔ میں سنجیدگی کے ساتھ اس ڈھانچے کا مقابلہ کرنے لگا ہم دونوں لڑتے لڑتے اس بڑے ہال میں آگئے جہاں حویلی کا مرکزی دروازہ تھا جس سے گزر کر میں اس حویلی میں داخل ہوا تھا ہم دونوں کو لڑتے کافی دیر ہوگئی میرے بازو شل ہو گئے اور میں تھکن محسوس کرنے لگا مگر وہ ڈھانچہ اسی جوش و خروش کے ساتھ لڑ رہا تھا جس جوش و خروش سے اس نے مقابلہ شروع کیا تھا، ابھی تک میں اپنا دفاع ہی کررہا تھا میں نے خود اس ڈھانچے پر وار نہیں کیا تھا مگر اب مجھے اندازہ ہورہا تھا کہ میں زیادہ دیر تک اس ڈھانچے کا مقابلہ نہیں کرسکوں گا لہٰذا میں نے بھی ڈھانچے پر وار کرنا شروع کردیئے میرے وار کرنے سے وہ ڈھانچہ کچھ بوکھلا سا گیا۔ یا شاید یہ میرا وہم تھا ورنہ ڈھانچے کا چہرہ تو تھا نہیں کہ جہاں ایکسپریشن آتے اور میں اندازہ لگاتا کہ ڈھانچہ بوکھلایا ہے یا نہیں۔

آخر کار لڑتے لڑتے مجھے موقع ملا اور میں نے ڈھانچے کو یہ تاثر دیا کہ میں اس کے بائیں جانب وار کررہا ہوں وہ اپنے بائیں حصے کو بچانے کے لئے دائیں جانب ہوا اور مجھے موقع مل گیا میری تلوار بجلی کی طرح چمکی اور میں نے ایک ہی وار میں اس کی گردن اڑا دی۔

ڈھانچے کی گردن فٹبال کی طرح اچھلتی فرش پر پڑتی ہوئی دیوار سے جا ٹکرائی اور ڈھانچے کا دھڑ لڑکھڑا کر گر پڑا، ڈھانچے کے گرتے ہی اس میں آگ لگ گئی اور ذرا

کی دیر میں سارا ڈھانچہ جل گیا۔

جہاں تھوڑی دیر پہلے ڈھانچہ پڑا ہوا تھا وہاں اب جلی ہوئی راکھ پڑی تھی۔ میں نے جلدی سے تلوار ڈھانچے کی راکھ پر پھینکی اور حویلی کے بیرونی دروازے کی جانب لپکا اور دروازہ کھولنا چاہا۔۔۔ مگر دروازہ نہ کھلا شاید کسی نے باہر سے دروازہ بند کر دیا تھا۔

حویلی کا یہ دروازہ بہت مضبوط تھا اس کو توڑنا میرے لئے مشکل تھا ابھی میں سوچ ہی رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ مجھے اپنے پیچھے کسی کی آواز آئی میں نے جلدی سے گھوم کر دیکھا مجھ سے کچھ فاصلے پر وہ چڑیل کھڑی دکھائی دی جسے میں نے تصویر میں دیکھا تھا۔ اب وہ بچے کا خون نہیں پی رہی تھی مگر اس کے لمبے لمبے دانت جو اس کے منہ سے باہر نکلے ہوئے تھے ان دانتوں سے ابھی تک خون ٹپک رہا تھا۔ اس چڑیل کی آنکھیں اوپر کو چڑھی ہوئی تھیں۔ اس کے چہرے پر وحشت چھائی ہوئی تھی اس نے لمبا سا لباس پہن رکھا تھا اور اس کے لباس پر جا بجا خون لگا ہوا تھا۔

اس چڑیل کے ہاتھ کے ناخن بہت لمبے تھے وہ چڑیل شکل سے بہت بھیانک نظر آ رہی تھی مجھے اپنا دل بند ہوتا محسوس ہو رہا تھا۔

''کون ہو تم؟'' میں نے دل مضبوط کر کے پوچھا۔

''تم کون ہو اور یہاں کیوں آئے ہو؟'' اس چڑیل نے میرا سوال نظر انداز کر کے اپنا سوال دہرایا۔ اس چڑیل کی آواز بہت گونجدار تھی ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی آواز ہال کے چاروں جانب سے آ رہی ہو۔

''میں ایک مسافر ہوں میری کار بارش کی وجہ سے بند ہو گئی تھی تو میں یہاں پناہ کی تلاش میں آ گیا تھا۔ مگر اس حویلی میں کیا ہو رہا ہے اور تم سب کون ہو؟'' میں نے جواب دیتے ہوئے سوال بھی کر ڈالا۔

''یہ حویلی بھوتوں کا مسکن ہے یہاں بھوت رہتے ہیں اور میں بھی ایک بھوت ہوں۔'' چڑیل نے گونجدار آواز میں جواب دیا۔ یہ سنتے ہی مجھے لگا جیسے میرا دل بند ہو گیا ہو خوف کی ایک لہر میری ریڑھ کی ہڈی [illegible] میں سنسنی دوڑ گئی مگر میں نے اپنے حواسوں پر قابو پائے رکھا۔

''محترمہ بھوت صاحبہ۔۔۔ مہربانی فرما کر اس دروازے کو کھول دیجئے اور مجھے یہاں سے جانے دیجئے۔''

''جو اس حویلی میں ایک بار آ جاتا ہے وہ واپس نہیں جاتا۔ اب تمہیں ساری عمر اس حویلی میں ہمارا غلام بن کر رہنا پڑے گا۔'' اس چڑیل نے انتہائی گونجدار آواز میں جواب دیا۔

''کیا مطلب؟''

''مطلب اب تم ہمارے غلام ہو اور تمہیں ساری زندگی اسی حویلی میں گزارنی پڑے گی تم اب کبھی بھی اس حویلی سے باہر نہیں جا سکتے۔'' اس چڑیل نے ہنستے ہوئے جواب دیا اس چڑیل کی ہنسی انتہائی مکروہ تھی۔

چڑیل کی بات سن کر ایک لمحے کو مجھے خوف محسوس ہوا مگر دوسرے ہی لمحے خوف کی جگہ شدید غصے نے لی غصے سے میرا چہرہ سرخ پڑ گیا

''اگر تم یہ سمجھ رہی ہو کہ تم مجھے روک سکتی ہو تو یہ تمہاری بھول ہے میں تمہیں مار کر اس حویلی سے جاؤں گا۔۔۔'' اتنا کہہ کر میں خطرناک ارادے سے آگے بڑھا تاکہ اس چڑیل پر حملہ کر سکوں وہ چڑیل بھی میرا ارادہ بھانپ گئی اس نے اپنا ہاتھ حویلی کے چھت پر لگے فانوس کی جانب کیا اور ہاتھ سے فانوس کو ہلکا سا اشارہ کیا فانوس چھت سے نکل کر سیدھا میرے سر کی جانب آیا تو میں نے چھلانگ لگا کر خود کو بچایا ورنہ میرے سر کے کئی ٹکڑے ہو سکتے تھے فانوس حویلی کے فرش سے ٹکرا کر چکنا چور ہو گیا۔

اسی وقت اس چڑیل نے دیوار پر لگے ایک بڑے خنجر کو اشارہ کیا اور وہ خنجر دیوار سے نکل کر سیدھا میری جانب آنے لگا۔ میں نے بڑی مشکل سے فرش پر لیٹ کر اپنے آپ کو خنجر کے وار سے بچایا پھر اس چڑیل نے کمرے کی مختلف چیزوں کو اشارے کرنا شروع کر دیئے کمرے کی ہر چیز [illegible] اس چڑیل کے اشارے کی منتظر [illegible] جیسے وہ [illegible] کی چیزیں [illegible] اور وہ چیزیں [illegible]

پینترے ہم نے آپ پر آزمائے تھے اگر وہ کسی اور شخص پر آزماتے تو وہ خوف سے چیخنے لگتا مگر آپ کے چہرے پر ذرہ خوف کا کوئی تاثر پیدا نہیں ہوا۔ شائد آپ کو بھوتوں سے ڈر نہیں لگتا۔'' آسٹین گولڈ برگ نے میری بات کا جواب دیتے ہوئے کہا۔

'' بھوتوں سے تو شائد میں ڈر جاؤں مگر میں جانتا تھا کہ یہ لوگ بھوت نہیں ہیں۔'' میں نے اس اداکارہ کی جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا جو چڑیل کا روپ دھارے ہوئے تھی۔

'' کیوں کیا ان لوگوں کے کاسٹیوم وغیرہ میں کوئی کمی ہے یا ان کی اداکاری میں کوئی جھول ہے۔'' آسٹین گولڈ برگ نے پوچھا۔

'' نہیں ہمارے معاشرے میں بھوتوں کے متعلق جو باتیں مشہور ہیں ان باتوں پر ان لوگوں کے کاسٹیوم وغیرہ پورے اترتے ہیں اور ان تمام لوگوں کی اداکاری بھی لاجواب تھی۔ مگر اس کے باوجود مجھے یقین تھا کہ یہ بھوت نہیں ہیں۔'' میں نے مسکرا کر جواب دیا۔

'' میں یہی بات تو آپ سے پوچھنا چاہ رہا ہوں کہ آپ کو کیوں یقین تھا کہ یہ بھوت نہیں ہیں۔''

'' مجھے اس لئے اس بات کا یقین تھا کہ یہ بھوت نہیں ہیں۔۔۔ کیونکہ'' میں نے مسکرا کر جملہ ادھورا چھوڑا۔

آسٹین گولڈ برگ اور اس کی ٹیم کے تمام لوگوں کے کان میرا جواب سننے کے منتظر تھے میں نے تھوڑا توقف کیا اور پھر جملہ مکمل کیا۔

'' کیونکہ میں خود ایک بھوت ہوں۔'' اس جملے کے ساتھ خود بخود میری آواز بھاری اور گونجدار ہوگئی۔

میں نے دیکھا کہ میری بات سن کر آسٹین گولڈ برگ اور اس کی ٹیم کے چہرے پر ایک لمحے کو خوف کے آثار پیدا ہوئے پھر دوسرے ہی لمحے آسٹین گولڈ برگ نے ایک زوردار قہقہہ لگایا اور کہا۔

'' اب آپ ہمیں ڈرانے کی کوشش کر رہے ہیں۔''

'' نہیں میں آپ کو ڈرانے کی کوشش نہیں کر رہا۔۔۔ واقعی میں ایک بھوت ہوں۔ اور یہ حویلی کا دروازہ جو شائد آپ نے باہر سے بند کروایا ہے۔ مجھے اس دروازے کو کھلوانے کی کوئی ضرورت نہیں میں اس بند دروازے کے پار بھی جاسکتا ہوں۔'' میں نے اتنا کہا اور اپنے قدم حویلی کے بند دروازے کی جانب بڑھائے اور نہایت اطمینان کے ساتھ بند دروازے سے گزر کر حویلی کے باہر آگیا۔ میں حویلی کے بند دروازے سے ایسے گزر گیا جیسے وہاں دروازہ ہی نہ ہو۔

حویلی سے باہر نکل کر میں نے آسمان کی جانب دیکھا آسمان سے بادل چھٹ چکے تھے بارش رک چکی تھی آسمان پر تارے چمک رہے تھے میں نے اپنی کار کی جانب دیکھا وہ حویلی سے تھوڑے فاصلے پر کھڑی تھی سڑک سے پانی بھی اتر چکا تھا اب راستہ صاف تھا میں سفر کرسکتا تھا۔ میں نے مسکرا کر حویلی کے بند دروازے کی جانب دیکھا پھر میں نے اپنا سر حویلی کے بند دروازے سے اندر کیا میرا دھڑ حویلی کے بند دروازے کے باہر ہی تھا جبکہ میرا سر بند دروازے کے اندر تھا۔

اندر آسٹین گولڈ برگ اور اس کے ساتھی آنکھیں پھاڑے دروازے کو تک رہے تھے انہوں نے آج تک بھوتوں کی فلمیں بنائی تھیں آج پہلی بار ان کا سامنا ایک جیتے جاگتے بھوت سے ہوا تھا۔ میں نے مسکرا کر ان سب کو دیکھا اور پھر آسٹین گولڈ برگ کو مخاطب کیا۔

'' مسٹر آسٹین۔۔۔! اب آپ کو اندازہ ہوگیا ہوگا کہ بھوت کیسے ہوتے ہیں اور وہ انسانوں کے درمیان کس طرح رہتے ہیں امید ہے آئندہ آپ اسکرین پر بھوتوں کا صحیح تصور پیش کریں گے۔'' میں نے مسکرا کر کہا اور اپنا دایاں ہاتھ ہلاتے ہوئے سب کو بائے بائے کہا۔

سب پھٹی پھٹی نظروں مجھے تک رہے تھے میں نے مسکرا کر اپنا سر بند دروازے سے نکالا اور اپنی کار کی جانب قدم بڑھا دیئے، مجھے صبح ہونے سے پہلے پہلے سیکنڈ نیو سٹی انکل ٹام کے پاس پہنچنا تھا۔

روح کی مدد

محمد قاسم رحمان۔ ہری پور

نوجوان اپنے عمل میں مصروف تھا اور اس کا عمل اختتام کو تھا کہ اچانک ایک جوان ہرن سامنے آگیا، ہرن کو دیکھ کر نوجوان کی خوشی کی انتہا نہ رہی اور نوجوان نے ایک تیز دھار خنجر ہرن کی پچھلی ٹانگ میں مار دی اور پھر..........

نیکی کرنے والے زندگی بھر خوش وخرم رہتے ہیں بلکہ ان کی روح بھی سکون میں ہوتی ہے کہانی پڑھ کر دیکھیں

اسپتال میں بچوں کے وارڈ کی کھڑکی کے سامنے کھڑی شہر بانو مایوسی اور ناامیدی کی عملی تفسیر نظر آرہی تھی اس کی نگاہیں اپنے زخمی بیٹے پر تھیں اور آنکھوں سے آنسو ساون بھادو کی طرح رواں دواں تھے۔

''وہ بیٹا جسے بے شمار دعاؤں کے بعد حاصل کیا تھا کیا وہ اس کو کھونے والی ہے؟ کیا وہ اپنے جگر کے ٹکڑے کو اتنی آسانی سے کھودے گی کیا وہ اس کے لئے کچھ نہ کر پائے گی؟'' اسی طرح کے سوالات اس کے دماغ میں چکرا رہے تھے کہ اچانک اس کے کندھے پر کسی نے ہاتھ رکھا تو وہ گھبرا کر پیچھے مڑی سامنے سہراب کھڑا تھا۔

''کیا ہوا سہراب حارث کے آپریشن کے لئے تین لاکھ کا بندوبست ہوگیا؟'' شہر بانو نے سوال تو پوچھ

یہ تو میرا ... ایک نیک دل ... تھی تو سہراب کی [illegible] میں ہو گی۔

سہراب بولا۔ ''خوش ہو جاؤ پیسوں کا انتظام ہو گیا ہے میں نے اپنے دوست سے قرض لیا ہے۔'' سہراب نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب سے نوٹوں کی گڈیاں نکال کر اسے دیں۔ ''تم آپریشن کے پیسے جمع کروا دو۔ میں ابھی آتا ہوں۔'' اور یہ بول کر وہ ایک طرف کو چلا گیا۔

شہر بانو حیران تھی کہ سہراب کا ایسا کون سا امیر دوست ہے جس نے ایک دن میں اسے تین لاکھ روپے دے دیئے۔ وہ اس سے پوچھنا چاہتی تھی مگر سہراب جا چکا تھا۔

شہر بانو آپریشن کے لئے پیسے ریسپشن پر جمع کروانے اور رسید لے کے جیسے ہی فارغ ہوئی تو سامنے سے اسے سہراب آتا ہوا دکھائی دیا۔ شہر بانو حیران ہوئی کہ سہراب نے یکدم کپڑے تبدیل کیسے کر لئے پہلے اس نے سفید شلوار سوٹ پہنا ہوا تھا اور اب اس نے دوسرے کپڑے پہنے ہوئے تھے۔ جس میں اس کا کسرتی بدن جھانک رہا تھا۔

''پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا۔'' قریب آ کر سہراب نے کہا۔

اور یہ سنتے ہی شہر بانو کو برقی جھٹکا لگا اور پھر وہ حیرت سے بولی۔ ''کیا مطلب ابھی آپ تھوڑی دیر پہلے مجھے پیسے دے چکے ہیں اور وہ میں نے حارث کے آپریشن کے لئے جمع بھی کروا دیئے ہیں اور یہ رہی رسید۔''

حیران ہونے کی باری اب سہراب کی تھی۔

''کیا بول رہی ہو میں تو ابھی آیا ہوں۔''

شہر بانو کا حیرت اور خوف سے برا حال ہونے لگا۔ ''کون تھا وہ! جس نے پیسے دیئے تھے؟''

اسی حیرت و استعجاب میں پورا دن گزر گیا۔

اور اگلے دن صبح کے نو بجے حارث کا کامیاب آپریشن ہو گیا۔

☆...☆...☆

''امی مجھے تیس ہزار روپے چاہئیں۔'' حاشر نے ہانڈی میں چمچہ ہلاتی ہوئی اپنی امی سے سپاٹ انداز میں کہا۔

رضیہ بیگم حیران ہو کر پیچھے مڑیں اور بھونچکوں کی طرح حاشر کا چہرہ تکنے لگیں۔

حاشر بولا۔ ''امی ایسے کیا دیکھ رہی ہیں۔''

''بیٹا میرے پاس تین سو روپے نہیں ہیں اس وقت اور تم تیس ہزار کی بات کر رہے ہو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے تم نے میٹرک کیا اور مجھ سے اس انداز میں ایک روپیہ نہیں مانگا اور آج تم تیس ہزار روپے مانگ رہے ہو۔''

''امی میں نے کالج میں ایڈمیشن فیس جمع کروانی ہے۔'' حاشر ایک ایک لفظ چباتے ہوئے بولا۔

''اور صرف دو دن رہ گئے ہیں۔ اس کے بعد میرا ایڈمیشن نہیں ہو گا۔''

''بیٹا میں کیا کروں ... مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آ رہا۔'' رضیہ بیگم نے اس سے کہا۔ ''تیس ہزار کہاں سے پیدا کروں۔'' یہ سن کر حاشر کی آنکھوں میں یاس و محرومی کی پرچھائیاں لہرانے لگیں اور پھر وہ دل مسوس کر اپنے کمرے میں آ گیا۔ اس نے سوچا پہلے نہا کر کپڑے چینج کرے پھر بیٹھ کر سوچے گا۔

اس نے اپنے کمرے میں موجود الماری کا دروازہ کھولا تو اسے الماری میں ایک خاکی رنگ کا لفافہ رکھا ہوا نظر آیا۔ اس نے اس کو کھول کر دیکھا تو اس میں ہزار ہزار کے تیس نوٹ تھے۔ ان نوٹوں کو دیکھتے ہی اس کا حیرت کے مارے برا حال ہونے لگا۔ نوٹ اس کے ہاتھ میں تھے اور وہ بھونچکوں کی طرح کمرے سے باہر نکلا۔ ''امی امی۔''

حاشر اپنی امی کو آوازیں دینے لگا۔

''ارے کیا ہو گیا؟'' رضیہ بیگم بھاگ کر کمرے کی طرف آئیں۔

''امی یہ پیسے آپ نے رکھے ہیں؟'' حاشر نے اپنی امی سے پوچھا۔

رضیہ بیگم بولیں۔ ''میں نے تو نہیں رکھے۔''

"کیا مطلب! اتنے پیسے انہوں نے رکھے ہیں!؟" حاشر حیرت سے بولا۔

"گنو تو ہیں کتنے؟!" رضیہ بیگم نے کہا۔

"امی بیس ہزار پورے ہیں۔" حاشر نے بتایا۔

"او مجھے تو لگتا ہے۔ خدا نے ہماری مدد کی ہے۔ یہ پیسے تم ایڈمشن کے لئے جمع کروا دو۔" رضیہ بیگم بولیں اور اس کے بعد انہوں نے جھٹ وضو کیا اور شکرانے کے نماز پڑھنے لگیں۔

اور حاشر بھی اپنے رب کا شکر ادا کرتے نہیں تھکتا تھا، خیر حاشر نے دوسرے دن جا کر ایڈمشن کے پورے بیس ہزار جمع کرا دیئے۔

☆☆......☆☆......☆☆

روئے زمین پر ازل سے بدی اور نیکی کی جنگ جاری ہے اور ابد تک جاری رہے گی، ہمیشہ سے نیکی، بدی پر بھاری پڑتی رہی ہے اور ابد تک نیکی کی ہی جیت ہوگی۔

لوگوں کی نظروں میں وہ ایک اوباش، چور، لٹیرا اور بے ضمیر انسان تھا۔

مگر اسے لوگوں کی قطعاً کوئی پروا نہ تھی اسے پروا تھی تو صرف اپنے رب کی، اس کے رب کا کیا حکم ہے کہ تمہاری ذات سے کسی کو دکھ نہ پہنچے اور پھر سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے وہ ہمیشہ یہی سوچتا تھا کہ "اپنے رب کو کیسے خوش رکھے۔" بہت سوچ وبچار کے بعد اس کے لئے اس نے ایک عجیب وغریب طریقہ اختیار کیا۔

اس نے امیروں کے گھر ڈاکے ڈالنے شروع کر دیئے تجوریوں کو لوٹنا شروع کر دیا۔

اس نے ان امیروں کو لوٹا جنہوں نے ناجائز ذرائع سے دولت حاصل کی تھی۔

اور پھر لوٹی ہوئی دولت غریبوں اور مسکینوں میں تقسیم کر دیتا تھا اور اپنے پاس بہت ہی کم رکھتا تھا جبکہ اپنا پیٹ پالنے کے لئے سخت مزدوری کرتا تھا۔

اس کا مقصد تھا، وقت سے تنگ اور ضرورت مند لوگ اس کی راہ میں اپنی نظریں بچھائے رکھتے تھے، وہ جدھر سے آتا تھا اس سمت لوگ یک ٹک دیکھتے رہتے تھے لوگ اس کے لئے دعائیں مانگتے رہتے تھے۔ کیونکہ وہ بے کس اور مجبور لوگوں کی ضرورت پوری کرتا تھا اور پھر ایک دن اس نیک انسان کا ایک روڈ ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو اس کے لئے لوگوں کی نظریں ساون بھادوں بن گئیں لوگ یاس ومحرومی کا شکار ہو گئے اور اپنے مسیحا کے لئے دعائے مغفرت میں لگ گئے اور اس نیک انسان کی روح اس سنسار میں رہ گئی اور پھر وقت ضرورت وہ لوگوں کی مدد کرنے لگی۔

حاشر اور شہر بانو کی مدد بھی اس نے ہی کی تھی اور اس طرح کے بے شمار مختلف لاچار لوگوں کی اس نے مدد کرنی شروع کر دی تھی۔

لیکن وہ دن عابد کے لئے بہت ہی منحوس دن ثابت ہوا تھا۔

اس روز صبح سے ہی موسم سہانا تھا، پرندے چہچہا رہے تھے ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں عابد کی روح ادھر ادھر منڈلا رہی تھی خوش وخرم جھومتی پھر رہی تھی کہ اچانک اسے نظر آیا کہ گاؤں کے قریب جو جنگل ہے اس میں ایک فرد بہت زیادہ مصیبت میں مبتلا ہے اور کسی والی مدد کے لئے پکار رہا ہے۔

اور عابد کی روح جنگل کی طرف پرواز کرنے لگی جب وہ جنگل میں پہنچی تو اسے ایک جھونپڑی نظر آئی اس نے جھونپڑی کے اندر دیکھا وہاں ایک عامل نما سادھو موجود تھا اس نے صرف ایک لنگوٹی باندھ رکھی تھی اس کا اوپری دھڑ برہنہ تھا اور ایک کالی دیوی کے بت کے سامنے ایک چبوترے پر بنایا گیا تھا کالی کے بت کے کئی ہاتھ تھے جن میں مختلف چیزیں تھیں انہی ہاتھوں میں سے ایک ہاتھ میں ایک خون آلود خنجر تھا۔ اور ایک دوشیزہ چبوترے پر بے ہوش پڑی تھی وہ نیم مردہ حالت میں تھی اس کے ہاتھ پاؤں مضبوطی سے رسی کے ساتھ باندھے گئے تھے اور اس وقت اس کے چہرے پر کرب اور اذیت کا تاثر نمایاں تھا۔

سادھو آہستہ آہستہ لڑکی کے قریب آرہا تھا اس کے ایک ہاتھ میں ایک فٹ لمبا اور دو انچ موٹا تیز دھار چھرا تھا۔

عابد کی روح سارا ماجرا سمجھ گئی یقیناً سادھو اس لڑکی کی بلی چڑھانے والا تھا۔

سادھو لڑکی کے گلے پر چھری رکھ چکا تھا اور لڑکی دہشت کے سبب کچھ بول نہیں پارہی تھی اب سوچنے کا وقت بالکل نہیں تھا عابد کو لڑکی کی ہر صورت میں جان بچانی تھی۔

چنانچہ وہ بنا سوچے سمجھے جھونپڑی میں داخل ہوگیا اس کا جھونپڑی میں داخل ہونا تھا کہ ایک بھونچال سا آگیا ایک عجیب قسم کا زلزلہ اور پھر جب سب کچھ تھما تو منظر پورے کا پورا تبدیل ہوچکا تھا سادھو قہقہے لگا رہا تھا اور وہ لڑکی غائب تھی۔

''آ تجھے بہت شوق ہے ناں کہ تو ہر منش کی سہایتا کرے اب تجھے اس کی جو سزا ملتی ہے اس کے لئے تیار ہوجا اب تیری ان دوان شکتی سے میں فائدہ اٹھاؤں گا۔'' سادھو بولا۔

''سب سے پہلے تیرے لئے یہ حکم ہے کہ ہمیں تو ایک انیس برس کی کنواری کنیا لا کر دے گا۔''

سادھو کی بات سن کر عابد کی روح آپے سے باہر اور طیش میں بولی۔ ''سادھو یاد رکھ میری ذات کے ذریعے تو انسانیت کو نقصان نہیں پہنچا سکتا تیری راہ میں، میں سب سے بڑی رکاوٹ بن جاؤں گا تو اپنی گیدڑ بھبکیاں اپنے پاس رکھ۔''

''اوہو ہماری بلی اور ہم ہی سے میاؤں میاؤں کررہی ہے۔

اگر تو میری راہ میں رکاوٹ ہے تو تیرا سروناش بھی میں خود کروں گا تو جانتا نہیں مجھے، سادھو رام لال جو کہتا ہے وہ کرکے رہتا ہے تیری آتما اب میری قیدی ہے اور میرے وش میں اور نا چاہتے ہوئے بھی تجھے میرا حکم ماننا ہوگا۔ بصورت دیگر تیرے ساتھ وہ ہوگا کہ تو جب بھی میرے بارے میں سوچے گا تجھ پر لرزہ طاری ہوجائے گا۔''

یہ سن کر عابد کی روح بولی۔ ''رام لال تو جو بھی کرلے مگر تو ہے بزدل تو نے چھپ کر مجھ پر وار کیا ہے تو نے میری انسانی ہمدردی کا فائدہ اٹھایا ہے ورنہ تیرا احترام کرنے کا سوال تو تو مجھے آگ میں بھی جھونک دے، پھر بھی میں انسانیت سوز کام کسی صورت بھی نہیں کروں گا۔''

عابد کی روح بولی تو سادھو آگ بگولہ ہوگیا۔

''ہوں رسی جل گئی لیکن بل نہیں گیا اب تو دیکھ تیرے ساتھ میں کیا کرتا ہوں۔'' سادھو نے اپنی انگلی عابد کی روح کی جانب کی تو دوسرے ہی لمحے عابد کی روح دھوئیں میں تبدیل ہونے لگی۔ سادھو نے پاس پڑی ہوئی شیشے کی بوتل اٹھائی اور کچھ بڑبڑا کر دھوئیں پر پھونک ماری تو اگلے ہی لمحے دھواں بوتل میں بھرتا چلا گیا جب پورا دھواں بوتل میں چلا گیا تو ڈھکن لگایا اور قہقہے لگانے لگا۔

ایک سال میں سادھو نے عابد کی روح کو بہت اذیتیں دیں کہ وہ سادھو کی بات مان لے مگر لاحاصل عابد کی روح اذیت پر اذیت سہتی رہی مگر سادھو کا ایک بھی انسانیت سوز کام نہ کیا، دراصل وہ ایک زبردست طاقت چاہتا تھا کہ مرنے کے بعد اسے قبر میں دفن کیا جائے اور وہ قبر میں اپنا مطلوبہ عمل کرکے امر ہوجائے اس کے لئے شیطان نے اسے بتایا کہ ''گیارہ کنواری لڑکیوں کی اسے بلی چڑھانی ہوگی اور ان لڑکیوں کو ایک مسلمان رحم دل روح اٹھا کر لائے گی۔''

چنانچہ اس نے عابد کی روح کا انتخاب کیا تھا لیکن پورا ایک سال گزر جانے کے باوجود اسے کچھ حاصل نہیں ہوا تھا، باوجود اس کے کہ اس نے عابد کی روح کو ہر قسم کی اذیت دی لیکن عابد کی روح انسانیت کی دشمن نہ بن سکی۔

☆ ☆ ☆

وہ ایک قصبہ تھا جہاں کچھ دیہات کے ریت رواج تھے تو کچھ شہروں کی سہولیات بھی تھیں وہاں سڑکیں

پکی تھیں اکثریت کسان اپنے کھیتوں میں گندم مکئی اور گنا کاشت کرتے تھے وہاں لڑکیوں کے لئے ایک ہائی اسکول بھی تھا اور پورے قصبے میں ایک سپر اسٹور بھی تھا۔ اس کا مالک لیاقت ایک رحم دل انسان تھا۔ لوگ اسٹور سے اکثر اوقات ادھار بھی لے جاتے تھے۔

لیاقت کا ایک دوست تھا جو کہ روحانی علوم میں ماہر تھا، اور یہ مشہور تھا کہ اس قصبے میں بھوت پریت اور بھٹکی ہوئی روحیں بھی ہیں وہ ایک نیک بزرگ بھی تھے ان کا نام عبداللہ تھا مگر سب انہیں نور بابا کہتے تھے اور واقعی ان کے چہرے پر بہت نور تھا۔

لیاقت کے دو بیٹے تھے ایک بیٹا شہر میں ہاسٹل میں رہ کر اپنی تعلیمی سرگرمیاں جاری رکھے ہوئے تھا۔ دوسرے بیٹے کا نام شہباز تھا۔ شہباز ایک بانکا اور خوبصورت نوجوان تھا۔

لیکن گزشتہ ایک ماہ سے شہباز بہت پریشان تھا، پریشانی کا سبب ایک بہت ہی بھیانک اور پراسرار خواب تھا جو وہ گزشتہ ایک ماہ سے دیکھ رہا تھا۔

خواب میں وہ ایک جنگل میں ہوتا اور چلتے چلتے اس کے پاؤں شل ہو جائے مگر اسے راستہ نہ سجھائی دیتا تھا۔ پھر وہ ایک جھونپڑی دیکھتا جھونپڑی میں ایک سادھو کسی انسان کو تکلیف دے رہا ہوتا۔

اور وہ انسان چلاتا۔ ''شہباز میری مدد کرو...... شہباز میری مدد کرو۔ میں اذیت میں ہوں خدارا میری مدد کرو۔''

اور یہ خواب دیکھتے ہی شہباز ہڑبڑا کر خواب سے اٹھ بیٹھتا اور اس طرح اٹھتے بیٹھتے اس کی سماعت سے وہی آوازیں سنائی دیتیں۔ ''شہباز میری مدد کرو...... شہباز خدارا میری مدد کرو۔''

اور پھر ایک وقت آیا کہ شہباز نے پکا فیصلہ کر لیا کہ اگلے دن اپنے بابا کے دیرینہ دوست نور بابا سے ملاقات کرے گا۔ کیونکہ اس کے خیال سے یہ کوئی ماورائی معاملہ تھا۔

اور پھر شہباز نور بابا کے پاس پہنچ گیا۔

روشن باتیں

نماز پڑھا کرو اس سے پہلے کہ تمہاری نماز پڑھی جائے۔

تجربہ سب سے بڑا اور بہترین استاد ہے۔

کبھی ایسی خواہش نہ کرو جو زندگی میں پوری نہ ہو سکے۔

غریب وہ ہے جس کا کوئی دوست نہیں۔

کسی سوال کا جواب معلوم نہ ہو تو لاعلمی کا اظہار کر دینا بہتر ہے۔

(عثمان غنی۔پشاور)

نور بابا کو سب کچھ بتانے کے بعد وہ ان کا چہرہ تکنے لگا نور بابا نے بڑے تحمل سے شہباز کی پوری بات سنی اس کے بعد انہوں نے کاغذ قلم لیا اور کاغذ پر لکیریں بنانے لگے کبھی ترچھی کبھی سیدھی تو کبھی عجیب سی زبان میں کچھ لکھنے لگتے۔

''شہباز بیٹا عابد کی روح کو تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔'' نور بابا بولے۔

''یہ عابد کون ہے؟'' شہباز نے پوچھا۔

نور بابا نے اسے عابد کی روح کی پوری کہانی بتائی اور کہا کہ ''سادھو رام لال نے اسے دھوکے سے قید کر لیا تھا اور اب اس کو طرح طرح کی اذیتیں دے رہا ہے اپنا گھناؤنا مقصد پورا کرنے کے لئے۔''

یہ سن کر شہباز بولا۔ ''لیکن بابا میں اس منحوس سادھو کو ختم کیسے کروں گا وہ تو بہت طاقتور ہے اس کے پاس کالی طاقتیں ہیں جبکہ میں بالکل نہتا ہوں ایک سادہ اور عام انسان۔''

شہباز کی بات سن کر نور بابا بولے۔ ''بیٹا اچھائی کرنے کی طاقت کبھی عام نہیں ہوتی۔ اور ویسے بھی سادھو کی جان ایک ہرن میں ہے اور وہ ہرن لوگوں کی نظروں سے غائب رہتا ہے۔ صرف وہ شخص اس ہرن کو دیکھ سکتا ہے جس نے گیارہ دن کا ایک چلہ کاٹا ہو۔''

''کیا مجھے کسی قبرستان میں جا کر چلہ کاٹنا ہوگا۔'' شہباز نے پوچھا۔

''تمہیں چلہ کاٹنا ہوگا لیکن قبرستان میں نہیں۔ اس سادھو کی جھونپڑی کے قریب ایک برگد کا درخت ہے تمہیں اس درخت کے پاس بیٹھ کر چلہ کاٹنا ہوگا اور جب تم چلہ کاٹو گے تو تم پر سادھو کی نظر نہیں پڑے گی۔

کیا تم یہ سب کچھ کر پاؤ گے؟'' نور بابا بولے۔

''جی بابا۔ میں اس معصوم روح کی مدد ضرور کروں گا۔'' شہباز اٹل فیصلے میں بولا۔

''تو ٹھیک ہے کل تم نماز عصر کے بعد آ جانا.... میں تمہیں چلے کا عمل بتا دوں گا تمہیں وہاں پہنچا بھی دوں گا اور اس کے بابت میں تمہارے ابو سے بات بھی کرلوں گا، چلہ کے درمیان تمہیں بھوک پیاس نہیں لگے گی بس تم یہ سمجھ لو کہ تم سب کی نظروں سے اوجھل رہوگے اور مکمل چلہ تمہیں حصار میں بیٹھ کر کاٹنا ہوگا۔

گیارہ دن میں تم کو خوب ڈرایا دھمکایا جائے گا مگر تم نے ڈرنا نہیں ہے ثابت قدم رہنا ہے اور چلہ جب ختم ہوگا تو ایک ہرن تمہارے سامنے ہوگا پھر تم نے ہرن کی پچھلی بائیں ٹانگ میں خنجر مارنا ہوگا اور پھر اس طرح سادھو کا خاتمہ ہو جائے گا اور تم عابد کی روح کو مزید اذیت سے بچا لو گے۔ اب تم اپنے گھر جاؤ اور کل وقت پر آ جانا۔''

دوسرے دن شہباز وقت مقررہ پر نور بابا کے پاس آ گیا، اس کے والد اور گھر والوں نے بھی اس کام کے لئے اسے اجازت دے دی تھی کیونکہ درمیان نور بابا تھے۔

تمام باتیں اور چلہ کا عمل بتانے کے بعد نور بابا بولے۔ ''شہباز بیٹا اب تم اپنی آنکھیں بند کرلو۔'' اس کے بعد شہباز نے اپنی آنکھیں بند کرلیں تو اسے لگا کہ وہ ہوا میں پرواز کر رہا ہے۔

پھر چند لمحوں بعد نور بابا کی آواز سنائی دی۔ ''شہباز بیٹا اب اپنی آنکھیں کھول دو۔'' شہباز نے جب آنکھیں کھولیں تو دیکھا کہ وہ ایک برگد کے درخت کے نیچے موجود ہے۔ اور تھوڑے فاصلے پر ایک جھونپڑی موجود ہے پھر شہباز حصار میں بیٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

دس دن گزر گئے اور شہباز کا چلہ کامیابی کے ساتھ جاری و ساری تھا۔

آج اس کے چلے کی آخری رات تھی پچھلے دس دنوں میں اس کو ڈرایا گیا تھا بھیانک اور دل کو لرزا دینے والے منظر سامنے آئے مگر وہ ثابت قدمی کے ساتھ اپنے ہدف پر قائم رہا۔ وہ جانتا تھا کہ چلے کی آخری رات بہت ہی کٹھن ہوگی۔

تقریباً پندرہ منٹ ہی گزرے ہوں گے کہ اس نے دیکھا کہ اس کا حصار ریل کی پٹڑی کے درمیان ہے اور ٹرین وسل دیتی ہوئی قریب آ رہی تھی شہباز کے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کیا کرے۔ اگر وہ حصار سے نہ نکلا تو بھیانک موت اور اگر وہ حصار سے نکل گیا تو نادیدہ قوتیں اسے عبرتناک موت دیں گی اور اس کے دس دن کی محنت رائیگاں چلی جائے گی۔

☆......☆......☆

ادھر جھونپڑی میں سادھو رام لال سخت مضطرب تھا کبھی اٹھ کر جھونپڑی میں چکر لگانے لگتا اور جب تھک جاتا تو اپنا سر پکڑ کر بے سدھ ہو کر بیٹھ جاتا اور بوتل میں قید عابد کی روح ہنسنے لگتی۔

''سادھو تمہارے بھیانک اختتام کا وقت قریب آ گیا ہے۔ باطل چاہے جتنا ہی طاقتور کیوں نہ ہو اس کو حق اور نیکی کے سامنے شکست کا سامنا کرنا ہی پڑتا ہے۔''

یہ سن کر سادھو چیخ پڑا۔ ''چپ کر منحوس تو کیا سمجھتا ہے کہ میں ہار جاؤں گا، یہ تیری بھول ہے، میں اپنے مقصد میں کامیاب ہوں گا، تو کیا سمجھتا ہے کہ میں جا کر اس دو ٹکے کے چھوکرے سے معافی مانگ لوں...... یہ کبھی نہیں ہوسکتا۔''

یہ سن کر عابد کی روح بولی۔

''بے وقوف سادھو میں بھگوان سے نہیں بلکہ اپنے رب العزت سے مدد مانگوں گا تو شہباز کو دو ٹکے کا

کہہ رہا ہے، تو یاد رکھ یہ دلیر نوجوان ہی تیری موت کا باعث بنے گا۔"

سادھو طیش میں آ کر بولا۔ "کل کا چھوکرا میرے سامنے ایک پل بھی نہیں ٹک سکے گا۔ تو سمجھ رہا ہے ناں۔"

لیکن سادھو اپنے کہے الفاظ سے خود مطمئن نہیں تھا وہ دل ہی دل میں شہباز سے خوف زدہ تھا۔ اور اپنے شیطانی دماغ میں شہباز کو زیر کرنے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

☆......☆......☆

شہباز نے اپنی آنکھیں بند کرلیں اور جب اس نے آنکھیں کھولیں تو وہ برگد کے درخت کے نیچے ہی تھا۔ پوری رات خوف ناک واقعات پیش آتے رہے لیکن شہباز نے کامیابی سے اپنا چلہ مکمل کرلیا، صبح کا اجالا ہر سو پھیل گیا اور پھر اچانک ایک خوبصورت ہرن تیزی سے چلتا ہوا آیا اور شہباز کے سامنے کھڑا ہوگیا۔

اب شہباز کو اگلا کام کرنا تھا، ہرن کی پچھلی بائیں ٹانگ میں خنجر گھونپنا تھا مگر اس خیال نے اس کی جان ہی نکال دی کہ خنجر تو اس کے پاس ہے نہیں۔

اب شہباز کو موت اپنے سامنے ناچتی ہوئی نظر آئی لیکن اس نے ہمت سے کام لیا اور اچانک اس کے ذہن میں ایک ترکیب آئی۔

وہ فوراً اٹھا اور جھونپڑی کی طرف دوڑ لگادی پھر جھونپڑی میں وہ داخل ہوگیا لیکن اس کا جائزہ لینے کے لئے اس کے پاس بالکل ٹائم نہیں تھا اس نے چبوترے کے پاس پڑا ہوا بڑا چھرا اٹھایا اور چشم زدن میں جھونپڑی سے باہر نکلا یہ سب اتنی جلدی میں ہوا کہ سادھو کچھ سمجھ نہ پایا۔

شہباز برگد کے درخت کے پاس پہنچ کر ہرن کو دیکھا مگر ہرن اب بھاگ رہا تھا صرف تین منٹ بچے تھے، شہباز ہرن کے پیچھے جنگل میں دوڑنے لگا مگر ہرن کی رفتار تیز ہونے لگی۔

ہرن بھاگ رہا تھا اور پیچھے سے سادھو رام لال قہقہے لگا رہا تھا۔

اچانک ہی ہرن کانٹے دار جھاڑیوں میں پھنس گیا اب شہباز کے حساب سے ایک منٹ رہتا تھا، شہباز نے ہرن کو کانٹوں میں پھنسے ہوئے دیکھا تو اس میں ایک جوش اور ولولہ امڈ آیا وہ چھرا سمیت ہرن کی طرف لپکا۔

سادھو بھی ہرن کو آزاد کرانے کے لئے پیچھے بھاگا، شہباز کی ٹانگ زخمی تھی مگر اس کا حوصلہ بلند اور جذبات سچے اور نیک تھے۔ وہ سادھو سے پہلے ہی ہرن کے پاس پہنچ گیا اور چھرا ہرن کی پچھلی بائیں ٹانگ میں گھونپ دیا، ایسا ہوتے ہی سادھو کی فلک شگاف چیخ سنائی دی جس سے سارا جنگل گونج اٹھا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے سادھو اور وہ ہرن دھواں بن کر غائب ہوگئے۔

اس کے بعد شہباز لنگڑاتا ہوا جھونپڑی میں آیا اور عابد کی روح کو آزاد کردیا۔

آزاد ہوتے ہی عابد کی روح بولی۔

"نیک اور بہادر انسان اب میرا اس دنیا سے عالم ارواح میں جانے کا وقت ہوگیا ہے۔ ایسے ہی دوسروں کی مدد کرنا میرا مشن تھا، میں تمہارا شکر گزار ہوں، اب تم اپنی آنکھیں بند کرو، میں تمہیں تمہارے قصبے میں پہنچا دیتا ہوں۔"

شہباز کو محسوس ہوا کہ وہ ہوا میں اڑ رہا ہے اور پھر چند لمحے بعد اس کی سماعت میں آواز آئی۔

"اب اپنی آنکھیں کھول دو۔"

اور جب اس نے اپنی آنکھیں کھولیں تو اس نے خود کو اپنے گھر کے سامنے پایا پھر وہ اپنے گھر میں داخل ہوا گھر والے اسے دیکھ کر بہت خوش ہوئے پھر اس نے نہا دھو کر کھانا کھایا اور تھوڑی دیر آرام کرنے کے بعد وہ نور بابا سے ملنے کے لئے گھر سے نکل گیا۔

جب وہ نور بابا کے پاس پہنچا تو اسے دیکھ کر نور بابا بہت خوش ہوئے اور اسے لگا کر اس کے سر پر شفقت بھرا ہاتھ پھیرا۔

زندہ صدیاں

ایم اے راحت

قسط نمبر: 10

صدیوں پر محیط سوچ کے افق پر جھلمل کرتی، قوس قزح کے دھنک رنگ بکھیرتی، حقیقت سے روشناس کراتی، دل و دماغ میں ہلچل مچاتی ناقابل یقین ناقابل فراموش انمٹ اور شاہکار کہانی

سوچ کے نئے در یچے کھولتی اپنی نوعیت کی بے مثال، لاجواب اور دلفریب کہانی

کوروتی کا انداز بیان بڑا انوکھا تھا، میں اس کی ہر بات کو زندہ آنکھ سے دیکھ رہا تھا، محسوس کر رہا تھا اور ہر واقعہ ہر بات کو زندہ صدیاں میں من و عن رقم کرنے کے لئے تیار تھا، کوروتی نے پھر کہنا شروع کیا۔

’’میں اس وقت اصنا کیہ کی حیثیت سے سکندر کے لئے شدید بے چین ہوگئی تھی اور میں نے اپنے بھائی سے کہا۔

’’آؤ جلدی کرو ہمیں فوراً سکندر کو اس سازش سے خبردار کرنا چاہئے لیکن ٹھہرو پہلے قسم کھاؤ کہ تم اس میں شریک نہیں ہو۔‘‘

’’نہیں میں نے ان لڑکوں کی باتیں اتفاقاً سن لی تھیں۔‘‘ میرے بھائی نے یقین دلایا۔

میں نے لبادہ اوڑھا اور اسی عالم میں بھاگتی ہوئی اس کمرے میں پہنچی جہاں سکندر اپنے کمانڈروں کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا، دروازے پر پہنچ کر میں رک گئی، میرا لباس اس قابل نہ تھا کہ سب کی موجودگی میں جا سکوں، میں نے اپنے بھائی سے کہا کہ وہ سکندر کو بلا لائے، سکندر فوراً ہی آ گیا اور مجھے اس عالم میں دیکھ کر بولا۔

’’خیریت تو ہے اصنا کیہ، کیا بات ہے؟‘‘

’’خیریت کہاں ہے میرے آقا، آپ کو قتل کرنے کی سازش کی جا رہی ہے۔‘‘ میں نے اسے صورت حال سے آگاہ کیا سکندر غور سے سنتا رہا۔

’’اب مجھے اندازہ ہوا کہ دیوتاؤں نے تم جیسی شریک حیات مجھے کیوں عطا کی ہے۔‘‘ اس نے جذباتی لہجے میں کہا اور میرے بھائی کی سمت دیکھا۔

’’شاباش۔ تم یقیناً بہت بڑے انعام کے مستحق ہو۔‘‘ محافظوں کے دستے کو طلب کر کے وہ تیزی کے ساتھ شاہی خواب گاہ کی سمت روانہ ہوگئے، میں صبا کے ساتھ وہیں کھڑی رہی، میں ان نوجوان لڑکوں کا انجام اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھنا چاہتی تھی، یہ لڑکے مقدونی امراء کے تھے، ان کو فوجی تعلیم کے لئے بادشاہ کے ساتھ رکھا جاتا تھا، اپنی کم عمری کی بناء پر ان کی وفاداری غیر مشکوک ہوتی تھی، یہ رات کو شاہی خیمہ گاہ پر پہرہ دیتے اسے لباس تبدیل کراتے اس کے جسم پر ہتھیار سجاتے اور اس کا گھوڑا تیار کر کے لانے کے فرائض انجام دیتے تھے، جب یہ اطلاع مل گئی کہ تمام سازشیوں کو گرفتار کیا جا چکا ہے تو میں اپنی خواب گاہ میں واپس آ گئی، رات کو پچھلے پہر سکندر بستر پر آیا تو میری آنکھ کھل گئی۔

’’یہ سازش کیسلیتھیز نے تیار کی۔‘‘ سکندر نے کہا۔

سکندر نے صبح ہوتے ہی ٹیسلیتھینز کی گرفتاری کا حکم دے دیا تھا، میں جب دربار عالم میں پہنچی تو تمام کمانداراور دوسرے اہلکار موجود تھے، یونانی قوانین کے مطابق ملزمان کے تمام رشتے داروں کو بھی دربار میں حاضر کردیا گیا تھا، میں آریل کے برابر جا کر بیٹھ گئی۔ سازش میں ملوث لڑکوں کی عمریں پندرہ سولہ سال سے زیادہ نہ تھیں۔ ہتھکڑیوں اور بیڑیوں میں جکڑے ہوئے وہ اور بھی معصوم لگ رہے تھے، اچانک سکندر کی آواز دربار میں گونجی۔

’’بولو تم نے میرے قتل کی سازش کیوں کی شامیز؟‘‘

’’اس لئے کہ تم نے ہمیں آزاد انسانوں میں شمار کرنا ترک کردیا تھا۔‘‘ شامیز بڑی دیدہ دلیری اور بے باکی سے بولا۔ ’’تم ہمیں غلام تصور کرنے لگے ہو۔‘‘

شامیز کے باپ نے آگے بڑھ کر شامیز کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ ’’نمک حرام اپنی زبان کو لگام دے۔‘‘ اس نے غصے میں کہا۔ ’’عالم پناہ میں التجا کرتا ہوں کہ اس بیوقوف کو دربار میں گفتگو کرنے کی اجازت نہ دی جائے۔‘‘

’’خاموش رہو دامیس۔‘‘ سکندر گرجا۔ ’’اس کو وہ زہر اگلنے دو جو اس کے استاد ٹیسلیتھینز نے اس کے ذہن میں بھرا ہے۔‘‘

’’شکریہ سکندر اعظم۔‘‘ شامیز نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ’’لیکن یہ زہر وقت کے عظیم دانشور ٹیسلیتھینز نے ہمارے ذہنوں میں نہیں بھرا ہے۔ یہ زہر تو عالم پناہ آپ نے بھرا ہے، ہم سے پہلے بھی آپ اپنے ساتھیوں کو قتل کرچکے ہیں، وہ لوگ جنہوں نے آپ کو سکندر اعظم بنایا، یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے آپ کو عظیم فاتح کہلانے کے قابل بنایا جن کی ڈھالوں نے دشمن سے آپ کا دفاع کیا، جن کی تلواروں نے آپ کے دشمنوں کو سرنگوں کردیا، لیکن آپ نے ان سب کو صفائی کا موقع دیئے بغیر موت کے گھاٹ اتار دیا، افسوس کہ مجھے فن خطابت نہیں آتا لیکن آپ نے ٹیسلیتھینز جیسے عظیم فلسفی اور خطیب کو قید کردیا ہے کیونکہ وہ باتیں کرتے ہیں ان سے ذہنوں کو علم کا نور ملتا ہے آپ آزادی اظہار سے کیوں خائف ہیں، ہاں ہم نے آپ کے قتل کا منصوبہ بنایا تھا، بے شک ہمیں قتل کردیجئے، لیکن زیوس کی قسم ہمارے استاد بے گناہ ہیں۔‘‘

لیکن سکندر کا فیصلہ واقعی اٹل ہوتا تھا۔ دوسرے دن ٹیسلیتھینز سمیت ان لڑکوں کو بھی بے دردی سے سنگسار کر کے قتل کردیا گیا، سکندر اس وقت اپنے کمانداروں کے ساتھ شراب نوشی میں مصروف تھا جب یہ اطلاع آئی کہ سزا پر عمل درآمد ہوگیا ہے، سکندر کے چہرے پر اس خبر سے جو طمانیت نظر آئی اس سے مجھے اندازہ ہوا کہ وہ اپنے دوست فلسفی سے کتنا خائف تھا۔

’’اب میں آرام کی نیند سو سکوں گا۔‘‘ اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ’’ہیملش نے جذبات کی پردہ پوشی کے لئے نظریں جھکالیں، میز نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔

’’ٹیسلیتھینز کی موت کے ساتھ ہمارا شباب بھی گیا، سکندر اور میں ارسطو کی درسگاہ میں ٹیسلیتھینز کے ساتھ تعلیم حاصل کرتے تھے۔‘‘

میرے ہمدم ذیشان عالی سکندر اعظم واقعی اس بات کا عملی نمونہ تھا کہ صرف آگے دیکھو، راستے میں آنے والی ہر مزاحمت کو ہٹاتے جاؤ اور آگے بڑھتے جاؤ، چنانچہ اب اس کا ارادہ یہ تھا کہ ہندوستان کا رخ کیا جائے، موسم بہار شروع ہوتے ہی برف پگھلنا شروع ہوگئی تھی، سکندر کا عظیم اور پرشکوہ لشکر ہندوستان کی سمت روانہ ہو چکا تھا، تاحد نگاہ تک تلواریں اور نیزے چمک رہے تھے، رنگ برنگے پرچم، چاندی اور سونے کے پتر چڑھی ہوئی ڈھالیں، ہزاروں کی تعداد میں اناج اور بار برداری کا سامان لئے ہوئے اونٹ مویشی اور پھر سواروں کے دستے، ان کے پیچھے بڑی بڑی بلند منجنیقیں۔ ان سب نے مل کر سکندر کے لشکر کو اتنا پرشکوہ بنا دیا تھا کہ دیکھنے والوں پر ہیبت طاری ہوتی تھی۔ میں لشکر کا اگلا سرا نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لیکن قدموں سے لرزتی ہوئی دھمک اور آسمان تک چھائے ہوئے گردوغبار کو دیکھ کر یہ یقین ہو رہا تھا کہ کسی میں سکندر کے مقابلے پر آنے کی جرات نہ ہوگی۔ سکندر اپنے گھوڑے پر سوار تھا، اس کے گرد شاہی

محافظوں کا ایک خاص دستہ تھا جو شاندار گھوڑوں پر سوار وہ شاہانہ انداز میں تنہا بیٹھا تھا، لشکر ہر روز تمام دن سفر کرتا اور سائے ڈھلتے ہی قیام کرتا، خیمے نصب ہو جاتے کھانا پکانے کے لئے جگہ جگہ آگ روشن ہو جاتی اور ہر سمت گہما گہمی شروع ہو جاتی۔ سکندر غسل کر کے جسم پر مالش کرواتا اور پھر کمانداروں اور ان کی بیویوں کے ساتھ مل کر کھانا کھاتا، سکندر مجھ سے اتنی والہانہ محبت کرنے لگا تھا کہ بہت سے کماندار مجھ سے حسد کرنے لگے تھے، مجھے اس کا بخوبی علم بھی تھا، لیکن ظاہر ہے میں اس سلسلے میں کچھ بھی نہیں کرسکتی تھی۔''

کوروتی کی اس بات پر ذیشان عالی نے عجیب سے انداز میں اس کا چہرہ دیکھا اور بولا۔

''ہر چند کہ میں اس دور میں نہیں تھا کوروتی لیکن تم یقین کرو کوروتی اس وقت میں بھی سکندر سے بے پناہ رقابت محسوس کررہا ہوں۔''

''میرے دوست میرے محبوب ذیشان عالی! اس وقت میں اصناکیہ کے روپ میں سکندر کی بیوی کی حیثیت سے تھی، ظاہر ہے میں اصناکیہ کی حیثیت سے اپنا کردار نبھا رہی تھی اور میں اگر تاریخ بدل سکتی تو شاید سکندر کی جگہ تمہیں دیکھنا پسند کرتی۔''

کوروتی کے یہ الفاظ سن کر ذیشان عالی مسرور ہوگیا تھا، تھوڑی دیر تک خاموشی کے بعد کوروتی نے پھر کہنا شروع کیا۔

اس دن کے انتھک اور دشوار گزار سفر کے بعد ہم ایک سرسبز وادی میں پہنچ گئے، یہاں پہنچ کر سکندر نے ٹیکسلا کے راجہ اور دوسرے حکمرانوں کے پاس قاصد بھیجے اور ان کو پیغام دیا کہ وہ اطاعت قبول کرلیں اور آمد پر اس سے ملاقات کریں۔ بیس دن کے بعد انہوں نے کوچ کیا اور برف پوش پہاڑوں کی یخ فضاؤں اور دشوار گزار بلندیوں سے گزرتے ہوئے ہم ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہوگئے، گھنے جنگلوں میں ہم نے پہلی بار بے شمار بندروں کو درختوں پر اچھلتے کودتے دیکھا اور ان درختوں پر سبز رنگ کے سانپ اس کثرت سے تھے کہ ان پر رسیوں کا گمان ہوتا تھا، جنگل سے گزر کر کابل کے قریب واقع ایک شہر پہنچ گئے۔ سکندر کی شہرت اور ہیبت اس سے آگے سفر کررہی تھی۔ گرد و پیش کے تمام لوگ اس کی اطاعت قبول کررہے تھے۔ ان لوگوں کا لباس وضع قطع اور زبان ہر چیز ہمارے لئے نئی تھی۔ ہمیں قیام کے دوران زیادہ دن نہ ہوئے تھے کہ ٹیکسلا کا راجہ سکندر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لئے پہنچ گیا۔ اپنے خیمہ شاہی کے سامنے سونے کی کرسی پر بیٹھ کر سکندر نے راجہ کو باریابی بخشی، اس کے مشہور کماندار اس موقع پر اس کے گرد کھڑے تھے، اور میں زر و جواہر سے لدی سکندر کے برابر والی کرسی پر بیٹھی تھی، راجہ اس سے پہلے اس کے درباری سردار زمرد اور موتیوں سے مزین پگڑیاں باندھے ہوئے تھے۔ وہ اپنے ساتھ بے شمار قیمتی تحائف لے کر آئے تھے، اس کے بعد دراز قد راجہ نمودار ہوا، اس کے کانوں میں ہیرے کے بالی تھے جن میں جڑے ہوئے ہیروں سے روشنی کی شعاعیں پھوٹ رہی تھیں، ہاتھوں میں سونے اور جواہرات کے کنگن تھے۔

''خوش آمدید راجہ صاحب۔'' سکندر نے کہا۔

''زیوس کے بیٹے سکندر، میں تمہارا خیر مقدم کرتا ہوں، تم سے قبل مختلف لوگوں کے ہندوستان آنے کی بات صرف روایت میں سنی تھی، لیکن تم کو میں خود خوش آمدید کہنے کے لئے موجود ہوں۔''

سکندر اس تخاطب پر بہت خوش ہوا، دونوں نے اپنے اپنے رواج کے مطابق قربانی کے خون میں تلوار اور بھالے ڈبو کر اپنی دوستی کا عہد کیا، پھر تحائف کا تبادلہ ہوا۔ راجہ کے ساتھ دوسرے چھوٹے سرداروں نے بھی سکندر کی اطاعت قبول کرلی، راجہ نے بتایا کہ سکندر کو زیادہ مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑے گا، کیونکہ ہندوستان بے شمار راجاؤں میں بٹا ہوا تھا جو ایک دوسرے کے کٹر دشمن تھے۔

تیس دن کے قیام کے بعد ہم پھر روانہ ہوگئے۔ سکندر نے ایملش کو راجہ کی رہنمائی میں پہلے ہی دریائے سندھ کی جانب روانہ کردیا تھا۔ تاکہ وہ دریا پار کرنے

کے لئے جہازوں اور کشتیوں کا بیڑہ اور پل تیار کرلیں۔
مجھے ایملش کا ساتھ چھوٹ جانے کا دکھ ہوا کیونکہ وہ اپنی خوش مزاجی کی بناء پر مجھے بہت پسند تھا اور تمام کمانداروں میں صرف وہ تھا جو مجھے عزیز رکھتا تھا، ہم اب ایک ایسے پہاڑی درے سے گزر رہے تھے جہاں گاڑیوں اور پالکی کے لئے بار بار راستہ بنانا پڑتا تھا، اس سست رفتاری سے عاجز آ کر سکندر نے فوج کے دو حصے لئے اور ہمیں وہیں چھوڑ کر مجھے اچانک متلی ہو کر ایک تے ہوئی، میں سمجھی کہ بدہضمی کی وجہ سے ایسا ہوا ہے لیکن میری ساتھی عورت نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''مبارک ہو اصناکیہ، تم حمل سے ہو۔''

اور اس وقت ذیشان عالی اصناکیہ کی حیثیت سے میری خوشی قابل دید تھی، دنیا کے عظیم فاتح نے مجھے یہ اعزاز بخشا تھا کہ میں اس کے بچے کی ماں بنوں گی۔''

کوروتی نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا اور ذیشان عالی سوچنے لگا کہ کتنی عجیب بات ہے، ایک ایسی عورت جس کی عمر کا کوئی تعین نہیں کیا جا سکتا، جو بظاہر انسانی روپ میں اس کی ساتھی ہے، لیکن اس کی اصل حیثیت کیا ہے، وہ دنیا کے ہر دور میں اچھے برے لوگوں کی ساتھی رہی ہے اور اب یونانی دور کے سکندر اعظم کی بیوی ہے، واہ واہ... زندہ صدیاں واقعی ایک ایسی ہی انوکھی تحریر بن کر لوگوں کے سامنے ہوگی جس کا کردار اپنے ساتھ رہنے والی ایک عورت کے بارے میں لکھے گا ایک ایسی عجیب داستان جس میں ہر دور کی عورت کی داستان وہ اس عورت کوروتی سے سنے گا بلکہ بعض لمحات خود کو اس کے ساتھ اس دور میں بھی محسوس کرے گا۔

بہرحال کوروتی نے پھر کہنا شروع کیا۔''میں نے اپنی ساتھی عورت سے وعدہ لے لیا تھا کہ میرے حمل کو راز رکھے گی، در اصل میں یہ خوشخبری سکندر کو خود سنانا چاہتی تھی، اسے ہم سے جدا ہوئے دو ماہ گزر چکے تھے کیونکہ باقی ماندہ لشکر کے ہمراہ دوسرے راستے سے آگے بڑھ رہے تھے جو نسبتاً زیادہ طویل تھا اس دوران سکندر کے خطوط میرے پاس آتے رہے۔ شروع میں اس کے خطوط محبت اور فراق کے ذکر سے بھرے ہوتے اور ساتھ ہی ان میں تمام فوجی کارروائیوں کی تفصیل بھی ہوتی، اس نے ایک فتح کے بعد اپنے ساتھی کو وہیں چھوڑا اور خود آگے بڑھ گیا، دوسرے خط میں اس نے گور میں قبائلیوں کے مقابلے کا ذکر کیا تھا اور تیسرا خط نیسا سے آیا جس میں اس نے لکھا کہ اس شہر کے لوگ عقیدہ رکھتے ہیں کہ نیسا کی بنیاد یونانی دیوتا نے رکھی تھی، شہر کی آبادی ایک پہاڑ کے دامن میں واقع ہے۔ پہاڑ کی ڈھلوانوں پر عشق پیچاں کے پودے بڑی کثرت سے پائے جاتے ہیں یہ اتنی خوب صورت جگہ ہے کہ میں یہاں کچھ عرصہ قیام کروں گا، تم جلد از جلد یہاں پہنچ جاؤ کیونکہ میں چاہتا ہوں کہ دیونی سوس کی عبادت کے تہوار میں جو جشن طرب ہونے والا ہے وہ میں تمہارے ساتھ جشن مناؤں گا۔''

میرے ساتھ موجود عورت نے جب یہ سنا کہ خط میں دیونی سوس کے جشن کا ذکر ہے تو کہنے لگی کہ میری معلومات کے مطابق دیونی سوس کے تہوار میں زبردست دعوت ہوتی ہے اور جشن طرب میں شراب پانی کی طرح بہائی جاتی ہے جس کے بعد کسی میں ہوش باقی نہیں رہتا اور مرد عورتیں بلا کسی امتیاز کے سر عام داد عیش دیتے ہیں۔ میں نے اس کی بات مذاق میں ٹال دی کیونکہ سکندر سے اس بات کی توقع نہیں کی جاسکتی تھی کہ وہ ایسے کسی بیہودہ جشن میں شرکت کرسکتا ہے۔

سات دن کے بعد سورج ڈھلے ہم شہر نیسا پہنچے، آسمان پر تارے چمک رہے تھے اور پہاڑ کی ڈھلوانوں پر ہر سمت مشعلیں روشن تھیں، دور سے ہی زبردست شور وغل موسیقی اور طبل کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ہم نے وادی ہی میں قیام کیا اور خیمے نصب کرلئے گئے، مجھے حیرت بھی تھی اور افسوس بھی کہ سکندر نہ تو خود میرے استقبال کے لئے آیا تھا اور نہ کسی اور کو بھیجا تھا۔ پہاڑی کی چوٹی سے شوروغل کی آوازیں تیز ہوتی جارہی تھیں۔ بستی کے لوگ بے تحاشا اسی سمت بھاگے چلے جارہے تھے، ہر طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

''جشن طرب جلدی چلو جشن طرب شروع

ہوگیا۔" وہ ناچتے گاتے پہاڑی کی سمت بھاگے جارہے تھے میری ساتھی عورت مسکراتی ہوئی میرے پاس آئی اس کی آنکھیں خوشی سے چمک رہی تھیں۔

"ایسا لگتا ہے، جشن شروع ہوگیا، سب ہمارا انتظار کرکے وہیں چلے گئے، میرا خیال ہے ہم بھی وہیں چلیں، میرا شوہر ایسے جشن میں کبھی شریک نہیں ہوتا، اس لئے مجھے آزادی کے ساتھ تفریح کا موقع مل جائے گا۔"

مجھے سکندر سے ملنے کی بے تابی تھی اور دل میں یہ جلن تھی کہ جانے وہ کس کے ساتھ دادِ عیش دے رہا ہو اس لئے ہم اسی حالت میں وہاں سے روانہ ہوگئے، دوسرے کمانداروں کی عورتیں بھی ہمارے ساتھ شامل ہوگئیں۔ ہم سب نے چہروں پر نقابیں ڈال لی تھیں۔ صبا میرے ساتھ تھی پہاڑی پر جانے والے ہجوم کے ریلے نے ہم کو جلدی اوپر پہنچادیا، چوٹی پر مندر موجود تھا، قربان گاہ پر پھیلے ہوئے تازہ خون سے ہم نے اندازہ کرلیا کہ جشن شروع ہوچکا ہے، ہر سمت درختوں کے جھنڈ جھاڑیاں اور عشق پیچاں کی بیلوں سے بنے کنج تھے۔ ہم جیسے ہی آگے بڑھے ایک سمت سے بہت سے لوگ دف اور جھانجھیں بجاتے ہوئے نکلے، ان کے چہروں پر بھیانک نقابیں چڑھی ہوئی تھیں لیکن جسم لباس سے عاری تھا، ان کے ساتھ ہی شراب کا ایک تیز بھبکا آیا میں نے مڑ کر دیکھا میری ساتھی عورت غائب ہوچکی تھی، میرے لئے اس جہنمی محفل طرب کو مزید دیکھنا ممکن نہ تھا، اس لئے صبا کو فوراً ساتھ لے کر فوراً واپس روانہ ہوگئی، ہم بھاگتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے، مقدونی محافظوں نے ہمیں شاہی خیمہ گاہ تک پہنچادیا، لیکن سکندر خیمے میں موجود نہ تھا۔ میرے بھائی نے ندامت سے جھکی ہوئی نظروں سے بتایا کہ وہ جشن میں شریک ہونے گیا ہے۔

صبا نے مجھے غسل دیا اور اس کے بعد میں لیٹ گئی۔ پہاڑی سے آنے والے شور وغل اور قہقہوں کی آوازیں ذہن پر ہتھوڑے چلا رہی تھیں۔ رات کے پچھلے پہر سکندر واپس آیا تو محافظ اسے سنبھالے ہوئے تھے، وہ نشے میں اتنا دھت تھا کہ اسے کسی بات کا ہوش نہ تھا مجھے دیکھ کر اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔

"اصنا کیہ..... اوہ..... میری اصنا کیہ....." اس نے لڑکھڑاتی زبان سے کہا اور میرے بازوؤں میں گر کر سوگیا۔

جشن طرب کا سلسلہ تین دن جاری رہا، سکندر اور اس کے ساتھی تمام دن سوتے اور تمام رات رنگ رلیاں مناتے۔ میں نے دانستہ یہ دن اپنے خیمے میں گزارے، سکندر کا یہ رویہ مجھے بے حد شاق گزرا تھا اور میں بے حد اداس تھی۔ اسی دن میرے بابا بھی نیسا پہنچ گئے، وہاں سے آنے کے بعد میری ان سے اب تک ملاقات نہ ہوسکی اس لئے ان کی آمد سے بڑی خوشی ہوئی۔ میں نے ان سے شکوہ کیا کہ سکندر کو اہل نیسا کے اس بے ہودہ جشن میں شرکت نہیں کرنی چاہئے تھی لیکن انہوں نے مجھے سمجھایا کہ فضول اندیشے نہ کروں۔ بادشاہوں کے لئے ایسے مواقع پر شرکت کرنا ضروری ہوتی ہے، مجھے ایک بار پھر اوانش کی یاد ستانے لگی۔

جشن کے خاتمے کے بعد سکندر نے مزید تین دن نیسا میں قیام کیا تاکہ اس کے ساتھی آرام کرکے تازہ دم ہوجائیں۔ روانگی سے ایک دن قبل رات کو میں بستر پر لیٹی ہوئی تھی کہ پردہ اٹھا اور سکندر اندر داخل ہوا، میں نے سرد مہری کا مظاہرہ کیا تو بڑی محبت سے میرے پاس بیٹھ کر بولا۔

"اصنا کیہ، میں تم سے شرمندہ ہوں، تم نے اپنے حاملہ ہونے کا ذکر کیا تو میں نشے میں تھا، لیکن تم نے یہ خوشخبری مجھے خط میں کیوں نہ تحریر کی۔"

"میں آپ کو خود یہ خبر مسرت سنانا چاہتی تھی، لیکن افسوس کہ جب یہاں پہنچی تو آپ ہوش وخرد سے دور پہنچے ہوئے تھے۔"

"مجھے افسوس ہے اصنا کیہ" سکندر نے معذرت کی۔ "لیکن تھکی ماندی فوج کو کبھی کبھی اپنے جذبات کی تسکین کی بھی ضرورت ہوتی ہے، میں نے اپنے لشکریوں کی خوشنودی کے لئے جشن میں شرکت کی تھی۔"

سکندر کا انداز معذرت آمیز تھا لیکن اس کے

باوجود میں نے اپنی سردمہری جاری رکھی۔ دوسرے دن ہم نے نیسا سے کوچ کیا۔ سکندر نے بچے کی پیدائش کا اعلان عام کردیا تھا۔ اس رات بھی سکندر کے پاس نہ گئی۔ تیسری شب کھانے کے بعد سکندر اپنے ساتھیوں کے ساتھ پانسہ کھیلنے بیٹھ گیا، شیمر نے کہا۔

''ہم جس طرف پیش قدمی کرتے ہیں لوگ پہلے سے بستیاں خالی کر کے چھپ جاتے ہیں ایسا لگتا ہے انہیں کسی طرح ہماری آمد کی خبر پہلے لگ جاتی ہے۔''

سکندر ایک لمحہ سوچتا رہا پھر اس نے کہا۔ ''ہمیں ایک بار پھر لشکر کو چار حصوں میں تقسیم کردینا چاہئے۔ میراز تم مشرق کی سمت سے آگے بڑھو، بطلیموس مغرب کا راستہ اختیار کریں۔ ایملش اور میں باقی دونوں سمتوں سے بڑھتے رہیں گے۔ اسی طرح ہم ہر سمت سے انہیں گھیرے میں لے لیں گے۔'' سب نے اس خیال کی تائید کی وہ سب منصوبہ بندی میں لگ گئے تو میری ساتھی عورت جو خود بھی ایک کماندار کی بیوی تھی مجھے علیحدہ لے گئی۔

''تم کو کیا ہوگیا ہے اصنا کیہ، اس نے کہا۔ ''نیسا پہنچنے کے بعد سے تم نے جو سرد رویہ سکندر کے ساتھ اختیار کیا ہے اس کا ذکر اب عام ہوگیا ہے، یہاں تک کہ لوگوں کو بھی یہ معلوم ہے کہ تم ایک رات بھی اس کے پاس نہیں گئیں۔''

''تم کو معلوم نہیں کہ میں حاملہ ہوں۔'' میں نے بے رخی کے ساتھ جواب دیا۔

وہ ہنس پڑی پھر بولی۔ ''معلوم ہے، اس لئے تو سکندر کو خوش رکھنا اور بھی ضروری ہے، ایسا نہ ہو کہ اس کے وقار کو ٹھیس پہنچے اور بات قابو سے باہر ہوجائے۔''

اس کی سرزنش نے مجھے خود بھی سوچنے پر مجبور کردیا، میں واقعی زیادتی کررہی تھی۔

جب سب لوگ چلے گئے تو میں نے بڑے پیار سے سکندر کو مخاطب کیا۔ ''آپ نے آج رات بہت کم کھانا کھایا۔''

سکندر نے چونک کر مجھے دیکھا، اس کی آنکھوں میں تمنائیں بھری ہوئی تھیں۔

''حسین اصنا کیہ بچپن میں میرے استاد نے نصیحت کی تھی کہ رات کو کھانا کم کھایا کرو، تب سے میں نے بھوک پر قابو پانا سیکھ لیا ہے، لیکن افسوس کہ استاد نے یہ نہیں سکھایا کہ اصنا کیہ کی محبت کی بھوک پر کیسے قابو پایا جائے۔''

میں خود بھی محبت کی بھوکی تھی، اس لئے جب سکندر نے بازو پھیلائے تو میں بے ساختہ ان میں سما گئی ہم کچھ دیر کے لئے سب کچھ بھول گئے۔

تین دن کے بعد جب سکندر روانہ ہونے کی تیاریاں کررہا تھا تو اس نے اچانک تمام خدمت گاروں کو باہر بھیج دیا اور مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔

''شوہر کے جسم پر ہتھیار سجانا بیوی کا فرض ہے۔''

''اس سے زیادہ خوشی کی کیا بات ہوسکتی ہے کہ یہ خدمت مجھے نصیب ہو۔'' میں نے جواب دیا۔ ''لیکن آپ کا جدائی کا تصور سوہان روح بنا ہوا ہے۔''

''اصنا کیہ، آج تم غیر معمولی پریشان نظر آتی ہو۔'' سکندر نے کہا۔ ''فکر نہ کرو میں تمہیں برابر خط لکھتا رہوں گا۔'' اس نے مجھے بڑی والہانہ محبت سے الوداعی بوسہ دیا۔

ہندوستان میں ہماری پیش قدمی جاری رہی، روانگی کے دو ہفتے بعد سکندر کا خط موصول ہوا وہ ہیران میں پیش قدمی کررہا تھا، وہاں کی رانی شیرانہ شہر کا دفاع کررہی تھی، اس نے دوسرے خط میں ہیران کی فتح کی خوشخبری دی۔ رانی نے صلح کر کے اطاعت قبول کرلی تھی، کئی دنوں کی جدائی کے بعد میں پھر سکندر کے پاس پہنچ گئی۔ ہیران میں ہمارا پرجوش خیر مقدم کیا گیا۔ میری پالکی پاس پہنچتے ہی سکندر ایک خیمے کا پردہ ہٹا کر بھاگتا ہوا نکلا اور لوگوں کی پرواہ کئے بغیر مجھے پالکی سے نکال کر اپنے بازوؤں میں بھرلیا۔

''کتنے دن ہوگئے میری اصنا کیہ۔'' اس نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''چھ ماہ۔'' میں نے شرماتے ہوئے جواب دیا۔

''خدا کی برکتوں سے یقین ہے کہ بیٹا ہوگا۔''

"زیوس کی دعاؤں سے وہ سکندر کا نام روشن کرے گا۔" سکندر نے بڑے فخر سے کہا۔ "لیکن جان من افسوس یہ ہے کہ اس حالت میں اب تم میرے ساتھ سفر نہ کرسکو گی۔" پھر ہم لوگ بہت دیر تک باتیں کرتے رہے اس کے بعد سکندر چلا گیا اور مجھے نیند آگئی۔

صبح میری آنکھ کھلی تو باہر شور ہو رہا تھا۔ صبا نے بتایا کہ ہیران کی رانی سکندر کے لئے تحائف لے کر آئی ہے۔ رانی سانولے رنگ کی ایک خوب صورت عورت تھی، سکندر نے اس کا استقبال بڑے تپاک سے کیا، بعض کنیزوں نے میرے کان بھرے کہ سکندر اس دلفریب عورت پر فریفتہ ہوگیا ہے اور ایک رات اس کے ساتھ گزار بھی چکا ہے۔ میں عورت تھی اس لئے حسد کی چنگاری سینے میں سلگ اٹھی، لیکن پھر سکندر نے دوسرے ہی دن فیصلہ کرلیا کہ وہ شہر کی مدد کے لئے جس کے آس پاس جنگجو قبائل بھی پناہ گزین ہوگئے تھے، قلعہ کی فصیلوں پر چڑھنا دشوار ہوگیا تھا کیونکہ وہ اتنی شدید تیر اندازی کرتے تھے کہ سکندر کے سپاہیوں کے لئے اس قلعے کے قریب پہنچنا بھی مشکل ہوجاتا تھا۔

سکندر نے قلعے کے قریب پہنچ کر قیام کیا اور قریبی جنگلوں میں سے بڑے بڑے درخت کٹوا کر اس کے اتنے بلند مچان بنوائے کہ فصیلوں تک پہنچنا ممکن ہوجائے۔ چودہ دن کی مسلسل محنت کے بعد یہ مچان تیار ہوگئے، میں اپنے خیمے میں کمانداروں کی بیویوں کے ساتھ باتیں کررہی تھی کہ اچانک زبردست شور سنائی دیا، ہم سب لوگ بھاگ کر دروازے سے باہر جھانکنے لگے۔ سکندر نے قلعے پر حملہ کرنا شروع کردیا تھا۔ ہزاروں سپاہی مچانوں پر چڑھ کر قلعہ میں داخل ہونے کی کوشش کررہے تھے۔ قلعہ کے اندر سے ہندوستانی قبائل ان پر پتھروں اور تیروں کی بارش کررہے تھے۔ زد میں آنے والے بے شمار سپاہی بلند مچانوں سے گر کر ہلاک اور زخمی ہورہے تھے۔ لیکن جیسے ہی ایک گرتا دوسرا اس کی جگہ پہنچ جاتا۔ میری نگاہیں سکندر کے چمکتے ہوئے خود پر جمی ہوئی تھیں۔ وہ جدھر جاتا نگاہیں اس کا تعاقب کرتیں، اب کچھ مقدونی تیر انداز فصیل پر پہنچ کر اندر مزاحمت کرنے والوں کو نشانہ بنارہے تھے، لیکن اندر سے بھی تیروں کی بوچھاڑ جاری تھی اور پھر فصیل پر دست بدست جنگ شروع ہوگئی۔ میرا دل زور زور سے اچھل رہا تھا، اگر سکندر کو کچھ ہوگیا تو کیا ہوگا، سارا جسم خوف سے کانپ رہا تھا، اچانک اتنے زور کا درد اٹھا کہ میں چیخ پڑی۔

"ارے تم کو کیا ہوا؟" میری ساتھی عورت نے چونک کر کہا۔ "ایسا لگتا ہے کہ تمہارا وقت آگیا ہے۔"

"لیکن ابھی تو ساتواں مہینہ ہے۔" میں نے درد سے کراہتے ہوئے کہا۔

"زیوس رحم کرے، ممکن ہے تمہیں ساتویں مہینے ہی ولادت ہونے والی ہو، ایسا ہوتا ہے گھبراؤ نہیں، میں شاہی طبیب کو پیغام بھجواتی ہوں کہ اصنا کیہ کی ولادت ہونے والی ہے۔" میری ساتھی عورت باہر نکل گئی۔

ایک طرف جنگ کی چیخ وپکار سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ دوسری طرف عورتوں نے چلانا شروع کردیا، میں نے چیخ کر کہا کہ پہلے باروس کو بلاؤ، مجھے صرف ایک ہی ڈر تھا کہ کہیں حمل ضائع نہ ہوجائے، لیکن خدا کو میرے خواب شرمندہ تعبیر کرنا منظور تھے۔ میرے بطن سے سکندر کا جانشین وجود میں آگیا تھا، ہر سمت خوشی کے شادیانے بجنے لگے۔ خوشی سے میری آنکھوں سے آنسو رواں ہوگئے، بالآخر باروس کی پیشگوئی پوری ہوگئی تھی۔

آہ میرے محبوب ذیشان عالی! اس وقت میں کوروتی کی حیثیت سے جس کرب میں تھی اس کا اندازہ لگانا بے حد مشکل ہے، بڑی مشکلوں سے اس سے نجات مل سکی تھی اور ایسا کرنے کے لئے مجبور تھی ورنہ مجھے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے پتھر کا بن جانا ہوتا۔ بہر حال شام ہونے سے پہلے ہی جنگ کا خاتمہ ہوگیا۔ کچھ دیر بعد سکندر پردہ ہٹا کر تیزی سے کمرے میں داخل ہوا وہ اب تک جنگی لباس میں تھا اور خود گرد و خون سے اٹا ہوا تھا۔

"جان من، فتح ہوتے ہی سب سے پہلے خوشخبری

یہ سنی کہ تم ماں بن گئی ہو۔'' اس نے جھک کر بڑی محبت سے مجھے بوسہ دیا اسے شاید میری بے تابی کا علم تھا جو اتنی جلدی آ گیا۔

''لیکن سکندر یہ صرف سات ماہ کا ہے، اتنا ذرا سا کہ ہاتھ لگاتے ڈر لگتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''بہرحال اس وقت سکندر کی خوشی قابل دید تھی، پھر وہ چلا گیا، مجھ پر جانے کیوں افسردگی طاری تھی، حالانکہ سکندر نے بچے کی پیدائش پر بے پناہ مسرت کا اظہار کیا تھا اور خود میری بھی مراد بر آئی تھی۔ دوسرے دن ہر سمت فضا میں گوشت کے جلنے کی بو پھیلی رہی کیونکہ مرنے والوں کی لاشیں جلائی جا رہی تھیں۔ مقدونی اپنے مردوں کو جلا کر ان کی قبریں بنایا کرتے تھے۔

سکندر نے فیصلہ کیا کہ جب تک شاہی طبیب مجھے چلنے کی ہدایت نہ دیں شاہی خیمہ پہاڑی کے دامن میں نصب رہے گا اور لشکر کا بڑا حصہ بھی مقیم رہے گا، لیکن سکندر نے خود بہت سے کمانداروں کو ساتھ لے کر پیش قدمی جاری رکھی۔

سکندر کی روانگی کے دوسرے دن میری تمام مسرتوں پر اوس پڑ گئی۔ میرے بچے نے اچانک دودھ پینا بند کر دیا، شاہی طبیب نے انگلی پر شہد لگا کر اسے چٹانا چاہا لیکن بچے کا حلق بند ہو چکا تھا، دو دن شاہی اطباء اور ہاروس بچے کی جان بچانے کی ہر ممکن کوشش کرتے رہے لیکن سب تدبیریں ناکام رہیں کسی دوا نے کام نہ کیا اور میرا پھول سا بچہ دم توڑ گیا، میں صدمے سے پاگل سی ہو گئی، ہاروس کو دیکھ کر میں اس پر برس پڑی۔

''تمہاری پیشگوئی جھوٹی تھی، بتاؤ اب سکندر کا کون جانشین بنے گا؟'' میں غم سے بے تاب ہو کر چلائی، ہاروس نے مجھے تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''خدا پر بھروسہ رکھو اعنا کیہ، وہ تمہیں ایک اور بیٹا عطا کرے گا۔''

لیکن تسلیاں کسی ماں کی ممتا کو اولاد کے صدمے سے نجات نہیں دلا سکتی ہیں، رو رو کے میرا برا حال ہو گیا، یہ لوگ مجھے تسلیاں دیتے رہے، مجھے صبر دلانے کے لئے دعا میں مانگی گئیں، لیکن چار دن تک میں بھوکی پیاسی غم سے نڈھال پڑی سسکیاں لیتی رہی، اور پھر اسی عالم میں مجھے شدید بخار ہو گیا، بے ہوشی کے عالم میں میری چیخیں بلند ہوتی رہیں، یہاں تک کہ بچے کی طرح میرا حلق بھی بند ہو گیا اور غذا تو کیا پانی کا ایک قطرہ بھی حلق سے اترنا ممکن نہ رہا، علاج کی تمام تر کوششیں ناکام ثابت ہوئیں، دعائیں بھی بے اثر ثابت ہوئیں، جب سب کو یقین ہو گیا کہ میرا بچنا محال ہے تو سکندر کو مطلع کرنے کے لئے ایک تیز رفتار قاصد روانہ کیا گیا، مجھے اپنی موت کا یقین ہو چکا تھا، ذرا بھی ہوش آتا تو میں سکندر کو آواز دیتی اور پھر مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میں تاریکیوں میں ڈوبتی چلی جا رہی ہوں، شاید میں مر رہی تھی۔

کوروتی کی حیثیت سے بھی میں پریشان ہوگئی تھی، ظاہر ہے اگر اعنا کیہ اس عالم میں مر گئی تو ایک بار پھر مجھے میرے دشمن کا سامنا کرنا پڑے گا، لیکن شاید ابھی میری بچت قدرت کو منظور تھی۔ ایک شام میں اسی طرح بے سدھ پڑی ہوئی تھی کہ ایک آواز سنائی دی۔

''اعنا کیہ، اعنا کیہ...'' ایک محبت بھری آواز مجھے بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی، اس آواز میں جانے کیا جادو تھا، جانے کیسا رس تھا، کیسی مٹھاس تھی، میرا دل بے ساختہ ہونے کو چاہ رہا تھا میں آنکھیں کھول دینا چاہتی تھی لیکن بے بس تھی، وہ آواز مسلسل مجھے بلا رہی تھی، مجھے پکار رہی تھی، میرا روان رواں لبیک کہنے کو بے تاب ہو رہا تھا میں زندگی کی دعا مانگ رہی تھی، یہاں تک کہ اچانک میری آنکھ کھل گئی۔ میرا محبوب، اولاش مجھ پر جھکا ہوا تھا، اس نے میرے دونوں ہاتھ مضبوطی سے پکڑ رکھے تھے، اس کا حسین چہرہ مسکرا رہا تھا۔ اس کی آنکھیں محبت سے چھلک رہی تھیں، ان سے محبت کا نور پھوٹ کر میری رگ و پے میں سرایت کر رہا تھا، اس کی محبت بھری شیریں آواز میرے کانوں میں رس گھول رہی تھی، اچانک اولاش کا چہرہ دھندلانے لگا ایک بار پھر میں تاریکیوں میں ڈوبنے لگی، اولاش نے بے تاب ہو کر آواز دی۔

''اصنا کیہ... اصنا کیہ... آنکھیں کھولو، دیکھو میں تمہارے پاس بیٹھا ہوں اصنا کیہ۔''

میں نے اپنی تمام تر قوت ارادی سے کام لے کر آنکھیں کھول دیں اولاش میرے پاس بیٹھا ہوا تھا، اس نے جلدی سے ایک پیالہ میرے لبوں سے لگا دیا۔

''اصنا کیہ یہ شربت پی لو، یہ محبت کی شراب ہے، میری محبت کی شراب۔'' اس نے سرگوشی میں کہا۔

''میں نہیں پی سکتی۔'' میں نے بے بسی کے عالم میں کہا۔

اولاش نے اپنے بازو کے سہارے مجھے اٹھا کر پیالہ پھر میرے لبوں سے لگا دیا، میرا سر اس کے سینے سے لگا ہوا تھا، اس کے دل کی دھڑکنیں مجھے محسوس ہو رہی تھیں۔ ''اس کو پی لو اصنا کیہ، میری زندگی، میری تمنا تم پی سکتی ہو، میری خاطر، اپنے اولاش کی خاطر اسے پی لو، میں قسم کھاتا ہوں کہ تم پی سکتی ہو، تمہیں کچھ نہیں ہوا ہے، تم پی سکتی ہو۔''

اس کے الفاظ میں جانے کون سا جادو تھا، وہ کہہ رہا تھا تم پی سکتی ہو اور مجھے یقین تھا کہ وہ سچ کہہ رہا ہے، میں نے لب کھول دیئے۔ شراب میرے حلق سے اتر رہی تھی، رگ و پے میں آگ سی دوڑنے لگی۔

''شاباش... شاباش جان من اب تم بالکل ٹھیک ہو، لو اب اسے کھاؤ، اس سے طاقت آئے گی۔''

اور میں نے اس کے حکم کی تعمیل کی اس نے آہستہ سے مجھے پھر لٹا دیا۔ ''اب تم صحت یاب ہو جاؤ گی، خدا عظیم ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اولاش، یہ سب کیا ہے کیا تم زندہ ہو، میں بھی زندہ ہوں کیا ہم دنیا میں ہیں؟''

اس نے سر ہلایا، میں نے دیکھا کہ خوشی سے اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور تب میری نظر سامنے کھڑے ہوئے ہاروس پر پڑی، میرا حلق اب کھل چکا تھا، اولاش نے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''آرام کرو اصنا کیہ، اب تم بالکل ٹھیک ہو۔'' اولاش نے بڑے پیار سے یقین دلایا۔

''مجھے اپنے بارے میں بتاؤ۔'' میں نے آہستہ سے کہا، نقاہت سے میری آواز نہیں نکل رہی تھی، ہاروس نے قریب آ کر آہستہ سے کہا۔

''باتیں بعد میں کر لینا، ابھی تم کو آرام کی ضرورت ہے سو جاؤ، اب ہم برابر والے خیمے میں انتظار کریں گے۔ اولاش کی روحانی قوت نے تمہیں نئی زندگی عطا کی ہے۔''

میری آنکھ کھلی تو خیمہ میں لیمپ جل رہا تھا، میرا بخار اتر چکا تھا اور حیرت انگیز طور پر میں خود کو بالکل توانا محسوس کر رہی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ کیا میں نے کوئی حسین خواب دیکھا تھا یا واقعی اولاش یہاں آیا تھا۔ اسی لمحے ہاروس اندر داخل ہوا میں نے بے ساختہ پوچھا۔

''کیا اولاش واقعی یہاں موجود ہے؟''

''ہاروس نے سر ہلا کر حامی بھری۔ ''وہ لشکر کے ساتھ ہے اور لوگوں کا روحانی معالج ہے۔''

خوشی سے میرا سارا وجود جھوم اٹھا میرا محبوب زندہ ہے میرا اولاش میرے پاس ہے۔

''محترم ہاروس اولاش کی موجودگی کا علم آپ کو کب سے تھا؟'' میں نے پوچھا۔

''کاہن اعظم نے افسردہ نظروں سے مجھے دیکھا، تقریباً گیارہ ماہ قبل سے۔'' انہوں نے فکر مند لہجے میں کہا۔ ''ہندوستان کی سرحدوں میں داخل ہوتے ہی مجھے اطلاع ملی تھی کہ لشکریوں کے ساتھ ایک ایسا شخص بھی سفر کر رہا ہے جو ہر تکلیف کا علاج روحانی طریقے سے کرتا ہے علاج بالاعتقاد کا یہ ماہر لشکر کے ساتھ چلنے والے خدمت گاروں کے ساتھ رہتا تھا، مجھے تجسس ہوا تلاش کیا تو دیکھا کہ وہ اولاش ہے، میں نے تم کو نہیں بتایا کیونکہ میرا خیال تھا اس خبر سے تم کو اذیت ہوگی تم اب سکندر کی بیوی ہو، لیکن جب تمہاری جان بچانے کی تمام تدبیریں ناکام ہوگئیں تو میں نے اسے بلوایا۔ میں نے دانستہ تمہارے کمرے سے سب کو یہ کہہ کر ہٹا دیا تھا کہ روحانی علاج کے لیے مکمل تنہائی اور یکسوئی ضروری ہے۔''

میں نے آہستہ سے التجا کی۔ ’’خدا کے لئے مجھے اس سے ذرا دیر کے لئے ملوا دیجئے۔‘‘

ہاروس مجھے سرزنش کی نظروں سے دیکھتے ہوئے باہر چلے گئے، لیکن کچھ دیر کے بعد ہی اولاش خیمے میں داخل ہوا، میں سحر زدہ نظروں سے اس کے حسین چہرے کو دیکھتی رہی، وہی سرخ سنہرے بال، وہی معصوم چہرہ اور وہی خوب صورت آنکھیں جن میں ہر لمحہ محبت کے چراغ روشن رہتے۔

’’اوہ اولاش، اولاش.....‘‘ میں اس کے سینے سے لگ کر سسکیاں لینے لگی۔ ’’تم مجھے چھوڑ کر کہاں چلے گئے تھے؟‘‘

اولاش احتیاط سے کام لے رہا تھا کیونکہ کچھ فاصلے پر ہاروس ہماری جانب پشت کئے کھڑے تھے۔

’’میں نے واپس بابل پہنچنے کی کوشش کی، تم کو پیغام بھیجنا چاہا لیکن افسوس کچھ ممکن نہ ہو سکا۔‘‘ اس نے افسردہ لہجے میں کہا۔

’’میں نے تمہارا بہت انتظار کیا اولاش، مجھے تمہارے وعدے پر یقین تھا، لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، پھر بھی یقین جانو اولاش، زندگی کی آخری سانس تک میں تم سے اسی طرح محبت کرتی رہوں گی۔‘‘

’’میں اپنے وعدے پر آج بھی قائم ہوں اصناکیہ، مجھ میں کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔‘‘ اس نے سرگوشی کی۔

میں بے ساختہ رو پڑی۔ ’’میں آج بھی تمہاری ہوں اولاش، ہمیشہ تمہاری رہوں گی، لیکن میں سمجھی کہ تم جنگ میں مارے گئے۔‘‘ میں نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا۔ اس نے مجھے تسلی دی، ہم زیادہ دیر باتیں نہ کر سکے کیونکہ قدموں کی چاپ سن کر ہاروس نے خبردار کیا کہ سکندر کا ایک خاص شاہی دستہ باریابی کے لئے اس طرف آ رہا ہے۔ دستہ جب اصناکیہ کی خبر گیری کے لئے اندر داخل ہوا تو اولاش وہاں سے جا چکا تھا۔

شاہی دستے نے اصناکیہ کی خیریت دریافت کی اور اس کے بعد وہاں سے چلا گیا۔ شاہی دستے کے جانے کے بعد میں نے ضد کر کے ہاروس کو مجبور کیا کہ اولاش کو بلوائیں، انہوں نے اور صبا نے مجھے باز رکھنے کی کوشش کی اور سمجھایا کہ اس طرح بار بار اس کا بلوانا لوگوں کو شبہ میں مبتلا کر سکتا ہے، لیکن میں نہیں مانی، مجبوراً انہوں نے ایک قاصد کو بھیج کر اولاش کو بلوا لیا، وہ خود تو چلے گئے لیکن صبا اور قاصد کو خیمے میں چھوڑ دیا، میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ کس طرح اولاش کے بازوؤں میں سما جاؤں، لیکن احتیاط دامن گیر تھی اس لئے دل پر جبر کر کے رہ گئی۔ دیر تک سرگوشیوں میں اظہار محبت کرتے رہے، پھر میں نے پوچھا۔

’’تم مجھ سے بابل آ کر کیوں نہیں ملے؟‘‘

وہ چند لمحوں تک مجھے پیاری نظروں سے دیکھتا رہا، پھر ٹھنڈی سانس لے کر بولا۔ ’’لمبی کہانی ہے، شاید میں کبھی نہ ملتا، کیونکہ سکندر جیسے بادشاہ کی بیوی کے حضور میں باریابی کی ہمت مجھ میں نہ تھی، لیکن تمہاری بیماری نے مجھے مجبور کر دیا۔‘‘ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ’’ایسس کی جنگ کے بعد میں گرفتار ہو گیا جہاں غلاموں کے ساتھ مجھے بھی ایک نامور طبیب کی غلامی میں دے دیا گیا، طبیب نے جب جڑی بوٹیوں میں دلچسپی دیکھی تو آزاد کر کے مجھے اپنا شاگرد بنا لیا اور وہیں ایک مرتبہ ایسا اتفاق ہوا کہ ایک مریض کو جب کسی دوا سے افاقہ نہ ہوا اور اس کی موت یقینی نظر آنے لگی تو میں نے دعاؤں اور روحانی طریقے سے علاج کیا اور اسے شفا ہو گئی، اس دن مجھے اپنی اس انجانی روحانی قوت کا پہلی بار اندازہ ہوا۔‘‘ اولاش نے مسکراتے ہوئے کہا اور پھر مجھے محبت بھری نظروں سے دیکھتا ہوا بولا۔

’’لیکن اصناکیہ، میں تمہارے فراق میں تڑپ رہا تھا، اس لئے موقع ملتے ہی فرار ہو کر یروشلم پہنچ گیا، لیکن گھر پر بھی جی نہ لگا تو کسی نہ کسی طرح بابل پہنچنے میں کامیاب ہو گیا، لیکن افسوس کہ بہت دیر ہو چکی تھی۔‘‘ اس نے ایک سرد آہ بھر کے کہا۔ ’’جس دن میں وہاں پہنچا اس روز تمہاری شادی کا جشن منایا جا رہا تھا۔‘‘

’’اوہ اولاش، میں مجبور تھی، خدا کی قسم اس میں میری مرضی کو کوئی دخل نہ تھا۔‘‘

''مجھے معلوم ہے اصناکیہ، میں تم کو الزام نہیں دیتا، شاید یہی ہماری قسمت ہے۔'' اولاش نے غمزدہ اور مایوس لہجے میں کہا۔ ''میں آج بھی...... '' لیکن ابھی اولاش کا جملہ پورا نہیں ہوا تھا کہ صبا بھاگ کر قریب آئی اور بتایا کہ مقدونی عورتیں اس طرف آرہی ہیں، اس طرح یہ گفتگو نامکمل رہ گئی تھی۔

ذیشان عالی! اصناکیہ کی حیثیت سے میں ایک عجیب سے موڑ پر تھی ایک طرف دنیا کا عظیم فاتح سکندر اعظم اور ایک طرف اصناکیہ کا محبوب اولاش، بڑی عجیب سی صورت حال تھی۔ اصناکیہ سکندر کی بیوی تھی جبکہ اولاش لشکریوں میں ان غریب لوگوں کے ساتھ رہتا تھا جو بن بلائے مہمان کی طرح فوج کے ساتھ سفر کررہے تھے اور لوگوں کی خدمت کرکے اپنا پیٹ بھرتے تھے، میں ہر لمحہ اس سے ملنے کے لئے تڑپتی رہتی تھی، پھر اچانک مجھے ایک ترکیب سوجھی اگر کسی طرح سکندر کو اس بات پر راضی کرلیا جائے کہ اولاش کو شاہی معالجوں میں شامل کرلے تو ملاقات ہونے کی راہ ہموار ہوسکتی تھی۔ کچھ دن بعد ہم سکندر کے پاس پہنچ گئے۔ رات کو جب ہم شاہی خیمے میں یکجا ہوئے تو میں نے اپنے بچے کی موت کا ذکر شروع کردیا، سکندر نے مجھے فوراً روک دیا اور بولا۔

''اسے بھول جاؤ اصناکیہ، تم موجود ہو تو دیوتا ہمیں اس کا نعم البدل بھی ضرور دیں گے، میں تو اس بات پر شکر ادا کرتا ہوں کہ تمہاری جان بچ گئی ہے۔''

مجھے موقع مل گیا تھا اس کے لئے میں نے فوراً کہا۔

''اگر اولاش نہ ہوتا تو میں بھی تم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہوگئی ہوتی، کیا تم اس روحانی معالج کو انعام نہ دوگے؟''

''اوہ کیوں نہیں، اس نے میری اصناکیہ کو شفا یاب کیا ہے، میں خود بھی اس عطائی سے ملنے کا خواہش مند ہوں۔''

''وہ عطائی نہیں سکندر جب تمام شاہی اطباء میری زندگی سے مایوس ہوچکے تھے تب اس نے مجھے صحت یاب کیا۔''

''او ہو تم تو واقعی اس کی بڑی معتقد ہوگئی ہو۔'' سکندر نے مسکرا کر جواب دیا۔ ''لو میں ابھی دیکھے لیتا ہوں کہ اس کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔'' سکندر نے حکم دیا کہ اولاش کو فوراً حاضر کیا جائے۔

میرا دل خوشی سے اچھلنے لگا تھا، لیکن جب خادم نے اطلاع دی کہ اولاش حاضر ہوگیا ہے تو اچانک میرا چہرہ زرد پڑ گیا، مجھے فوراً خدشہ محسوس ہوا کہ اگر سکندر کو ہماری محبت پر ذرا بھی شبہ ہوگیا تو میرا جو حشر ہوگا وہ تو اپنی جگہ اولاش کی موت یقینی تھی، بڑی مشکل سے میں نے خود پر قابو پایا، اسی لمحے اولاش خیمے میں داخل ہوا اس نے زمین بوس ہوکر سکندر کو تعظیم دی۔

''سکندر اعظم کا اقبال بلند ہو، غلام حاضر ہے۔'' اولاش نے نظریں جھکائے ہوئے کہا۔ سکندر خوش ہوگیا کیونکہ اولاش نے یونانی زبان میں بات کی تھی۔

''اٹھو اولاش، میرے قریب آکر بیٹھو۔'' سکندر نے اولاش کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''میں تمہارا ممنون ہوں تم نے میری اصناکیہ کی جان بچا کر میری خوشنودی حاصل کرلی ہے اور تم بڑی شستہ یونانی بولتے ہو، کیا تم نے دوسرے مضامین میں بھی تعلیم حاصل کی ہے۔''

''شہنشاہ اعظم، پہلے میں نے مذہبی تعلیم حاصل کی تھی، پھر ریاضی یونانی عبرانی اور پھر موسیقی کی تعلیم حاصل کی، میں بڑا اچھا گلوکار تھا لیکن ظاہر کے محاصرے کے دوران ایک تیر نے میرا گلا ایسا زخمی کیا کہ میں نے گانا چھوڑ دیا۔''

''اولاش، میرے استاد نے مجھے طب کی تعلیم دی ہے اس لئے مجھے روحانی علاج پر اعتقاد نہیں ہے، لیکن تم مجھے بلا جھجک اس کے بارے میں بتاؤ۔''

اولاش نے مختصراً بتایا۔ ''میں نے جنگ کے دوران بہت سے زخمیوں کو اس طریقے سے شفایاب کیا تھا۔''

''تو پھر اپنے گلے کا علاج کیوں نہ کرسکے؟'' سکندر نے فوراً سے ٹوکا۔

''اس لئے عالی جاہ کہ جو تسکین دوسروں کو شفا یاب دیکھ کر ہوتی ہے وہ گانے سے کبھی نہ ہوتی تھی۔'' اولاش نے برجستہ جواب دیا۔ ''خدمت روح کی تسکین

کا سب سے بہتر ذریعہ ہے۔''

''تم کہتے ہو تم نے میری اضا کیہ کا علاج دعاؤں سے کیا ہے؟!'' سکندر نے کہا۔ ''اگر تم نے طب کا مطالعہ کیا ہوتا تو تم کو یہ معلوم ہوتا کہ دوا کے بغیر علاج ناممکن ہے۔''

''میرے آقا، میں نے پانچ سال تک طب کا مطالعہ بھی کیا ہے میرے استاد ایک ماہر طبیب تھے انہوں نے مجھے طب کی مکمل تعلیم دی ہے۔'' اولاش نے جواب دیا۔

''واقعی۔'' سکندر نے حیران ہو کر پوچھا۔ اور پھر اولاش سے دواؤں اور طریقہ علاج کے بارے میں پوچھتا رہا، اولاش کا ہر جواب سکندر کی حیرت میں اضافہ کر رہا تھا پھر سکندر نے کہا۔

''تم واقعی ایک ماہر طبیب ہو، لیکن کیا یہ حقیقت ہے کہ تم دواؤں کے بجائے صرف دعا سے علاج کر سکتے ہو؟!'' سکندر نے اولاش کو غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں قسم کھاتا ہوں کہ یہ حقیقت ہے۔'' اولاش نے یقین دلایا۔ ''آپ نے سنا ہو گا کہ ایک شخص موسیقی سے علاج کیا کرتا تھا، میں نے ان گنت لب دم زخمیوں اور مریضوں کا صرف دعا سے علاج کیا ہے۔''

''اگر تم اس پائے کے معالج ہو تو پھر لشکریوں میں کیوں پڑے ہو، تم اپنی اس صلاحیت سے دنیا کی کثیر دولت کما سکتے ہو۔''

''غریب لشکریوں کو میری ضرورت ہے، وہ دوا کے اخراجات برداشت نہیں کر سکتے، اور میری ضروریات بڑی محدود ہیں۔'' اولاش نے جواب دیا۔

''تم فلسفی بھی معلوم دیتے ہو اولاش، میں تمہیں اضا کیہ کے علاج کا منہ مانگا انعام دوں گا۔'' سکندر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''بولو کیا چاہتے ہو لو سونے کی طشتری تمہاری نذر ہے۔''

''جہاں پناہ، آپ کی اس سخاوت ذرہ نوازی کا شکریہ، لیکن مجھے دولت نہیں چاہئے۔''

''دولت نہیں چاہئے۔'' سکندر نے حیران ہو کر کہا۔ ''تو پھر خدا کے بندے تم اور کیا چاہتے ہو؟!''

''غریب لشکریوں کے لئے مویشی ان کے افلاس زدہ بچوں کو گائے کے دودھ کی ضرورت ہے اور ان کو پیٹ بھرنے کے لئے گوشت کی۔''

''ان احمقوں سے کس نے کہا تھا کہ گھر بار چھوڑ کر فوج کے پیچھے لگ جائیں۔'' سکندر غصے میں گرجا لیکن فوراً ہی نرم پڑ گیا۔ ''لیکن گھبراؤ نہیں تمہاری خواہش ضرور پوری کی جائے گی۔''

اولاش شکریہ ادا کر کے چلا گیا تو سکندر نے مجھ کو مخاطب کیا۔ ''یہ شخص مجھے پسند ہے لیکن اس کے طریقہ علاج پر مجھے یقین اب بھی نہیں آتا، میں خود مشاہدہ کروں گا۔''

دوسرے دن صبح سویرے میں شاہی طبیب اور سکندر بھیس بدل کر خدمت گاروں کے خیموں میں پہنچ گئے، ہمارے چہرے تقریباً چھپے ہوئے تھے۔ اولاش کو تلاش کرنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی۔ ایک جگہ بہت سا مجمع لگا ہوا تھا، اولاش ان کے درمیان آنکھیں بند کئے عبادت کے انداز میں بیٹھا دعا پڑھ رہا تھا، سامنے اسٹریچر پر بارہ تیرہ برس کا ایک لڑکا لیٹا ہوا پُر امید نگاہوں سے اولاش کے چہرے کو گھور رہا تھا، شاہی طبیب لڑکے کو دیکھ کر چونک پڑا۔

''عالی جان، یہ ناممکن ہے۔'' اس نے سرگوشی کی۔ ''میں اس لڑکے کا معائنہ کر چکا ہوں اس کی دونوں ٹانگیں مفلوج ہو چکی ہیں اب یہ کبھی نہ چل سکے گا۔''

شاہی طبیب کی اس بات پر میرا دل ڈوبنے لگا، اگر اولاش ناکام ہو گیا تو سکندر کی نظروں سے ہمیشہ کے لئے اتر جائے گا، ہم سب انتظار کرتے رہے یہاں تک کہ کئی گھنٹے گزر گئے اور سورج زوال پر آ گیا، لیکن اولاش اسی طرح آنکھیں بند کئے دعا کر رہا تھا، جیسے جیسے وقت گزرتا جا رہا تھا، میرے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے شاہی طبیب نے کئی بار سکندر سے کہا کہ انتظار فضول ہے لڑکا ہرگز نہیں چل سکے گا، لیکن سکندر ٹس سے مس نہ ہوا، یہاں تک کہ سہ پہر کا وقت آ گیا۔ مایوسی سے میرا دل ڈوبنے لگا کہ اچانک مجمع کے لبوں سے

حیرت واستعجاب کا نعرہ بلند ہوا۔ میں نے جلدی سے اس طرف دیکھا، لڑکا خود اٹھ کر بیٹھ گیا تھا، اسی لمحہ اس کی ماں مجمع کو چیرتی ہوئی آگے بڑھی، ماں کو دیکھتے ہی لڑکا خوشی سے چیختا ہوا اس کی سمت بھاگا۔

''ماں...... میں چل سکتا ہوں، میں چل پھر سکتا ہوں، میرے پیر ٹھیک ہوگئے۔''

اولاش کو شاہی معالج کا عہدہ مل گیا اور اسے شاہی خیموں کے درمیان جگہ دے دی گئی۔ میرا دل خوشی سے جھوم رہا تھا، اب میرا محبوب ہر لمحہ میرے قریب رہے گا، لیکن سکندر نے صبح ہوتے ہی لشکر کو کوچ کا حکم دیا۔ ہم چودہ دن مسلسل سفر کرتے رہے۔ اس دوران مجھے اولاش کو صرف دور سے دیکھنے کا موقع مل سکا اور پھر ایک دن جب ہم گرمی سے بدحواس ہو چکے تھے پہاڑوں کی ڈھلوانوں سے اترتے ہوئے سپاہیوں نے خوشی سے چلانا شروع کردیا۔

''انڈس...... انڈس'' ہم دریائے سندھ کے کنارے پہنچ گئے۔ فاصلے پر ایملش کا لشکر خیمہ زن نظر آرہا تھا، ہم جیسے ہی قریب پہنچے کماندار نے آگے بڑھ کر سکندر کا خیر مقدم کیا، یہ اٹک کا علاقہ تھا، جہاں دریائے سندھ کی چوڑائی نسبتاً کم تھی، گرمی اور پیاس سے نڈھال لشکریوں اور جانوروں نے جی بھر کے دریا کے پانی سے خود کو سیراب کیا، پانی دیکھ کر ان میں زندگی کی لہر دوڑ گئی۔ اس رات سکندر بہت خوش تھا۔ ہم نے وہ سارا علاقہ فتح کرلیا ہے۔ جہاں تک شیمر نے قبضہ کیا تھا اس کے آگے براعظم ہند کا وہ حصہ شروع ہوتا ہے جہاں آج تک کسی حملہ آور کے قدم نہیں پہنچے، اس علاقے کے حکمرانوں کو زیر کرنا ہی اصل مسئلہ ہے، وہ جنگجو آن والے ہیں، اصل جنگ کا مزہ اب آئے گا۔'' سکندر نے کہا۔

''آپ کے بلند اقبال کے آگے پورا ہندوستان سرنگوں ہو جائے گا۔'' میں نے کہا۔

''نہیں جان من یہ بہت جیالے بہادر ہیں، آسانی سے شکست قبول نہیں کریں گے۔'' سکندر نے جواب دیا۔

اس رات کھانے پر تمام کماندار اپنی بیویوں کے ساتھ موجود تھے۔ ہر سمت جشن کا سماں تھا سکندر میرے اور ایملش کے درمیان بیٹھا تھا، کھانے کے بعد شراب کا دور چلنے لگا، جیسے جیسے نشہ بڑھتا گیا وہ جیسے یہ بھول گیا تھا کہ میں برابر میں بیٹھی ہوں پھر اچانک لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں حکم دیا۔

''اصنا کیہ، تم دوسرے خیمہ میں جاؤ۔''

بادشاہ کا حکم تھا اس لئے تعمیل کے علاوہ چارہ کار نہ تھا، دوسرے خیمے میں جاتے ہوئے میں نے مڑ کر دیکھا۔ میں نے تہیہ کرلیا تھا کہ اب میں بھی اولاش کی محبت کو تشنہ نہیں رکھوں گی، خیمہ میں پہنچ کر میری ساتھی عورت نے مجھے سمجھایا۔

''اصنا کیہ اس طرح جی ہلکان نہ کرو۔''

دوسرے دن سکندر شام تک شاہی خیمے میں سوتا رہا، رات جب وہ کھانے پر آیا تو اس کے چہرے پر کسی ندامت کا شائبہ تک نہیں تھا، لیکن مجھے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کراہت محسوس ہو رہی تھی، پھر اسی دن دریا کو پار کرنے کا کام شروع ہوا۔ دریا پر کشتیوں کا مضبوط پل بنایا گیا تھا لیکن لشکر کی کثرت تعداد کا اس بات سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ اس کام کو مکمل کرنے میں تین دن لگ گئے۔ اس کے بعد ٹیکسلا کے باہر پہاڑی کے دامن میں ایک وسیع میدانی علاقے میں ہم خیمہ زن ہوگئے۔ لشکر والے بہت خوش تھے کیونکہ ان کا خیال تھا کہ سکندر یہاں سے بابل کی طرف واپسی کا اعلان کرے گا، وہ مسلسل سفر اور متواتر جنگوں سے بالکل نڈھال ہو چکے تھے، لیکن انہیں سکندر کے ارادوں کا علم نہیں تھا۔

رات کو ٹیکسلا کے راجہ نے ہماری دعوت کی ہمیں محل تک لے جانے کے لئے شاہی ہاتھی بھیجے گئے تھے جن کے ہودے سونے اور چاندی کے بنے ہوئے تھے، سارا شہر خوب صورتی سے سجایا گیا تھا، ہر سمت چراغاں تھا لوگ جوق در جوق سکندر اعظم کے استقبال کے لئے کھڑے تھے، ٹیکسلا کا خوب صورت اور وسیع محل بقعہ نور بنا ہوا تھا، محل کے باغ میں رنگ برنگی روشنیاں جھلک رہی تھیں، سنگ مرمر کا بنا ہوا خوب صورت محل جھلملا رہا

تھا، مہاوت نے جیسے ہی ہاتھی کو روکا راجہ اپنی رانی کے ساتھ ہمارے استقبال کو آگے بڑھا۔ محل کی سجاوٹ دیکھ کر ہم وہاں کے حسن کو بھول گئے، ضیافت میں شاہانہ اہتمام کیا گیا تھا، کھانے کے بعد جب ہم سب بیٹھے تو سکندر نے مطلب کی بات چھیڑ دی، راجہ نے بتایا کہ اس کے دو بڑے دشمن تھے، شارا اور پورس، دونوں بہت طاقتور راجہ تھے، لیکن اگر سکندر نے ان کے خلاف جنگ کی تو وہ تمام تر فوجی قوت سکندر کے حوالے کر دے گا۔

''ہم دوستی کا پیمان کر چکے ہیں اس لئے تمہارا دشمن ہمارا بھی دشمن ہے، ہم انہیں شکست دیئے بغیر چین سے نہیں بیٹھیں گے۔'' سکندر نے جواب دیا۔

''شارا اور پورس کے جاسوس ان کو آپ کی پیش قدمی کی اطلاعات پہنچاتے رہے ہیں اور ان دونوں نے مقابلے کے لئے بھاری تعداد میں فوجیں جمع کر لی ہیں۔ وہ آپ کو دریائے جہلم پر روکنے کی تیاریاں کر رہے ہیں۔''

سکندر اس اطلاع پر مسکرا دیا اس نے راجہ سے پوچھا ''کیا دریائے جہلم کو پار کرنا دشوار ہوگا؟''

''بہت دشوار..... کیونکہ بعض جگہ یہ دریا اتنا چوڑا ہے کہ اس پر سمندر کا گمان ہوتا ہے اور دوسری جگہوں پر اس کا بہاؤ اتنا تیز ہے کہ ہاتھی کے پیر جمنا بھی مشکل ہوں گے، پھر پانی میں نوکیلی چٹانوں کی وجہ سے کشتیوں کے ڈوبنے کا خطرہ بھی رہتا ہے۔''

''راجہ تم نے اس طرح دشواریوں کا ذکر کر کے میرے ارادے اور مضبوط کر دیئے ہیں، ہم نے دریائے جہلم سے زیادہ بڑی مشکلات کو سر کیا ہے، کل ہم شارا اور پورس کے پاس قاصد روانہ کر کے ان کو اطاعت کا پیغام دیں گے، اگر وہ نہیں مانے تو پھر ہماری تلواریں انہیں سرنگوں کرنے کے لئے تیار ہیں۔''

سکندر کے کمانداروں نے ایک دوسرے کو معنی خیز نظروں سے دیکھ کر سرگوشیاں شروع کر دیں۔ وہ اس جنگ کے لئے تیار نہ تھے، لیکن سکندر کا فیصلہ ہمیشہ اٹل ہوتا تھا۔

دوسرے دن، راجہ نے شہر کی سیر کرانے کا اہتمام کیا تھا۔ تمام دن ہم جلوس کی شکل میں ٹیکسلا کے گرد و نواح میں گھومتے رہے، راجہ ہم کو سانپ کے باغ میں لے گیا۔ یہ سب مقدس سانپ تھے۔ ان میں اتنے بڑے اژدھے بھی تھے کہ پورا آدمی نگل جاتے تھے، ایک پنجرے میں بہت سے چمکیلے سانپ تھے، راجہ نے بتایا کہ یہ بڑے زہریلے ہیں ان کا کاٹا پلک جھپکتے مر جاتا ہے، اس نے خبردار کیا کہ جہلم کے قریب یہ بکثرت پائے جاتے ہیں۔

دوسرے دن میں نے لولگ جانے کا بہانہ کیا اور سکندر کے ساتھ نہیں گئی۔ میرا دل اولاش سے ملنے کے لئے بے قرار تھا، سکندر کو میری ناسازی طبیعت پر یقین آ گیا کیونکہ بلا کی گرمی پڑ رہی تھی، اس لئے وہ تنہا چلا گیا، مطلع صاف ہوتے ہی میں نے صبا کو دوڑایا کہ وہ اولاش کو بلا لائے، اس نے خوفزدہ نگاہوں سے مجھے دیکھا، میں نے اسے ڈانٹا کہ وہ حکم کی تعمیل کرے، سکندر شام سے پہلے واپس نہیں آئے گا کیمپ ویران پڑا ہے کیونکہ سارے لوگ شہر گھومنے گئے ہیں، تم میرے غلاموں کو بھی چاندی کے سکے بانٹ کر شہر جانے کیا جازت دے دو، سکندر کو معلوم ہے کہ میری طبیعت ناساز ہے اس لئے وہ اولاش کی آمد پر شبہ نہ کرے گا۔

شاہی معالجوں کا خیمہ بالکل ہی قریب تھا، ذرا دیر بعد صبا نے آ کر اولاش کی آمد کی اطلاع دی، میں نے کہا کہ اسے اندر لے آؤ اور تم ہمارے خاص آدمی کے ساتھ خیمہ کے دوسرے حصے میں جا کر بیٹھو، صبا نے مجھے تشویش کی نظروں سے دیکھا لیکن کچھ بولی نہیں اور اسی لمحہ خیمے کا پردہ اٹھا اور اولاش اندر داخل ہوا، اسے دیکھتے ہی صبر و قرار کا دامن ہاتھ سے چھوٹ گیا اور میں بھاگ کر اس سے لپٹ گئی۔

''اولاش..... اوہ اولاش.....'' میں نے اسے محبت سے بھینچتے ہوئے کہا، لیکن اولاش پتھر کے بت کی طرح جامد کھڑا رہا، اس نے مجھے ہاتھ بھی نہ لگایا میں نے اسے پیار کرنا چاہا تو اس نے سر پیچھے کر لیا اور خوفزدہ لہجے میں بولا۔

''نہیں اصنا کیہ تم اب سکندر کی شریک حیات ہو۔'' میں نے اسے حیرت سے دیکھا۔ ''لیکن اس میں

میری مرضی کو دخل نہیں تھا، میں مجبور تھی اولاش۔''

اولاش خاموش رہا اس نے آہستہ سے میرے بازوؤں کو علیحدہ کردیا، اصنا کیہ جیسی حسین وجمیل عورت کو جس کے لئے سکندر جیسا شہنشاہ دیوانہ تھا، اسے اولاش جیسا ایک حقیر سا آدمی یوں ٹھکرا رہا تھا مایوسی اور غصے سے میں کانپنے لگی اور حقارت سے اس پر تھوک دیا۔

''جھوٹے مکار..... تو نے تو آخری سانس تک مجھ سے محبت کرنے کی قسم کھائی تھی، کیا وہ سب فریب تھا؟''

اولاش اسی طرح ساکت کھڑا رہا۔ ''میں نے ہمیشہ تمہاری پرستش کی ہے، میں ہمیشہ تم سے محبت کرتا رہوں گا، اتھاہ محبت اصنا کیہ، لیکن اب تم شادی شدہ ہو۔''

''اس سے کیا ہوتا ہے، یہ زبردستی کی شادی تھی، او اولاش..... اولاش..... میں کتنی بے قراری سے تمہارا انتظار کررہی تھی۔''

''تم کو میرے دل کی تڑپ کا اندازہ نہیں اصنا کیہ، اس میں ہر لمحے تمہارے لئے ٹیس اٹھتی ہے، آہ تم نے صبر وقرار کے بندھن توڑ دیئے، اب..... اب میں صبر نہیں کرسکتا۔''

''اولاش..... میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی؟''

''جان من! قسمت کا لکھا کون مٹا سکتا ہے۔''

اس نے ایک سرد آہ بھر کر کہا اور آہستہ سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ ''جو کچھ اس دل پر گزر رہی ہے اس کا اندازہ تم بھی نہ کرسکو گی اصنا کیہ، اب مجھے اجازت دو میرا ٹھہرنا مناسب نہ ہوگا۔''

''اس شرط پر کہ کل تم پھر اسی وقت یہاں آؤ گے، اور فکر نہ کرو میں نے سکندر سے بہانہ کردیا تھا کہ میری طبیعت ناساز ہے، میں اسے بتادوں گی کہ میں نے تمہیں علاج کے لئے طلب کیا تھا۔''

تین دن تک میں اسی طرح اپنے غلاموں کو رقم دے کر بازار بھیج دیتی، چوتھے دن برابر کے خیمے سے اچانک ہی آہٹ سنائی دی اور پھر صبا کی غیظ وغضب میں ڈوبی آواز ابھری۔

''کمینی..... کتیا..... تو جاسوسی کررہی تھی؟''

میں اور اولاش اچھل کر علیحدہ ہوگئے آواز پھر آئی، لیکن یہ کسی اور عورت کی آواز تھی۔

''میں نے کچھ نہیں دیکھا میں قسم کھاتی ہوں مجھے چھوڑ دو۔''

صبا نے قہر آلود لہجے میں کہا۔ ''پھر تو یہاں جھکی ہوئی کیا دیکھ رہی تھی، یقیناً جاسوسی کررہی تھی۔''

''نہیں، نہیں، میری مالکن کا بروچ یہاں گر گیا تھا میں اسے تلاش کررہی تھی۔''

''تو جھوٹی ہے حرافہ۔ تیری یہی سزا ہے۔'' اس مرتبہ آواز میرے خاص آدمی کی تھی۔

میں نے اولاش کو فوراً رخصت کردیا کیونکہ خدشہ تھا کہ میری آواز سن کر سنتری اندر نہ آجائیں، اولاش کے جاتے ہی میں پردہ اٹھا کر برابر والے خیمہ میں داخل ہوئی، لیکن نظریں اٹھاتے ہی دم بخود رہ گئی۔ کنیز کی لاش فرش پر پڑی تھی۔ میرے آدمی کے خنجر نے اسے ہمیشہ کے لئے خاموش کردیا تھا، خوف و وحشت سے میں کانپ گئی، لیکن میرے آدمی نے مجھے تسلی دی۔

''آپ بالکل فکر نہ کریں ملکہ عالیہ۔ اس کی لاش کا کسی کو پتہ بھی نہیں چلے گا، شہنشاہ کی واپسی سے قبل میں اسے ٹھکانے لگادوں گا۔''

صبا اور میرے وفادار ساتھی نے مل کر ایک بڑے صندوق سے کپڑے نکال کر لاش اس میں ڈال کر کپڑوں سے ڈھانک دی خدا نے مجھے بال بال بچالیا تھا۔ اس کنیز کے واقعے کے بعد میں اتنی ڈر گئی تھی کہ پھر اولاش سے ملاقات کی ہمت نہ کرسکی، چودہ دن تک میں ہر لمحہ سکندر کے ساتھ رہی، انہی دنوں سکندر نے ہندو اور بدھ سادھوؤں کے متعلق بڑی دلچسپی کا اظہار کیا، ٹیکسلا کے قریب ایک یوگی تانترک کی بڑی دھوم تھی سکندر نے اسے بلوا بھیجا، لیکن اس نے جواب دیا کہ اگر سکندر کو ملنے کی خواہش ہے تو خود آئے۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ سکندر غصہ ہونے کے بجائے بلا تامل اس یوگی سے ملنے روانہ ہوگیا، اس نے ساتھ میں اپنے اطباء کو بھی لے

لیا جن میں اولاش بھی شامل تھا، یہ برہمن تمام سادھوؤں سے برتر تصور کیا جاتا تھا اور اس کے بہت سے چیلے تھے، سکندر نے اس سے پوچھا۔

''موت کے متعلق تمہارا کیا نظریہ ہے؟''

''ہم اسے ایک نئی زندگی کا آغاز کہہ سکتے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''ہم یونانیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے، آپ کے خیال میں بہترین فلسفہ حیات کیا ہے؟''

''وہ جو ذہن کو غم اور خوشی سے بے نیاز کردے۔''

ایک شاہی طبیب نے پوچھا کہ وہ بیماری کا علاج کیسے کرتے ہیں، تو اس کے شاگرد فورسین نے جواب دیا۔

سکندر ان باتوں سے اتنا متاثر ہوا کہ فورسین کو اپنے دانشوروں میں شامل کرکے اپنے ساتھ لے آیا۔ ہم نے تین روز تک ٹیکسلا میں قیام کیا، اس دوران راجہ شارا نے سکندر کی اطاعت قبول کرلی جس سے سپاہیوں کے حوصلے کچھ اور بلند ہوئے، لیکن راجہ پورس نے نہ صرف اطاعت سے انکار کیا بلکہ سکندر کو جنگ کے لئے للکارا بھی۔

انہی ایام میں مجھے احساس ہوا کہ اولاش کا بچہ میرے بطن میں پرورش پا رہا ہے، مجھے نجانے کیوں ایک انجانی سی مسرت کا احساس ہوا میں یہ خوشخبری اولاش کو سنانے کے لئے بے تاب ہوئی لیکن سکندر نے اچانک جنگ کی تیاریاں اس زور و شور سے شروع کردیں کہ موقع ہی نہ مل سکا۔

ہم جیسے ہی پورس کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے بارشیں شروع ہوگئیں، اکیس دن تک ہم بارش کے دوران سفر کرتے رہے، سفر کی تکالیف سے سپاہیوں میں بڑی بددلی پیدا ہونے لگی کیونکہ کیچڑ اور راستے میں موسلادھار بارش کے دوران چلنا انتہائی دشوار ہو رہا تھا اور پھر مقدونی اور ایرانی سپاہی اس موسم کے عادی نہ تھے، لیکن سکندر نے پھر بھی سفر جاری رکھا، میں نے اس دوران سکندر کو اپنے حاملہ ہونے کی خوشخبری سنادی لیکن وہ اتنا مصروف تھا کہ زیادہ خوشی کا اظہار نہ کرسکا، ہم جیسے جیسے آگے بڑھ رہے تھے کیچڑ زدہ زمین ختم ہوتی جارہی تھی اور راستہ پتھریلا ہوتا جارہا تھا، بنجر اور بھورے رنگ کے پہاڑوں کا سلسلہ نظر آنے لگا، جب ہم پہاڑی علاقہ میں چڑھائی پر پہنچے تو سڑکیں تیز پانی کے ریلے میں ڈوبی ہوئی تھیں۔ جن سے گزرنا دشوار ہوجاتا لیکن جہلم کی ترائی میں داخل ہوتے ہی بارشیں تھم گئیں اور ہر سمت سبزہ نظر آنے لگا، اس تبدیلی نے سپاہیوں میں تازہ حوصلہ پیدا کردیا۔ لیکن جہلم کے کنارے پہنچتے ہی سب کو ایک دھچکا سا لگا، دریا کے پار کنارے پر راجہ پورس اتنے بڑے لشکر کے ساتھ قیام پذیر تھا کہ حد نگاہ تک آدمیوں کا سمندر ٹھاٹھیں مارتا نظر آرہا تھا۔ ان میں سپاہی پیدل سوار تیر انداز نیزہ بردار سپاہیوں کے علاوہ ہاتھیوں اور رتھوں کی ایک بھاری تعداد بھی شامل تھی، سکندر نے بھی دریا کے کنارے خیمہ زن ہونے کا حکم دیا اب دونوں فوجیں آمنے سامنے تھیں اور درمیان میں صرف دریائے جہلم حائل تھا جس کا طغیانی زدہ پانی ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔

رات کو سکندر نے تمام کمانداروں کی مجلس بلائی دوران سے کہا۔ ''پورس کی فوجوں کی موجودگی میں دریا کو عبور کرنا ناممکن ہے، ہمارے گھوڑے ہاتھیوں کو دیکھ کر خوفزدہ ہوجائیں گے اور کنارے پر جانے کے بجائے دریا میں پھسل کر ڈوب جائیں گے، اس لئے دریا پار کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے، ہمیں کوئی خفیہ راستہ تلاش کرنا ہوگا۔''

تمام کمانداروں نے اس بات سے اتفاق کیا، سکندر چند لمحے خاموش رہنے کے بعد بولا۔

''اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم پورس کو دھوکے میں رکھیں، ہم لمحہ بہ لمحہ اپنے دستوں کو گھاٹ کی مختلف سمتوں میں اس طرح حرکت دیتے رہیں جیسے پار کرنے کا ارادہ کررہے ہیں اور جب مقابل کنارے پر پورس کی فوج جمع ہوجائے تو پھر کسی اور سمت رخ تبدیل کردیں اس کے لئے ہمیں لشکر کو مختلف حصوں میں تقسیم کردینا چاہئے، مختلف ٹکڑیاں دریا پار کرنے کا تاثر دے کر پورس کو مصروف رکھیں اور اس دوران ہم دوسرے کنارے پر پہنچنے کے لئے کوئی محفوظ اور خفیہ راستہ تلاش کرلیں۔''

"اس کے ساتھ ہم اپنی کشتیوں کو بھی دریا میں اتار دیں اور انہیں بھی اس مقصد کے لئے حرکت دیتے رہیں۔" ایملش نے رائے پیش کی۔

"بالکل مناسب رائے ہے۔" سکندر نے جواب دیا۔

بارش پھر اچانک شروع ہوئی اور دو دن تک دریا کی سطح بہت بلند ہوگئی تھی، اس دوران سکندر کی حکمت عملی نے پورس کو پریشان اور حیران کردیا تھا، کبھی وہ دیکھتا کہ کشتیاں دریا پار کرنے کے لئے تیار ہورہی ہیں، کبھی وہ دیکھتا کہ سپاہی مسلح ہوکر سوار ہورہے ہیں، وہ اپنی فوج کو جمع کرتا تو کچھ دیر کے بعد دور کسی اور کنارے پر سکندر کی فوجیں جمع ہوکر نعرہ زنی شروع کردیتیں وہ دفاع کے لئے ادھر تیاریاں کرتا تو کسی اور جگہ فوجی نقل و حرکت شروع ہوجاتی۔ سکندر کی اس حکمت عملی سے پورس ہاتھیوں کو نقل و حرکت دیتے دیتے اس قدر عاجز آگیا کہ ایک جگہ دفاع کے لئے جم کر بیٹھ گیا، اسے یقین آگیا کہ بارشیں رکنے سے قبل سکندر حملے کی کوشش نہیں کرے گا۔

اس دوران سکندر نے دریا پار کرنے کے لئے ایک مناسب جگہ تلاش کرلی تھی۔ فوجوں کے اجتماع سے کچھ فاصلے پر ایک گھنا جنگل تھا، جہاں خشکی کا ایک حصہ اندر کی سمت بڑھا ہوا تھا اور درمیان میں ایک جزیرہ تھا جس کا ایک کنارہ پار والے گھاٹ سے جا کر مل گیا تھا یہ جگہ کیمپ سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر تھی اور گھنے جنگل نے آڑ کرلی تھی۔ یہاں دریا میں تھوڑا سا موڑ بھی تھا جس کی بنا پر پورس کی فوجوں کو یہ حصہ نظر نہیں آسکتا تھا، موسلا دھار بارش اور بادلوں کی زبردست گھن گرج میں سکندر کی فوجوں کی نقل و حرکت کا شور دب کررہ گیا بجلی کی کڑک سے کان پڑی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی، لیکن سکندر نے موسم کی خرابی کی پرواہ کئے بغیر اپنے منصوبے پر عمل درآمد جاری رکھا اور اس کی فوجوں نے دریا پار کرلیا، لیکن ایک نئی دشواری پیش آئی، یہاں کنارہ دلدلی تھا، اور اس کے کیچڑ میں نقل و حرکت مشکل ہوگئی تھی، صبح کا اجالا پھیلنے لگا اور بارش تھم چکی تھی، اس لئے سکندر اپنی فوج کی ترتیب مکمل کرسکتا دشمن کے پہرے داروں کو علم ہوگیا اور پورس نے فوراً ہی ایک سو رتھوں اور دو ہزار سواروں اور پیدل سپاہیوں کے ساتھ سکندر پر حملہ کردیا، سکندر کے سپاہی اس اچانک حملے کے لئے تیار نہ تھے۔

پہلے حملے میں یونانیوں کی ایک بڑی تعداد کام آئی، لیکن آگے بڑھتے ہی پورس کے رتھ اور گھوڑے دلدل میں پھنس گئے اور اس طرح یونانیوں کو سنبھلنے کا موقع مل گیا۔ اس کے بعد گھمسان کی جنگ شروع ہوگئی۔ سکندر اپنے محبوب گھوڑے پر سوار ہوکر جنگلی نعرے بلند کرتا ہوا دشمن پر جھپٹ پڑا، ایسا رن پڑا کہ کسی کو کسی کا ہوش نہ رہا، سکندر نے صرف سواروں کے دستوں کو ساتھ لے کر حملہ کیا تھا، لیکن یہ ایسے ماہر شمشیر زن تھے کہ ذرا دیر میں دشمن کے پرے الٹ گئے۔ پورس کے رتھ دلدلی زمین میں دھنس گئے اور بیکار ہوگئے، صورتحال سے گھبرا کر اس نے اپنے سواروں کو پیچھے ہٹایا اور مسلسل پیچھے ہٹتا ہوا ہاتھیوں کے پیچھے جا رکا، اب ہاتھیوں کا دستہ ایک دفاعی دیوار کی طرح درمیان میں حائل تھا۔ پورس نے ہاتھیوں کے حملے کا حکم دیا، بلتر بند ہاتھیوں کی تعداد دو سو تھی اور ہر ہاتھی کے درمیان سو فٹ کا فاصلہ تھا جس میں تیرانداز کھڑے تھے۔ لیکن ان کی کمانیں اتنی بڑی اور بھاری تھیں کہ ان کو زمین پر رکھ کر نشانہ لگانا پڑتا تھا۔ ہاتھیوں کے پیچھے تیس ہزار سوار تھے اور تین سو رتھ تھے جن پر دو تیرانداز اور دو ڈھال بردار ان کے دفاع کے لئے موجود تھے، پورس کی اصل قوت ہاتھیوں اور رتھوں پر منحصر تھی، ہاتھیوں نے سکندر کے فلانگ کو اپنی سونڈوں اور پیروں سے روندنا شروع کردیا، مقابلہ اتنا نازک تھا لیکن سکندر نے فلانگ کو آگے بڑھنے سے روک کر انتہائی پھرتی کے ساتھ ایک ہزار تیراندازوں سے دشمن کے بائیں حصے پر حملے کا حکم دیا کہ پورس کی فوج بدحواس ہوگئی۔

اسی دوران ایک اور کمانڈر تازہ دم فوج لے کر پہنچ گیا، سکندر نے خود دائیں جانب سے حملہ کیا اور تیر کی طرح اندر گھستا چلا گیا، اس کا حملہ اتنا شدید تھا کہ پورس کے سپاہی اس پیش قدمی کو نہ روک سکے۔ ادھر فلانگ

نے بھاری جانی نقصان کے باوجود ہاتھیوں کو آگے نہ بڑھنے دیا اور بھاگ بھاگ کر تیروں اور کلہاڑوں سے ہاتھیوں کی سونڈوں اور پیروں کو زخمی کرتے رہے۔ اسی دوران سکندر کا ایک اور کمانداد چکر کاٹ کر پورس کی فوج کے عقب میں پہنچ گیا، سکندر اتنی شدت اور غیض و غضب میں لڑ رہا تھا کہ اس کا گھوڑا تھک کر گرا اور مر گیا، لیکن اس نے فوراً ہی ایک دم تازہ دم گھوڑے پر چھلانگ لگائی اور پھر لڑائی شروع کردی۔ پورس اپنے ہاتھی پر ڈٹا ہوا فوج کو بار بار مختلف ترتیب سے حملے کا حکم دے رہا تھا حالانکہ وہ ہر سمت سے تیروں کی زد میں تھا۔

اس دوران پورس کی ساری فوج سکندر کے محاصرے میں آچکی تھی۔ ایسی گھمسان کی جنگ ہو رہی تھی کہ انجام کا اندازہ دشوار تھا، لیکن اچانک پورس کے زخمی ہاتھی بدحواس ہو کر مڑے اور انہوں نے اپنی فوج کو روندتے ہوئے بھاگنا شروع کردیا۔ پورس کے سپاہی اس غیر متوقع آفت سے گھبرا کر تتر بتر ہوگئے اور مقدونیوں نے ایک بھرپور حملے سے جنگ کو انجام تک پہنچادیا، لیکن پورس آخر دم تک ڈٹا رہا، اس کی شکست خوردہ فوج نے راہ فرار اختیار کی لیکن پھر بھی اس نے جان بچانے کی فکر نہیں کی۔

جنگ ختم ہوگئی، کچھ دیر بعد جب پورس کو گرفتار کرکے لایا گیا تو سکندر خود اس کے پاس پہنچا دراز قد اور باوقار پورس کی دلیری نے سکندر کو بہت متاثر کیا اس نے پورس سے پوچھا۔

''پورس تم خود بتاؤ کہ تمہارے ساتھ کس قسم کا سلوک کیا جائے؟''

پورس نے سر بلند کرکے دلیری کے ساتھ جواب دیا۔ ''ویسا ہی سلوک جیسا بادشاہوں کے ساتھ کیا جاتا چاہئے؟''

سکندر اس جواب سے بہت خوش ہوا۔ ''ایسا ہی ہوگا راجہ پورس، لیکن بتاؤ تم اور کیا چاہتے ہو؟''

''میں نے جو جواب پہلے دیا اس میں سب کچھ شامل ہے۔''

سکندر نے فوری جنگ بندی کا حکم دیا، پورس کی رعایا کو عام معافی دی اور اس طرح دریائے جہلم کے کنارے پر واقع میدان میں ایک اور جنگ میں سکندر نے فتح و نصرت کا پرچم لہرا دیا۔

لشکر میں جشن فتح شروع ہو چکا تھا، میرا دل اولاش کی سلامتی کی دعائیں مانگ رہا تھا جو سکندر کے ساتھ ہی دریا پار کرکے میدان جنگ میں زخمیوں کے علاج کے لئے گیا تھا، اچانک شاہی خیمے کا پردہ ہٹا اور سکندر اپنے محبوب کماندار ایملش کے ساتھ اندر داخل ہوا، دونوں کے لباس خون اور کیچڑ میں لت پت تھے، لیکن دونوں فتح کی خوشی سے سرشار تھے۔

''اصنا کیہ! میری جان! آؤ تم بھی ہمارے ساتھ جام نصرت پیو، ہم نے ہندوستان میں فتح کے دروازے کھول دیئے ہیں۔''

تمام کمانداروں اور دوسرے سرداروں نے خوشی کے نعرے بلند کئے ہر ایک مسرت سے دیوانہ ہو رہا تھا۔ عورتوں نے اپنے اپنے شوہروں کی مرہم پٹی شروع کروی میں نے آگے بڑھ کر سکندر کی زرہ بکتر اتاری اور اس کے جسم سے خون صاف کرنے لگی، خیمہ قہقہوں سے گونج رہا تھا، سکندر نے ایک عام ضیافت کا اعلان کیا۔ اس ضیافت میں اس نے کمانداروں کو خوش کرنے کے لئے ہر ایک کو سونے اور جواہرات کے بھاری انعام و اکرام دیئے۔ کئی دن تک فتح کا جشن جاری رہا اس کے بعد سکندر نے لشکر کو کوچ کا حکم دیا ہم مسلسل فتح کرتے ہوئے آگے بڑھتے رہے۔ ہندوستان کے زر و جواہر کے خزانے سمیٹتے ہوئے دریائے چناب اور راوی کے علاقوں پر سکندر اعظم کی عظمت و کامرانی کے پرچم لہراتے بالآخر ہم دریائے بیاس کے کنارے خیمہ زن ہوگئے، یہاں پورس اور دوسرے ہندوستانی سرداروں نے یہ خبر عام کردی کہ اگر سکندر نے اس سے ٹکر لی تو تباہ ہو جائے گا، یونانی سپاہی مسلسل جنگ و جدل اور طویل عرصہ تک گھر سے دوری کی بناء پر پہلے ہی بددل ہو چکے تھے، ان خبروں نے ان کے حوصلے اور

بھی پست کردیئے۔

سکندر اس صورت حال سے سخت برہم اور دل برداشتہ ہوا اس نے تمام کمانداروں کا ایک اجلاس طلب کیا اور ان سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔

''تم سب نے اپنی شجاعت اور دلیری سے ایشیا میں اپنی فتح ونصرت کے پرچم گاڑ دیئے ہیں، اب اگر ہم اس طرح واپس چلے گئے تو سارے مفتوح علاقے ہاتھ سے نکل جائیں گے مجھے معلوم ہے کہ تم سب تھک چکے ہو لیکن میں چاہتا ہوں کہ یہاں سے کچھ فاصلے پر واقع دریائے گنگا تک کا علاقہ فتح کرنے کے بعد مشرق میں سمندر بہتا ہے، ہم وہاں سے جہاز پر آرام کے ساتھ واپسی کا سفر شروع کریں گے۔''

سب خاموش سنتے رہے لیکن ایک کماندار بطلیموس نے ہمت کرکے سکندر سے کہا۔ ''سکندر، ہم پرتاپ سنگھ کی قوت سے خائف نہیں ہیں لیکن یونانی سپاہی جنگ کرتے کرتے نڈھال ہو چکے ہیں ان کے لباس پھٹ چکے ہیں ہتھیار کند ہو چکے ہیں اور قویٰ جواب دے چکے ہیں اور اب وہ اس سے آگے جانے کے لئے تیار نہیں ہیں۔''

''بطلیموس سچ کہہ رہا ہے، ہمارے بہادروں نے بہت زروجواہر حاصل کرلیا ہے اب انہیں کسی چیز کی تمنا نہیں ہے۔''

''کیا تم سب یہ چاہتے ہو کہ اتنی عظیم الشان فتوحات کے بعد فاتح عالم بننے کا سنہری موقع چھوڑ دیا جائے۔''

اچانک ایملش کھڑا ہوگیا اور اس نے سکندر سے کہا۔ ''ہمیں اعتدال پسندی کا ثبوت دینا چاہئے ہم میں سے بیشتر اپنے والدین اور بیوی بچوں کی شکل کو ترس گئے ہیں، ہم سب اب واپس جانا چاہتے ہیں۔''

''میں فیصلہ کرنے سے پہلے اپنے سپاہیوں سے خطاب کروں گا۔'' سکندر گرجا۔ ''مجھے امید ہے کہ وہ میرا ساتھ دیں گے۔''

بگل بجتے ہی لشکر کے ہزاروں سپاہی شاہی خیمہ کے سامنے جمع ہوگئے، سکندر نے بڑے اعتماد اور جوش کے ساتھ ان سے خطاب کیا، اس کا خیال تھا کہ سپاہ اس کی تقریر کا پرجوش جواب دے گی، لیکن سناٹا طاری رہا، اس نے پھر غصے میں اپنے دلیروں کے جوش حمیت کو للکارا، لیکن سناٹا نہ ٹوٹ سکا، ایک اور کماندار نے سپاہیوں کی ترجمانی کرتے ہوئے کہا۔

''سکندر اعظم! تمہارا اقبال بلند ہے ہم نے ہمیشہ تم سے وفا کی ہے اور ہمیشہ تمہارے وفادار رہیں گے لیکن اس سے پہلے اقبال سکندری کو ٹھیس پہنچے اپنے دلیروں کی بات مان لو اور واپس چلنے کا اعلان کردو، یہی تمہارے جان نثاروں کی خواہش ہے۔'' اس کے ساتھ ہی ہزاروں آوازیں ایک ساتھ تائید میں بلند ہوئیں۔

''نہیں...... اگر کوئی میرا ساتھ نہیں دے گا تو میں تنہا پیش قدمی کروں گا۔'' سکندر گرجا اور پیر پٹختا ہوا اپنے خیمہ میں چلا گیا۔

تین دن تک وہ تنہائی میں پڑا رہا، نہ اس نے کچھ کھایا نہ پیا بس روتا رہا، فاتح اعظم شہنشاہ سکندر جس نے کبھی شکست نہیں کھائی تھی، اپنی ضد سے مجبور تھا، میں نے محسوس کرلیا کہ سکندر کو پہلی بار اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں شکست قبول کرنا ہوگی، میرا دل اولاش کے لئے بے تاب تھا، سکندر اپنے خیمہ میں بند پڑا تھا، وہاں جانے کی مجھے بھی اجازت نہ تھی۔ اس دن میں نے ہمت کرکے اولاش کو اپنے خیمے میں طلب کیا، احتیاط کے پیش نظر میں نے صبا کو خیمے میں ہی روک لیا تھا، وہ فاصلے پر پشت کئے کھڑی تھی، میں بیمار بنی لیٹی تھی اولاش میرے بستر کے برابر آکر بیٹھ گیا۔ میں نے اس کے دونوں ہاتھ گرم جوشی سے دباتے ہوئے کہا۔

''میرے مسیحا میرے محبوب تم جانتے ہو میرا مرض کیا ہے اور اس کا علاج صرف اور صرف تمہاری محبت ہے۔''

''میں جانتا ہوں اصافیہ۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ ''لیکن درمیان میں دیوار شاہی کو میری محبت بھی نہیں توڑ سکتی۔''

''ہم نے وہ دیوار بھی توڑ دی ہے اولاش، میرے

بطن میں تمہاری محبت کی نشانی پرورش پارہی ہے۔''

میرا خیال تھا کہ وہ خوشی سے اچھل پڑے گا، لیکن اس نے گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

''اصنا کیہ کیا واقعی..... کیا یہ سچ ہے؟''

''ہاں اولاش، یہ سچ ہے، لیکن میرا خیال تھا کہ تم میری طرح خوشی سے دیوانے ہوجاؤ گے، کیا تم کو یہ سن کر مسرت نہیں ہوئی؟''

وہ چند لمحے آنکھیں بند کئے بیٹھا رہا، پھر آہستہ سے بولا۔''اصنا کیہ مجھے معاف کردو، میری زندگی۔'' اس نے آبدیدہ نظروں سے مجھے دیکھا۔''لیکن یہ کیسی مسرت ہوگی کہ میں اسے دیکھ سکوں گا اس سے محبت کرسکوں گا، لیکن آہ میں اسے بیٹا نہ کہہ سکوں گا۔ کبھی نہیں۔'' وہ اپنی سسکیاں دباتے ہوئے بولا۔

''میں تم سے شرمندہ ہوں اولاش، میرے پاس تمہارے اس درد کا کوئی علاج نہیں۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''تم بے قصور ہو اصنا کیہ..... بے شک ہم دونوں مجبور ہیں، بے شک ہماری قسمت میں فرقت ہی فرقت ہے، لیکن یاد رکھنا میری تمنا محبت نہ دوری سے کم ہوتی ہے اور نہ قربت کی محتاج، ہم کہیں بھی ہوں کسی حال میں ہوں ہمارے دل اپنی محبت کی روشنی سے منور رہیں گے، دکھ درد جدائی یہ سب کچھ محبت کے آگے ہیچ ہیں، خدا حافظ، میری دعا ہے کہ ہماری محبت سے روشن ہونے والا چراغ ہمیشہ جگمگاتا رہے۔''

کوروتی بڑے تاثر انگیز لہجے میں یہ سب کچھ کہہ رہی تھی اور میرے دوستو، مجھے پڑھنے والو، ذیشان عالی پورے اعتماد سے یہ بات کہہ رہا ہے کہ تم لوگ مجھے اچھی طرح جانتے ہو اور سمجھتے ہو، میں متاثر ہورہا تھا، ایک انسان کی حیثیت سے، کوئی غیر انسانی بات کرکے میں تمہیں دھوکہ نہیں دینا چاہتا کوروتی نے اب تک جو کچھ مجھے بتایا تھا وہ اس لحاظ سے میرے لئے باعث تکلیف تھا کہ میں اس کے ساتھ بہت ہی خوب صورت وقت گزار رہا تھا اور یہ وقت میرے لئے ایک حیثیت رکھتا تھا، اس کے منہ سے یہ محبت بھری داستان سن کر مجھے اچھا نہیں لگ رہا تھا، کوروتی نے میرا چہرہ دیکھا اور دیکھ کر ایک دم چونک پڑی۔

''ارے..... تمہاری آنکھیں کیا کہہ رہی ہیں ذیشان عالی؟''

اس کے ان الفاظ پر میں چونک پڑا اور میں نے ایک مضمحل سی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''میری آنکھیں۔''

اس کے ہونٹوں پر ایک دلآویز مسکراہٹ پھیل گئی، اس نے بڑے پرمحبت لہجے میں کہا۔''ہاں تمہاری آنکھیں، اب یہ تو نہ ہو کہ میرا صدیوں کا تجربہ جھوٹا ہے، میں اتنا تو پہچان ہی سکتی ہوں اور میں سچ بتاؤں بے پناہ خوشی ہوئی ہے مجھے تمہاری آنکھوں کا یہ رنگ دیکھ کر۔''

''ارے بابا، مگر کیا کہہ رہی ہیں میری آنکھیں؟''

''جھوٹ تو نہیں بولو گے مجھ سے؟''

''بولوں گا بھی تو تم بولنے کب دوگی، میرا جھوٹ پکڑلوگی؟''

''ہاں مجھ میں یہ صلاحیت ہے۔''

''تو پھر بولو، کیا پوچھنا چاہتی ہو؟''

''کیا میری کہانی سے تمہیں رقابت کا احساس ہورہا ہے؟'' اس نے سوال کیا اور مجھے ہنسی آگئی، میں نے کہا۔

''ہاں ہورہا ہے۔''

''بالکل فطری بات ہے، لیکن خوش نصیبی کی بات یہ ہے کہ میں جس نے پہلی بار تمہیں صحیح معنوں میں اپنے محبوب کی حیثیت سے دیکھا ہے اس بات سے آشنا ہورہی ہوں کہ میرا محبوب مجھے اتنا ہی چاہتا ہے، جتنا کہ میں خواہش مند تھی، میرے لئے یہ بڑے سرور کی بات ہے، تم نے مجھ سے یہ پوچھا تھا کہ وہ انسان نما جانور میرا مطلب نیوسکی سے ہے، میرے جسم کو نوچتا تھا تو میں نے تمہیں بتایا تھا کہ وہ ماضی کی عورت تھی، میں نہیں، میں تو اس وقت تمہیں صرف ایک کردار کی حیثیت سے اس عورت کی کہانی سنا رہی تھی، نیوسکی سے نہ میرا

کوئی رشتہ تھا، نہ وہ میری قربت میں تھا، بس ہم ماضی کی سیر کررہے تھے اور یہی کیفیت اس وقت بھی ہے، وہ عورت اصناکیہ تھی جس کا میں نے روپ دھارا تھا، لیکن میری روح میرا جسم تو الگ ہی تھا، میں تو صرف ایک کردار ادا کررہی تھی اور نہ میری اس سے کوئی جسمانی قربت ہوئی، نہ میرے دل میں اس کے لئے کوئی مقام حاصل ہوا، وہ اصناکیہ کے کھیل تھے جو تاریخ کا ایک حصہ تھی، یہ ساری باتیں تھیں۔''

میں خاموش ہوگیا، اس کی تاویل میری سمجھ میں نہیں آسکی تھی، چلو پچھلی بار تو اس نے نیوسکی کے معاملے میں ایک روپ دھارلیا تھا اور وہ اصل عورت تھی، بقول کوروتی کے وہ خود نہیں، لیکن اس بار تو کوروتی نے یہ اعتراف کیا تھا کہ وہ جان بچانے کے لئے بھاگ رہی تھی اور وہاں سے اصناکیہ کا رنگ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی، میں نے سوال اس سے کرڈالا تو وہ ہنس کر بولی۔

''ہاں، مگر یہ بات تمہارے علم میں ہے کہ وہ ایک بچپن تھا اور جو وجود بچپن سے لے کر جوانی تک رہا وہ صرف ایک خیال تھا، میں خود نہیں۔''

مجھے ایک دم ہنسی آگئی، کوروتی جو کچھ کہہ رہی تھی حقیقی نگاہ سے دیکھنے سے مجھے وہ تسلیم نہیں ہورہا تھا، بڑی انوکھی بات تھی، ناقابل فہم اور ناقابل یقین، البتہ میں نے ذیشان عالی کو سمجھایا کہ بیٹے اپنی توجہ اپنی کتاب پر رکھو جسے تمہیں بڑی محنت سے ترتیب دینا ہے، اگر اس طرح تم متاثر ہوئے تو یہ تو غلط ہوجائے گا، تم کیوں اپنے نقصان پر تلے ہوئے ہو، وہ زمانہ قدیم کی ایک پراسرار شخصیت ہے، ایک دلکشی کی حامل تم ایک ایسی عورت کی معیت میں زندگی گزار رہے ہو، جو آب حیات پیے ہوئے ہے، آب حیات کی کہانیاں بے شمار لکھی گئی ہیں، میں نے خود ایسی کہانیاں لکھی ہیں جو صرف مفروضات پر مبنی ہوتی ہیں، لیکن میری زندگی میں ایسا کوئی کردار آجائے گا، جو آب حیات پیے ہوئے ہو، وہ میرے لئے بڑی اہمیت کا حامل تھا، چنانچہ میں نے خود کو سنبھال لیا اور ہنس کر بولا۔

''ہاں میں یہ اعتراف کرچکا ہوں کہ جب تم کسی کے بارے میں اپنی محبت کا اظہار کرتی ہو تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔''

اس کے چہرے پر مسرت کے نقوش منجمد ہوگئے تھے اس نے پیار بھری آواز میں کہا۔ ''تم میرے محبوب ہو ذیشان عالی! میں تمہیں دل سے چاہتی ہوں، جو کہانیاں میں تمہیں سناتی رہی ہوں وہ ماضی کی کہانیاں تھیں اور ماضی گزر چکا ہے، بس یہ میرا علم اور میرا انداز ہے کہ میں تمہیں ماضی کا ایک کردار بنا کر وہاں لے جاتی ہوں لیکن وہ کردار ہم نہیں ہوتے، تم خود بھی کبھی محسوس کرنا وہ تو صرف ایک تصور ہوتا ہے جو ماضی میں کھوچکا ہے، میں تو تمہارے سامنے صرف صدیاں زندہ کردیتی ہوں اور کچھ نہیں۔

ویسے میں تمہیں ایک بات بتاؤں یہ حال جو ہے نا یہ ماضی سے کہیں زیادہ خوب صورت ہے، اس حال میں جو کچھ میں دیکھ رہی ہوں اسے دیکھ دیکھ کر دنگ رہ جاتی ہوں، انسان کیا بن چکا ہے، زمانہ قدیم میں جادو ہوا کرتا تھا اور جادوگر مگر وہ شکلیں لئے اس دنیا کو مشکلات کا شکار کرتے رہتے تھے، خود میرا واسطہ بھی اس طرح کے جادوگروں سے پڑچکا ہے، میں تمہیں بتاچکی ہوں کہ میں نے جو علوم سیکھے ہیں ایسے ہی لوگوں سے سیکھے ہیں جو مافوق الفطرت تھے، سمجھ گئے ہوگے نا میری بات، تو میں اس حال کی بات کررہا ہوں بلکہ تم نے پہلی بار مجھے شمن پیچی اور اس کے محبوب سے روشناس کرایا تو میں ہل کر رہ گئی، حسن وعشق کی لاتعداد داستانیں ماضی میں میری آنکھوں کے سامنے سے گزر چکی ہیں، نجانے کیا کیا ہوا ہے ماضی میں، لیکن آج جو کچھ ہوا ہے اور جو ہورہا ہے اس نے مجھے دنگ کردیا ہے، چلو چھوڑو...

ہم یوں کرتے ہیں ذیشان عالی کہ کچھ عرصے کے لئے سب کچھ بھول جاتے ہیں، بقول تمہارے تم جو کتاب ترتیب دے رہے ہو اس کی ترتیب بھی کچھ عرصے کے لئے تم روک دو، وہ سب بعد میں کرلینا مجھے

اپنی محبوب کی حیثیت سے تم اپنی قربت میں زیادہ سے زیادہ جگہ دو، درحقیقت جو لمحات میں اب گزار رہی ہوں وہ میری صدیوں کی زندگی کے سب سے دلکش لمحات ہیں، کیونکہ اس میں میرا محبت میرے ساتھ ہے، وہ جسے زندگی میں سب سے پہلے میں نے چاہا، تم سے پہلے میں نے کسی کو دل کی گہرائیوں سے نہیں چاہا، بلکہ ایسے ہی حالات کا شکار رہی جس نے میرے سامنے کوئی نہ کوئی داستان بیان کردی، تو میں تمن پتی اور اس کے محبوب کے بارے میں جو کہہ رہی تھی دل ہلا ڈالا تھا میرا اس داستان نے اور جو کچھ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا وہ صحیح معنوں میں مجھے پاگل کرنے کا باعث بن گیا تھا، میں اکتا گئی ہوں اپنے ماضی سے ... تمہاری دنیا بہت دلکش ہے، چلو گھر سے نکلتے ہیں باہر نکلتے ہیں، اس دنیا کو قریب سے دیکھیں گے، پلیز پلیز پلیز.....'' وہ لجاجت بھرے انداز میں بولی تو میں بھی آمادہ ہوگیا۔

لیکن میں آپ کو دل کی بات بتاؤں، میرے قریبی عزیزو اور دوستو! یعنی میرے پڑھنے والو کہ میں نے دل میں یہی سوچا تھا کہ زندہ صدیاں لکھ رہا ہوں اور ایک کردار میری کتاب کا مرکزی کردار ہے۔ بلکہ اگر دو بھی کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا، کیونکہ بھنسالی میرے لئے ایک کردار بے شک تھا، لیکن اس سے میرا زیادہ واسطہ نہیں پڑتا تھا، اور وہ مجھ سے دور ہی رہتا تھا، مطلب میرے کہنے کا یہ ہے کہ میں اپنے اس کردار کو کسی بھی طرح بددل نہیں کرنا چاہتا تھا۔

وہ اگر یہ کہہ رہی تھی کہ یہاں سے چلا جائے اور دیکھا جائے کہ میری دنیا کتنی دلکش ہے تو جب زندہ صدیوں کا یہ باب تکمیل پا رہا ہوگا تو میں اس کی خواہش کے بارے میں بھی لکھوں گا اور یہ تحریر کروں گا کہ اس کے بعد کیا ہوا، سو اس کے بعد یوں ہوا کہ میں نے اس کی خواہش کے مطابق تیاریاں کیں سب سے پہلے ہمیں اپنا گھر چھوڑنا تھا تو ہم دونوں باہر نکل آئے اور اس کے بعد میں نے ایک انتہائی خوب صورت فائیو اسٹار ہوٹل میں قیام کیا۔ اس سے پہلے بھی ہوٹلوں میں قیام کرچکا تھا، لیکن اس وقت ایک حسین عورت میری محبوب کی حیثیت سے میرے ساتھ تھی جس پر میرا پورا تصرف تھا۔

کوروتی یہاں آکر مکمل طور پر یہاں کے پروگراموں میں حصہ لے رہی تھی اور بہت خوش تھی بارہا اس نے ہوٹل کے خوب صورت ہال میں بیٹھ کر مجھ سے اس بات کا اظہار کیا تھا کہ میری یہ دنیا ماضی کی دنیا سے کہیں زیادہ حسین ہے اس کے مشاغل اور یہاں کی زندگی میں بڑی دلکشی ہے۔ وہ سب کچھ ہے یہاں جو ماضی کے راج محلوں یا عظیم ترین شہروں میں نہیں ہوتا تھا۔ موجودہ دور شاید صدیوں کی تاریخ میں سب سے خوب صورت دور تھا اس کا یہی کہنا تھا۔

مجھے بھی اس کے ساتھ لطف آرہا تھا، ایک دن میں نے اس سے پوچھا کہ ''ابھی وہ یہیں قیام کرے گی یا ہم باہر کی سیاحت کا آغاز کریں؟''

تب اس نے جواب دیا کہ ''نہیں تھوڑا وقت یہیں گزاریں گے، یہ تبدیلی مجھے بہت اچھی لگ رہی ہے۔''

میں نے اس سے کہا کہ ''میں اپنے مسودے کے کاغذات یہیں اٹھا لاتا ہوں، تھوڑا سا وقت میں اپنی کتاب لکھنے میں بھی صرف کروں گا۔'' اس نے اس کی اجازت دے دی اور میں اپنے گھر آگیا۔

یہاں میں نے خاصا وقت گزارا تھوڑا سا یہیں بیٹھ کر لکھ لیا تھا، اس وقت شام کے ساڑھے پانچ بجے تھے جب میں واپس ہوٹل پہنچا میرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوا تھا میں اندر داخل ہوگیا، حالانکہ ابھی شام ہی ہوئی تھی لیکن کمرے میں مدہم بلب روشن تھا مجھے حیرت ہوئی بڑے صوفے پر کوئی ہوٹل کے بیڈ روم کا کمبل اوڑھے ہوئے بیٹھا ہوا تھا اس کمبل نے اس کا چہرہ تک ڈھک رکھا تھا۔ میں نے ادھر ادھر نگاہیں دوڑائیں اور پھر میرے منہ سے نکلا۔

''کوروتی۔'' جواب میں مجھے بے اختیار رونے کی آواز سنائی دی تھی، ایک عجیب سی آواز جسے سن کر میں سخت حیران ہوگیا۔

(جاری ہے)

روشن آنکھیں

احسان سحر۔میانوالی

اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سا سحر نظر آتا تھا ان میں اتنی کشش تھی کہ کوئی بھی جب اس کی آنکھوں میں اپنی نظر ڈالتا تو وہ سحر زدہ ہو کر رہ جاتا اور پھر اچانک ایک واقعہ رونما ہوا جس نے سب کو لرزا کر رکھ دیا۔

دل ودماغ سے برسوں محو نہ ہونے والی اپنی نوعیت کی دلکش، دلنشین اور دلفریب کہانی

ان سارے واقعات نے بھی مجھے دہلا کر رکھ دیا تھا۔ بات صرف اتنی تھی کہ اس لڑکی کی آنکھیں مجھے بہت اچھی لگی تھیں۔ ان آنکھوں میں بہت کچھ تھا۔ شرارت، دعوت، وہ آنکھوں میں جب آنکھیں ڈال کر بات کرتی ایک عجیب سی کیفیت ہوجاتی۔ ایسی بے خودی جیسے سارا جسم سنسنانے لگا ہو۔ میں نے اس کو ایک تقریب میں دیکھا تھا وہ خود بھی بہت خوب صورت تھی، سلگتا ہوا حسن اور نہ جانے کن جہانوں کی سیر کراتی ہوئی روشن آنکھیں، میں بہت دیر سے اسے دیکھ رہا تھا۔

اس نے ذرا سی دیر میں نہ جانے کتنوں کو گرویدہ کرلیا تھا، بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ کشتوں کے پشتے لگادیے تھے۔ وہ قریب سے گزرنے والے جب کسی نوجوان کو ایک بار بھرپور نظر سے دیکھ لیتی تو وہ اس کے اردگرد چکرانے لگتا۔

''یار یہ لڑکی کمال کی ہے۔'' میں نے اپنے دوست سے کہا۔

''تم نازش کی بات کر رہے ہو نا.....؟'' اس نے لڑکی کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''میں نہیں جانتا کہ اس کا نام نازش ہے یا کچھ اور۔''

''ہاں اس کا نام نازش ہی ہے اور بہت ہی کمال کی چیز ہے۔ بہت بے باک، اس نے نہ جانے کتنوں کو اپنا دیوانہ بنا رکھا ہے وہ کسی کے ساتھ سیریس نہیں ہے، یہ سمجھو کہ یہ ایک نمبر کی فلرٹ ہے۔'' میرے دوست نے لڑکی کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔

''کچھ بھی ہو اس میں بلا کی کشش ہے۔''

''یہ تو ہے۔'' میرے دوست عادل نے ایک گہری سانس لی۔ ''خاص طور پر اس کی آنکھوں میں جادو ہے جس کو بھی نظر بھر کر دیکھ لے وہ اس کا دیوانہ ہو جاتا ہے۔''

''یار میرا بھی دیوانہ ہونے کو دل چاہ رہا ہے۔ تم اس سے میرا تعارف تو کرا دو۔''

''اس سے تعارف کے لئے کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔'' عادل نے کہا۔ ''بس اس کے پاس پہنچ کر اس سے ہیلو ہائے کرلو خود ہی تعارف ہو جائے گا۔''

میں یونہی بے پروائی سے ٹہلتا ہوا اس کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے خود پر اعتماد تھا کہ میں بھی اپنے گہرے نیلے رنگ کے سوٹ میں بہت اچھا لگ رہا ہوں گا، میں نے جان بوجھ کر براہ راست اس کی طرف دیکھنے سے گریز کیا تھا بلکہ اپنا چہرہ دوسری طرف رکھا تھا یہ اور بات ہے کہ میری توجہ اس کی طرف تھی۔

کچھ دیر بعد میں یونہی سرسری انداز میں اس کی طرف دیکھا جیسے اتفاقاً اس کی طرف نگاہ پڑ گئی ہو۔ مجھے دیکھ کر اس کی روشن اور بے پناہ پرکشش آنکھوں کی چمک میں اور اضافہ ہو گیا تھا۔ پھر اس کے ہونٹوں پر ایک خیر مقدمی سی مسکراہٹ نمودار ہوئی۔

مجھے اس سے بات کرنے کے لئے کسی بہانے کی ضرورت نہیں پڑی تھی بلکہ خود اس نے پہل کر دی تھی۔

''ہیلو۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ شاید اس بھیڑ میں کسی کو تلاش کر رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔'' اپنے آپ کو، یہاں آ کر کھو سا گیا ہوں۔''

''خوب۔'' اس کی مسکراہٹ اور گہری ہو گئی۔

''میں تلاش کرنے میں مدد کروں؟''

''شکریہ آپ کا، آپ تو خود اس بھیڑ میں گم لگ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔

''یہ بات تو ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔ ''میں بھی اپنے آپ کو تلاش کرتی پھر رہی ہوں۔''

ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھوں کی شرارت اور اس کی شوخی نہ جانے کہاں گم ہو گئی تھی۔ یہ ایک لمحے کا تاثر تھا اس کے بعد اس کی آنکھیں پھر اسی انداز سے چمکنے لگیں۔ اسی وقت دو تین لڑکیوں نے اسے آ کر گھیر لیا اور وہ ان کے ساتھ چلی گئی، جاتے جاتے اس نے ایک بھرپور نگاہ مجھ پر ڈالی تھی۔

اس لڑکی نے مجھ پر خاص اثر مرتب کر دیا تھا۔ میں عام طور پر اس قسم کی حرکتوں اور سرگرمیوں سے زیادہ دور ہی رہتا ہوں لیکن اس میں یقیناً کوئی ایسی بات تھی کہ جو مجھے کئی دنوں تک یاد رہی تھی۔ میں نے اپنے دوست سے اس کے بارے میں دریافت کیا۔

''یار وہ کون ہے، اور کہاں رہتی ہے؟''

''کیا بات ہے خیریت تو ہے کیا اس کے عشق میں گرفتار ہو گئے ہو؟''

''نہیں بھئی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''اس کی آنکھوں میں جو خاص قسم کی چمک اور کشش ہے اس نے مجبور کر دیا ہے۔''

''اس کے چکر میں مت پڑنا، وہ بہت ہی فلرٹ قسم کی لڑکی ہے۔''

''پھر بھی اگر تم اس کے بارے میں کچھ جانتے ہو تو بتا دو۔''

''میرا کیا ہے میں بتا دیتا ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''وہ ایک بینک کی شاخ گلشن والی میں کام کرتی ہے۔''

''اوہ۔'' میں نے گہری سانس لی۔ ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں آزادی سے اس سے جا کر مل سکتا ہوں۔''

''ہاں ہاں کیوں نہیں، وہ ویسے بھی نئے لوگوں سے ملنے کی شوقین ہے، تم چلے جاؤ گے تو اس کی ڈائری میں ایک نئے نام کا اضافہ ہو جائے گا۔''

میں دوسرے ہی دن...... بینک کی اس شاخ میں پہنچ گیا۔ وہ سامنے ہی بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کی خوب صورت آنکھوں میں چمک پیدا ہوگئی تھی، میں اس کے سامنے والی کرسی پر جا کر بیٹھ گیا۔ ''میرا خیال ہے۔ تم نے مجھے پہچان لیا ہوگا......؟''

''بہت اچھی طرح۔'' وہ مسکرا دی۔ ''اور میں تمہارے آنے کا ہی انتظار کر رہی تھی۔'' اس نے بھی جواباً بے تکلفی کا اظہار کیا تھا۔

''وہ کیوں......؟'' میں نے چونک کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

''وہ اس لئے کیونکہ ابھی تک تو کوئی ایسا نہیں ملا جس نے مجھ سے دوبارہ ملنے کی خواہش نہ کی ہو۔''

''اوہ...... بہت مان ہے تمہیں اپنے آپ پر......؟''

''کیوں...... کیا نہیں ہونا چاہئے۔'' اس نے اپنی روشن آنکھیں جیسے میری آنکھوں میں پیوست کر دی تھیں اور میں ان آنکھوں کے سحر میں ڈوبتا چلا گیا۔

''اچھا اب یہاں تک آنے کا مقصد بھی بتا دیں؟'' اس نے میری طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اب کیا مقصد بھی بتانا پڑے گا؟'' میں نے بھی شوخی سے اس کو سوال میں گھیر لیا۔

''نہیں، میں سمجھ گئی۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اچھا چلیں آدھے گھنٹے کے بعد میں یہاں سے آف ہو جاؤں گی، آپ مجھ سے کوالٹی میں مل لیں آپ نے دیکھا بھی ہوگا۔''

''ہاں دیکھا ہے۔''

''او کے پھر جائیں اور کسی بے قرار روح کی طرح اس کے آگے ٹہلتے رہیں، میں تھوڑی دیر میں آ رہی ہوں۔'' وہ آدھے گھنٹے سے پہلے پہنچ گئی تھی، ہم ایک

لوڈشیڈنگ

اسے پہلی بار میں نے اپنے دوست کی شادی میں دیکھا وہ میرے سامنے سے کئی بار گزری، وہ بار بار مجھے سر سے پاؤں تک دیکھ رہی تھی، شاید میں اسے پہلی نظر میں اچھا لگا اور وہ مجھے بھی بہت اچھی لگی، آخر اس نے مجھے اشارہ کیا۔ میں موقع دیکھ کر اس کے پاس گیا اور آہستہ سے پوچھا۔ ''جی فرمایئے۔'' اس نے شرماتے ہوئے کہا۔ ''بھائی آپ نے الٹی شلوار پہنی ہوئی ہے۔''

''بجلی والو تمہارا حشر کیا ہوگا، ذرا ہوش کے ناخن لو۔''

شرم

ایک شخص گاؤں سے ایک بیمار مرغی فروخت کے لئے بازار لے گیا تو بازار میں ایک شخص نے اس شخص سے پوچھا کہ ''اس مرغی کا سر کیوں نیچے ہے، کہیں بیمار تو نہیں ہے تو اس شخص نے کہا۔ ''گاؤں کی مرغی ہے بازار میں رش دیکھ کر شرما رہی ہے۔''

(تارز نوید-کراچی)

طرف آ کر بیٹھ گئے تھے۔

''اب میں تم کو ایک مزے کی بات بتاؤں۔'' اس نے کہا۔ ''اس ریسٹورنٹ کا اسٹاف بھی مجھ پر جان چھڑکتا ہے۔ کاؤنٹر والے سے لے کر ویٹر تک یہ سب میرے دیوانے ہیں۔''

''لیکن تم نے یہ کیسا چکر چلا رکھا ہے؟''

''اس میں بہت مزہ آتا ہے جناب۔'' وہ ہنس کر بولی۔ ''یہ مرد بہت ہوشیار اور ذہین بنتے ہیں لیکن صرف ایک نگاہ ان کی ہوشیاری اور ذہنیت کو کھا جاتی ہے۔ مجھے ان کی عاجزی دیکھنے میں مزہ آتا ہے۔ جب میں ان سے نگاہیں پھیر لیتی ہوں تو پھر ان کی بے قراری دیکھنے کے قابل ہوتی ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے بس اب تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔''

''شاید میں ایسا ثابت نہ ہوسکوں.....''

''مجھے اس کی توقع بھی نہیں ہے۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''کیونکہ اس دوران مجھے پرکھنے کا سلیقہ آ گیا ہے، میں بھانپ لیتی ہوں کہ کون کس ارادے سے میری طرف بڑھ رہا ہے۔''

''لیکن تم جو بھی کرتی پھر رہی ہو اس میں تو تمہاری بدنامی ہے۔''

''میں نے کبھی ایسی باتوں کی پروا نہیں کی۔'' وہ بے پروائی سے بولی۔ ''جو مجھے جانتے ہیں وہ میری اس ایکٹی وٹی سے واقف ہیں اور انہیں مجھ پر پورا بھروسہ ہے۔ جیسے میرے گھر والے، میرے رشتے دار اور میرے دوست۔''

''اس کے باوجود تمہیں احتیاط کرنی چاہئے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ لوگ کسی بھی وقت تمہارے لئے خطرناک ہوسکتے ہیں۔''

''ہاں مجھے زندگی میں ابھی تک دو قسم کے لوگ ملے ہیں۔'' وہ مسکرا کر بولی۔ ''ایک مجھ پر جان دینے والے جو پوری طرح میرے ٹرانس میں آ جاتے ہیں اور دوسرے مجھے نصیحت کرنے والے اور مزے کی بات یہ ہے کہ نصیحت کرنے والوں کی بھی اندرونی خواہش کچھ اور ہی ہوتی ہے جس کو وہ ظاہر نہیں کرتے۔''

''تم واقعی بہت خطرناک لڑکی ہو؟'' میں نے کہا۔

''شکریہ اس تبصرے کا۔'' وہ ہنس پڑی۔ ''اب یہ بتائیں آپ دوبارہ کب بینک کی طرف آئیں گے؟ میرا خیال ہے کہ اب آپ کا آنا جانا تو رہے گا۔''

''دل تو یہی چاہتا ہے۔'' اس نے میری آنکھوں میں جھانکا۔ ''لیکن شاید اپنے بھرم کی خاطر میں کچھ دن ادھر نہ آسکوں۔''

''اوہ ایسا مت کہئے ورنہ یہ بندی بے موت مر جائے گی۔''

وہ واقعی خطرناک لڑکی تھی۔ ایک تو ویسے اس کی آنکھیں اپنے ٹرانس میں لے لیتی تھیں۔ پھر اس کا حسن، اس کی ذہانت اور دلفریب باتیں یہ سب کسی کو بھی پاگل کرسکتی تھیں۔ میں نے اظہار تو نہیں کیا تھا لیکن یہ سچ ہے کہ میں خود اس کے ٹرانس میں آ گیا تھا۔ بس فرق یہ تھا کہ میں دوسروں کی طرح اس کے قدموں میں گرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے بعد میں اس کی طرف نہیں گیا۔ میں یہ دیکھنا چاہتا تھا کہ مجھ میں کتنا صبر ہے، اس کے بغیر میں پرسکون رہ سکتا ہوں یا نہیں۔ لیکن یہ مرحلہ ذرا دشوار ہی ہوتا جا رہا تھا۔

بالآخر ایک دن میں خود ہی اس کے بینک کی طرف چلا گیا۔ اس کے کولیگ نے بتایا کہ وہ کسی کے ساتھ سامنے والے ریسٹورنٹ تک گئی ہے۔ ہوٹل وہی ہوسکتا تھا۔ ''کوالٹی'' ہوٹل پہنچ گیا۔ وہ واقعی ایک نوجوان کے ساتھ بیٹھی اس سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اور وہ نوجوان اس پر قربان ہوا جا رہا تھا۔

مجھے دیکھ کر اس نے ہاتھ ہلا کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کی طرف نہیں جانا چاہتا تھا۔ لیکن اس نے اتنے والہانہ اور پرجوش انداز میں ہاتھ ہلایا تھا کہ مجھے اس کی میز کی طرف جانا ہی پڑ گیا۔ ''احسان ان سے ملیں۔'' اس نے اس نوجوان کی طرف اشارہ کیا۔ ''یہ میرے نئے دوست سلیم احمد ہیں۔''

خواب ہے یا سراب ہے
سعدیہ لیاقت
آٹھ گھنٹے کی یہ فلائیٹ ایک کٹھن مرحلہ تھا۔ پاکستان سے ڈنمارک کا سفر جوزیبا نے پہلی بار کتنی خوشی سے گزارا تھا آج اس سے کتنا مختلف تھا۔ پچھلی بار جہاں اپنوں سے بچھڑنے کا غم تھا تو دوسری طرف اپنے گھر جانے اور جیون ساتھی سے ملنے کی خوشی تھی۔ پر اب تو اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ رات میں گم ہو جانے والا ایک پرندہ ہو جو بے سمت اڑے جا رہا ہے جسے نہ منزل کا پتہ ہے اور نہ ہی راستے کی خبر۔
قیمت
-/400 روپے
دعا بک کارنر
منشی محلہ گلی نمبر 5
امین پور بازار
فیصل آباد

''سلیم نہیں، نعیم۔'' اس شخص نے تصحیح کی۔ ''میرا نام ہی بھول جاتی ہیں۔''

''اوہ سوری۔'' نازش جلدی سے بولی۔ ''پلیز برا نہ مانئیں میری یادداشت دن بدن کمزور ہوتی جارہی ہے۔'' پھر اس نے میری طرف دیکھا۔ ''آپ کیوں کھڑے ہیں آپ تو بیٹھ جائیں۔''

''نازش مجھے آپ سے ایک ضروری بات کرنی تھی۔'' اس نوجوان نے کہا۔

''ہاں ہاں بات بھی ہوجائے گی پہلے اپنے پرانے دوست سے حال چال تو پوچھ لوں۔''

میں نے محسوس کیا کہ اس نوجوان کا موڈ خراب ہوگیا تھا۔ کہاں تو وہ لہک لہک کر باتیں کررہا تھا اور کہاں تو وہ کچھ دیر بعد معذرت کرکے رخصت ہوگیا۔

''سالا۔'' نازش نے برا منہ بنا کر گالی دی۔ ''چلے آتے ہیں عشق کرنے۔''

''یہ کہاں سے مل گیا تھا تمہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''یہ موصوف اپنا بینک اکاؤنٹ کھلوانے آئے تھے بس مجھے دیکھ کر مجھ پر دل و جان سے قربان ہوگئے۔ میں نے بھی تھوڑی سی حوصلہ افزائی کردی۔ بس اتنی سی بات تھی۔ اب ناراض ہوگئے ہیں۔''

''نازش تمہیں یہ کھیل بہت مہنگا پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''کسی دن تم مصیبت میں پھنس جاؤ گی۔''

''احسان صاحب یہ آجکل کے فیشن ایبل بناسپتی مردوں میں اتنی اہمیت اور ہمت نہیں رہی کہ وہ اپنی غیرت کے لئے اپنی جان پر کھیل جائیں، یہ تو بس اپنی دم ہلانا جانتے ہیں اور یہ کچھ نہیں کرسکتے۔''

''نازش میں پھر کہتا ہوں تمہاری یہ روشن آنکھیں کسی دن تمہیں مصیبت میں ڈال دیں گی۔''

''میں ایک بات بتاؤں جناب عالی۔ آج تک میری ان روشن آنکھوں کو ایسا کوئی چہرہ ملا ہی نہیں جس کو دیکھ کر میں سکتے میں رہ جاتی اس سے آپ بے فکر رہیں کوئی میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

پھر اس نے بات بدل دی۔ میں نے بھی اس کے موڈ کو دیکھتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں شروع کردیں۔ اس لڑکی کو سمجھانا بے کار تھا۔ مجھے تو اس کے گھر والوں پر حیرت ہورہی تھی۔ انہوں نے کسی طرح اس کو اتنی آزادی دے رکھی تھی۔

پھر ایک دن راستے میں اس سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ایک کار سے اتر کر کسی طرف جارہی تھی اس کے ساتھ ایک مرد اور ایک عورت بھی تھی۔ یہ دونوں بہت باوقار دکھائی دے رہے تھے۔ ''ارے احسان صاحب۔'' اس نے مجھے دیکھ کر آواز لگائی۔ ''ادھر آئیں۔''

''ان سے ملیں یہ ہیں میرے ڈیڈ، اور یہ ہیں میری ممی..... اور یہ احسان صاحب جو اکثر مجھے سمجھاتے رہتے ہیں۔''

''خوشی ہوئی ہے آپ سے مل کر۔'' اس کے ڈیڈ نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ''نازش اکثر آپ کا ذکر کرتی ہے۔'' مجھے وہ بہت ہی اچھے لگے تھے۔ خالص مشرقی والدین خاص طور پر اس کی ماں کے چہرے پر نور برس رہا تھا۔ ''بیٹا کبھی گھر آؤ۔'' اس کی ماں نے کہا۔

''جی ہاں ضرور آؤں گا، بشرطیکہ کہ نازش مجھے اپنے گھر میں برداشت کرسکے۔''

''اور اگر نصیحت نہ ہو تو پھر برداشت کرلوں گی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔

اس کی بات پر ہم سب ہنس پڑے۔ اس کے ڈیڈ نے مجھے پتہ سمجھا دیا تھا۔

کچھ دنوں کے بعد ایک شام میں واقعی اس کے گھر پہنچ گیا۔ وہ ایک خوب صورت بڑا مکان تھا۔

نازش اس وقت وہاں نہیں تھی، اس کے والدین تھے۔ مجھے ڈرائنگ روم میں بیٹھا دیا گیا۔

اس کے ڈیڈ نے مجھے بتایا کہ وہ اپنے کسی دوست کے ساتھ باہر گئی ہوئی ہے۔

ایسا بتاتے ہوئے میں نے ان کی آواز اور ان کے لہجہ میں بھی دکھ محسوس کیا تھا۔ جیسے وہ اندر سے ٹوٹ رہے ہوں۔

''جناب پتہ نہیں مجھے کہنا چاہئے یا نہیں لیکن آپ

لوگوں کو دیکھتے ہوئے کہنے کی جسارت کررہا ہوں۔‘‘
’’میرا خیال ہے کہ میں سمجھ گیا ہوں کہ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔‘‘ نازش کے ڈیڈ نے میری طرف دیکھتے ہوئے کہا۔
’’ہاں، نازش کے لئے یہ رویہ بہت خطرناک ہے۔‘‘ میں نے کہا۔ ’’کوئی یہ نہیں سمجھے گا کہ وہ مذاق میں اس قسم کی حرکتیں کررہی ہے۔ وہ فلرٹ سمجھا جائے گا۔ اور وہ بری طرح بدنام ہوجائے گی۔‘‘
’’ہم بھی یہی سمجھتے ہیں۔‘‘ اس کی ماں نے غمگین صورت بناتے ہوئے کہا۔ ’’بیٹا ہم خود اس کی طرف سے بہت پریشان ہیں نہ جانے اسے یہ عادت کہاں سے پڑ گئی ہے، وہ کیوں ایسا کرتی ہے، جب بھی اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہیں تو وہ ہنس کر ٹال دیتی ہے۔ کہتی ہے کہ ’’اسے آج تک ایسا کوئی نہیں ملا جس سے وہ متاثر ہوسکے، اس لئے ہم اس کی طرف سے بے فکر رہا کریں۔‘‘
’’اب یہی ہوسکتا ہے کہ آپ لوگ اس کی شادی کردیں۔‘‘ کچھ دیر کی گھمبیر خاموشی کے بعد میں نے کہا۔
’’وہ اس کے لئے بھی تیار نہیں ہوتی۔‘‘ اس کے ڈیڈی نے کہا۔ ’’کہتی ہے کہ ابھی لائف انجوائے کرنا چاہتی ہے۔ بینک میں جاب بھی اس نے اپنے شوق کی خاطر کی ہے۔‘‘
’’بیٹا اب تم ہی اسے سمجھانے کی کوشش کرو۔‘‘ اس کی ممی نے میری طرف امید بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔ میں نے انہیں تسلی دی کہ میں اپنی سی کوشش کروں گا جو بظاہر مجھے ناکام ہی لگتی تھی۔ پر اندھیرے میں ایک چراغ جلانے سے وہ اندھیرا اتنا نہیں رہتا جتنا پہلے ہوتا ہے۔ اسی امید پر میں نے ان سے وعدہ کیا کہ میں اپنی سی کوشش کروں گا، میں وہاں کچھ دیر بیٹھ کر واپس آگیا۔
پھر تقریباً پندرہ بیس دنوں تک اس سے ملاقات نہ ہوسکی۔ وہ کہاں ہے کیسی ہے۔ کیا کررہی ہے؟ یہ سوال بس ریورس ہی ہے۔ ظاہر ہے وہ وہی کررہی ہوگی جو وہ کافی عرصہ سے کررہی ہے۔ میرا بینک کی طرف جانا ہی نہیں ہوا۔
پھر ایک دن گیا تو پتہ چلا کہ اس نے جاب چھوڑ دی ہے۔ بڑی عجیب بات تھی، کوئی وجہ تو ہوگی اور پتہ نہیں کیوں میرا دل کہہ رہا تھا کہ وہ وجہ عام سی نہیں ہوگی خاص ہی ہوگی، ویسے یہ بہت حیرت کی بات تھی کہ اس کا ایسا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ ’’جاب چھوڑ دی۔‘‘ میں نے حیرت سے پوچھا۔ ’’وہ کیوں؟‘‘ میں نے وجہ جاننا چاہی۔
’’یہ کسی کو معلوم نہیں جناب۔‘‘ کیشیئر کے جواب سے مجھے مایوسی تو ہوئی، خیر میں خود ہی یہ وجہ معلوم کرلوں گا۔‘‘
میں ایک شام موقع نکال کر اس کے گھر پہنچ گیا۔ اس کی ممی اور ڈیڈی سے ملاقات ہوئی تھی۔ ’’نازش کہاں ہے؟ اس نے جاب کیوں چھوڑ دی۔‘‘ میں نے خیریت وغیرہ پوچھنے کے بعد ان سے پہلا سوال کیا۔ اور مجھے یقین تھا کہ یہاں سے میں بے مقصد نہیں لوٹوں گا۔
’’بیٹا اس کی دنیا بدل گئی ہے۔‘‘ اس کی ماں نے بتایا۔ ’’اور اب تو وہ پردہ بھی کرنے لگی ہے کسی کے سامنے بھی نہیں آتی۔‘‘ اس کی ماں کے لہجے میں حیرت اور خوشی کا ملا جلا رجحان پایا جاتا تھا۔
’’کیا........‘‘ یہ سب سن کر میں حیرت سے اچھل پڑا۔ ’’یہ سب کیسے ہوگیا۔ اتنی بڑی تبدیلی......؟‘‘
’’میں بتاتا ہوں۔‘‘ اس کے ڈیڈی نے کہا۔ ’’میں ایک بزرگ سے بیعت ہوں۔ صاحبزادہ فاروق حسن وہ کہیں اور رہتے ہیں۔ وہ ایک دن ہمارے ہاں تشریف لائے۔ ہم نے ان سے نازش کے بارے میں تفصیل سے بات کی، انہوں نے بتایا کہ وہ اسی لئے یہاں تشریف لائے ہیں۔ کیونکہ کل انہیں ہدایت کی گئی ہے۔ انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ کس نے ہدایت کی ہے۔ بہر حال ان کے کہنے پر نازش ان کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ انہوں نے نازش سے فرمایا۔ ’’بیٹا تمہاری روشن اور خوب صورت آنکھوں کے لئے ایک دل کش نظارہ موجود ہے۔ اس کے بعد تمہیں کسی اور کو دیکھنے کی خواہش نہیں رہے گی۔‘‘
بزرگ نے اتنا کہہ کر نازش کو رخصت کردیا اور ہم سے کہنے لگے۔ ’’اب اس بچی کا پہلے سے زیادہ خیال رکھئے گا۔‘‘ اور وہ چلنے لگے۔ اس کے دوسرے اور تیسرے دن کے بعد نازش کی کیفیت ایسی ہوگئی۔ اس نے جاب

چھوڑ دی، اور پردہ کرنے لگی۔ اب وہ کسی کو بتاتی بھی نہیں ہے کہ اس میں اتنی عظیم تبدیلی کیسے آئی ہے۔'' اس کے ڈیڈی نے مکمل تفصیل سے مجھے آگاہ کیا اور چپ ہوگئے۔

''حیرت ہے۔'' میں نے تفصیل سننے کے بعد ایک گہری سانس لی اور پوچھا۔ ''کیا آپ لوگ اس کی اس تبدیلی سے خوش ہیں؟''

''بیٹا ہمارا کیا پوچھتے ہو، ہمیں تو ایسا لگ رہا ہے کہ ہمیں دو جہاں کی دولت مل گئی ہے۔''

''کیا میں ان سے مل سکتا ہوں۔'' میں نے آخر میں اپنی خواہش کا ان سے اظہار کیا۔

''نہیں، وہ کسی نامحرم سے نہیں ملتی، ہاں تم اس سے باتیں ضرور کر سکتے ہو۔''

''چلیں بات ہی کرا دیں!'' میں نے ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ وہ دونوں ڈرائنگ روم سے چلے گئے۔ نازش سے میری باتیں اس طرح ہوئی تھیں کہ وہ پردے کے پیچھے کھڑی ہوئی تھی۔ ''آپ تو بہت حیران ہوئے ہوں گے۔'' اس نے مجھ سے پوچھا۔

''ظاہر ہے۔'' میں نے جواب دیا۔ ''کیا تم مجھے بتا سکتی ہو کہ ایسا انقلاب کس طرح آیا؟'' میں نے اس سے اہم سوال کیا جس کو جاننے کا تجسس مجھے بے چین کئے جا رہا تھا۔

کچھ دیر کی خاموشی کے بعد اس کی آواز آئی۔

''چلیں آج بتا ہی دیتی ہوں۔ آپ نے یہ تو جان لیا ہوگا کہ بزرگ مجھ سے کیا کہہ گئے تھے۔ اس کی دوسری رات میں نے ایک خواب دیکھا۔ مسجد نبوی کا مزار اقدس کی جالیاں اور اس کے چاروں طرف نور کی لہریں، نور کا سمندر تھا، میری نگاہیں نہیں ٹھہر رہی تھیں۔ میں اسی کیفیت میں بیدار ہوئی تو میرے دل کی عجیب کیفیت ہو رہی تھی۔ اپنے آپ پر اختیار نہیں رہا تھا۔ اپنی بدقسمتی پر رونا آ رہا تھا کہ میری آنکھیں کیوں کھل گئیں۔ وہ خواب کیوں ختم ہوگیا۔

بہرحال وہ خواب مجھے پھر دکھائی دیا۔'' اسی طرح، نور کے سمندر میں گھرا ہو روضہ مبارک اور اس کے آس پاس میں کھڑی ہوئی، جب بیدار ہوئی تو پورا جسم لرز رہا تھا اور بزرگ کی وہ بات یاد آ رہی تھی کہ ''میری روشن اور خوب صورت آنکھوں کے لئے ایک دلکش نظارہ موجود ہے۔ اس کے بعد کسی اور کو دیکھنے کی خواہش نہیں رہے گی۔'' نازش اپنی حیرت انگیز اور دلچسپ روداد سنانے کے بعد خاموش ہوگئی۔ اور میں سحر زدہ سا اسے اور اس کی روداد دیکھے اور سنے جا رہا تھا۔

''سبحان اللہ۔'' میری زبان سے بے اختیار نکلا، میں اس سحر زدہ کیفیت سے نکل آیا تھا۔

''واقعی اب کسی کو دیکھنے کی خواہش نہیں ہے۔'' اس نے کچھ دیر بعد کہا۔ ''اسے دیکھ کر پھر نہ دیکھیں کسی کو۔ یہ سودا بھی آنکھوں کو مہنگا نہیں ہے۔'' اس نے آخر میں ایک شعر پر بات ختم کی۔ وہ خاموش ہوگئی اور مجھے پتہ چل گیا کہ اس میں اتنی عظیم تبدیلی کہاں سے آئی ہے۔

''بہت بہت مبارک ہو نازش، بہت مبارک ہو۔'' میں نے کہا۔ ''اب اگر تم برا نہ مانو تو ایک بات کہوں؟''

''جی فرمائیں۔'' اس نے انکساری سے پوچھا۔

''میں تمہارے والدین کو تمہارے لئے اپنا رشتہ دینا چاہتا ہوں۔'' میں نے اپنے مطلب کی بات کی۔

''وہ کیوں......؟'' اس کی آواز میں حیرت شامل تھی۔

''وہ اس لئے کہ تمہاری روشن آنکھوں نے تو تمہارے دل کی دنیا روشن کر دی ہے اور میں تمہاری روشن آنکھوں کے طفیل اپنی عاقبت روشن کرنا چاہتا ہوں، کیا اجازت دو گی مجھے۔'' میں نے اپنی بات ختم کر کے سوال کر دیا۔

''آ......آپ ممی اور ڈیڈی سے بات کریں۔'' اس کی شرماتی ہوئی آواز آئی۔ پھر وہ پردے کے پیچھے سے ہٹ گئی تھی۔

اور جب میں اس کے گھر سے نکلا تو سرشاری کی کیفیت کے ساتھ ساتھ یہ یقین بھی تھا کہ ''شاید اب میری عاقبت بھی سنور جائے۔''

روحوں کا ملن

عامر ملک۔ راولپنڈی

اچانک نوجوان کو کمرے میں ایک روح نظر آئی جس کے ہونٹوں پر معنی خیز مسکراہٹ تھی اس نے ایک جیتی جاگتی وجود کی طرف اشارہ کیا تو وہ وجود آگے کی طرف بڑھی اور فرش پر گر کر ڈھیر ہوگئی اور پھر دونوں روحیں کمرے سے نکل گئیں۔

دل ودماغ بلکہ عقل کو حیران کرتی لرزیدہ لرزیدہ خوف کا سکہ بٹھاتی ڈراؤنی کہانی

ناصرہ نے جوں ہی کھڑکی کھولی۔ تو ہوا کے تیز جھونکوں سے زلفیں اس کے چہرے پر بکھر گئیں۔

شام گہری ہوچکی تھی اور سرمئی دھند کے گہرے ہوتے جارہے تھے۔ قریب ہی شور مچاتی ندی بہہ رہی تھی۔ جس کے دوسرے کنارے بہت دور تک گاؤں کے قبرستان کی اداس اور خاموش بستی آباد تھی۔ اس خاموش بستی میں اس کے خوابوں کا شہزادہ سعید ابدی نیند سورہا تھا۔ وہ دونوں بھی اس ندی کنارے درختوں کے جھنڈ تلے چوری چھپے ملا کرتے تھے۔ یہیں انہوں نے ایک دوسرے سے نہ بچھڑنے کی قسمیں کھائی تھیں، عہد و پیمان کئے تھے لیکن جب اس کے باپ کو پتہ چلا تو اس نے اپنے پدرانہ اختیارات سے فائدہ اٹھاتے ہوئے چند ہی دنوں میں اس کی شادی اپنے بھتیجے قیصر سے کردی۔

قیصر شہر کے ایک کالج میں پروفیسر تھا۔ اسے شادی

کے بعد اپنے خاوند کے ساتھ شہر جانا پڑا اور پھر وہ وہیں کی ہو رہی، اب گاؤں میں اس کے لئے رکھا ہی کیا تھا۔ اس کے محبوب سعید نے اس کی شادی کے تھوڑے ہی دنوں بعد خودکشی کرلی اور ایک سال بعد اس کا بوڑھا باپ بھی مرگیا۔ باپ کی موت کے چھ سال بعد وہ اپنے خاوند کے ہمراہ گاؤں آئی تھی۔ یہ گھر اس کی آرزوؤں کا مدفن تھا۔ ناصرہ کی آنکھیں ڈبڈبا گئیں اور ماضی کی یادوں کے دیئے جھلملانے لگے۔

''کیا تمہیں یقین ہے کہ تم گاؤں کی آبادی سے الگ تھلگ اس کھنڈر نما مکان میں رہ سکو۔''

قیصر نے سامان کھولتے ہوئے ناصرہ سے کہا۔

''ہاں...... کیوں نہیں۔'' ناصرہ نے اپنے خیالات سے چونکتے ہوئے کہا۔ ''میں نے زندگی کا بیشتر حصہ یہاں گزارا ہے۔''

''آبادی سے بہت دور ہے۔'' قیصر نے دوبارہ اعتراض کیا۔ ''تم ابھی طویل بیماری سے اٹھی ہو۔ تنہائی سے طبیعت پر بوجھ نہ پڑے اور تم دوبارہ بیمار ہو جاؤ۔''

''ڈارلنگ! میری فکر نہ کرو۔'' ناصرہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میری بیماری پر پس انداز کی ہوئی ساری پونجی تو خرچ کر چکے ہو۔ اب پیسے کے بغیر مری جانے سے تو رہے۔ ہمارے لئے گاؤں ہی صحت افزا مقام ہے۔ ایسا پرسکون ماحول تو مری میں بھی میسر نہیں۔ کیوں تمہیں یہ جگہ پسند نہیں ہے۔''

''مجھے تو بے حد پسند ہے۔'' قیصر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بس تمہاری وجہ سے پریشان ہوں......'' ناصرہ نے کوئی جواب نہ دیا اور شوہر کے ساتھ مل کر سامان کھولنے اور قرینے سے رکھنے میں مصروف ہوگئی۔ جلد ہی دونوں نے ضرورت کا سامان لیا اور خواب گاہ کو صاف کرکے بستر لگادیئے۔ ناصرہ نے کھانا پکایا اور کھانا کھانے کے بعد دونوں لیٹ گئے۔ کھڑکیوں کے شیشوں میں سے چاند کی ٹھنڈی چاندنی ناصرہ کے حسین چہرے پر پڑ رہی تھی......

وہ ماضی کے دھندلکوں میں کھوئی ہوئی زندگی کے نشیب و فراز کے متعلق سوچ رہی تھی کہ اسے کھڑکی کے شیشے سے چپکی ہوئی ایک بھیانک شکل دکھائی دی۔ اور وہ خوف سے کانپ اٹھی۔ ''ڈارلنگ! کھڑکی کے آگے کوئی کپڑا ہی تان دو۔ پردے صبح آویزاں کروں گی۔'' ناصرہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا۔ قیصر نے ادھر ادھر نظر دوڑائی اور پھر اپنے نیچے سے بستر کی چادر نکال کر کھڑکی کے سامنے دیوار میں لگی ہوئی کیلوں سے چادر کے کنارے باندھ کر پردے کی طرح لٹکادی۔

''کچھ اور......؟'' قیصر نے ناصرہ کو چھیڑتے ہوئے کہا۔

''بس مہربانی۔'' ناصرہ بھی ہنس دی۔

ایک ہفتے تک دونوں میاں بیوی گھر کی صفائی وغیرہ میں مصروف رہے۔ قیصر نے ناصرہ کی سہولت اور آرام کے پیش نظر گاؤں کی ایک لڑکی عاشی کو گھر کے کام کاج اور کھانا پکانے کے لئے ملازم رکھ لیا۔ عاشی ایک یتیم لڑکی تھی۔ جو اپنے چچا کے گھر جانوروں سے بھی بدتر زندگی گزار رہی تھی۔ گھر کا سارا کام اس نے اپنے ذمے لے لیا۔ ناصرہ کو تو وہ ہاتھ نہ لگانے دیتی۔ کام تھا ہی کیا...... دو آدمیوں کا کھانا پکانا اور گھر کی صفائی۔

چند ہی دنوں میں عاشی نے اپنی مالکن کے دل میں گھر کرلیا۔ ناصرہ بھی اس سے خوش تھی۔ وہ عاشی کو ملازمہ کے بجائے بہن سمجھتی۔ اس نے عاشی کو اپنے ساتھ شہر لے جانے کا وعدہ بھی کیا۔ ہفتہ میں ایک بار وہ دونوں بس میں سوار ہوکر شہر سودا سلف خریدنے جایا کرتیں۔ قیصر بھی مطمئن تھا کہ عاشی کی موجودگی سے ناصرہ کا دل بھی بہلا رہتا تھا۔

دل ہنسی خوشی گزار رہے تھے کہ اچانک ناصرہ کی صحت گرنے لگی اور وہ ہر وقت کھوئی کھوئی اور پریشان سی رہنے لگی۔ رفتہ رفتہ وہ عاشی کی موجودگی سے بے نیاز ہوگئی اور اپنے شوہر سے بھی دلچسپی ختم ہوگئی۔ اب وہ سارا دن کمرے میں کھڑکی کے سامنے کرسی ڈالے بیٹھی خلاؤں میں گھورا کرتی۔ گویا اسے کسی کی آواز کا انتظار ہو۔ شروع میں تو قیصر نے اس تبدیلی کی جانب توجہ نہ دی۔ لیکن کب

تک...... آخرایک دن اس نے ناصرہ سے پوچھ ہی لیا۔
''تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی ہے۔''
''اب تو میں بالکل تندرست ہوں۔'' ناصرہ نے بدستور کھڑکی سے باہر دیکھتے ہوئے جواب دیا۔
''تمہاری یہ بات تو خیر میں ماننے کے لئے تیار نہیں ہوں۔'' قیصر کہنے لگا۔ ''صاف دکھائی دے رہا ہے کہ تمہاری صحت ان چند دنوں میں بہت گرگئی ہے۔ رنگ ہلدی کی طرح زرد ہورہا ہے اور تم اب بھی اپنے آپ کو تندرست کہتی ہو، گزشتہ کئی دنوں سے تم پریشان اور متفکر ہو۔ آخر بات کیا ہے؟''
''آپ کے ہوتے ہوئے بھلا مجھے کیا پریشانی ہوسکتی ہے۔'' ناصرہ نے پلٹ کر دیکھا اور مسکرا کر دھیمی آواز میں کہا۔
''میرا خیال ہے اب ہم شہر چلے جائیں۔'' قیصر نے ناصرہ کا کندھا پیار سے تھپتھپایا۔ ''وہاں تمہارا علاج بھی ہوسکے گا۔''
''کیوں...... یہاں کیا ہے......؟''
''یہاں کوئی اچھا ڈاکٹر نہیں ہے۔'' قیصر نے جواب دیا۔
''لیکن مجھے ہوا کیا ہے...... بالکل تندرست ہوں۔'' ناصرہ مسکرائی...... ''شہر سے ابھی تو آئی ہوں...... وہاں پر وہی ہنگامہ وہی شور، نہ دن کو چین نہ رات کو آرام...... اور پھر تمہاری چار ماہ کی چھٹی ابھی باقی ہے۔ شہر جاکر کیا کریں گے۔''
قیصر کا ناصرہ کی باتوں سے اطمینان تو نہ ہوا۔ لیکن وہ خاموش ہوگیا۔ اسے ناصرہ کی حساس طبیعت کا علم تھا۔ اگر شہر جانے کے لئے اصرار کیا تو وہ رو رو کر جان ہلکان کردے گی۔ طویل بیماری سے اٹھنے کے بعد وہ ویسے بھی چڑچڑی ہوگئی ہے۔''
میاں بیوی کی اس مختصر سی گفتگو کے چند ہی دن بعد کی بات ہے۔ رات کا پچھلا پہر تھا۔ کھڑکی کھلی ہونے کے سبب سردی سے قیصر کی آنکھ کھل گئی دیکھا تو ناصرہ کھڑکی کے پاس کھڑی باتیں کررہی تھی...... ''اس وقت کون ہوسکتا ہے۔ ناصرہ کس سے پیار کی میٹھی باتیں کررہی ہے؟'' مگر ناصرہ کے علاوہ کسی کی آواز سنائی نہیں دی۔
قیصر بستر سے اٹھ کر دبے پاؤں کمرے سے باہر آیا تاکہ اپنی بیوی سے رات کی تنہائی میں چھپ کر ملنے والے کو دیکھ سکے، لیکن وہاں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ قیصر آگے بڑھ کر کھڑکی کے پاس پہنچا اور ناصرہ کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ ناصرہ نے اس کی طرف قطعاً توجہ نہ دی اور بدستور ہنس ہنس کر باتیں کرتی رہی۔
''ناصرہ!'' قیصر نے اس کو کندھوں سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔
ناصرہ نے پلٹ کر قیصر کو دیکھا اور پھر کھڑکی کی طرف منہ پھیر کر دوبارہ ہنسنے لگی۔ چند لمحوں کے توقف کے بعد قیصر نے دوبارہ گرجدار آواز میں اسے پکارا تو وہ چونک گئی جیسے اسے کسی نے گہری نیند سے جگادیا ہو۔ قیصر نے ناصرہ کو پکڑ کر بستر پر لٹایا اور کھڑکی بند کردی۔ ناصرہ فوراً ہی سوگئی لیکن قیصر کو نیند نہ آئی اور وہ صبح ہونے تک کروٹیں بدلتا رہا۔
ناصرہ کے بارے میں اسے تشویش لاحق ہوگئی۔ بہت دیر تک سوچنے کے بعد اس نے صبح ناشتہ پر اس واقعہ کے متعلق ناصرہ سے بات کرنے کا فیصلہ کرلیا۔ مگر جب صبح ناشتہ کرنے بیٹھے تو ناصرہ کا مرجھایا ہوا چہرہ دیکھ کر اس نے اس پریشان کن موضوع پر گفتگو کرنا مناسب نہ جانا اور شہر جاکر اپنے فیملی ڈاکٹر سے مشورہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ناشتے کے دوران دونوں خاموش رہے، گویا دو اجنبی کسی ہوٹل میں اتفاق سے ایک ہی میز کے گرد آ بیٹھے ہوں۔ ناشتہ سے فارغ ہونے کے بعد قیصر نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔
''میں شہر جارہا ہوں۔ تم بھی میرے ساتھ چلوگی۔ دوپہر تک لوٹ آئیں گے۔''
''میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ناصرہ نے انکار کردیا اور بولی۔ ''عاشی سے پوچھ لو...... اسے شاید کوئی چیز...... سودا منگوانا ہو......''
''عاشی سے کیا پوچھوں۔ یہ تمہارا کام ہے۔ میرے ساتھ چلو وہاں ڈاکٹر سے دوا بھی لے لینا۔'' قیصر

نے معمول کر بات کی۔'' نہیں ڈارلنگ'' ناصرہ نے سختی
سے انکار کردیا۔ ''میں بیمار تو ہوں نہیں۔ سردرد ہے۔
ابھی آرام آجائے گا۔ اتنی معمولی سی بات کے لئے ڈاکٹر
کے پاس جانا عجیب سا لگتا ہے۔'' اتنا کہہ کر ناصرہ کرسی
سے اٹھ کھڑی ہوئی اور دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

قیصر نے بھی مزید اصرار نہ کیا اور لباس تبدیل
کرکے شہر روانہ ہوگیا۔ ایک گھنٹہ بعد وہ اپنے فیملی ڈاکٹر
کے پاس بیٹھا اسے ناصرہ کی بیماری کے متعلق بتا رہا تھا۔
ڈاکٹر نے ساری بات سننے کے بعد کہا کہ ''اس میں
پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں۔ یہ اعصابی کمزوری اور
ذہنی انتشار کا نتیجہ ہے۔ رات سوتے وقت نیند کی دو
گولیاں ایک ہفتے تک باقاعدگی سے کھلادیا کرو۔ صبح
تک گہری نیند سوتے رہنے سے تھکے ہوئے اعصاب کو
سکون ملے گا تو کچھ ہی دنوں میں آرام آجائے گا۔''

قیصر نے وہاں سے نکل کر ایک میڈیکل اسٹور
سے نیند کی گولیاں خریدلیں اور ایک دوست سے ملنے اس
کے گھر چلا گیا۔ دونوں بہت دیر تک بیٹھے گپیں ہانکتے
رہے۔ قیصر کو دوست کے اصرار پر دوپہر کا کھانا بھی اس
کے ہاں کھانا پڑا۔ بعد دوپہر اس نے بازار سے تھوڑا سا
پھل، بسکٹ، ٹافیاں اور سگریٹ خریدے اور بس میں
سوار ہوکر گاؤں روانہ ہوگیا۔

☆☆☆

وہ جوں ہی گھر کے کمرے میں داخل ہوا اس کی نظر
ناصرہ پر پڑی۔ جو شیشے کا بڑا فریم اپنے سامنے رکھے قالین
پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس فریم میں برف پوش پہاڑوں کی خوب
صورت سینری تھی، جسے ناصرہ نے اتار کر اپنے سامنے رکھا
ہوا تھا۔ قیصر نے آگے بڑھ کر دیکھا تو فریم کے چاروں
کناروں کے ساتھ انگریزی کے حروف کی ''اے'' سے
لے کر ''زیڈ'' تک کی چھوٹی چھوٹی پرچیاں لکھی ہوئی پڑی
تھیں اور شیشے کے درمیان میں شیشے کا چھوٹا سا گلاس
اوندھا پڑا تھا۔ جس پر ناصرہ ایک انگلی رکھے بیٹھی تھی۔
گلاس آہستہ آہستہ سرک کر ایک حرف کو چھوتا اور کبھی
دوسرے کو۔ قیصر کے دیکھتے ہی دیکھتے گلاس نے فریم کے
شیشے پر کسی حرف کو چھوئے بغیر ادھر ادھر گھومنا شروع
کردیا۔ ناصرہ اس قدر منہمک تھی کہ اسے قیصر کی موجودگی
کا احساس ہی نہ ہوا۔ قیصر نے تھوڑی دیر بعد ناصرہ کو اپنے
بازوؤں میں اٹھا کر بھینچتے ہوئے کہا۔ ''یہ کیا ہورہا ہے؟''

ناصرہ گھبرا گئی اور پھر سنبھلتے ہوئے بولی۔
''ڈارلنگ! تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔''

''کیا میں اتنا ہی بھیانک ہوں کہ مجھے دیکھ کر تم ڈر
جاتی ہو'' قیصر نے چھیڑا اور بازوؤں کی گرفت مضبوط
کردی۔

''چھوڑو بھی نا''

''پہلے یہ بتاؤ کہ تم کیا کررہی تھیں؟''

''اچھا بتاتی ہوں۔'' ناصرہ نے شرما کر آنکھیں
نیچی کرلیں اور قیصر کو سمجھانے لگی کہ ''گلاس جن حروف کو
چھوجاتا ہے۔ ان کو ترتیب دی جائے تو اپنے سوال کا
جواب مرتب ہوجاتا ہے۔''

''کون جواب دیتا ہے؟'' قیصر نے تمسخرانہ لہجے
میں پوچھا۔

''روح..... میں ابھی سعید سے باتیں کررہی
تھی۔'' ناصرہ نے سنجیدگی سے کہا۔

''کیا وہ مجھ سے بھی بات کرے گا'' قیصر نے
قہقہہ لگایا۔

''ہاں..... کیوں نہیں۔'' ناصرہ کہنے لگی۔ ''تم اپنی
انگلی گلاس کے پیندے پر رکھو لیکن دیکھو وزن نہ ڈالنا''

قیصر نے بیوی کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے
دائیں ہاتھ کی دوسری انگلی گلاس کے پیندے پر رکھ کر کہا۔

''کیا تم رات کے وقت بھی سعید سے باتیں
کررہی تھیں''

''ناصرہ کو ایسے محسوس ہوا کہ جیسے اس کے شوہر نے
شک کا نیزہ اس کے دل میں اتار دیا ہو۔ لیکن اس نے
اپنے حواس پر قابو رکھتے ہوئے فوراً ہی جوابی حملہ کیا۔'' کیا
تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں؟''

''میں نے یہ کب کہا ہے۔'' قیصر بیوی کی صاف
گوئی سے پریشان ہوگیا اور بات کو ٹالتے ہوئے کہنے لگا۔

"وہ دیکھو۔ گلاس چلنے لگا۔" گلاس آہستہ آہستہ سرکتا ہوا انگریزی کے حروف 'این' کو چھو کر شیشے کے درمیان تک آیا اور چکر کاٹنے کے بعد 'او' کو چھو کر گھومنے لگا۔

"سعید نے تم سے بات کرنے سے انکار کردیا ہے۔" ناصرہ نے تشریح کی۔ "دیکھا تم نے..... حروف 'این' اور 'او' کے ملانے سے 'NO' بنتا ہے۔"

"کیوں؟"

"اس لئے کہ وہ تمہیں پسند نہیں کرتا۔" ناصرہ نے ہلکا سا قہقہہ لگایا۔

"یہ سب بکواس ہے۔" قیصر نے منطقی انداز اختیار کیا۔ کیا تم نے کبھی سوچا ہے کہ گلاس ہاتھ کے پٹھوں کے لاشعوری حرکت سے شیشے کی چکنی سطح پر سرکتا ہے۔"

"اگر ایسا ہو تو ہمیں ہماری خواہش کے مطابق جواب ملنا چاہئے۔" ناصرہ نے اعتراض کیا۔

"یہ بات نہیں..... سعید مجھ سے ڈرتا ہے۔" قیصر نے مذاق اڑایا۔

"وہ تم سے نہیں ڈرتا بلکہ تمہیں اپنا رقیب جان کر نفرت کرتا ہے۔" ناصرہ نے کہا۔

قیصر ہنس پڑا اور ناصرہ کے لبوں پر اپنے لب رکھتے ہوئے سرگوشی کرتے ہوئے کہنے لگا۔ "تمہارے زہر شکن حسن کی وجہ سے تو کبھی میں خود کو بھی اپنا رقیب سمجھنے لگتا ہوں۔" اتنا کہہ کر اس نے ناصرہ کو اپنے بازوؤں میں اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا اور خود قریب ہی کرسی پر بیٹھ گیا۔ ناصرہ نے مخمور نگاہوں سے قیصر کو دیکھا اسے تنگ کرنے کے لئے کہنے لگی۔ "تم نہیں جانتے ڈارلنگ! تمہاری ان باتوں پر سعید کو کتنا غصہ آتا ہے۔"

"ہاں کیوں نہ ہو، رقیب روسیا جو ہوا۔" قیصر نے قہقہہ لگایا اور پھر سمجھانے لگا۔ "تم سارا دن کھڑکی کے پاس بیٹھی الٹی سیدھی باتیں نہ سوچا کرو۔ یہ تمہاری طویل بیماری کے اثرات کا نتیجہ ہے۔ لو..... میں تمہارے واسطے ڈاکٹر سے دوا لے کر آیا ہوں۔ رات سونے سے تھوڑی دیر پہلے تین گولیاں دودھ کے ساتھ کھالینا۔" قیصر نے حبیب سے نیند کی گولیوں کی چھوٹی سی شیشی نکال کر ناصرہ کے ہاتھ میں تھمادی۔

"یہ کون سی گولیاں ہیں؟" ناصرہ نے شیشی کو الٹ پلٹ کر دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" قیصر نے جھوٹ بولا۔ حالانکہ دوائی خریدتے وقت اس نے کیبل خود ہی اتار پھینکا تھا۔

قیصر نے سعید والے معاملے کو زیادہ اہمیت نہ دی لیکن تنبیہ کرلیا کہ وہ سعید کے بارے میں معلومات ضرور حاصل کرے گا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ سعید کا ہیولہ ناصرہ کی ذہنی اختراع کے سوا کچھ نہ ہو۔

بھلا روحیں انسانوں سے کیونکر ملاقات کرسکتی ہیں۔ یہ ناممکن ہے۔ ناصرہ شاید بیمار ہے۔ اسے کسی ذہنی امراض کے ماہر ڈاکٹر کو دکھا کر علاج کرانا چاہئے.....

قیصر بہت دیر تک سوچتا رہا..... نیند کی گولیاں کھانے سے اس رات ناصرہ بڑی گہری نیند سوئی بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ نیم بے ہوشی کے عالم میں پڑی رہی۔ دوسری رات بھی ایسا ہی ہوا۔ جس سے ناصرہ کی صحت پر بڑا اچھا اثر پڑا اور قیصر کو بھی سکون ملا.....

☆.....☆.....☆

چار پانچ دن بعد کی بات ہے۔ قیصر ڈرائنگ روم میں بیٹھا اپنے دوست پروفیسر جمال کی لکھی ہوئی کتاب "دنیا کی قدیم تہذیبیں" کا مطالعہ کررہا تھا کہ عاشی گھبرائی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی۔

"جناب....." عاشی خاموش ہوگئی۔ وہ اپنی مالکہ کے خلاف کیوں کر کچھ کہتی۔

"ہاں کہو..... تم خاموش کیوں ہوگئیں۔"

"جی وہ قبرستان میں بیٹھی ہیں۔" عاشی نے ڈرتے ڈرتے ادھوری بات کی۔

"کون.....؟" قیصر کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا.....

"کیا ناصرہ.....؟"

"جی ہاں..... آدھ گھنٹے سے بھی زیادہ ہوگیا ہے۔" عاشی نے بات پوری کی۔

"دیکھو عاشی..... تم مجھ سے کوئی بات چھپا رہی ہو۔" قیصر نے کہا۔ "تم یہاں کی اسی گاؤں کی رہنے والی

ہوا اور ناصرہ بھی۔۔۔ سعید کون ہے؟"

"جی" عاشی کی گھبراہٹ خوف میں بدل گئی۔ کچھ بھی ہو۔ وہ ملازمہ تھی۔ اپنی مالکہ کے خلاف کچھ کہنا چھوٹا منہ اور بڑی بات والا معاملہ تھا حالانکہ اس نے ناصرہ کو پہلے دن ہی پہچان لیا تھا۔ لیکن وہ اپنی حیثیت سے آگے بڑھنا نہیں چاہتی تھی۔ اب عاشی کو اپنی حماقت کا احساس ہوا کہ اس نے قیصر سے بات ہی کیوں کی۔ ناصرہ جانے اور اس کا شوہر۔۔۔ اس نے اپنی ہمدردی کا اظہار ہی بہت بھونڈے طریقے سے کیا ہے۔

"سعید کون ہے؟" عاشی کو خاموش پا کر قیصر نے دوبارہ پوچھا۔

"میں نہیں جانتی۔" عاشی نے جھوٹ بول کر جان چھڑانا چاہی۔

"تم جھوٹ بولتی ہو۔ اگر نہیں بتاؤ گی تو میں تمہاری شکایت ناصرہ سے کروں گا اور وہ تمہیں ملازمت سے نکال دے گی۔" قیصر نے دھمکی دی۔

"خدا کے لئے ان سے کچھ مت کہیئے گا۔" عاشی نے منت کی اور اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگ گئیں۔ مجبور ہوکر اس نے سعید اور ناصرہ کے معاشقے اور سعید کی خودکشی تک کے تمام واقعات بتا دیئے۔ قیصر نے کرسی پر بیٹھ کر سگریٹ سلگایا اور لمبا کش لے کر کہنے لگا۔

"میں جانتا ہوں۔ ناصرہ انتہائی شریف اور وفادار عورت ہے۔ سعید سے معاشقہ جوانی کی حماقت کے سوا کچھ بھی نہیں تھا۔ ان کی محبت یقیناً گناہوں کی آلودگی سے پاک تھی۔"

عاشی خاموش کھڑی سنتی رہی اور قیصر کہتا چلا گیا۔ دونوں کی حالت ایک سی تھی۔ عاشی اپنی حماقت پر کھڑی آنسو بہاتی رہی اور قیصر دل کا بوجھ ہلکا کرنے کے لئے بے سروپا باتیں کئے جارہا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا گویا وہ ایک دوسرے کے مونس وغم خوار ہوں۔ تھوڑی دیر بعد قیصر نے اپنے جذبات پر قابو پاتے ہوئے بات کا رخ تبدیل کیا اور بولا۔

"عاشی مجھے تمہاری مدد کی ضرورت ہے۔"

"جی۔۔۔ میں۔" وہ گڑبڑائی۔

"ہاں میں تمہاری اس خدمت کے عوض تمہیں دوگنی تنخواہ دوں گا۔" قیصر نے لالچ دیا۔ "تم جانتی ہو کہ میں ناصرہ کو دل کی گہرائیوں سے چاہتا ہوں۔ تم بھی اسے چاہتی ہو۔ ہمیں چاہئے کہ ہم اسے اس مصیبت سے نجات دلائیں۔ تم ہر وقت اس کے ساتھ سائے کی طرح لگی رہو اور مجھے ایک ایک بات سے باخبر رکھو۔ بس اس سے زیادہ مجھے اور کچھ نہیں چاہئے۔"

عاشی۔۔۔ ناصرہ کی کیا نگرانی کرتی۔ اس کا کوئی کام ڈھکا چھپا نہیں تھا۔ وہ ہر بات خود ہی اپنے شوہر کو بتا دیتی۔۔۔

اس دن قبرستان سے آنے کے بعد ناصرہ نے قیصر کو بتایا کہ "مستقبل میں سعید خود اس سے ملنے آیا کرے گا۔"

ناصرہ کی بات کا جواب دینے کے بجائے قیصر مسکرا کر خاموش رہا۔ اس کے نزدیک سعید کا وجود ناصرہ کے وہم کی تخلیق تھا۔ لیکن ایک خوب صورت اور جوان بیوی کا خاوند ہونے کی حیثیت سے اس کے دل کو شدید دھچکا لگا اور انا کو سخت ٹھیس پہنچی۔

☆...☆...☆

اتوار کا دن تھا۔ قیصر نے ناصرہ کو فلم دیکھنے کے لئے شہر جانے کو کہا۔ مگر ناصرہ نے انکار کردیا۔ قیصر کا خیال تھا فلم دیکھنے کے بہانے شہر جا کر ناصرہ کا معائنہ کسی اچھے ڈاکٹر سے کرایا جائے۔ تفریح بھی ہوجائے گی اور کام بھی۔۔۔ اب اسے اکیلے ہی جانا پڑا۔ اس دن قیصر بے حد مغموم اور پریشان تھا۔ شام تک بے مقصد ادھر ادھر گھومنے کے بعد وہ فلم دیکھنے سینما ہاؤس چلا گیا۔ اس کا ذہنی اضطراب اس قدر بڑھ چکا تھا کہ تھوڑی ہی دیر بعد فلم دیکھے بغیر ہی باہر نکل آیا۔ اس وقت رات کے دس بجنے کو تھے۔ اس نے دو پیکٹ سگریٹ کے خریدے اور بس میں سوار ہوکر گھر روانہ ہوا۔۔۔ گھر پہنچتے ہی اسے ایک تازہ افتاد کا سامنا کرنا پڑا۔۔۔

ناصرہ ندی کنارے ایک پتھر پر بیٹھی ایک نوجوان سے باتیں کررہی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ کوئی خواب دیکھ رہا ہو۔ ناقابل یقین کی بات حقیقت کا روپ دھار چکی تھی۔ سعید۔۔۔ اس کی بیوی کے قریب ہی بیٹھا

ہوا تھا۔ قیصر کی قوت برداشت جواب دے گئی اور وہ غصے میں بپھرا ہوا سعید سے دو دو ہاتھ کرنے کے لئے سعید کی طرف بڑھا..... لیکن وہاں تو ناصرہ کے سوا کوئی نہ تھا..... اب ناصرہ وہاں تنہا بیٹھی تھی۔

''تم یہاں کیا کررہی ہو؟'' قیصر غصے سے چیخا۔

''کمرے میں دل گھبرایا تو میں.....''

''بکواس مت کرو، تم جھوٹ بول کر مجھے دھوکہ دینا چاہتی ہو۔'' قیصر نے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھینچتا ہوا گھر لے آیا۔ عاشی نے آگے بڑھ کر ناصرہ کی مدد کرنا چاہی تو قیصر نے غصے میں اس کے گلابی رخسار پر ایک چپت رسید کردی۔ اس کی حالت پاگلوں کی سی ہوگئی تھی۔

اس رات قیصر کو ایک پل کے لئے بھی نیند نہ آئی۔ وہ ناصرہ اور سعید کے بارے میں سوچتا رہا۔ سعید نے اس کی خوشیوں میں محرومیوں کا زہر گھول دیا تھا۔ اس نے خودکشی نہیں کی تھی۔ بلکہ ڈھونگ رچا کر دنیا والوں کو دھوکہ دیا تھا۔ وہ یقیناً بہت بڑا دھوکے باز اور مکار ہے۔

☆......☆......☆

صبح ہوتے ہی قیصر گاؤں سے لکڑی کے تختے، میخیں اور ہتھوڑی وغیرہ خرید کر لایا کہ مکان کے باہر ندی کی طرف کھلنے والی کھڑکی کو مستقل طور پر بند کردیا جائے۔ ناصرہ نے ہزار منت کی۔ سعید سے نہ ملنے کا وعدہ کیا۔ قسمیں کھائیں لیکن جو شکوک قیصر کے دل میں پیدا ہوچکے تھے انہیں ناصرہ کی قسمیں اور وعدے دور نہ کرسکے۔ قیصر نے ناصرہ کا گھر سے باہر نکلنا بند کردیا۔ اور ناصرہ عملاً قیدی بن کر رہ گئی۔ مگر قیصر اس کے باوجود مطمئن نہ تھا، اس نے سعید کا خاتمہ کرنے کی ٹھان لی۔ اب ہر وقت پستول اپنے کوٹ کی جیب میں رکھتا تاکہ موقع ملتے ہی اسے ٹھکانے لگادے۔

اس واقعہ کے چند دن بعد ناصرہ کی صحت یک لخت پھر سے گرنا شروع ہوگئی اور دیکھتے ہی دیکھتے وہ ہڈیوں کا پنجر بن گئی۔ علاج معالجے سے بھی فائدہ نہ ہوا۔ مرض بڑھتا گیا۔ جوں جوں دوا کی۔ آخر ایک دن ڈاکٹر نے کہہ دیا کہ ''اب دوا کے بجائے مریضہ کے لئے دعا کی جائے۔''

ناصرہ کی بیماری کو زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ناصرہ نے قیصر کو پاس بلا کر کہا۔

''میری زندگی کی آخری گھڑیاں آپہنچی ہیں..... ڈارلنگ مجھے معاف کردو۔ یہ میری آخری خواہش ہے۔''

''ایسی باتیں نہ کرو ناصرہ! تم بہت جلد تندرست ہوجاؤ گی۔'' قیصر کی آواز بھرا گئی۔

''ڈارلنگ..... میں نے تم سے بے وفائی نہیں کی۔'' ناصرہ نے قیصر کی بات ان سنی کرتے ہوئے نیم مردہ آواز میں کہا۔

''سعید زندہ نہیں ہے۔ تمہیں اس کے بارے میں غلط فہمی ہوئی ہے۔ اس کی بے چین روح میری تلاش میں بھٹکتی رہی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے بچھڑ گئے تھے۔ شاید تمہیں میری بات پر یقین نہ آئے لیکن یہ حقیقت ہے کہ خودکشی کرنے والے کی روح اس وقت تک سکون نہیں پاتی جب تک وہ اپنے چاہنے والے کو نہیں پالیتی..... سعید نے مجھے پالیا ہے۔ تمہاری ان پابندیوں نے میری مشکل آسان کردی ہے۔ میں تمہاری بیوی ہونے کی وجہ سے سعید سے دور رہنا چاہتی تھی لیکن تمہارے شکوک نے مجھے بے بس اور سعید کو مجبور کردیا ہے کہ ہم دونوں مل جائیں۔ ایک ہوجائیں۔ سعید تمہیں ہلاک کردینا چاہتا تھا۔ مگر میں نے اسے باز رکھا تمہاری ہلاکت سے، سعید اور میرے ملاپ میں وقت کا فاصلہ بڑھ جاتا..... تمہیں اگر میری بات کا یقین نہ ہو تو وہ دیکھو..... تمہارے بالکل قریب پیچھے سعید کھڑا ہے۔ اسے میرا ہی انتظار ہے۔''

قیصر نے پلٹ کر دیکھا تو اچھل پڑا اور کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ اب دونوں ایک دوسرے کے مقابل کھڑے تھے۔ سعید کو دیکھ کر قیصر کے چہرے کا رنگ اڑ گیا اور وہ خوف سے تھرتھر کانپنے لگا۔ اس نے بات کرنا چاہی لیکن نہ کرسکا۔

''ڈارلنگ..... ! خدا حافظ.....''

''قیصر نے پلٹ کر ناصرہ کی طرف دیکھا اور آنسوؤں سے اس کے رخسار بھیگ گئے۔

''ناصرہ اسے چھوڑ کر جاچکی تھی۔ ہمیشہ کے لئے۔

مورکھ

ملک این اے کاوش۔ سلانوالی

رات کا گھٹا ٹوپ اندھیرا ہر سو مسلط تھا، ہاتھ کو ہاتھ سجائی نہ دیتا، اور پھر اچانک دل کو دہلاتی اور سوچ سے بیگانہ کرتی ناقابل فراموش، ناقابل یقین، خوفناک کہانی، جو پڑھنے والوں کو ششدر کرکے رکھ دے گی۔

دل ودماغ کو مبہوت اور عقل کو انگشت بدنداں کرتی اپنی نوعیت کی اچھوتی کہانی

''**زندگی** بذات خود ایک بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے۔ کبھی اپنوں سے ملا دیتی ہے تو کبھی اپنوں سے اتنا دور کردیتی ہے کہ صدیوں کی مسافتیں درمیان میں حائل ہوجاتی ہیں۔ میں آج جو تمہارے سامنے براجمان ہوں یہ نہ سمجھنا کہ میں کل کا دودھ پیتا بچہ ہوں بلکہ میری عمر صدیوں کا محاصرہ کیے ہوئے ہے۔ اپنی عمر کا اندازہ میں خود بھی نہیں کرسکتا ہاں البتہ اتنا کہہ سکتا ہوں کہ میری عمر تین چار صدیوں پر محیط ہوگی۔۔۔۔۔۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تم میری بات کا قطعاً اعتبار نہیں کروگی مگر یہ سب کچھ حقیقت پر مبنی ہے اور شیطان دیوتا اس بات کے سب سے بڑے گواہ ہیں۔۔۔۔۔۔'' تہہ خانے کی خاموش فضا میں اس وقت اس لفظوں کی بازگشت گونج رہی تھی۔

اس کا نام ٹھاکر مہندر ناتھ پرتاب سنگھ تھا۔ سب کچھ بدل گیا تھا۔ صدیوں کے طویل لمحات میں اس نے کئی روپ اختیار کیے تھے لیکن ایک چیز جو نہیں بدلی تھی وہ اس کا نام تھا۔ وہ اپنی شخصیت کی پہچان قائم ودائم رکھنے کا متمنی تھا۔ اس نے ان گزرے ادوار میں بہت کچھ دیکھا تھا۔ لیکن اس کی اصل منزل ابھی اس سے بہت دور تھی۔ یہ بھی بات درست ہے کہ اس نے شیطان دیوتا کے چرنوں میں زندگی کے یہ طویل ادوار گزارد یے تھے۔ شیطان دیوتا کی پوجا پاٹ میں اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ شیطان دیوتا نے اسے ایسی شکتیوں سے نوازا تھا۔ جو شاید کسی کو نہ ملی ہوں۔ شیطان دیوتا اس کی پوجا پاٹ سے بہت خوش تھے۔ وہ ہر اتوار اور منگل کو شیطان دیوتا اور کالی ماتا کے چرنوں میں انسانوں کی بلی دیتا آیا تھا۔

دنیا کی کوئی بھی شکتی اس کے راستے میں حائل ہونے کی سکت نہ رکھتی تھی۔ کئی بار اسے کٹھن حالات وواقعات سے نبرد آزما ہونا پڑا تھا۔ لیکن اس نے چنداں چنتا تک نہ کی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے ہر در پیش آنے والی مصیبت کو اپنی شکتیوں کے بل بوتے پر بڑے بڑوں کو ناکوں چنے چبوائے تھے۔ وہ جو کچھ بھی تھا اس نے کبھی تخیل میں بھی نہ سوچا تھا کہ وہ کبھی ایسا بھی بن سکتا ہے۔ وہ بھی عام منش کے جیسے ایک عام منش تھا۔ لیکن حالات کی بدلتی کروٹ نے اس شریف النفس منش کو انسان سے شیطان بننے پر مجبور کردیا تھا۔

اس وقت بھی وہ شیطان دیوتا کے چرنوں میں انسانی بلی دینے کے بعد اپنی محبوبہ کے شریر کے پاس کھڑا تھا۔ جسے ایک بار پھر لقمۂ اجل بنا دیا گیا تھا۔ اور جنہوں

نے اسے لقمہ اجل بنایا تھا۔ ان دونوں شیطان دیوتا کے کارندوں کو وہ کالی ماتا اور شیطان دیوتا کے چرنوں میں بلی چڑھا چکا تھا۔ اسے اپنی محبوبہ کی موت کا کوئی غم نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ تھوڑی سی تگ ودو کے بعد اپنی محبوبہ کے شریر میں اس کی روح کالی شکتیوں کے بل بوتے پر واپس ڈال دے گا۔ وہ نہ صرف مہاشکتی مان بن چکا تھا بلکہ امر بھی ہو چکا تھا۔ موت اس کے نام سے بھی خوف کھاتی تھی۔ وہ اپنی محبوبہ کو بھی امر کرنا چاہتا تھا لیکن ہر بار جب وقت قریب آتا تو کوئی نہ کوئی اس کے کیے کرائے پر پانی پھیر دیتا تھا۔ لیکن اب کی بار اس نے مصمم ارادہ کرلیا تھا کہ وہ ایسا لائحہ عمل اختیار کرے گا کہ اس کے اور اس کی محبوبہ کے درمیان کوئی بھی حائل ہونے کی سکت نہ کر پائے گا۔

اس وقت بھی اس کی محبوبہ کا شریر اس کے سامنے پڑا تھا۔ ہر بار جب وہ بھی اپنی محبوبہ کی آتما کو اس کے شریر میں داخل کرتا تو یہی الفاظ دہرایا کرتا تھا جس کی وجہ سے اس کی محبوبہ ہوش میں آتے ساتھ ہی پہلا نام اسی کا لیتی تھی۔ اور پھر یکبارگی اس کی یادداشت واپس آجاتی تھی۔ اسے گزرے تمام لمحات اور حالات وواقعات یاد آجایا کرتے تھے۔

ہر بار کی طرح آج بھی اسے وہ دن یاد آگئے جب پہلی بار اس کی محبوبہ موت سے ہمکنار ہوئی اور اس کا شریر اس کے سامنے پڑا تھا۔ اس کے دھرم کے لوگوں نے اس کے باپ کے کہنے پر اس کی محبوبہ کے شریر کو جلا کر بھسم کرنے کی لاکھ سعی کی تھی لیکن وہ اپنی محبوبہ کے شریر کو لے کر وہاں سے ایسا نو دو گیارہ ہوا تھا کہ ہر شخص انگشت بدنداں رہ گیا کہ آناً فاناً ان دونوں کو زمین نگل گئی ہے یا آسمان کھا گیا ہے۔ لیکن حقیقت کیا تھی صرف وہی جانتا تھا۔

☆......☆......☆

ٹھاکر پرتاب سنگھ کا نام سن کر بڑے بڑوں کی دھوتی گیلی ہو جایا کرتی تھی۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ ایک سخت مزاج اور اصول پرست انسان ثابت ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی تھی لیکن ہر ٹھاکر کی طرح اس کے قلب میں بھی اپنی بڑائی کا گھمنڈ بہت زیادہ تھا۔ وہ ہمیشہ دوسروں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتا تھا۔ لیکن ایک بات ثابت تھی کہ اس نے کبھی بھی اپنی رعایا سمیت کسی کے ساتھ بھی زیادتی نہ کی تھی۔ وہ ہر ایک کا بہت خیال رکھتا تھا۔ اس کی جائیداد اور بینک بیلنس کا اس کے پاس کوئی شمار نہ تھا۔ اس کی زمینوں سمیت اس کی محل نما کوٹھی میں درجنوں نوکر چاکر کام کرتے تھے۔

آج تک کبھی کسی نے اس بات کا گلہ نہ کیا تھا کہ اس نے کبھی کسی کا حق رکھا ہو یا کسی کے ساتھ کسی بھی قسم کی کوئی زیادتی کی ہو۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کو پانچ سال بعد بھگوان نے ایک چاند سے لڑکے سے نوازا تھا۔ دونوں پتی پتنی نے اولاد کے حصول کے لیے نہ جانے کیا کیا تھا۔ انہوں نے رعایا کے لیے ایک بہت بڑا مندر بنوایا تھا۔ جہاں بھگوان اور کالی ماتا کے علاوہ کئی مورتیاں رکھی گئی تھیں۔ وہاں آنے والوں کو ہر سہولت میسر تھی۔ کھانے پینے کے علاوہ باہر سے آنے والوں کے لیے رہنے کے لیے بھی سہولیات میسر تھیں۔

بالآخر بھگوان کی کرپا سے اس کی پتنی کی کوکھ سے ایک چاند سے بچے نے جنم لیا۔ بچے کی پیدائش کی خوشی میں اس نے باقاعدہ جشن کا نہ صرف اہتمام کیا بلکہ غرباء میں سونا، پیسہ اور کھانا تقسیم کیا گیا۔ پوری رعایا اس کی خوشیوں میں شامل ہوئی بچے کی خوشی میں ایک ماہ تک اس نے جشن منایا۔ وقت کب پر لگا کے گزرا پتہ ہی نہ چلا اور بچے کے بعد اس کو بھگوان نے ایک لڑکی سے نوازا۔ اس کی فیملی مکمل ہو چکی تھی۔ دونوں بچوں کی نگہداشت پر اس نے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا تھا۔ ہر لحاظ سے اس نے بچوں کی پرورش پر پانی کی طرح پیسہ بہانا شروع کر دیا تھا۔ بچوں کی تعلیم کے لیے گھر میں ہی شہر کے ایک مشہور استاد کی خدمات لی گئیں۔

دونوں بچوں نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھے تو دونوں پتی پتنی کو سب سے پہلے اپنی لڑکی کے ہاتھ

پہلے کرنے کی چنتا لاحق ہوگئی۔ وہ جانتے تھے کہ حالات ناخوشگوار ہونے میں وقت نہیں لگتا۔ بے شک ہر کس وناکس ٹھاکر پرتاب سنگھ کے نام سے خوف کھاتا تھا۔ لیکن بات عزت کی تھی اور حریفوں کا کوئی اعتبار نہیں ہوتا۔ لیکن ٹھاکر پرتاب سنگھ اس بات سے بھی آشنا تھا کہ اسے اپنی لڑکی کے لیے اپنے برابر کے لوگوں کا انتخاب کرنا ہے۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ حالات وواقعات سے بخوبی آشنا تھا اور جانتا تھا کہ ہر کس وناکس اس کی لڑکی سے شادی کرنے کا متمنی ہوگا کیونکہ وہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کی اکلوتی لڑکی ہے۔ نجانے کیوں ہر آنے والا دن اس کے دل میں عجیب ہی کھٹکا پیدا کرتا تھا۔ ہر آنے والا دن اسے عجیب وغریب کیفیت میں مبتلا کردیتا تھا۔

لڑکے اگر کنوارے بھی رہ جائیں تو کوئی فرق نہیں پیدا ہوتا لیکن لڑکی ماں باپ کے سر پر امانت کی طرح ہوتی ہے۔ لڑکی ایک قرض کی طرح ہوتی ہے۔ اور یہ قرض ادا تو کرنا ہی ہوتا ہے۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ بھی اس فریضہ کو احسن طریقے سے سرانجام دینا چاہتا تھا۔ لیکن ٹھاکر پرتاب سنگھ اس بات سے قطعی طور پر آشنا نہ تھا کہ اس کے پس پشت کیا کھچڑی پک رہی تھی۔

ٹھاکر پرتاب سنگھ نے اپنے لڑکے کا نام مہندر ناتھ پرتاب سنگھ رکھا تھا جبکہ لڑکی کا نام چاندنی رکھا تھا۔ چاندنی حقیقت میں چاند کی چاندنی کی مانند تھی۔ اس کا چہرہ چودھویں کے چاند کی مانند چمکدار تھا۔ اس کو بھگوان نے بلا کا حسن دیا تھا۔ ہر کس وناکس اس کو دیکھ کر آنکھیں تک جھپکنا بھول جاتا تھا۔ لیکن کسی میں اتنی جسارت نہ تھی کہ کوئی بھی چاندنی کو کچھ کہہ سکتا۔ ویسے بھی ٹھاکر پرتاب سنگھ کی رعیت میں کوئی بھی ایسا منش ابھی تک کسی ماں نے جنا تک نہیں تھا جو ایک بھول سرزد کر کے خود کو ابدی نیند سلا سکتا۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کا قہر آسمان چھوتا تھا۔

دوسری طرف چاندنی اپنی کوٹھی میں کام کرنے والے بھنڈر کے لڑکے پریم پر فدا ہوگئی تھی۔ پریم اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھتا تک نہ تھا لیکن اس کی نگاہیں ہمہ وقت اس کے سراپے کا محاصرہ کیے رکھتی تھیں۔ کئی ملازموں نے اس بات کو نوٹ بھی کیا تھا لیکن کسی میں کیا مجال کہ کوئی چاندنی کے اس ردعمل پر زبان تک کھول سکتا۔ البتہ پریم کو کئی ملازموں نے کہا کہ ”وہ خود کو چاندنی سے دور رکھے ورنہ ٹھاکر پرتاب سنگھ اسے زندہ درگور کردیں گے۔“ لیکن اس کے دل میں کوئی چور نہیں تھا اس لیے وہ صاف بات کرتا تھا کہ ”میں نے کبھی چھوٹی ٹھاکرانی صاحبہ کو میلی آنکھ سے دیکھا تک نہیں۔ اس لیے مجھ سے ایسی کوئی بات کرنے سے قبل اپنے الفاظ پر غور ضرور کرلیا کرو۔“

دن گزرتے گئے اور چاندنی پریم کے قریب آتی چلی گئی۔ اپنے کمرے کی صفائی کے لیے وہ پریم کو بلواتی تھی جبکہ اس کی خاص ملازمہ اس کے لیے ایلچی کا کام کرتی تھی۔ پریم چاندنی سے دور رہنا چاہتا تھا۔ وہ جتنا اس سے دور ہونے کی سعی کرتا تھا چاندنی اتنا اس کے قریب آتی چلی جارہی تھی۔ حتیٰ کہ دونوں اتنا قریب آگئے کہ ہر حائل رکاوٹ دور ہوگئی۔ وہ ایسا لمحہ تھا جب دونوں ہوش وحواس کھو بیٹھے تھے اور جب ہوش وحواس کی دنیا میں پلٹے تو پریم کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔ اسے اپنی موت واضح دکھائی دینے لگی تھی۔ اس نے ٹھاکر پرتاب سنگھ کی عزت کی دھجیاں اڑائی تھیں اور وہ اس کا انجام بخوبی جانتا تھا۔

چاندنی بھی تھوڑی تذبذب کا شکار تھی لیکن وہ اپنی پریشانی کو پریم پر عیاں نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ وہ جلد از جلد اس پریشانی سے جان چھڑانا چاہتی تھی۔ ابارشن کے علاوہ وہ کوئی حل بھی نہ تھا۔ لیکن وہ جانتی تھی کہ یہ ایک بہت بڑا ریسک تھا۔ اس کے لیے سب سے پہلے اسے کسی بااعتماد انسان کو اپنے ساتھ ملانا ہوگا۔ لیکن وہ ان حالات میں کسی پر بھروسہ کرنے کو قطعاً تیار بھی نہ تھی۔

دن گزرتے گئے اور ان دونوں کے تعلقات میں آئے روز اضافہ ہونے لگا۔ یہاں تک کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کے منشی چوبندر ورما کو بھی اس بات کی بھنک پڑ گئی۔ وہ شروع سے ہی دوسروں پر نگاہ رکھنے والا انسان

تھا۔ اسے جب ان حالات کا پتہ چلا تو اسے اپنی قوت سماعت پر وشواس نہ ہوا تھا۔ اس نے اس بات کی ٹوہ لگانے کا مصمم ارادہ کرلیا اور پھر ایک دن چاندنی اور پریم کو حویلی کے پچھلے باغیچے میں عریاں حالت میں دیکھ کر انگشت بدنداں رہ گیا۔ اسے اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ ایک کمین ٹھاکر پرتاب سنگھ کی عزت کی ایسے دھجیاں اڑانے کی جسارت رکھ سکتا ہے۔

وہ جانتا تھا کہ اس بات کی اگر ٹھاکر پرتاب سنگھ کو اس بات کی بھنک بھی پڑ جائے تو وہ اس نیچ منش کے ساتھ ساتھ اس کی ساری فیملی کو تہس نہس کرکے رکھ دیں گے۔ لیکن وہ خود اس کو روک بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ جس قدر دور تک پہنچ چکا ہے۔ ان حالات میں اگر وہ ان دونوں کے درمیان مداخلت کرے گا تو ممکن ہے چاندنی اسے پلک جھپکتے میں ابدی نیند سلوا دے اور کسی کو کانوں کان خبر تک نہ ہو سکے۔ اس نے اس مسئلے کا حل سوچ لیا بے شک یہ ایک بہت بڑا رسک تھا لیکن اس نے اپنے اس منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کا تہیہ کر لیا تھا۔

وہ اس وقت ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ان دونوں کی ناقابل برداشت حرکات وسکنات پر نگاہ رکھے ہوئے تھا جب اچانک ہی اس کی قوت سماعت سے جانی پہچانی آوازوں کی بازگشت ٹکرائی۔

”میں بھلا ٹھکرانی صاحبہ کو کیسے منع کر سکتی ہوں لیکن ایک نہ ایک دن چوری چوری پکڑی ضرور جاتی ہے اور جس دن چوری پکڑی جائے اس کے ساتھ ساتھ اس کی معاونت کرنے والے سب ہی پھنس جاتے ہیں کیا کروں کچھ سجھائی نہیں دے رہا نہ کروں تو کیا کروں تم ہی بتاؤ کوئی اوپائے تو ہوگا اس مسئلے کا۔۔۔۔“ یہ آواز چاندنی کی نوکرانی خاص کی تھی۔

منشی نے آواز کی سمت دیکھا تو اس سے تھوڑے فاصلے پر ایک درخت کی اوٹ میں کھڑے دو افراد اسے دکھائی دیئے۔ ان دونوں کی پشت اس کی طرف تھی۔ اور حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ دونوں ہی چاندنی کی نوکرانیاں تھیں۔ منشی کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ جلوہ گر ہوئی۔ جیسے اسے اپنے منصوبے کی آپس میں جڑتی کڑیاں مل گئی تھیں۔ اب اس کے لیے پریشانی کی کوئی بات نہ تھی۔ وہ اس نیچ ذات منش کو ایسی سزا دلوانا چاہتا تھا کہ اس کی آنے والی پشتیں بھی یاد رکھیں۔

☆......☆......☆

”تمہیں پتہ ہے منشی تم کیا بک رہے ہو۔۔۔۔؟“ ٹھاکر پرتاب سنگھ نے منشی کی بات سن کر غصے سے بھوکے شیر کے جیسے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

”میں سچ کہہ رہا ہوں ٹھاکر صاحب۔ میں نے آپ کا نمک کھایا ہے اور یہ آپ کے کھائے نمک کا نتیجہ ہے کہ۔۔۔۔۔۔۔ میری غیرت نے یہ گوارہ نہیں کیا کہ کوئی کم ذات آپ جیسے مہان ٹھاکر۔۔۔۔۔۔ جو ہم جیسے نیچ ذات لوگوں کی اتنی چنتا کرتے ہیں کی عزت کی طرف میلی آنکھ سے بھی دیکھنے کی سکت رکھتا ہو اور۔۔۔۔۔ اس نیچ نے تو ایسی گھٹیا حرکت کی ہے کہ اس کا کوئی مداوہ ہی نہیں ہے۔۔۔۔“ منشی نے بمشکل تمام الفاظ چبا چبا کر ادا کیے۔ جبکہ اس کی بات سن کر ٹھاکر پرتاب سنگھ اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کی طرف لپکا اور اس کو گریبان سے پکڑ لیا۔

”یاد رکھنا منشی اگر تیری بات جھوٹ پر مبنی ہے تو ابھی اس بات کا اقرار کرلے کیونکہ دونوں صورتوں میں تجھے مرنا ہے۔ اگر اب تو اقرار کرلے کہ تیری بات جھوٹ پر مبنی ہے تو تلوار کے ایک وار سے تیری گردن تن سے جدا کر کے تجھے آزادی دے دوں گا اور اگر تو اپنی بات پر ڈٹا رہا اور جائے وقوعہ پر پہنچ کر تیری بات جھوٹی ثابت ہوئی تو تیرے پریوار سمیت تجھے بھوکے کتوں کے آگے ڈال دوں گا۔۔۔۔“ ٹھاکر پرتاب سنگھ نے منشی کو گریبان سے پکڑ کر اوپر اٹھا لیا اور بات ختم کرکے زور سے پیچھے کی طرف پھینکا تو وہ تقریباً اڑتے ہوئے پچھلی دیوار سے جا ٹکرایا۔

خوف سے منشی کی گھگھی بندھ گئی۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ بلاوجہ اپنے ہی

پیروں پر اس نے کلہاڑی ماری تھی۔ جو بھی تھا ایک نہ ایک دن تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو ہی جاتا تھا۔ یہ بلی چوہے کا کھیل ایک نہ ایک دن سب کے سامنے عیاں ہو ہی جاتا تھا۔ بلاوجہ اس نے مداخلت کر کے اپنی جان شکنجے میں پھنسادی تھی۔ دیوار سے سر ٹکرانے کی وجہ سے ایک بار تو اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے تھے۔ جب وہ کچھ ہوش میں آیا تو اس نے ایک طائرانہ نگاہ غصے سے پیچ وتاب کھاتے ٹھاکر پرتاب سنگھ پر ڈالی۔ جو دیوار پہ لٹکی میان میں سے تلوار نکال کر اس کی سمت بڑھ رہا تھا۔

''بول خبیث انسان! کیا جو کچھ تو نے کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے یا جھوٹ۔''

ٹھاکر نے ایک بار پھر اسے گریبان سے پکڑ کر زمین سے اٹھایا۔ منشی کے چھکے چھوٹ چکے تھے۔ اس کی اوپر کی سانس اوپر اور نیچے کی سانس نیچے اٹک کر رہ گئی تھی۔

''ٹھ۔۔۔ ٹھا۔۔۔ کک۔۔۔ کر۔۔۔ ص۔۔۔ ا۔۔۔ حب۔۔۔ وہ۔۔۔ جم۔۔۔ نا۔۔۔ بھ۔۔۔ بھی۔۔۔'' منشی کے حلق سے بمشکل یہ الفاظ نکلے۔ خوف سے اس کے پورے شریر پر کپکپی طاری تھی۔

''کیا جمنا۔ کیا وہ بھی تیری اس بات میں شامل ہے۔۔۔؟'' ٹھاکر نے نفرت بھری نگاہ اس پر ڈالتے ہوئے اس کا گریبان مزید دباتے ہوئے کہا۔ تو منشی کو اپنی سانسوں کی ڈوری ٹوٹتی ہوئی محسوس ہوئی۔ اگر ٹھاکر فوراً اسے چھوڑ نہ دیتا تو ممکن تھا کہ وہ سورگباش ہو جاتا۔

''نہیں۔۔۔ ٹھاکر صاحب۔۔۔ چھوٹی۔۔۔ چھوٹی ٹھاکرانی۔۔۔'' منشی بس اتنا ہی بول پایا تھا کہ ٹھاکر نے اسے دھکا دے کر ایک بار پھر دور پھینک دیا اور بلند آواز سے ملازم ''ارجن'' کا نام پکارا۔ نام پکارنے کی دیر تھی کہ ارجن دوڑتا ہوا اندر داخل ہوا۔

''جی بڑے ٹھاکر صاحب۔۔۔'' ملازم نے ٹھاکر پرتاب سنگھ کے تیور بھانپتے ہوئے دھیمے لہجے میں دست بستہ ایستادہ ہوتے ہوئے کہا۔

''فوراً سے بھی پیشتر جمنا کو لے کر آ۔ وہ جہاں بھی ہو جو بھی کر رہی ہو اسے گھسیٹتے ہوئے میرے پاس لے کر آ۔۔۔'' ٹھاکر نے غصے سے دھاڑتے ہوئے کہا۔ اور ملازم ''جو حکم بڑے ٹھاکر'' کہتا ہوا الٹے قدم پلٹ گیا۔

اتنی دیر میں منشی بھی اپنے حواس بحال کرنے میں چنداں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے ایک نگاہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کے دہکتے چہرے کو دیکھا اور دیوار کا سہارہ لے کر کھڑا ہو گیا۔

''بڑے ٹھاکر میں آپ کا جدی پشتی خادم چلا آرہا ہوں۔۔۔ آپ کی عزت کے بارے میں کچھ کہنے کی بھلا مجھ میں سکت ہی کہاں ہے۔۔۔ ٹھاکر جی جمنا چھوٹی ٹھاکرائن کی ہم نوا بنی ہوئی ہے اسے ایک اور ملازمہ کے ساتھ وہاں ایک درخت کی اوٹ میں باتیں کرتے ہوئے میں نے خود سنا ہے۔۔۔ وہ دو ملازمائیں چھوٹی ٹھاکرائن اور اس کم ذات کے بارے میں سب کچھ جانتی ہیں۔۔۔ جمنا کے علاوہ دوسری کون ہے اس کو میں ٹھیک سے نہیں پہچان پایا لیکن جمنا کو اس کی آواز کی وجہ سے میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ اس کو چھوٹی ٹھاکرائن اور اس کم ذات کے بارے میں ہی بتا رہی تھی۔۔۔'' منشی جو لفظوں کو مالا پہنانے کی سعی کر رہا تھا۔ ابھی اس کی بات مکمل بھی نہ ہو پائی تھی کہ ارجن جمنا کو تقریباً گھسیٹتے ہوئے لے کر اندر داخل ہوا۔

اس نے اندر داخل ہوتے ہی اسے ٹھاکر پرتاب سنگھ کی طرف پھینکا۔ جمنا اپنا توازن برقرار نہ رکھتے ہوئے ٹھاکر پرتاب سنگھ کے قدموں میں جا گری۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ نے اسے بالوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ جمنا درد کی کیفیت سے ماہی بے آب کی طرح تڑپ کر رہ گئی۔

''بول کم ذات۔ تجھے میں نے اپنی لڑکی کی حفاظت کے لیے اس کے ساتھ رکھا ہوا تھا اور تو نے اس فریضہ کو کیسے سرانجام دیا۔۔۔؟'' ٹھاکر پرتاب سنگھ نے ایک ہاتھ سے تو اس کے بال پکڑ رکھے تھے جبکہ اسے سیدھا کھڑا کر کے دوسرے ہاتھ سے اس کی ٹھوڑی

سے پکڑ کر اس کا چہرہ اوپر کرتے ہوئے اس سے پوچھا۔

ٹھاکر پرتاب سنگھ کی بات سن کر جمنا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ جس بات کا ڈر تھا وہی ہو چکا تھا۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کو شاید ساری بات سے آشنائی حاصل ہو چکی تھی۔ اسے اچھی طرح سے اس بات کا علم تھا کہ اب اگر اس نے ٹھاکر پرتاب سنگھ کے سامنے جھوٹ سے کام لیا تو فوراً سے بھی پیشتر ٹھاکر پرتاب سنگھ اسے ابدی نیند سلا دے گا۔ ممکن ہے ٹھاکر پرتاب سنگھ کے پاس کوئی ٹھوس ثبوت نہ بھی ہو لیکن جو بھی تھا ایک طرف ٹھاکر پرتاب سنگھ اور دوسری طرف چھوٹی ٹھاکرانی صاحبہ کی عزت کا مسئلہ تھا۔ لیکن اب پچھتائے کیا ہوت جب چڑیاں چگ گئیں کھیت کے موافق اب پانی سر سے گزر چکا تھا۔ اب تو بھگوان کی طرف سے کوئی چمتکار ہی ہوتا تھا اور تب ہی سب کی جان بخشی ہو سکتی تھی۔ ورنہ جس غصے کی آگ میں اس وقت ٹھاکر تپ رہا تھا۔ اس آگ کی تپش تو اسے ابھی سے ہی اپنے شریر میں چبھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔

''میں نے۔۔۔۔ میں نے اپنے فرض کو با حسن نبھایا ہے بڑے۔۔۔ ٹھاکر صاحب۔۔۔۔'' الفاظ بمشکل ہی اس نے چبا چبا کر ادا کیے۔ جبکہ اس کی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ نے اسے اٹھا کر دور پھینکا۔ اس کے پورے شریر میں درد کی ٹیسیں اٹھنے لگی تھیں۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ اٹھے۔ اسے اب وشواس ہو چکا تھا کہ ٹھاکر حقیقت سے آشنائی حاصل کر چکا ہے۔ اس لیے فی الفور ٹھاکر پرتاب سنگھ کے غیض و غضب سے بچنے کے لیے اس کے قدموں میں گر کر معافی مانگ لی جائے تو بہتر ہے۔ یہ خیال بجلی کی سی سرعت سے اس کے دماغ میں کودا اور پلک جھپکتے میں وہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کے قدموں میں آ گری۔

''بڑے ٹھاکر صاحب۔ میں مجبور تھی، چھوٹی ٹھاکرانی کا ساتھ نہ دیتی تو وہ مجھے جان سے مروا دیتیں اور اگر آپ کی بات نہ مانتی تو آپ۔ میں تو دونوں اطراف سے پنڈولیم کی طرح لٹک کر رہ گئی تھی۔ بڑے ٹھاکر میں نے بذات خود چھوٹی ٹھاکرانی کو ایک دو بار سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن انہوں نے مجھے میری اوقات یاد دلوا کر میری بولتی بند کر دی تھی۔۔۔ میں نردوش ہوں بڑے ٹھاکر۔۔۔ میں بھگوان کی سوگند کھا کے کہتی ہوں کہ میں نردوش ہوں مجھ پر رحم کیجئے۔۔۔۔'' جمنا نے آنسو بہاتے ہوئے رحم طلب آنکھوں سے بڑے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا لیکن ٹھاکر پرتاب سنگھ کا غصہ اپنے عروج کی بلندیوں کو چھو چکا تھا۔

اس نے ایک بار پھر اسے بالوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ اور کھا جانے والی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے گویا ہوا:

''اس کا مطلب ہے کہ منشی نے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت پر مبنی ہے۔''

ٹھاکر کی بات کا جمنا کے پاس کوئی جواب ہوتا تو جواب دیتی۔ اس لیے چپ رہی۔ اس کا پورا شریر تھر تھر کانپ رہا تھا۔ کبوتر کے جیسے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوئی جا رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس اوپائے کا کیا حل نکالے۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ اس کی بھول کی سزا صرف موت ہی ہے وہ بھی ایک اذیت ناک موت۔ نجانے کس وقت منشی نے سب کچھ دیکھ لیا تھا۔ اسے منشی پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن وہ جانتی تھی کہ وہ منشی کا بال تک بیکا کرنے کی سکت نہیں رکھتی۔ اس لیے دل میں کڑھنے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔

''تیرے ساتھ جو دوسری چھوکری ہے وہ کون ہے؟''

ٹھاکر کی اس بات پر جمنا کو لہو اپنی رگوں میں جمتا ہوا محسوس ہوا لیکن دوسرے ہی لمحے اس کے پورے شریر میں خوشی کی ایک لہر دوڑ گئی کیونکہ اس کی معاونت کرنے والی کوئی اور نہیں منشی چوبندر داما کی بیٹی منیسا درما تھی۔ منشی نے اپنے ہی پیروں پر کلہاڑی ماری تھی۔ اب وہ تو مرے گی ہی ساتھ اس کی بیٹی کو بھی لے ڈوبے گی۔ اس نے ایک نگاہ منشی پر ڈالی جس کے چہرے پر شیطانیت نے پوری طرح قبضہ جما رکھا تھا۔

پھر اس نے ٹھاکر پرتاب سنگھ کی طرف دیکھا۔ جو ابھی تک اسے بالوں سے پکڑے ہوئے تھا۔

”وہ ۔۔۔ وہ منیسا ورما ہے ۔۔۔ بڑے ٹھاکر۔۔۔“ اس نے ٹھہر ٹھہر کر جواب دیا تو ٹھاکر سمیت منشی کے قدموں تلے سے بھی زمین سرک گئی۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کی قہر آلود نگاہیں منشی پر جم گئیں جبکہ منشی نے کھا جانے والی نگاہوں سے جمنا کی طرف دیکھا۔ وہ حالات کی نزاکت کو بھانپ چکا تھا۔

”یہ۔۔۔ یہ جھوٹ بول رہی ہے بڑے ٹھاکر۔ اپنی جان بچانے کے لیے یہ سارا الزام میری بیٹی پر لگا رہی ہے۔ یہ خود دوشی ہے ”میری بیٹی نردوش ہے۔ یہ اپنا دوش چھپانے کے لیے سارا الزام میری بیٹی پر لگا کر اسے پھنسانا چاہتی ہے بڑے ٹھاکر۔۔۔“ منشی نے غصے سے تقریباً دھاڑتے ہوئے کہا۔

”اگر تیری بات غلط ہوئی تو ایسی موت ماروں گا کہ تیری آتما بھی میرے نام سے تھر تھر کانپے گی۔“ اور جمنا کو چھوڑ کر منشی کی طرف بڑھتے ہوئے تیری بیٹی اگر شامل ہوئی تو اس سمیت تیرے پریوار کو واصل نرک کردوں گا۔“ ملازم جو جمنا کو گھسیٹ کے لایا تھا اس کی طرف مڑتے ہوئے اس کی بیٹی جہاں بھی ہو اسے لے کر آ۔۔۔“ ٹھاکر پرتاب سنگھ کمرے کے ایک طرف بنی وال ونڈو کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ اس کی نگاہیں باہر کی طرف لگی ہوئی تھیں لیکن دماغ اندر ہونے والی کارروائی میں الجھا ہوا تھا۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کرے تو کیا کرے۔ اسے اپنی رعایا سے ایسی کوئی امید و توقع وابستہ نہ تھی۔ جیسا یہ سب کر رہے تھے۔ اس کے پس پشت کیا کیا گل کھل رہے تھے اسے کسی بات کا پتہ تک نہ تھا۔ رعایا نے اس کی رحم دلی کا ناجائز فائدہ اٹھایا تھا۔

جلد ہی ٹھاکر کے سامنے منیسا ورما کو بھی لا کر پھینک دیا گیا۔ جو کمرے میں پہلے سے موجود اپنے پتا جی، جمنا اور غیظ و غضب میں بھرے ٹھاکر کو دیکھ کر حیران و ششدر رہ گئی۔ معاملے کی سنگینی تو اس کی سمجھ سے باہر تھی لیکن حالات و واقعات بتا رہے تھے کہ دال میں ضرور کچھ کالا تھا۔ بلکہ پوری دال ہی کالی لگ رہی تھی۔ جمنا کی حالت بتا رہی تھی کہ کوئی گھٹنا گھٹی ہے اوپر سے منشی کے چہرے پر اڑتی ہوائیں بتا رہی تھیں کہ حالات درست نہیں ہیں ضرور کوئی مسئلہ درپیش آ چکا تھا۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ اس کی طرف مڑا اور کھا جانے والی نظروں سے دیکھا۔

”تجھے پتہ چل ہی گیا ہوگا کہ تم دونوں کو یہاں کس واسطے لایا گیا ہے۔ جو کچھ تم لوگ میرے پس پشت کھچڑی پکاتی پھر رہی ہو مجھے اس کے بارے میں مکمل معلومات موصول ہو چکی ہیں اس لیے بالکل جھوٹ سے کام مت لینا ورنہ میرے غیظ و غضب سے تم بخوبی آشنا ہو۔۔۔۔“ ٹھاکر نے گہری کھا جانے والی شعلہ اگلتی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

منیسا نے ساری بات آرام سے سنی۔ اتنی دیر میں وہ اپنی کیفیت پر قابو پا چکی تھی۔ وہ جان چکی تھی کہ اب کچھ بھی ہو جائے پانی سر سے گزر چکا تھا۔ ٹھاکر جتنی بھی تسلیاں دے اس کی اور جمنا کی موت مترشح ہے۔ لیکن معاملہ یہاں اس کے پریوار کا تھا۔ اگر وہ بات مان جائے تو اس کے ساتھ ساتھ اس کے پریوار کو بھی ٹھاکر نیست و نابود کر کے رکھ دے گا۔ اس لیے اگر کوئی جلد سے جلد حکمت عملی نا اپنائی گئی تو بہت نقصان ہو سکتا ہے۔ اور وہ اپنے پریوار کی خاطر اپنے تن من دھن کی قربانی دینے سے دریغ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنی تو جان دے سکتی تھی لیکن اپنے پریوار پر آنے والی آنچ بھی برداشت نہ کر سکتی تھی۔ حالات و واقعات بتا رہے تھے کہ جمنا سب کچھ اگل چکی ہوگی لیکن اب اس صورت حال میں جمنا کو ہی شکنجے میں پھنسا دینا لازمی تھا۔ دوسری صورت میں اس کے پریوار کی زندگی داؤ پر لگنے کا اندیشہ تھا۔

”بڑے ٹھاکر۔ مجھے جھوٹ بولنے کا شوق نہیں۔ میں نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے۔ میرے باپ دادا نے آپ کے گھر کا نمک کھایا ہے میں بھلا کیسے آپ کے پس پشت کوئی ایسی حرکت کرنے کی سعی کر سکتی ہوں جس کے عوض آپ کی عزت و آبرو داؤ پر لگ

جائے۔۔۔ میرے پتاجی اور ماتاجی نے میری پرورش میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کیا ہے۔ انہوں نے سدا مجھے ایک ہی بات سکھائی ہے کہ ٹھاکر خاندان کے لیے ہمارا تن من دھن قربان ہے۔ تو آپ سوچیے مجھے کیا آئی میں کوئی ایسی حرکت کرنے کی جسارت کرسکوں۔۔۔'' منیسا نے بڑے تحمل کے ساتھ ٹھاکر کے سامنے دست بستہ ہوکر کہا۔ اس نے چنداں توقف کیا۔ پھر گویا ہوئی:

''کل رات میں بڑی ٹھاکرانی کے کمرے کی جھاڑ پونچھ کررہی تھی تو مجھے باغیچے میں کچھ سائے دکھائی دیے۔ پھر ایک سایہ آگے گزر گیا جبکہ دوسرا سایہ ایک درخت کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔۔۔ جلد ہی وہ سایہ نجانے کیوں اس درخت کی اوٹ سے نمودار ہوا تو کمرے سے چھن چھن کر باہر جاتی روشنی اس کے چہرے پر پڑی تو اسے دیکھ کر میں انگشت بدنداں رہ گئی۔ یقین جانیے ٹھاکر صاحب وہ کوئی اور نہیں یہ جمنا تھی۔''

''بڑے ٹھاکر۔۔۔'' جمنا نے منیسا کی بات سن کر اپنی صفائی پیش کرنی کی سعی کی لیکن ٹھاکر نے بایاں ہاتھ اس کی طرف اٹھا کر اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا تو وہ چاروناچار خاموش رہ گئی۔ اندر ہی اندر وہ جل بھن کر رہ گئی تھی کیونکہ منیسا جو کچھ بھی کہہ رہی تھی وہ مکمل طور پر جھوٹ پر مشتمل تھا۔ دونوں باپ بیٹی مل کر اسے پھنسانے کے چکر میں تھے حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ منیسا بھی اس جرم میں اس کی برابر کی شریک تھی۔

''تو اپنی بات مکمل کر۔۔۔'' ٹھاکر نے جمنا کو خاموش کروانے کے بعد منیسا کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے چنداں تشویش ہوئی کہ ضرور دال میں کچھ کالا ہے۔ میں بات کی کھوج نکالنے کی غرض سے باغیچے میں گئی تو نجانے کیسے جمنا کی نگاہ مجھ پر پڑگئی۔ یا اسے میری موجودگی کی بھنک پڑگئی تو وہ میرے پاس آگئی۔ میں نے اس سے پوچھا کہ تم اتنی رات گئے یہاں کیا کررہی ہو۔ اور تمہارے ساتھ کون ہے جو تھوڑی دیر قبل آگے گیا ہے۔ تو اس نے اپنے لبوں پر انگلی رکھتے ہوئے مجھے خاموش کروادیا اور پھر دھیمے لہجے میں اس نے مجھے چھوٹی ٹھاکرانی اور اس لونڈے کے متعلق بتایا اور مجھے اس نے کہا کہ اگر میں اپنا منہ بند رکھوں تو اس کے عوض چھوٹی ٹھاکرانی سے وہ مجھے بہت کچھ لے دے گی۔ میں نے اس وقت تو کوئی جواب نہ دیا۔ واپس پلٹ آئی۔

لیکن تھوڑی ہی دیر بعد چھوٹی ٹھاکرانی کی طرف سے بلاوا آگیا۔ میں چھوٹی ٹھاکرانی کے کمرے میں گئی تو جمنا بھی ان کے پاس تھی۔ انہوں نے بھی انہی الفاظ کو دہرایا کہ اگر میں اپنا منہ بند رکھوں اور ان کے ساتھ مل جاؤں تو اس کے عوض وہ مجھے انعام واکرام سے نوازیں گی۔ ٹھاکر صاحب سب کیا چل رہا تھا مجھے قطعاً کچھ خبر نہیں تھی لیکن میں اتنا سمجھ چکی تھی کہ ضرور کچھ ہونے والا ہے۔ میں آپ کو بتانے سے بھی خوف کھارہی تھی کہ کہیں آپ میری بات کو غلط سمجھ کر میرا سر کٹوا نہ دیں۔ مجھے اپنی جان کی تو کوئی چنتا نہیں لیکن میری وجہ سے میرے نردوشی ماتا پتا کو بھی آپ کے قہر کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ میں شدید تذبذب کا شکار تھی کہ کروں تو کیا کروں۔ پتاجی کو تلاش کیا لیکن وہ نہ ملے کیونکہ وہ یہاں آپ کے پاس موجود تھے۔ اور یہی نہیں آج رات چھوٹی ٹھاکرانی اپنا سب کچھ سمیٹ کر اس لونڈے کے ساتھ چمپت ہوجائیں گی یہ باتیں مجھے (جمنا کی طرف ایک بار پھر اشارہ کرتے ہوئے) اسی نے بتائی تھیں۔ وہ لونڈا رات کے پچھلے پہر آئے گا۔ چھوٹی ٹھاکرانی قیمتی زیوارت، نقدی کے علاوہ نجانے کیا کیا لے کر اس کے ساتھ۔۔۔۔۔۔''

قبل اس کے کہ منیسا اس سے آگے کچھ کہتی ٹھاکر نے اسے خاموش کردیا۔

''اس نے جو کچھ کہا ہے کیا یہ سچ ہے یا جھوٹ۔۔۔؟'' ٹھاکر نے دیوار کے ساتھ مکھی کے جیسے چپکی جمنا کی طرف کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''بڑے ٹھاکر آپ میری بات کا وشواس کریں یہ جو کچھ کہہ رہی ہے۔۔۔۔۔'' جمنانے دھواں دھار روتے ہوئے کہا۔لیکن ٹھاکر نے ایک بار پھر اسے خاموش کروادیا۔

''بکواس بند کر۔۔۔'' ٹھاکر غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے بولا۔

''یہ بتا کہ یہ جو کچھ کہہ رہی ہے یہ سچ ہے یا جھوٹ۔''

''یہ سب جھوٹ ہے۔۔۔'' جمنانے دونوں بازوؤں میں منہ کو چھپاتے ہوئے آہ وفغاں کرتے ہوئے جواب دیا۔

''کیا سچ ہے اور کیا جھوٹ اس کا پتہ تو آج چل ہی جائے گا۔میں تم دونوں کی زندگی بخش رہا ہوں لیکن اس شرط پر کہ تم دونوں چاندنی سے کوئی بھی بات نہیں کروگی۔علاوہ ازیں تم دونوں کو جلا کر خاکستر کردوں گا۔تم چاندنی کے ساتھ ویسے ہی رہوگی جیسے پہلے تھیں۔تم دونوں پر خفیہ نظر رہی جائے گی۔جو کچھ جیسے چل رہا ہے اسے چلنے دو ورنہ دوسری صورت میں تم دونوں کو تمہارے پریواروں کے ساتھ جلا کر خاکستر کردوں گا۔اب فوراً سے بھی پیشتر دفع ہوجاؤ یہاں سے۔۔۔'' ٹھاکر نے دونوں کی طرف غصیلی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے اور دوسرے ہی لمحے دونوں وہاں سے نو دو گیارہ ہوگئیں۔

ان دونوں کے جانے کی دیر تھی کہ ٹھاکر ملازم کی طرف متوجہ ہوا۔

''ان دونوں پر کڑی نظر رکھو۔اور تم (منشی کی طرف غصے سے دیکھتے ہوئے) اگر اس کمرے سے باہر نکلے تو (ایک بار پھر ملازم کی طرف دیکھتے ہوئے) اس کا نکلتے ساتھ ہی فوراً سر کاٹ کردینا۔۔۔'' اتنا کہہ کر ٹھاکر تو وہاں سے چلتا بنا لیکن منشی اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔

☆......☆......☆

''چھوٹے ٹھاکر بڑے ٹھاکر کے رعب ودبدبے اور غصے سے بہت خوف آتا ہے۔کہیں ایسا نہ ہو ہمارا یہ چھپ چھپ کر ملنا ایک دن ان پر عیاں ہوجائے تو قیامت برپا ہوجائے گی۔وہ سب کچھ تہس نہس کرکے رکھ دیں گے۔ہم لوگ تو آپ کے برابر نہیں ہیں بڑے ٹھاکر اس بات کو کسی طور قبول نہیں کریں گے اور مجھے میرے پریوار سمیت ابدی نیند سلادیں گے۔۔۔'' پریتی نے چھوٹے ٹھاکر مہندر ناتھ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔اس کی آنکھوں میں تیرتا خوف چھوٹے ٹھاکر کی نظروں سے چھپ نہ سکا تھا۔

تم خواہ مخواہ مضطرب ہورہی ہو۔چنتا نہ کرو میں جلد ہی پتاجی کو راضی کرلوں گا۔ارے پگلی تم جانتی نہیں لوگوں کی نظر میں پتاجی جتنے سخت مزاج ہیں حقیقت میں پتاجی اتنے ہی رحم دل اور احساس مند منش ہیں۔۔۔'' چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

پریتی ملکیش گاؤں کے مندر کے پنڈت ملکیش راؤ کی بیٹی تھی۔ملکیش راؤ کی ساری زندگی اس مندر میں گزرگئی تھی۔ہندو لوگ جو چڑھاوے چڑھا جاتے تھے۔ٹھاکر پرتاب سنگھ نے ان پر ملکیش راؤ کو حق دیا تھا کہ وہ سب کچھ اس کا ہوگا۔علاوہ ازیں وقتاً فوقتاً ٹھاکر پرتاب سنگھ اس کی مدد کردیا کرتا تھا۔ایک پورے گاؤں میں وہی تھا جس کی ٹھاکر عزت بھی بہت کرتا تھا اور اس کی مدد بھی کردیا کرتا تھا۔ملکیش راؤ کو ٹھاکر پرتاب سنگھ نے مندر کے عقب میں ہی ایک اچھا سا گھر بنوا دیا تھا۔جس میں وہ اپنی پتنی اور بیٹی کے ساتھ رہ رہا تھا۔

ملکیش راؤ کی پتنی تھوڑی موڈی قسم کی اور بدمزاج عورت تھی۔یہی وجہ تھی کہ گاؤں کا کوئی بھی شخص ان کے گھر آنا تک گوارہ نہ کرتے تھے۔پنڈت سے بھی سب مندر میں ہی ملتے تھے۔پنڈت ملکیش راؤ بذات خود ٹھیک تھا۔خاص کر ان کے لیے جو کچھ چڑھاوے چڑھا جاتے تھے اور جو بس بھگوان کی پوجا پاٹ کرنے آتے تھے ان کے سامنے تو یہ سامنہ۔۔ کر ہی آتا تھا۔

چھوٹے ٹھاکر کو پہلے دن ہی پنڈت ملکیش راؤ کی بیٹی بہت بھاگئی تھی۔وہ اس کے لیے اپنے دل میں بہت کچھ محسوس کرنے لگا تھا۔پہلے پہل تو اس نے اپنے

اس ذہنی انتشار کو ختم کرنے کی بہت کوشش کی لیکن وہ اپنے دل بے قرار پر قابو نہ پا سکا تھا۔ اور اس نے جلد ہی محسوس کر لیا تھا کہ پنڈت کی بیٹی اس کے لیے بہت اہم ہے اور قبل اس کے کہ کوئی اور اس کا جیون ساتھی بن جائے اسے کوئی اوپائے نکالنا چاہیے تھا۔ پنڈت کی پتنی بڑے ٹھاکر کی کوٹھی میں کام کرتی تھی جبکہ اس کی بیٹی بہت کم ہی کام پر آتی تھی۔ ہاں اگر کبھی کبھار اس کی ماتا کی حالت درست نہ ہوتو پھر وہ آ جاتی تھی۔

اس دن بھی اس کی ماتا کی طبیعت کچھ ناساز ہونے کی وجہ سے اسے کام پر آنا پڑ گیا۔ وہ جیسے ہی کوٹھی میں داخل ہوئی چھوٹے ٹھاکر کی نگاہ اس پر پڑ گئی۔ اسے دیکھتے ساتھ ہی وہ بھاگم بھاگ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد ایک ملازمہ کے ہاتھ پریتی کو بلوا بھیجا کہ اسے کہو کہ آ کر چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کی صفائی کر جائے۔ ملازمہ کو بھلا کیا شک ہونا تھا کہ ایک نوکرانی پر چھوٹے ٹھاکر کیسی نگاہ ڈال سکتے ہیں۔ نوکرانی کمرے سے باہر نکلی تو اس وقت پریتی ہاتھ میں خالی تھالی لیے گزر رہی تھی۔

”سنو پریتی کہاں جا رہی ہو تم۔۔۔۔۔؟“ ملازمہ نے اسے روک کر پوچھا۔

”بڑی ٹھاکرانی کے کمرے میں خالی برتن پڑے ہیں وہ اٹھانے جا رہی ہوں۔۔۔۔۔“ اس نے ماتھے پر آئے بالوں کی لٹ کو کان کی لو کے پیچھے چھپاتے ہوئے کہا لیکن آتش کی پرکالی وہ لٹ ایک بار پھر اس کے ماتھے پر آ گری۔

”تم ایسا کرو کہ یہ خالی تھالی مجھے دو، چھوٹے ٹھاکر تمہیں اپنے کمرے میں بلا رہے ہیں۔۔۔۔۔“ ملازمہ کی بات سن کر اس کا ماتھا ٹھنکا اور اس نے حیران وششدر ہو کر اس کی طرف دیکھا۔

”کیوں خیر تو ہے۔۔۔۔؟“ اس نے تھوک نگلتے ہوئے پوچھا۔

”ہاں ہاں خیر ہی ہے۔ چھوٹے سرکار کا کمرہ صاف کرنا ہے۔۔۔۔۔“ اس نے تھالی اس کے ہاتھوں سے پکڑتے ہوئے کہا۔ تو اس کے سانس میں سانس آئی۔ لیکن دل مطمئن نہ ہوا۔

تھالی ملازمہ کو دے کر وہ چھوٹے ٹھاکر کے کمرے کے پاس آئی۔ تمام ترہمت کو یکجا کیا اور دروازے کو کھٹکھٹایا۔ جبکہ دوسری طرف دستک کی آواز سن کر چھوٹا ٹھاکر فوراً سے بھی پیشتر بجلی کی سی سرعت سے اٹھ کر کھڑکی کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا اور ایک لمبی سانس خارج کرنے کے بعد گویا ہوا۔ ”آؤ۔“

پریتی چپ چاپ اندر داخل ہوئی۔ ایک نظر چھوٹے ٹھاکر پر ڈالی جو کھڑکی کے سامنے کھڑا کھڑکی کا پردہ ہٹا کر باہر کچھ دیکھ رہے تھے۔ پریتی نے کمرے میں چہار سو نگاہ دوڑائی تو سارا کمرہ چمک کرتا دکھائی دیا۔

”کمرہ تو صاف ہے کہیں دھول، گرد یا مٹی دکھائی نہیں دے رہی پھر مجھے کیوں بلا بھیجا ہے چھوٹے ٹھاکر۔۔۔۔۔؟“ پریتی کے ذہن میں یہ سوال بجلی کی سی سرعت سے کوندا۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ کچھ پوچھتی چھوٹا ٹھاکر خود ہی بول پڑا۔

”تم دیکھ ہی چکی ہو کہ کمرہ مکمل طور پر صاف ستھرا ہے پھر میں نے تمہیں کیوں بلایا ہے یقیناً تمہیں حیرانگی تو ہوئی ہوگی۔“

”جج۔۔۔ جی۔ ہاں۔۔۔۔“ اس نے لفظوں کو تقریباً چباتے ہوئے کہا۔ تب آناً فاناً چھوٹے ٹھاکر نے اس کی طرف رخ بدلا۔

”میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں پریتی۔۔۔۔؟“ چھوٹے ٹھاکر نے الفت بھری نگاہوں سے اس کے سراپے کا طواف کرتے ہوئے کہا۔ پریتی کو اس کی باتوں کی کچھ سمجھ نہیں آئی لیکن چھوٹے ٹھاکر کے لہجے میں اتنی الفت اور مٹھاس ضرور دال میں کچھ کالا لگ رہا تھا۔ اس نے بولنے کی سعی کی لیکن اس کی تمام ترہمت جواب دے گئی۔

”چنتا مت کرو میں تمہیں کچھ نہیں کہوں گا۔ تمہاری عزت کو بھی کچھ نہیں ہوگا۔ میں ان ٹھاکروں میں سے نہیں ہوں جن کی نگاہیں رعایا کی عزت پر لگی

ہوتی ہیں۔''

چھوٹا ٹھاکر خود ہی بڑبڑائے جا رہا تھا اسے کچھ سمجھ نہ آ رہی تھی کہ ان باتوں کا وہ کیا جواب دے۔ وہ تو بس بوتگوں کے جیسے مبہوت کھڑی بس اس کی باتیں سن رہی تھی۔

''دیکھو پریتی رنگ، نسل، ذات پات یہ تو سب بھگوان کے بنائے ہیں۔ اونچ نیچ سب کچھ اسی کا بنایا ہوا ہے میں ان باتوں پر قطعاً وشواس نہیں کرتا بس ان سب باتوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے آج تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں؟''

''جج۔۔۔جی ۔۔۔ چھچھ۔۔۔۔چھو۔۔۔۔ ٹے ۔۔۔ٹھا۔۔۔۔کر۔۔۔آپ۔۔۔حک۔۔۔م ۔۔۔۔کریں۔۔۔۔۔'' اس نے بمشکل تمام اپنا جملہ پورا کیا۔

اس کے جملے کے پورا ہونے تک چھوٹا ٹھاکر تقریباً اس کے قریب پہنچ چکا تھا۔ اسے اپنی سانسوں کی روانی رکتی ہوئی محسوس ہونے لگی۔ تا زیست کبھی ایسا مرحلہ اس سے پہلے اس کی زیست میں نہیں آیا تھا۔ نہ ہی کبھی اس نے کسی دوسرے انسان خاص کر مرد کی کوئی قربت حاصل کی تھی۔ اور آج یکبارگی چھوٹے ٹھاکر کا یہ لہجہ اس کے لیے حیران کن تھا۔ اس کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔ اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے تھے۔ ہتھیلیاں عرق آلود ہوگئی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آ رہی تھی لیکن اس کی کیفیت سے اتنا ضرور دکھائی دے رہا تھا کہ اگر چھوٹے ٹھاکر کی طرف سے کوئی مزید پیش رفت ہوئی تو اس کا فوراً ہارٹ فیل ہو جائے گا۔ اس کی کیفیت کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے چھوٹا ٹھاکر فوراً ہی پیچھے ہولیا۔

''پریشان مت ہو۔۔۔۔'' چھوٹے ٹھاکر نے اس کی طرف الفت بھری نگاہ سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں باتوں کو طول نہیں دینا چاہتا بس دوٹوک بات کروں گا کہ پریتی میں تم سے بہت پیار کرتا ہوں۔ یقین مانو پہلی نگاہ میں ہی تم میرے دل میں سما گئی ہو۔ میں کئی دنوں سے اسی وقت کا منتظر تھا کہ کسی پل تنہائی میں تم سے کچھ کہنے کا موقع میسر آئے اور دل کی بات تم سے کہہ دوں۔''

چھوٹا ٹھاکر بولتا جا رہا تھا۔ جب کہ اسے ٹھاکر کی باتیں دور کسی کنویں سے آتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اسے کچھ سمجھ ہی نہیں آ رہا تھا کہ ان باتوں کا کیا جواب دے۔ اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے تھے۔ اس کی وجہ اسے بھی معلوم نہ تھی کہ اس کی آنکھیں چھوٹے ٹھاکر کی بات سن کر اشکبار کیوں ہوگئی تھیں۔ حالانکہ چھوٹے ٹھاکر نے اس کے ساتھ کچھ غلط نہیں کیا تھا۔

''کیا ہوا تمہیں؟''

چھوٹے ٹھاکر نے اس کی آنکھوں سے بہتے آنسو دیکھتے ہوئے اس سے پوچھا۔ تو جواباً پریتی یکبارگی ٹھاکر کے قدموں میں گر گئی۔

''مجھے شما کیجیے چھوٹے ٹھاکر۔۔۔آپ نجانے کیا کہہ رہے ہیں۔۔۔آپ کو نہیں پتہ۔۔۔لیکن آپ کی یہ۔۔۔یہ باتیں ہم غریبوں کا۔۔۔جینا اجیرن کردیں گی۔۔۔ہماری کیا اوقات کہ آپ جیسے۔۔۔مہان لوگوں سے پیار دیار کریں ۔۔۔چھوٹے ٹھاکر۔۔۔بھگوان کے لیے ہمیں شما۔۔۔دے دیجیے۔۔۔۔بڑے ٹھاکر کے غضب سے ہمیں بچا لیجیے۔۔۔بڑے ٹھاکر کی سماعت سے کوئی بات ٹکرا گئی تو۔۔۔۔وہ مجھے میرے پریوار سمیت ابدی نیند سلادیں گے۔ چھوٹے ٹھاکر ہم چھوٹے لوگوں پر شما کیجیے۔۔۔۔بھگوان کے لیے ۔۔۔۔'' پریتی دھواں دھار رو رہی تھی لیکن اس کی رونے کی آواز اتنی بلند بھی نہیں تھی کہ کمرے کے در و دیوار سے باہر نکلتی۔ چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کی بات سن کر اسے کندھوں سے پکڑ کر کھڑا کیا۔ اس کا سارا چہرہ اشکوں سے تر ہو چکا تھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے اس کے ڈوپٹے سے اس کا چہرہ صاف کیا۔

''تم چنتا کیوں کر رہی ہو۔ ایسا کچھ بھی نہیں ہوگا پریتی۔ میں تمہیں دلہن بنا کر اس گھر میں لاؤں

گا اور اس گھر کا ہر فرد تمہیں قبول کرے گا۔۔۔۔۔“ چھوٹے ٹھاکر نے اس کی ڈھارس بندھاتے ہوئے کہا۔

”ایسا ممکن نہیں ہے چھوٹے ٹھاکر آپ پرچھائیوں کے پیچھے دوڑ رہے ہیں۔۔۔۔“ پریتی نے تمام تر ہمت کو یکجا کر کے اپنی کیفیت پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

”جو انسان ناممکن کو ممکن نہ بنا سکے اس کی زندگی بھی بھلا کوئی اہمیت رکھتی ہے۔ میں تمہیں وچن دیتا ہوں پریتی کہ بھگوان کی سوگند تمہیں اس گھر کی دلہن بناؤں گا اور درپیش تمام مصائب ومشکلات سے مل کر نبرد آزما ہوں گے۔ تم پہ یا تمہارے پریوار پر آنچ آنے سے پہلے سامنے میں ہوؤں گا۔ ابھی کسی میں اتنی سکت نہیں پریتی کہ میرے مدمقابل ایستادہ ہونے کی سعی کر سکے اور پھر تمہیں بھی پتہ ہے کہ مستقبل قریب میں میں ہی وارث ہوں۔ یہ ساری رعایا میرے حکم کی تابع ہوگی۔ بہت جلد میرا دور شروع ہونے والا ہے۔ پتا جی اپنی حیات میں ہی یہ سب کچھ میرے سپرد کرنے کے خواہاں ہیں۔۔۔۔“

چھوٹے ٹھاکر کی باتوں سے پریتی کی کچھ ڈھارس ضرور بندھی لیکن وہ مکمل طور پر مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

☆☆☆

رات اپنے پر پھیلا چکی تھی۔ آج پہلی بار ٹھاکر پرتاب سنگھ کی حویلی میں جلد ہی سناٹا چھایا تھا اور یہ سب کچھ زندگی میں پہلی بار ہوا تھا۔ ورنہ رات گئے تک حویلی میں لوگوں کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ آج سورج ڈھلنے سے قبل ہی ٹھاکر پرتاب سنگھ نے سب کو مطلع کروا دیا تھا کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کی طبیعت چنداں ناساز ہونے کی وجہ سے آج وہ کسی سے مل نہیں پائیں گے۔ حویلی کی لائٹیں بھی جلد ہی گل کر دی گئی تھیں۔ ٹھاکر سب کی نظروں کے سامنے بے شک کمرے میں داخل ہوا تھا لیکن اپنی اہلیہ کو اس نے صرف اتنا کہا تھا کہ اسے ایک ضروری کام سے شہر تک جانا ہے رات کی تاریکی میں وہ اس لیے جا رہا ہے کہ حالات کی پیچیدگی کو بھی ملحوظ خاطر میں رکھنا پڑتا ہے۔ اور جلد ہی وہ واپس لوٹ آئے گا اور کسی کو پتہ بھی نہ چلے کہ میں اپنے کمرے میں ہوں کہ کہیں گیا ہوا ہوں۔ لائٹوں کے گل ہوتے ہی وہ کمرے سے نکل کر منشی کے ساتھ باغیچے میں جا کے ایک طرف براجمان ہو گیا تھا۔ باغیچے کے اس طرف گھنے درخت تھے۔ جن کے نیچے ٹھاکر اور منشی کی موجودگی کا کسی کو رتی برابر احساس تک نہ ہو سکتا تھا۔

دوسری طرف جمنا اور منیسا کی کیفیت ماہی بے آب کی سی ہو چکی تھی۔ منیسا ابھی تک جمنا کے روبرو نہیں آئی تھی ایک بار دونوں کا آمنا سامنا ضرور ہوا تھا لیکن اس وقت دونوں چھوٹی ٹھاکرانی کے سامنے ایستادہ تھیں اور چھوٹی ٹھاکرانی انہیں رات کے بارے میں لائحہ عمل سمجھا رہی تھیں۔ لیکن اسے خود اس بات کا بھی پتہ نہ تھا کہ اس کے اپنائے گئے تمام لائحہ عمل اس کے لیے کارگر ثابت نہیں ہوں گے۔ آج کی رات ایک امتحان کی رات تھی۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کے لیے بھی، چاندنی اور اس کی دونوں ملازماؤں کے لیے بھی۔ جمنا اور منیسا بہت کوشش کے باوجود بھی چھوٹی ٹھاکرانی کو حالات سے آگاہ نہیں کر پا رہی تھیں کیونکہ وہ جانتی تھیں کہ ایسی صورت میں ان کا کیا حشر نشر ہوگا۔ خیر اب جو کچھ ہونا تھا وہ تو ہو کر ہی رہنا تھا چاہے وہ کچھ بھی کر لیتیں۔ چھوٹی ٹھاکرانی کو آگاہ کرنے یہ نہ کرنے سے بلا ٹلنے والی نہ تھی۔ اس بات سے تو وہ دونوں بھی بخوبی آشنا تھیں ان کے ساتھ کچھ اچھا ہونے کی توقع نہیں۔

دونوں چھوٹی ٹھاکرانی کے اس وقت پاس ہی تھیں۔ جب پوری حویلی کی بتیاں گل کی گئی تھیں۔ جلد ہی چھوٹی ٹھاکرانی نے انہیں چلنے کے لیے کہا تو دونوں کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ دونوں چیخ چیخ کر چھوٹی ٹھاکرانی کو آنے والی افتاد سے آشنا کرنا چاہتی تھیں لیکن وہ جانتی تھیں کہ ٹھاکر کے لوگ ضرور کہیں نہ کہیں چھپ کر ان پر نگاہیں جمائے ہوئے ہوں گے۔ چھوٹی ٹھاکرانی نے دونوں کو تذبذب کا شکار دیکھا تو فوراً ہی پوچھ لیا۔

”کیا بات ہے تم دونوں کے چہروں پر یہ ہوائیاں

کیوں اڑ رہی ہیں سب خیر تو ہے ناں۔۔۔؟'' چھوٹی ٹھاکرانی کی پیشانی پر پریشانی کے باعث سلوٹیں عیاں ہو چکی تھیں۔

''نن۔۔۔نہیں تو۔۔۔چھو۔۔۔ٹی ٹھاکرانی۔۔۔ ایسی کوئی بات نہیں۔۔۔'' بالآخر منیسا نے ہی بمشکل تمام کہا۔

'''تمہارے لہجے سے لگ رہا ہے کہ کچھ نہ کچھ گڑ بڑ ہے۔۔۔؟'' چھوٹی ٹھاکرانی نے بغور اس کے چہرے کو دیکھتے ہوئے کہا۔ تو منیسا نے نظریں چراتے ہوئے کہا۔

''چھوٹی ٹھاکرانی صاحبہ! آپ بلاوجہ ہی چنتا کر رہی ہیں ہم تو اپنے پتا جی کی طرف سے پریشان ہیں ان کی طبیعت صبح تھوڑی ناساز تھی۔۔۔۔'' منیسا نے سفید جھوٹ تو بول دیا تھا لیکن اس کا چہرہ اس بات کی عکاسی کر رہا تھا کہ اس نے جو کچھ بھی کہا تھا سب کچھ جھوٹ پر مبنی تھا۔

''اور تم اتنی پریشان کیوں دکھائی دے رہی ہو۔۔۔؟'' چھوٹی ٹھاکرانی نے جمنا کو مخاطب کرتے ہوئے کہا تو وہ اچانک یوں چونکی جیسے گہری نیند سے انسان چونک کر بیدار ہوتا ہے۔

''نن۔۔۔نہیں تو چھوٹی ٹھاکرانی صاحبہ بھلا میں کیوں پریشان ہوں گی۔۔۔'' اس نے بھی منیسا کی طرح جھوٹ کا سہارہ لیتے ہوئے کہا۔

پہلے تو چاندنی کا ماتھا ٹھنکا۔ لیکن عشق کے نشے میں وہ اس قدر غرق ہو چکی تھی کہ اس بات کو پس پشت ڈال دیا کہ چلو جو بھی ہے ان کے ذاتی معاملات ہیں۔ صبح وہ ان کے بارے میں بھی کچھ سوچ و بچار کر لے گی۔ اس وقت فی الحال اسے چنتا اپنے پریمی کی تھی جو شاید کب کا آ کر اس کے انتظار میں آتش عشق میں کھڑا سلگ رہا ہوگا۔

وہ ان دونوں کے ساتھ فوراً سے بھی پیشتر وہاں سے دھیمے قدم چلتی نکلی اور جلد ہی تینوں باغیچے میں پہنچ چکی تھیں۔ منیسا اور ما اور جمنا دونوں کی کیفیت مرغ بسمل کی سی ہو رہی تھی۔ دونوں کو معلوم تھا کہ یہیں کہیں آس پاس بڑے ٹھاکر اور اس کے کارندے گھات لگائے براجمان ہوں گے جو پلک جھپکتے میں ان سب کو اچک لیں گے۔ چاندنی کی رفتار ان دونوں سے تھوڑی تیز تھی اس لیے جلد ہی وہ ان دونوں سے بہت آگے نکل کر اندھیرے میں غائب ہوگئی۔ جبکہ وہ دونوں وہیں درخت (جس کے نیچے رات انہیں منشی نے کھڑا دیکھا تھا) کے نیچے کھڑی ہوگئیں۔ ابھی انہیں وہاں کھڑے ہوئے چند ثانیے ہی نہ ہوئے تھے کہ کے بعد دیگرے دو دلدوز اور سماعت شکن چیخوں نے ان دونوں کی قوت سماعت پر دستک دی۔ چیخوں کی آواز ان کی سماعت سے کیا ٹکرائی۔ دونوں کے منہ سے گھٹی گھٹی سی چیخیں نکل گئیں۔ دونوں کے شریر بری طرح کانپ رہے تھے۔ دونوں کو موت کی پرچھائیاں دکھائی دینے لگی تھیں۔ موت انہیں اپنے سر پر ناچتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔

☆……☆……☆

بڑی ٹھاکرانی کو یہ سب کچھ نجانے کیوں شک میں مبتلا کیے جا رہا تھا۔ اس کا دل کسی انجانے خوف سے بری طرح کانپ رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے کچھ ہونے والا ہے۔ اسے اس حویلی میں آئے برسوں بیت گئے تھے اور ان بیتے برسوں میں کبھی کوئی دن ایسا نہیں آیا تھا۔ جب سرشام حویلی کی بتیاں گل کی گئیں ہوں۔ ٹھاکر نے کسی سے بھی ملنے سے انکار کیا ہو یا پھر رات کے اندھیرے میں ٹھاکر یوں بنا کچھ بتائے کہیں نکلے ہوں۔ ان کا دل دھک دھک دھڑک رہا تھا۔ انہیں یقین ہو چکا تھا کہ دال میں ضرور کچھ کالا ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اپنے قلب مضطرب کو نہیں سمجھا پا رہی تھیں کہ سب کچھ ٹھیک ہے۔ وہ جتنا خود کو ایزی کرنے کی سعی کرتی اتنی ہی پریشانی میں اضافہ ہو جاتا۔ وہ بے صبری سے بڑے ٹھاکر کی واپسی کا انتظار کر رہی تھیں۔ رات اپنے پر پھیلانے لگی تھی۔

کمرے کی چار دیواری میں انہیں اپنا دم گھٹتا ہوا

محسوس ہونے لگا تھا۔ انہوں نے سوچا کہ باہر چل کر چند منٹ چہل قدمی کرکے تازہ ہوا کھا آئیں۔ ابھی ان کے قدم دروازے تک ہی پہنچے تھے کہ ان کی قوت سماعت سے چہ میگوئیوں کی بازگشت ٹکرائی۔ انہوں نے کمرے کا دروازہ تھوڑا سا کھول کر باہر جھانکا تو تین سائے انہیں حویلی کے باغیچے والے دروازے کی طرف لپکتے دکھائی دیے۔ اندھیرے کی وجہ سے وہ انہیں پہچان تو نہ پائی لیکن اس کا دل سمجھ گیا کہ حالات کچھ خراب ہیں۔ حالات کی بہتی الٹی گنگا کا راز جاننا ضروری تھا۔ وہ تینوں کون تھے یہ پتہ لگانے کے لیے وہ بھی دھیرے دھیرے ان کے پیچھے ہولی۔

تینوں سائے لمبی راہداری کراس کرکے باغیچے کے دروازے کے پاس جا کر رک گئے۔ پھر یکے بعد دیگرے تینوں سائے باغیچے کا دروازہ کراس کرکے باغیچے میں داخل ہوگئے۔ بڑی ٹھاکرانی کے قدموں میں یک لخت تیزی آگئی۔ ان کا دل بری طرح سے دھڑک رہا تھا۔ وہ جلد سے جلد جاننا چاہتی تھیں کہ وہ تینوں کون ہیں؟ جلد ہی وہ بھی باغیچے کا دروازہ کراس کرگئیں۔ باغیچے میں اندھیرے کا راج تھا۔ لائٹیں گل ہونے کی وجہ سے ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے رہا تھا۔ کچھ دیر وہ ایک ہی جگہ مبہوت بنی ایستادہ رہیں۔ تھوڑی دیر بعد وہ اندھیرے میں کچھ دیکھنے کے قابل ہوئیں تو انہیں ایک شجر کے نیچے دو سائے دکھائی دیے لیکن قبل اس کے کہ وہ ان کی طرف لپکتی۔ یکے بعد دیگرے دو سماعت شکن چیخوں نے ان کی قوت سماعت پر دستک دی تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ کیونکہ وہ چیخ سن کر ہکا بکا رہ گئیں۔ آواز انہوں نے فوراً سے بھی پیشتر پہچان لی تھی۔ وہ آواز ان کی اپنی بیٹی چاندنی کی تھی لیکن اس کی آواز کے ساتھ جو دوسری آواز بڑی ٹھاکرانی کی قوت سماعت سے ٹکرائی تھی وہ کسی مرد کی آواز تھی۔

معاملے کی نزاکت کو وہ بھانپ گئی تھیں۔ آج کی رات میں ہونے والی اس انہونی سے انہیں آشنائی تو ہوگئی تھی لیکن یہ آشنائی اس قدر بھیانک ہوگی اس کے بارے میں انہوں نے تصور میں بھی نہ سوچا تھا۔ دوسرے ہی سے باغیچے کی لائٹیں جلادی گئیں تو ان کی آنکھوں نے ایک نہایت ہی بھیانک منظر دیکھا۔ ان کی بیٹی اور ایک لڑکا دونوں بڑے ٹھاکر کی گرفت میں تھے اور سب سے حیران کن بات کہ دونوں نیم عریاں حالت میں تھے۔ انہیں اپنی قوت بینائی پر وشواس ہو رہا تھا۔ بڑے ٹھاکر کا غم وغصے سے برا حال ہو چکا تھا۔ غصے سے پیچ وتاب کھاتے ٹھاکر نے دونوں کو ایک جھٹکے سے اپنے سامنے زمین پر پھینکا۔ تبھی بڑے ٹھاکر کی اوٹ میں بڑی ٹھاکرانی کو منشی کا منحوس چہرہ بھی دکھائی دیا۔ جبکہ دوسری طرف بڑے ٹھاکر کے دو کارندوں کے ہاتھ میں جال میں پھنسی مچھلیوں کی طرح تڑپتی جمنا اور منیسا دکھائی دیں۔ جنہیں انہوں لا کر ٹھاکر کے سامنے زمین پر پھینک دیا۔ انہیں ٹھاکر کے سامنے پھینکنے کے بعد دونوں الٹے قدموں پلٹ گئے۔ ٹھاکر کا چہرہ غصے سے لال بھبھوکا ہوا جا رہا تھا۔

بڑی ٹھاکرانی اس بات سے بخوبی آگاہ ہو چکی تھی کہ ٹھاکر کے دل میں کیا بات ہے اور قبل اس کے کہ ٹھاکر اپنے من میں مچلتے خیال کو عملی جامہ پہنائے اسے بی النور ٹھاکر کے چنگل سے ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اپنی بیٹی کی جان بچانی تھی۔ ابھی اس نے پہلا قدم اٹھایا تھا کہ ٹھاکر کی بجلی کی مانند کڑکتی آواز اس کی قوت سماعت سے ٹکرائی۔ اس نے منشی کو مخاطب کیا تھا۔

''میرے سامنے آ ؤ منشی......'' ٹھاکر کی بات سن کر منشی کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔ لیکن اپنی تمام تر ہمت یکجا کرکے وہ ٹھاکر کے سامنے آیا۔ پھر ٹھاکر نے کھا جانے والی نظروں سے منیسا اور جمنا کو اشارہ کیا اور منشی کے ساتھ کھڑے ہونے کو کہا تو دونوں تھر تھر کانپتی منشی کے ساتھ کھڑی ہوگئیں۔

''ہم جدی پشتی ٹھاکر ہیں۔ ہمارے خوف اور رعب ودبدبے کے سامنے موت بھی نہیں ٹک پاتی۔ ہمارے عزت کی طرف دیکھنے کی کبھی کسی میں جسارت پیدا نہیں ہوئی اور تم (چاندنی کے ساتھ زمین پر

پڑے نیم عریاں لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے)۔تم نے ہماری عزت کی دھجیاں اڑائیں۔کیا تمہیں یہ خیال نہیں آیا کہ میں تیرا اور تیرے پریوار کا کیا حشر کروں گا۔۔۔۔۔؟'' ٹھاکر کی بات سن کر نوجوان کی گھگھی بندھ گئی۔اس نے رحم طلب نگاہوں سے بڑے ٹھاکر کی طرف دیکھا۔لیکن بڑے ٹھاکر کی نگاہوں میں اسے اپنے لیے موت کے پھیلتے سایوں کے علاوہ کچھ دکھائی نہ دیا۔

اتنی دیر میں بڑی ٹھاکرانی بھی وہاں پہنچ چکی تھی۔اس نے فوراً اپنی لڑکی کی طرف لپک کر اس کے نیم عریاں شریر کو ڈھانپا۔

''پیچھے ہٹ جاؤ ٹھاکرانی۔۔۔۔'' ٹھاکر نے غصے سے بھوکے شیر کی مانند دھاڑتے ہوئے ٹھاکرانی کو مخاطب کر کے کہا۔

''شما کیجیے مہاراج۔یہ آپ کی اکلوتی اور لاڈلی بیٹی ہے۔بھول تو ہر منش سے سرزد ہوسکتی ہے۔یہ بھی ایک بھول کر بیٹھی۔یہ تو انجان ہے اس لڑکے نے اسے پھسلا کر اپنے چنگل میں پھنسالیا ہوگا۔میں آپ سے اپنی بیٹی کی زندگی کی بھیک مانگتی ہوں شما کیجیے۔۔۔۔'' ٹھاکرانی نے آنسو بہاتے ہوئے کہا۔لیکن ٹھاکرانی کے بہتے آنسو ٹھاکر کے غصے کو کم نہ کرسکے۔

اپنی زبان کو لگام دو اور بکواس بند کرو۔کیا تمہیں نہیں معلوم کہ یہ کیا گل کھلا رہی ہے۔کس طرح ٹھاکروں کے پریوار کی پگڑی اچھالی ہے اس نے۔بے شک یہ ہماری بیٹی ہے لیکن اس کی سزا سوائے موت کے اور کوئی نہیں ہے اور اگر تم نے اس کی ذرا بھی حمایت کرنے کی سمت کی تو ابھی اور اسی وقت جس رشتے میں ہم دونوں منسلک ہیں اس سے بے دخل کر کے باہر نکال پھینکوں گا۔رہی بات اس نوجوان کی تو اس نے زندگی کی بہت بڑی بھول سرزد کی ہے اس کا انجام تو موت ہے ہی لیکن ہماری بیٹی نے تو رتی برابر ہماری عزت کی چنتا نہیں کی ہے اور تم ہو کہ اس کی زندگی کی بھیک مانگ رہی ہو۔۔۔۔'' ٹھاکر نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے کہا تو ٹھاکرانی کو چاروناچار منہ کو بند کرنا پڑا۔

وہ اس بات سے آشنا تھی کہ ٹھاکروں کی فیملی میں عزت کی خاطر تن من دھن کی قربانی دینے کے کئی واقعات اس کی آنکھوں کے سامنے رونما ہوئے تھے۔ٹھاکر پرتاب سنگھ بھی تو اسی پریوار کا ایک فرد تھا۔ابھی ان میں بحث وتکرار ہورہی تھی کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ کا پتر ٹھاکر مہندرناتھ بھی وہاں آن پہنچا۔اسے بھی ساری حقیقت سے آشنائی ہوچکی تھی۔وہ دبے قدموں اپنی ماں کے پہلو میں آکے کھڑا ہوگیا تھا۔اس کی آنکھوں سے خوف وہراس عیاں ہورہا تھا۔اس کی زندگی میں یہ پہلا واقعہ تھا۔آج تک اس نے صرف اپنے پتاجی اور ماتاجی کے علاوہ پرانے ملازمین سے اپنے بزرگوں کی بہادری کے قصے اور آبرو کی خاطر دی گئی قربانیوں کے قصے سنے تھے اور آج جو کچھ اس کی نگاہوں کے سامنے تھا۔اسے یہ سب کچھ دیکھ کر اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہورہا تھا۔

آج جو اس کی نگاہوں کے سامنے غم وغصے کا لبادہ اوڑھے ٹھاکر پرتاب سنگھ کھڑا تھا۔وہ کوئی اور تھا۔اور جو آج تک اس کی نگاہوں کے سامنے رہا تھا۔وہ کوئی اور تھا۔اس ٹھاکر اور اس ٹھاکر میں زمین آسمان کا فرق نمایاں تھا۔اس ٹھاکر کی نگاہوں میں اپنی اولاد کے لیے بے انتہا پیار اور محبت تھی جبکہ اس ٹھاکر کی شعلہ بار آنکھیں اپنی اولاد کے لیے نفرت کے جذبات عیاں کررہی تھیں۔اس کا دل بری طرح سے ہول رہا تھا۔اس کے اور پریتی کے مابین تو ایسے کوئی سمبندھ بھی نہیں تھے لیکن وہ جانتا تھا کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ اب کسی طور بھی ان کے اس رشتے کو قبول نہیں کرے گا۔تبھی اس کی قوت سماعت سے ٹھاکر پرتاب سنگھ کی بادل کی طرح گرجتی آواز سنائی دی۔

''ٹھاکروں کی عزت کی طرف کوئی میلی آنکھ سے بھی دیکھے تو ٹھاکر اس کی آنکھیں نوچ کر اپنے پالتو کتوں کو کھلا دیتے ہیں اور خبیث انسان تم نے ایسی غلطی کی ہے جس کا ازالہ موت کے سوا کچھ نہیں۔تمہاری موت ایک

مثالی موت ہوگی اور تمہارے ساتھ (اپنی بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے) اس خبیث لڑکی کی موت بھی عبرت ناک ہوگی۔ جو کبھی ہماری بیٹی ہوتی تھی لیکن اب ہم اس سے ہر طرح کا رشتہ ناطہ توڑ چکے ہیں۔ تم لوگوں کی موت میرے پالتو کتوں کے ہاتھوں لکھی ہے وہ تمہاری بوٹیاں نوچ نوچ کر کھائیں گے تو تمہیں احساس ہوگا کہ تم دونوں نے زندگی کی کتنی بڑی بھول سرزد کی ہے۔ لیکن معاملہ عزت کا ہے تم دونوں کی موت سے ٹھاکر پریوار کی عزت کو کوئی اور بھی اچھال سکتا ہے (منشی، اس کی بیٹی اور جمنا کی طرف دیکھتے ہوئے) اس لیے اس راز کو یہیں دفن کرنے کے لیے تم سب کی موت ضروری ہے۔۔۔'' ٹھاکر نے فیصلہ کن لہجے میں کہا تو منشی فوراً سے بھی پیشتر اس کے قدموں میں آن گرا۔

''شما کیجیے مہاراج۔ ہم تو آپ کے جدی پشتی غلام ہیں۔ بھلا ہماری وجہ سے آپ کی عزت کیوں خراب ہوگی۔ ہم کیوں آپ کی عزت کا ڈھنڈورا پیٹیں گے۔ ٹھاکر صاحب ہماری خدمت گیری پر آپ کو بھی کوئی شک نہیں ہوگا ہم پر رحم کیجیے بھگوان کے لیے ہم پر رحم کیجیے مہاراج۔''

منشی کے دھواں دھار رونے دھونے کا ٹھاکر پر بھلا کہاں اثر ہونے والا تھا۔ جس شخص کے قلب کو اس کی اہلیہ کے بہتے آنسو نہ پگھلا سکے اس شخص کے پتھر قلب کو ایک نیچ انسان کے اتھرو بھلا کیسے پگھلا سکتے تھے۔ ٹھاکر نے پاؤں کو زور سے جھٹکا دیا تو پاؤں کے ساتھ دیمک کی طرح چمٹا منشی پیچھے جا گرا۔ منشی کے ساتھ ساتھ جمنا اور منیسا کی آنکھیں بھی اشکبار ہو چکی تھیں۔ انہیں بھی اپنی ایک اذیت ناک موت دکھائی دے رہی تھی۔ دوسری طرف چاندنی اور اس کے عاشق نے ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا تھا۔

بڑی ٹھاکرانی نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ اپنی بیٹی کے ہاتھ سے ایک جھٹکے سے چھڑا دیا۔ لیکن اب کی بار اس کی بیٹی نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ یہ ٹھاکر پریوار کے لیے اور بھی ڈوب مرنے کا مقام تھا۔ ابھی تک ان کی اس حرکت کو ٹھاکر پرتاب سنگھ نے نہیں دیکھا تھا۔ دیکھ لیتا تو امید تھی تلوار سے دو ٹکڑوں میں منقسم کر کے رکھ دیتا۔ ٹھاکرانی چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اپنے عاشق کا ہاتھ چھوڑ کر اپنے پتا جی کے قدموں میں گر کر اپنی زندگی کی بھیک مانگ لے تو امید تھی کہ ٹھاکر پرتاب سنگھ اسے معاف کر دیتا۔ لیکن اس کی حرکتیں منہ مانگی موت والی تھیں۔

''اس جنم میں تو آپ ہمیں اذیت ناک موت دے کے ابدی نیند سلا دیں گے پتا جی لیکن کس کس جنم میں آپ ہمارے ساتھ یہ زیادتی کریں گے۔ اس جنم میں نہ سہی اگلے جنم میں تو ہم اکٹھے ہو جائیں گے۔ یاد رکھنا پتا جی پیار کی جنگ میں ذات، نسل اور یہ اونچ نیچ کوئی معنی نہیں رکھتی۔ آپ جیسے لوگوں کے سینوں میں دل ہو تو پیار کی چاشنی سے آشنائی حاصل ہو۔ آپ لوگوں کے سینوں میں تو دل نہیں پتھر کے ٹکڑے بھگوان نے رکھ دیئے ہیں تبھی تو آپ کو پیار کی قدر و قیمت کا نہیں پتا۔ اس جنم میں نہ سہی مر کر تو ہماری آتمائیں اکٹھی ہوں گی۔۔۔۔'' یہ آواز چاندنی کی تھی جس نے ٹھاکر پرتاب سنگھ سمیت وہاں پر موجود ہر کس و ناکس کو حیران و ششدر کر کے رکھ دیا تھا۔

حالانکہ حقیقت یہ تھی کہ خود ٹھاکر اپنے فیصلے پر دل ہی دل میں افسوس کر رہا تھا۔ اور وہ وقت دور نہیں تھا جب وہ اپنی بیٹی خطا کو معاف کر کے باقی سب کو ابدی نیند سلا دیتا لیکن اس کی بیٹی نے جلتی پر تیل چھڑکنے والی بات کی تھی۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ کے زخموں پر نمک چھڑک دیا تھا۔ ٹھاکر پرتاب سنگھ نے کھا جانے والی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

''میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ تم اپنی اولاد کی ایسی گندی پرورش و نگہداشت کرو گی۔۔۔۔'' ٹھاکر پرتاب سنگھ غصے سے بڑی ٹھاکرانی کے پاس سے گزرتے ہوئے بولا۔

ٹھاکر کا اشارہ پا کر اس کے کارندوں نے بڑی ٹھاکرانی اور چھوٹے ٹھاکر کو وہاں سے واپس لوٹنے پر مجبور کر دیا۔ بڑی ٹھاکرانی اور چھوٹا ٹھاکر بار بار مڑ مڑ کر پیچھے دیکھ رہے تھے۔ جبکہ چاندنی کی پشت ان کی طرف

تھی اور اس نے ایک بار بھی ان کی طرف مڑ کر نہیں دیکھا۔ باغیچے کا دروازہ پار کرنے کے ساتھ ہی بڑی ٹھاکرانی اور چھوٹا ٹھاکر تقریباً بھاگتے ہوئے اوپر والے کمرے میں گئے جہاں سے باغیچے کا سارا منظر واضح دکھائی دیتا تھا۔ وہ دیکھنا چاہتا تھا کہ ٹھاکر آیا حقیقت میں اپنی اولاد کو ایک بھیانک موت دے گا یا اولاد کی محبت میں آکر اسے معاف کردے گا۔ لیکن جلد ہی ان کی آنکھوں کو ایک بھیانک منظر دیکھنے کو ملا۔

باغیچے میں روشنی دن کا سا پیدا کر رہی تھی۔ اس روشنی میں انہوں نے دیکھا کہ حویلی کے دروازے سے اچانک ہی تین کتے باغیچے میں داخل ہوئے۔ کتوں کے قد اور جسامت اس بات کا اعلان کر رہی تھیں کہ باغیچے میں موجود لوگ ان کتوں سے نبرد آزما ہونے کی سکت اپنے اندر نہیں رکھتے۔ وہ کتے خاصے طاقتور دکھائی دے رہے تھے۔ چاندنی اور اس لونڈے کی پشت ابھی تک باغیچے کے دروازے کی طرف تھی۔ جبکہ منشی اس کی بیٹی اور بمنا کی آنکھیں باغیچے کے دروازے سے اندر آتے کتوں پر جمی ہوئی تھیں۔

آناً فاناً ہی افراتفری کا سا ماحول پیدا ہوگیا۔ منشی اس کی بیٹی اور بمنا نے باغیچے میں اپنی جان بچانے کے لیے ادھر ادھر دوڑنا شروع کردیا جبکہ چاندنی اور اس لونڈے نے پہلی بار مڑ کر دیکھا۔ کتے سرعت سے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ بڑی ٹھاکرانی اور چھوٹے ٹھاکر کو پہلی بار ان دونوں کی آنکھوں میں بھی موت کے خوف کی پرچھائیاں دکھائی دیں لیکن وہ اپنی جگہ سے ہلے نہیں۔ شاید موت کے لیے انہوں نے خود کو تیار کرلیا تھا۔ اس کے بعد نہایت ہی بھیانک منظر ماں بیٹے کی نظروں نے دیکھا۔ دونوں نے فوراً سے بھی پیشتر اپنی نگاہوں کو گھمالیا کیونکہ وہ اس منظر کو دیکھنے کی تاب نہ لاسکے تھے۔

☆......☆......☆

''کیا تم واقعی ٹھیک کہہ رہے ہو......؟'' پریتی نے خوفزدہ نگاہوں سے چھوٹے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''اگر ایسی بات ہے تو تم جانتے ہی ہو کہ ہمارا انجام کتنا بھیانک ہوگا۔ بڑے ٹھاکر کے غیظ وغضب سے بھلا ہم کیسے بچ سکتے ہیں۔ آپ بھگوان کے لیے ہمیں چھوڑ دیجئے وگرنہ ہمارے ساتھ ساتھ بڑے ٹھاکر آپ کو بھی تہس نہس کرکے رکھ دیں گے۔ ہمیں اپنی جان کی تو کوئی چنتا نہیں ہے لیکن آپ کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔''

پریتی کی بات میں حقیقت تھی لیکن چھوٹے ٹھاکر کے بس میں نہ تھا کہ وہ پریتی کو اپنی زندگی سے دخل انداز کرسکے۔ وہ اب اتنا دور پہنچ چکے تھے کہ واپسی کے تمام تر راستے مفقود ہو چکے تھے۔ اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ اب اس مسئلے کا کوئی نہ کوئی تو اپائے نکالنا ہی تھا وگرنہ ٹھاکر پرتاپ سنگھ کا غیظ وغضب اس کے ساتھ ساتھ پریتی کو بھی لے ڈوبے گا اور یہی وہ چاہتا نہیں تھا۔ تبھی اس کے ذہن میں ایک نہایت ہی جاندار منصوبہ بن گیا اس نے فیصلہ کن نگاہوں سے پریتی کی طرف دیکھا۔ پریتی کو اس کے دیکھنے کا انداز کچھ عجیب سا لگا۔

''کیا ہوا تم ایسے کیوں گھور گھور کے مجھے دیکھ رہے ہو......؟'' بالآخر پریتی نے پوچھ ہی لیا۔

''میں نے اس مسئلے کا اپائے تلاش کرلیا ہے پریتی لیکن تمہیں میرا ساتھ دینا ہوگا......'' چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں تھامتے ہوئے کہا۔

''میں کچھ سمجھی نہیں......؟'' پریتی نے بدستور تعجب سے پوچھا۔

''ہمیں یہاں سے کہیں دور نکل جانا ہوگا۔ یہی اس مسئلے کا بہتر اپائے ہے وگرنہ یہاں ہماری زندگیاں خطرے سے خالی نہیں ہوں گی......'' چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کے چہرے پر نگاہیں ٹکاتے ہوئے کہا۔

شاید وہ پریتی کے چہرے کے تاثرات جاننا چاہتا تھا۔ اس کی بات کے مکمل ہوتے ہی پریتی کے چہرے کا رنگ یکسر بدل گیا تھا۔ اس کے بشرے کا رنگ ہلدی مائل ہوگیا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے ابھی اس کا ہارٹ فیل ہوجائے گا اور وہ ان پہاڑوں سے نیچے

گہری کھائی میں لڑھک جائے گی۔ اس وقت دونوں گاؤں کے باہر پہاڑوں کی اوٹ میں جہاں شروع سے ہی دونوں کی ملاقاتیں ہوتی چلی آئی تھیں براجمان تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے حیرت ویاس سے اس کے بشرے کے بدلتے رنگوں کو دیکھا۔ وہ سمجھ گیا تھا کہ پریتی اس کا ساتھ دینے کے لیے قطعاً تیار نہ تھی۔

''لگتا ہے تم میرا ساتھ دینے کے لیے قطعاً تیار نہیں ہو، اگر ایسی ویسی کوئی بات ہے تو بلاجھجک تم کہہ ڈالو۔''

چھوٹے ٹھاکر کا لہجہ مایوسانہ تھا۔ پریتی نے ایک نگاہ اسے دیکھا۔ وہ جانتی تھی کہ چھوٹا ٹھاکر اس وقت جذبات کے گھوڑے کی لگام تھامے ہوئے ہے۔ لیکن جذبات کا لبادہ جب اتر جاتا ہے تو انسان کو اپنے کیے پر بہت افسوس ہوتا ہے اور وہ اس کیفیت سے دوچار ہونا نہیں چاہتی تھی۔ ویسے بھی وہ جانتی تھی کہ وہ دنیا میں جہاں کہیں بھی روپوش ہوجائیں بڑے ٹھاکر انہیں بالآخر ڈھونڈ ہی نکالیں گے۔ یہ اس مسئلے کا بالکل بہتر اپائے نہ تھا۔ بلکہ یہ بڑے ٹھاکر کے غیض وغضب کو للکارنے والی بات تھی۔ اس کے پتا جی اور ماتا جی بڑے ٹھاکر کے احسانوں تلے دبے ہوئے تھے اور اگر وہ چاندنی کی طرح کوئی بھول سرزد کرتی تو بڑے ٹھاکر نے اس لونڈے، جمنا اور منشی کے پریوار کی طرح اس کے پریوار کو بھی نیست ونابود کر کے رکھ دینا تھا۔

''ایسی بات نہیں ہے لیکن تم اس بات سے بخوبی آشنا ہو کہ۔۔۔'' قبل اس کے کہ پریتی اپنا جملہ مکمل کرتی ان کے عقب سے ایک گرجدار آواز سنائی دی۔

''او غافل کیا تجھے تیری بہن کا انجام یاد نہیں رہا۔''

یہ آواز بڑے ٹھاکر کی تھی جسے سنتے ہی دونوں نے فوراً سے بھی پیشتر مڑ کر دیکھا۔ اور اپنی پشت پیچھے بڑے ٹھاکر کو دیکھ کر دونوں اپنی جگہ سے بجلی کی سی سرعت سے کھڑے ہوگئے تھے۔ دونوں کے قدموں تلے سے زمین سرک گئی تھی۔ دونوں کو اپنے حواس باختہ ہوتے ہوئے محسوس ہو رہے تھے۔ ان کی رحم طلب نگاہیں بڑے ٹھاکر پر ٹکی ہوئی تھیں۔

''تمہاری جرأت کیسے ہوئی کہ تم اس غلطی کو دہرانے کی کوشش کرو جس کی وجہ سے تمہاری بہن کو اپنی زندگی سے ہاتھ دھونے پڑ گئے۔ تم جانتے ہو اس غلطی کا انجام کیا ہوگا۔ اور چھوکری تو بتا (پریتی کی طرف کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے) کیا تجھے اپنی زندگی پیاری نہیں تھی کہ تو نے ٹھاکر پریوار میں سمونے کا خیال ہی کیسے اپنے ذہن میں پیدا کرلیا۔ مجھے تم دونوں پر کئی دنوں سے شک تھا۔ اب تم دونوں کو بھی موت سے ہمکنار ہونا پڑے گا۔''

''پتا جی مم۔۔۔ میری۔۔۔'' چھوٹے ٹھاکر نے کچھ کہنا چاہا لیکن اس کے کچھ بولنے سے قبل ہی ایک بجلی کی سی سرعت سے آتے تیر نے پریتی کے عین دل کے مقام پر چھید کر ڈالا۔ دوسرے ہی لمحے پریتی چھوٹے ٹھاکر کے قدموں میں گری اور گرنے کے ساتھ ہی ٹھنڈی پڑ گئی۔

چھوٹے ٹھاکر کو اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہو رہا تھا کہ یہ سب کچھ حقیقت ہے۔ اس نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ یوں پل بھر میں اتنا بڑا المیہ بھی پیش آسکتا ہے۔ لیکن یہ حقیقت تھی۔

''اس چھوکری کی چتا کو اسی جگہ آگ لگا دو۔ اور اسے (چھوٹے ٹھاکر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے) زنجیروں میں جکڑ کر لے آؤ۔۔۔'' بڑے ٹھاکر نے تحکمانہ لہجے میں کہا اور واپس جانے کے لیے مڑا۔

چھوٹے ٹھاکر کے لیے یہ ایک امتحان کا وقت تھا۔ اسے کچھ بھائی نہ دے رہا تھا۔ بڑے ٹھاکر کے کارندے اس کی طرف بڑھے۔ لیکن قبل اس کے کہ وہ قریب آتے۔ ایک پل میں چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کے دل سے تیر نکال کر پیچھے گہری کھائیوں کی نذر کیا اور دوسرے ہی لمحے ایک نہایت ہی ناقابل فراموش منظر سب کی آنکھوں نے دیکھا۔ چھوٹے ٹھاکر نے پریتی کے شریر کو بانہوں میں بھرا اور دوسرے ہی لمحے چھوٹے ٹھاکر نے خود کو گہری کھائی کی نذر کر دیا۔

''بڑے ٹھاکر.....'' ایک کارندے نے دونوں لفظوں کو چنداں کھینچ کرادا کرتے ہوئے بڑے ٹھاکر کو مخاطب کیا تو بڑے ٹھاکر کواس کی اس حرکت پر بہت غصہ آیا۔

بڑے ٹھاکر نے گھوم کراس کی طرف دیکھا تو انگشت بدنداں رہ گیا کیونکہ وہاں صرف اس کے تینوں کارندے کھڑے تھے لیکن چھوٹے ٹھاکراوراس کے قدموں میں پڑی مردہ پریتی کا کوئی اتہ پتہ نہ تھا۔ایک کارندہ جس نے بڑے ٹھاکر کو پکارا تھا خوف وحیرت کے ملے جلے تاثرات سے بڑے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے ہاتھ کا اشارہ کھائی کی طرف کررہا تھا۔بڑے ٹھاکر کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔وہ کسی طور بھی اپنے پتر کوسزانہیں دینا چاہتا تھا۔کیونکہ اسے پہلے ہی اپنی بیٹی کوموت کے گھاٹ اتارنے کاغم اندرہی اندردیمک کی طرح چاٹ رہا تھا۔لیکن اب تووہ تہی دست ہو چکا تھا۔وہ اپنی پتنی کو کیا منہ دکھائے گا اب اس کے پاس سوچنے سمجھنے کے لیے کچھ بھی نہ بچا تھا۔؟

''بڑے ٹھاکر،چھوٹے ٹھاکر نے خود کواس گہری.....''ایک کارندے نے بولنا چاہا لیکن بڑے ٹھاکر نے ہاتھ کے اشارے سے اسے چپ کرادیا۔اور اپنی کیفیت پر قابو پانے کی خاطر ایک پتھر کا سہارا لے کر نیچے براجمان ہوگیا۔اسے کچھ بجھائی نہ دے رہا تھا۔اس کی دنیالٹ چکی تھی۔اس کے پاس کچھ بھی نہ بچا تھا۔اس نے اپنے ہی ہاتھوں اپناسب کچھ داؤ پر لگا دیا تھا۔اس کا دل کررہا تھا کہ چیخ چیخ کرسارے عالم کو کہے کہ وہ اپنی اولاد کا قاتل ہے۔اسے اپنے آپ سے بھی گھن آرہی تھی۔اس کا من چاہ رہا تھا کہ اپنی ہی تلوار سے اپنے ٹکڑے کرڈالے۔اس کی آنکھیں نم آلود ہوگئی تھیں۔اس کے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب ہوگئی تھیں۔اس کی آنکھوں کے سامنے دن دیہاڑے تارے ناچ رہے تھے۔

☆......☆......☆

چھوٹے ٹھاکر کے سامنے آج پھراس کی محبوبہ کا شریر پڑا تھا۔اس کی پوجا پاٹ مکمل ہو چکی تھی۔اوراس کی محبوبہ کے شریر میں جنبش پیدا ہورہی تھی۔اس کی آتما واپس اس کے شریر میں لوٹ آئی تھی۔اس کے لبوں پرابتسام کی لہردوڑ گئی تھی۔اس نے اپنے بازو پھیلا دیئے اوردوسرے ہی لمحے اس کی محبوبہ اس کے بازوؤں میں پنڈولیم کی طرح جھوم رہی تھی۔

''پریتی تمہیں ایک نئی زندگی مبارک ہو.....'' اس نے اپنی محبوبہ کوخود سے جدا کرتے ہوئے کہا۔

''میں دن بدن تمہارے احسانوں کے بوجھ تلے دبتی جارہی ہوں مہندر،اب تو مجھے بھی امر کردو پلیز.....'' پریتی نے نم آلود لہجے میں چھوٹے ٹھاکر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے۔اب موت تمہارے پاس آنے سے بھی خوف کھائے گی۔آج رات میں تمہیں امر کردوں گا پھرمیری طرح تمہیں بھی دنیا کی کوئی طاقت ایذا نہیں پہنچا سکے گی.....'' چھوٹے ٹھاکر نے اسے دوبارہ اپنی بانہوں میں بھرتے ہوئے کہا۔

''اس خام خیالی کو ذہن سے نکال پھینکو مہندر،اس کے ساتھ ساتھ آج تمہاری زندگی کی بھی آخری رات آگئی ہے۔تم نے لوگوں پرظلم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔اب ایشور کا قہر تمہاری موت کی صورت میں تم پر نازل ہونے والا ہے.....'' تہہ خانے کی خاموش فضا میں ایک انجانی آواز ان دونوں کی قوت سماعت سے ٹکرائی۔

دونوں نے فضا میں ادھرادھر نگاہیں دوڑائیں۔خاص کر چھوٹے ٹھاکر کو اپنی قوت سماعت پر وشواس نہیں ہورہا تھا کیونکہ تہہ خانے کی خاموش فضا میں گونجنے والی بازگشت کسی اور کی نہیں چاندنی کی تھی۔دوسرے ہی لمحے تہہ خانے کے ایک کونے میں چاندنی اوراس نوجوان کے وجود حاضر ہوگئے۔جسے ٹھاکر پرتاب سنگھ نے اپنی بیٹی کے ساتھ ساتھ ابدی نیند سلا دیا تھا۔

''تم شاید میری شکتیوں سے آشنا نہیں ہو چاندنی۔میں وہ مہندر ناتھ نہیں رہا جو پہلے تھا میں کالی شکتیوں

کا مہار لجہ بن گیا ہوں۔۔۔۔‘‘ چھوٹے ٹھاکر نے قہر آلود نگاہوں سے اپنی بہن کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’کالی شکتیوں کا کوئی وجود نہیں ہوتا مہندر۔ شیطان خود سب سے بڑا دھوکہ ہے جو انسان کو دھوکے سے اپنا اسیر بنا لیتا ہے۔ اور پھر اپنے راہ پر چلنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ اور پھر جلد ہی نرک اس کا مقدر بن جاتا ہے۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ تم امر ہو چکے ہو تو آج تمہاری یہ خام خیالی بھی ختم کیے دیتی ہوں۔ پہلے تمہیں یہ بتا دوں کہ پتا جی کے قہر کا نشانہ بننے کے بعد ہماری آتماؤں نے ہمارے شریروں کو خیر آباد کہہ ڈالا۔ ہماری آتماؤں کا شریر سے نکلنا تھا کہ ہمیں احساس ہوا کہ ہم دنیا میں بھی غلط راستے پر چلتے رہے ہیں۔ اصل راستہ ایشور کے پرارتھنا اور منش کی خدمت کے راستے پر چلنا ہے۔ لیکن اپنی من مانی کرتے رہے ہم نے دوسروں کا خیال نہ کیا۔

وہ ایک مہان پرش تھا جس نے ہم دونوں کی آتماؤں کو دنیا میں واپس بلایا۔ اس کے پاس ایشور کی شکتیاں تھیں جس کے بل بوتے پر اس نے ہماری آتماؤں کو اپنے وش میں کر لیا۔ پھر اس نے ہمیں بتایا کہ نرک کے عذاب سے ایک ہی صورت میں چھٹکارا مل سکتا ہے جب ہم کوئی ایسا شبھ کام کر جائیں جس کے عوض ہماری بخشش کا سامان ہو جائے۔ ہم فوراً مہان پرش کے قدموں میں گر گئے اور فریاد کی کہ ہمیں نرک کے عذاب سے نجات دلا دیں۔ تو اس نے ہمارے ذمے ایک کام یہ لگایا کہ اگر ہم دونوں تمہیں تمہاری شکتیوں سمیت نیست و نابود کر دیں تو ہماری بخشش کا سامان ہو سکتا ہے۔‘‘

چھوٹے ٹھاکر کو اپنی قوت سماعت پر وشواس نہ ہو رہا تھا کہ اس کی بہن ایسی باتیں کرے گی۔ جن لوگوں کو وہ سدا غلط سمجھتا آیا ہے اس کی بہن انہیں صحیح کہہ رہی تھی اس کا من چاہ رہا تھا کہ فوراً سے بھی پیشتر تہس نہس کر کے رکھ دے۔ پہلے تو اس کا من چاہا کہ ابھی اس کو نرک میں ڈال پھینکے لیکن پھر اس نے اپنے آپ پر ضبط کرتے ہوئے کہا۔

’’تم شاید جانتی نہیں ہو کہ تم کس کے مدمقابل ہو لیکن میں پھر بھی تمہیں اپنی بہن ہونے کے ناطے ایک بار پھر تمہاری بھول کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کہتا ہوں کہ فوراً میرے قدموں میں گر جاؤ۔‘‘

’’کسی بھی خوش فہمی میں نہ رہو سفاک انسان تم اس دنیا کے لیے عذاب بن چکے ہو۔ تم نے نجانے کتنے ہی بے گناہوں کو ابدی نیند سلا دیا ہے۔ اس لیے تمہاری موت اب لازمی ہے۔۔۔۔‘‘ یہ آواز اس نوجوان کی تھی جس کی وجہ سے اس کی بہن کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑ گئے تھے۔

’’بکواس بند کرو خبیث انسان اب دیکھو میں تم دونوں کو کیسی موت مارتا ہوں تم دونوں نے سارا مزہ خراب کر کے رکھ دیا ہے۔۔۔۔‘‘ چھوٹے ٹھاکر نے غیض و غضب سے بھڑکتے ہوئے کہا۔

پھر اس نے منہ ہی منہ میں بڑبڑانا شروع کر دیا۔ دوسرے ہی لمحے اس نے ان دونوں کی طرف پھونک ماری تو دونوں کے گرد آگ کا ایک کنڈل قائم ہو گیا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے یہ آگ پلک جھپکتے میں ان دونوں کو جلا کر بھسم کر ڈالے گی۔ لیکن ان دونوں کے چہروں پر کسی بھی قسم کے کوئی آثار عیاں نہیں ہو رہے تھے۔ چھوٹے ٹھاکر نے ان دونوں کو بے فکر دیکھ کر حیرت سے ان دونوں کی طرف دیکھا۔ اور اگلا پل اسے مزید حیرت کے سمندر میں غوطہ زن کرنے والا تھا جب آگ کا حصار یکدم ختم ہو گیا۔

’’پتا جی نے ہم دونوں کو اپنے غیض و غضب کا نشانہ بنایا تھا لیکن مر کر بھی میں نے کبھی ان کے بارے میں اپنے دل میں کدورت نہ پیدا ہونے دی تھی اور تم نے ۔۔۔ ظالم انسان تم نے تو وہ قدم اٹھایا جس کا کوئی ازالہ ہی ممکن نہیں ہے۔۔۔۔‘‘ چاندنی نے غم و غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

’’اب دیکھو تمہاری اس محبوبہ کا میں کیا حال کرتی ہوں۔‘‘

چاندنی نے اتنا کہا اور دوسرے ہی لمحے تہہ خانہ

پریتی کی سماعت شکن چیخوں سے گونج اٹھا۔ چھوٹے ٹھاکر کے قدموں تلے زمین سرک گئی۔ اسے اپنی قوت بینائی پر وشواس نہیں ہو پارہا تھا کہ اس کی طاقتیں ان دونوں کے سامنے ماند پڑ جائیں گے۔ اس نے غصے سے پیچ وتاب کھاتے ہوئے چاندنی اور اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ جبکہ دوسری طرف پریتی کا شریر جل کر بھسم ہو چکا تھا۔ اس کی آتما چھوٹے ٹھاکر کے سنبھلنے سے پہلے نرک کی نذر ہو چکی تھی۔ نرک سے واپس لوٹانا تو اب چھوٹے ٹھاکر کے بس کا بھی کھیل نہ رہا تھا۔

”یہ تم نے کیا کیا میری پریتی کو۔۔۔ میری پریتی کو مجھ سے ہمیشہ کے لیے دور کردیا۔۔۔“ چھوٹے ٹھاکر نے غم وغصے سے تلملاتے ہوئے چاندنی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تم دونوں کو نیست ونابود کر کے رکھ دوں گا تم دونوں کی آتماؤں کو ہمیشہ کے لیے اپنا بندی بنائے ایسی سزائیں دوں گا کہ تمہاری آتمائیں ہمیشہ میرے نام سے بھی کانپتی رہیں گی۔“

چھوٹے ٹھاکر کا غصہ آسمان کی وسعتوں کو چھو رہا تھا۔ اس نے منہ ہی منہ میں تیزی سے دونوں کی طرف کھا جانے والی نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بڑبڑانا شروع کردیا۔ لیکن ان دونوں کے چہروں پر مکمل اطمینان تھا۔ کسی بھی قسم کے کوئی تاثرات عیاں نہ تھے۔ چھوٹا ٹھاکر دل ہی دل میں ان کے چہرے پہ اطمینان کو دیکھ کر خوفزدہ بھی تھا لیکن اسے اپنی شکتیوں پر مکمل وشواس بھی تھا کہ اس نے ہمیشہ شیطان دیوتا کی پوجا کی ہے تو اس کے عوض شیطان دیوتا نے نہ صرف اسے امر کردیا تھا بلکہ ایسی شکتیوں سے بھی نوازا تھا جن کی بدولت وہ بڑے سے بڑے مہان کو تاکوں چنے چبوا سکتا تھا۔

تھوڑی دیر وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑاتا رہا اور پھر دوسرے ہی لمحے اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں کو آپس میں بغل گیر کیا۔ پھر ہاتھ کو زور سے جھٹکا تو اس کے ہاتھوں سے آگ کی چنگاریاں بڑی تعداد میں نکلنے لگیں۔ ان کی تپش سے چھوٹے ٹھاکر کی پیشانی عرق آلود ہوگئی لیکن چاندنی اور وہ نوجوان مکمل طور پر اطمینان سے کھڑے اس کی حرکات وسکنات کو دیکھ رہے تھے۔ آگ کی چنگاریاں سرعت سے ان دونوں کی طرف لپکنے لگیں۔ چھوٹے ٹھاکر کے چہرے پر خوشی کے تاثرات نمایاں ہونے لگے تھے۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ یہ اس کا ایک ایسا کاری وار تھا کہ جو پل بھر میں ان دونوں کی آتماؤں کو اپنی گرفت میں لے لے گا اور پھر دونوں اس کے سامنے گڑگڑائیں گے اور منت سماجتیں کریں گے تو وہ اس شرط پر انہیں اس آگ سے چھٹکارا دے گا کہ اگر وہ دونوں اس کی غلامی کو قبول کرلیں گے۔

لیکن یہ اس کی خوش فہمی ثابت ہوئی کیونکہ وہ آگ یکبارگی رک گئی اور اگلا منظر نہایت ہی بھیانک تھا۔ ان دونوں کی طرف لپکتی آگ ایک دم واپس پلٹی اور بجلی کی سی سرعت سے اس کی طرف لپکی تو اس کے ہاتھوں کے چھکے چھوٹ گئے۔ اس نے فوراً ہی دوسرا منتر پڑھ کر اس آگ کو بجھایا۔

”تمہاری موت آج یقینی ہے مہندر تم جتنے بھی جتن کرلو آج تم ہمارے ہاتھوں موت کے گھاٹ ضرور اترو گے۔ ہم بھی تو دیکھتے ہیں کہ تمہارے اس شیطان دیوتا، جس نے تمہیں امر کیا ہے وہ آج تمہیں کیسے بچاتا ہے۔ ہم تمہیں اسی تہہ خانے میں قید کرکے تمہیں ہمیشہ کے لیے یہیں دفن کرجائیں گے۔ تم جیسے ناسور کے لیے یہی جگہ دفن کے لیے بہتر ہے۔ تم جیسا ظالم، جس نے اپنے ہی والدین کو اپنی شیطانی طاقتوں کی نذر کردیا اس کا اس دنیا میں رہنا مناسب نہیں۔ ایک بہن کبھی بھی اپنے بھائی کو موت کی نیند نہیں سلاتی لیکن تم جیسے شیطان کے پجاری کا ٹھکانہ دنیا نہیں جہنم کی دہکتی آگ ہے۔ اب اپنی آنکھوں سے دیکھو کہ ہم تمہارے اس شیطان دیوتا کا کیا حال کرتے ہیں۔ اسے کہو کہ اگر اس میں اپنے بچاؤ کی شکتی ہے تو خود کو بچالے۔۔۔۔۔۔“ چاندنی نے چھوٹے ٹھاکر کو للکارتے ہوئے کہا۔

چھوٹے ٹھاکر کے قدموں تلے زمین سرک گئی تھی۔ اس نے انگشت بدنداں آنکھوں سے چاندنی کی

طرف دیکھا اور پھر پرامید نگاہوں سے شیطان دیوتا کے بت کی طرف دیکھا۔ جیسے اسے امید ہو کہ وہ نہ صرف اپنی بلکہ اس کی بھی رکشا کرے گا۔ اور یہی نہیں ان دونوں کو بھی ابدی نیند سلا دیں گے۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا اس نے ایک نہایت ہی عجیب منظر دیکھا۔ تہہ خانے کی چھت میں اچانک ہی ایک بہت بڑا شگاف ہوگیا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس شگاف میں سے دودھیا رنگ کی روشنی اندر داخل ہونے لگی۔

روشنی کے اندر داخل ہونے کی دیر تھی کہ اچانک تہہ خانہ چیخوں سے گونج اٹھا۔ چیخنے والے دکھائی نہیں دے رہے تھے لیکن تہہ خانہ مکمل طور پر ماتم کدہ بن چکا تھا۔ یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی نہایت ہی کرب واذیت کی کیفیت میں مبتلا ہوکر واویلا کررہا ہو۔ چیخنے والی ایک نہیں کئی آوازیں تھیں۔ مردوں، عورتوں اور بچوں تک کی آوازیں شامل تھیں۔ چھوٹا ٹھاکر حیرت دیاس سے اپنے چہار سو نگاہیں دوڑا رہا تھا۔

''بہت خوب۔''

اچانک اس کی قوت سماعت سے چاندنی اور اس نوجوان کی اکٹھی آواز سنائی دی۔ اس نے اس طرف دیکھا جہاں چاندنی اور نوجوان کھڑے تھے لیکن یہ دیکھ کر دہ گنگ رہ گیا کہ وہ دونوں وہاں نہ تھے۔ دوسرے ہی لمحے اس کی قوت سماعت سے ایسی آواز ٹکرائی جیسے کوئی ہتھوڑے سے کوئی چیز توڑ رہا ہو۔ اس نے فوراً سے بھی پیشتر آواز کی سمت نگاہیں دوڑائیں تو اگلا منظر دیکھ کر وہ حیران وششدر رہ گیا۔ چاندنی شیطان دیوتا کے دیوقامت بتوں کو توڑنے پر لگے ہوئے تھے۔

''نہیں۔۔۔۔ بھگوان کے لیے رک جاؤ۔۔۔۔ ایسا نہ کرو۔۔۔ تم جو کہو گے میں کرنے کے لیے تیار ہوں۔۔۔۔'' بھگوان کے لیے رک جاؤ۔۔۔۔ اس نے زور زور سے چیختے ہوئے کہا۔ لیکن اس کی چیخوں کی آواز بھلا ان تک کیسے پہنچتی پورا تہہ خانہ پہلے ہی چیخوں سے گونج رہا تھا۔

اس کی نگاہوں کے سامنے شیطان دیوتا کا بت زمین پر آگرا۔ اس کے ساتھ ہی جیسے پورے تہہ خانے میں زلزلہ آگیا ہو۔ اس نے دیکھا کہ اس دودھیا روشنی کے ساتھ ہی چاندنی اور اس نوجوان کا شریر چھت میں بنے شگاف میں سے رفو چکر ہوگئے۔ تہہ خانہ مکمل طور پر بند ہو چکا تھا۔ اس کے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ اسے اپنی موت یقینی دکھائی دے رہی تھی۔ اس نے کبھی تصور میں بھی نہ سوچا تھا کہ واقعی کبھی اسے موت بھی آن گھیرے گی۔ وہ خود کو ہمیشگی امر سمجھتا آیا تھا لیکن جو اپنی حفاظت نہیں کرسکے تھے انہوں نے اس کی حفاظت خاک کرنی تھی۔

☆......☆......☆

چاندنی اور اس نوجوان کا شریر جیسے ہی اس تہہ خانے سے باہر نکلا۔ ان کے سامنے بڑے ٹھاکر اور بڑی ٹھاکرائن کی آتمائیں آگئیں۔ شاید وہ دونوں ان کے ہی انتظار میں تھیں۔ بڑے ٹھاکر اور بڑی ٹھاکرائن کی نظروں میں شرمندگی کے تاثرات عیاں تھے۔

''ہم واقعی غلط تھے لیکن جو طریقہ تم دونوں کے پیار کا تھا وہ بھی تو غلط تھا۔ آج ہم تم سے بہت خوش ہیں کیونکہ تم دونوں نے وہ کارنامہ سرانجام دیا ہے جس کی وجہ سے ایشور تم دونوں کے لیے سورگ میں مقام دے گا۔ اب چلو ہمارا یہاں سے جانے کا وقت آگیا ہے۔۔۔۔'' یہ آواز بڑے ٹھاکر کی تھی۔

دور آسمان کی وسعتوں پر ایک چھوٹی سی بدلی چھائی ہوئی تھی۔ جس سے دودھیا روشنی نکل کر ان کے شریروں تک آن پہنچی تھی۔ ان کے شریر یکبارگی اوپر اٹھنے لگے۔ چاندنی اور اس نوجوان نے آخری بار زمین کی طرف دیکھا۔ تہہ خانہ زمین بوس ہو چکا تھا۔ ہر طرف گرد وغبار اور دھند چھائی ہوئی تھی۔ چھوٹا ٹھاکر اپنے انجام کو پہنچ چکا تھا۔ وہ واصل نرک ہو چکا تھا۔ اپنی معشوقہ کے پاس ہمیشہ کے لیے وہ پہنچ چکا تھا۔ دنیا اس کے ناسور سے پاک ہو چکی تھی۔

بے بس روح

نعیم بخاری آکاش۔ اوکاڑہ

اچانک نوجوان کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی اور درختوں کے گرنے کی آواز سنائی دی اور پھر جب اس نے گھوم کر آواز کی سمت دیکھا تو اس کی گھگھی بندھ گئی کیونکہ اس کے سامنے ایک بہت دیو ہیکل بد ہیت شخص کھڑا تھا پھر……

ایک نوجوان کی دردناک خوفناک دہشت ناک، وحشتناک اور عبرتناک دل دہلاتی روداد

دھند کی دبیز تہہ کو چیرتی ہوئی گاڑی سڑک پر فراٹے بھرتی جارہی تھی۔ آج کی رات بھی کچھ زیادہ اندھیری تھی اور اوپر سے دھند نے مزید کہر برپا کر رکھا تھا۔ گاڑی کی ہیڈ لائٹس بمشکل چند گز دور تک ہی روشنی بکھیرنے میں کارگر ثابت ہورہی تھی۔ ایسے میں نوے کی اسپیڈ سے گاڑی چلانا کسی صورت بھی دانش مندی کی نشانی نہیں تھی اور کسی ہولناک حادثے کا شکار ہونا معمولی بات تھی۔ یہ ضرغام محمود کی خوش بختی تھی کہ یہ روڈ سنسان تھا اور اس کے اردگرد جنگل ہونے کی وجہ سے رات کو اس طرف کوئی ذی روح سفر نہیں کرتا تھا۔

ڈرائیونگ سیٹ پر براجمان ضرغام کا پاؤں ایکسلیٹر پر بڑھتا ہی جارہا تھا۔ اس کے دماغ پر آج شب ہونے والی تکرار کے الفاظ نشتر بن کے برس رہے تھے۔ اس کے اندر غصے کی وجہ سے غبار بھر چکا تھا۔ اس کی گرفت

اسٹیئرنگ پر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ بڑھتی جا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں ونڈ اسکرین پر جمی ہوئی تھیں جبکہ اس کا دماغ خیالات کی بھول بھلیوں میں بھٹک رہا تھا......!

''ضرغام کی والدہ وفات پا چکی تھیں جبکہ والد حیات تھے اس کی بڑی دو بہنیں تھیں۔ انیلہ اور نائلہ.... ضرغام کے والد کے پاس اپنے آباؤ اجداد کی کروڑوں روپے مالیت کی دولت موجود تھی۔ توقیر حسن نے اپنی اولاد کو اعلیٰ تعلیم دلوانے کی بھرپور کوشش کی جس میں ضرغام کی بہنیں اپنے باپ کی خواہش پوری کرنے میں کامیاب رہیں جبکہ ضرغام کی نیچر ان سے یکسر مختلف تھی، پڑھائی میں نالائق تھا اور اپنے دوستوں کا وسیع جھنڈ رکھتا تھا، ہوٹلوں میں جانا سیر و تفریح کرنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ اس نے اپنی پڑھائی مکمل نہیں کی۔ وہ کئی مرتبہ اپنے والد توقیر حسن کے ساتھ جھگڑا کر چکا تھا مگر آج کی رات تو حد ہی ہوگئی۔

آج شب جب وہ تیار ہو کر گھر سے باہر جانے لگا تو لاؤنج میں بیٹھے لوگوں کو دیکھ کر ٹھٹھک کر رک گیا۔ اس کے چچا جان چچی اور ان کا بیٹا حامد بیٹھے ہوئے تھے حامد پڑھا لکھا ہونہار لڑکا تھا اور اپنے والد کا بزنس سنبھالے ہوئے تھا۔

ضرغام کو حامد سخت ناپسند تھا ان کی آپس میں ذرا بھی نہیں بنتی تھی۔ اس نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''آپ لوگ خیریت سے آئے ہیں.....''

حامد کی والدہ نے خوش لہجے میں جواب دیا۔

''جی بیٹا..... ہم نائلہ کے رشتے کے لئے آئے ہیں۔''

اور پھر ضرغام نے غصے سے نائلہ کی طرف دیکھا نائلہ بھی ضرغام اور حامد کے تعلقات کے متعلق جانتی تھی۔ ''تمہیں تو سب پتا تھا نائلہ.....؟'' ضرغام نے حیرت سے کہا لیکن نائلہ نظریں جھکائے بیٹھی رہی۔

جب کہ توقیر حسن صوفے پر براجمان ضرغام کو زہر خند نظروں سے گھور رہے تھے۔

''بھائی جان آپ کمرے میں جائیں۔'' انیلہ نے التجائیہ لہجے میں کہا وہ مہمانوں کے سامنے کوئی جھگڑا نہیں چاہتی تھی۔

صورتحال کو دیکھتے ہوئے چچا جان نے ضرغام کو مخاطب کیا۔ ''بیٹا اگر کوئی مسئلہ ہے تو بتاؤ آخر ہم ایک ہی خاندان کے ہیں۔''

''چچا جان پلیز! آپ خاموش رہیں تو بہتر ہے۔'' ضرغام نے اکھڑے لہجے میں کہا تو حامد کھڑا ہوگیا اسے اپنی ماں اور والد کی بے عزتی برداشت نہیں ہو رہی تھی حامد نے کہا۔ ''ابو جان اٹھیں.....''

حامد کی والدہ نے توقیر حسن کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا جبکہ آصف حسن نے حامد کا ہاتھ پکڑ کر بیٹھا لیا تھا۔

''ہاں..... ہاں چلے جاؤ مجھے بھی تم جیسے لڑکے سے اپنی بہن کی شادی نہیں کرنی ہے۔'' ضرغام اپنے آپ سے باہر ہوگیا تھا۔ توقیر حسن غصے سے کھڑے ہوگئے۔ ''تم سے یہ کس نے پوچھا ہے.....'' اور پھر بولے۔ ''ذرا یہ بھی تو بتاؤ کہ کس بنیاد پر تم اس رشتے سے انکار کر رہے ہو۔ ذرا اپنی ذات سے حامد کا موازنہ کرو آخر کیا جواز پیش کروگے۔''

ضرغام نے نظریں اٹھا کر حامد کی طرف دیکھا اس کے چہرے پر فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔ توقیر حسن بول رہے تھے۔ ''چلو حامد کی ذات پر کسی غیر سنجیدہ پہلو کو ڈھونڈنا تو بعد کی بات ہے پہلے تم یہ بتاؤ کہ کسی نے تم سے مشورہ مانگا ہے اگر ہم لوگ تمہاری اتنی اوقات سمجھتے تو سب سے پہلے تم سے ہی مشورہ کرتے لیکن تمہیں تو اپنی آوارہ گردی سے فرصت ہی نہیں ملتی ہے۔''

''پاپا آپ میری ان کے سامنے بے عزتی کر رہے ہیں۔''

''میں ان لوگوں کے سامنے تمہاری تعریف کرتا اور اس رشتے کے متعلق تمہاری رائے کو لازمی قرار دیتا مگر تمہاری حرکتوں کی بدولت ایسا ممکن نہیں ہے اور بہتری اسی میں ہے کہ تم اپنے کام سے کام رکھو۔'' توقیر حسن بات ختم کرکے دوبارہ صوفے پر بیٹھ گئے جبکہ ضرغام غصے میں کڑھتا ہوا باہر نکلا اور گاڑی میں بیٹھ کر انجانی منزل کی طرف بڑھ گیا۔

ضرغام غصے سے گاڑی چلا رہا تھا اسے ذرا بھی پروا نہیں تھی کہ وہ کسی اندوہناک حادثے کا شکار بھی ہو سکتا ہے، اچانک ہی روڈ پر لائٹ چمکی وہ شاید کوئی موٹر سائیکل سوار تھا جو دھند میں سے اچانک ہی نمودار ہوا تھا۔ ضرغام نے اسے بچانے کی خاطر گاڑی کا بائیں سمت موڑا اور بریک لگانے کی پوری کوشش کی تھی اور پھر گاڑی چرچراتی ہوئی روڈ سے نیچے اتر گئی۔

ضرغام نے روشنی کی طرف دیکھا وہ موٹر سائیکل نہیں تھی بلکہ سیاہ لبادے میں لپٹا ہوا ایک تاڑ قد کا آدمی تھا جس نے ہاتھ میں لیمپ نما روشن چیز پکڑی ہوئی تھی۔ اس سے پہلے کہ ضرغام گاڑی کو سنبھالتا گاڑی ایک درخت سے اتنی شدت سے ٹکرائی کہ گاڑی کا بونٹ اندر کی طرف دھنس گیا جبکہ ونڈ اسکرین کا شیشہ ٹوٹ کر اس کو لہولہان کر گیا تھا اور ساتھ ہی اس کا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرایا اور وہ اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا.....!

نجانے کتنی دیر بعد اس کو ہوش آنا شروع ہوا۔ اس نے آنکھیں کھولنے کی کوشش کی لیکن ماتھے سے بہنے والا خون اس کے چہرے پر جم چکا تھا جس کی بدولت وہ اپنی آنکھیں پوری طرح سے کھول نہیں پایا۔ اس کا سر کسی پھوڑے کی طرح دکھ رہا تھا۔ اس نے نیم وا آنکھوں سے دیکھا ایک انسانی ہیولہ ہاتھ میں سفید دودھیا رنگت کا لیمپ تھامے کچھ کہہ رہا تھا لیکن اس کی آواز پہاڑوں میں گونجنے والی بازگشت کی مانند سنائی دے رہی تھی۔ اس کا سر چکرانے لگا یہ آواز اس کے دماغ پر ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ اس نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

پھر اس ہیولے نے اس کے پاؤں پر زور سے ایک لات رسید کی تو اس کا پورا بدن جھنجھنا اٹھا۔ اس نے دوبارہ آنکھیں کھولنے کی کوشش کی، خون پورے چہرے پر جم چکا تھا جس کی وجہ سے اسے شدید تکلیف کا احساس ہوا، اس کو محسوس ہوا کہ اس کے زخم پر جمنے والی خون کی لکیر اس کے زخم سے خون رسنے لگا تھا۔

اب اس کو لات مارنے والا جلاد صفت انسان دکھائی دے رہا تھا۔ دو تانے قد کا آدمی تھا۔ جو سر سے گنجا تھا۔ اس کی آنکھوں کے گرد سیاہ حلقے تھے اور جب وہ بات کرتا تھا تو اس کے دانت بھیڑیے کی طرح ہونٹوں سے باہر جھانکنا شروع کر دیتے تھے۔ اس نے سیاہ رنگ کا لمبا سا چغہ پہنا ہوا تھا۔ اس کی شخصیت بہت ہی پراسرار لگ رہی تھی۔

''چلو اٹھو بند کرو یہ ڈرامہ.....'' وہ ضرغام کو غصیلی نظروں سے گھورتا ہوا بولا۔

''جلدی اٹھو۔'' تمہارے جیسے انسانوں کی وجہ سے میری راتیں بھی نیست و نابود ہو چکی ہیں۔'' اس کا لہجہ زہر خند تھا اور وہ بہت ہی حقارت سے ضرغام کو مخاطب کر رہا تھا۔

ضرغام کا گلا سوکھ چکا تھا اسے شدت سے پیاس لگی ہوئی تھی۔ ''پپ پانی پلیز تھوڑا پانی.....'' اس سے آگے وہ بول نہیں سکا اور لمبے لمبے سانس لینے لگا۔

یہ سن کر وہ پراسرار آدمی قہقہے لگانے لگا، اس کے قہقہوں کی آواز ضرغام کے سر میں ہتھوڑے برسا رہی تھی۔ ضرغام نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔

''پانی چاہیے اٹھو پانی بھی مل جائے گا۔ پہلے اندھیر نگری کا طواف تو کر لو۔'' اس آدمی کی بات سن

سوئیٹی

بیوی نے ناشتہ کرتے ہوئے اپنے شوہر سے پوچھا۔ ''سوئیٹی کون ہے جس کا نام آپ رات کو سوتے میں لے رہے تھے۔''

خاوند نے چونک کر کہا۔ ''سوئیٹی! سوئیٹی! ہاں یاد آیا گھوڑ دوڑ میں میں نے اس پر شرط لگائی تھی۔ اس کا نام سوئیٹی ہے۔

بیوی نے مسکرا کر کہا۔ ''اس گھوڑی کا کل دو مرتبہ ٹیلی فون آیا تھا۔''

(مسکان فاطمہ۔ کنگن پور)

کرضرغام نے اٹھنے کی کوشش کی، تب ضرغام کو احساس ہوا کہ گاڑی میں وہ موجود نہیں تھا، وہ ایک درخت سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا تھا، حادثے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ضرغام کو وقتی طور پر کچھ بھی یاد نہیں رہا تھا اس نے دائیں بائیں دیکھا تو تھوڑے ہی فاصلے پر اس کو اپنی گاڑی کسی کھلونے کی طرح پچکی ہوئی دکھائی دی۔

ضرغام کے شکستہ دماغ میں آج شب ہونے والے واقعات کسی فلم کی طرح چلنے لگے۔ اب اس کو احساس ہو رہا تھا کہ اس نے کتنی بڑی غلطی کی تھی جو اتنی تیز رفتاری سے گاڑی چلائی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ خیال بھی پریشان کر رہا تھا۔ "یہ آدمی کون ہے؟"

اس نے درخت کے تنے کا سہارا لے کر اٹھنے کی کوشش کی تو اسے پتا چلا کہ اس کے بائیں گھٹنے میں گہری چوٹ لگی تھی وہ لڑکھڑا کر گر گیا اور شدت تکلیف سے کراہنے لگا۔ اس نے دونوں ہاتھوں کی مدد سے اپنا گھٹنا پکڑ لیا تھا۔ اس وقت اسے اپنے سر کا درد اس درد کے سامنے ہیچ معلوم ہو رہا تھا اس کا گھٹنا سوج چکا تھا، بظاہر کوئی ہڈی ٹوٹی ہوئی تو نہیں تھی لیکن ہڈی پر کاری ضرب لگی تھی۔

اس پراسرار آدمی نے دوبارہ دہاڑتے ہوئے کہا۔ "تمہیں سنائی نہیں دیتا۔ کھڑے ہو جاؤ تمہیں ہی جلدی تھی اندھیر نگری میں آنے کی اب اٹھو اور بھگتو اپنے کرتوت کی سزا۔"

"یہ تم کیا کہہ رہے ہو!..." ضرغام نے روہانسے لہجے میں کہا۔ "پلیز مجھے اسپتال لے چلو۔"

وہ پراسرار آدمی خباثت سے مسکرانے لگا۔ "جب اٹھو گے تو تمام حقیقت تم پر آشکار ہو جائے گی۔ اب اٹھو..." اس نے کہتے ہوئے اس کو گریبان سے پکڑ کر کھڑا کردیا۔ مگر ضرغام سے سیدھا کھڑا نہیں ہو جا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے اپنے زخمی گھٹنے کو پکڑ رکھا تھا اس آدمی نے ایک ہاتھ سے ضرغام کی شرٹ کندھے سے مضبوطی سے تھام لی اور اپنے ساتھ گھسیٹنے لگا۔ وہ لمبے لمبے ڈگ بھر رہا تھا۔ جس کی وجہ سے ضرغام کو چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ تھوڑی ہی فاصلہ طے کرنے کے بعد وہ آدمی رک گیا۔ اس نے ضرغام کو چھوڑ دیا تو ضرغام نے سکھ کا سانس لیا اور وہیں زمین پر بیٹھ گیا یہ چند قدموں کا فاصلہ اسے میلوں کی مسافت پر محیط معلوم ہوا تھا۔

اس پراسرار آدمی نے دائیں، بائیں دیکھا اور بولا۔ "ہاں... یہی تو ہے... ہاں... ہاں بالکل یہی جگہ... اسی جگہ ہونا چاہیے اس بدبخت کو۔" اس آدمی نے آنکھیں بند کیں اور اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ہوا میں لہرانے لگا وہ منہ میں کچھ بڑبڑا رہا تھا۔ چند ثانئے تک یہی عمل دہرانے کے بعد وہ رک گیا پھر اس نے آگے بڑھ کر ایک کانٹے دار جھاڑی اٹھا کے ضرغام کی طرف دیکھا اور معنی خیز انداز میں بولا۔ "اب اندھیر نگری کا دوار کھل چکا ہے۔"

لیکن ضرغام کو اس آدمی کی بات سمجھ نہیں آئی تھی۔ وہ ہونقوں کی طرح اس آدمی کو دیکھ رہا تھا۔ وہ پراسرار آدمی اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی کانٹے دار جھاڑی سے زمین پر پڑے خشک پتوں کو ہٹانے لگا اس کا انداز ایسا تھا جیسے وہ زمین پر گری کسی چیز کو ڈھونڈ رہا ہو۔ یکا یک ہی اس کی جھاڑی کسی چیز میں اٹک گئی۔ تو وہ آدمی رک گیا اس نے لیمپ والا ہاتھ تھوڑا آگے کرکے مزید روشنی کی اور پھر ثابت میں سر کو ہلاتے ہوئے جھاڑی کو ایک جھٹکے سے اوپر کی جانب کھینچا تو ضرغام کو پتا چلا کہ وہ جھاڑی کسی صنف نازک کے بالوں میں اٹکی ہوئی تھی جیسے ہی اس نے جھاڑی کھینچی تو ایک نسوانی کراہ سنائی دی تو ضرغام کے رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ سنسنی کی ایک لہر اس کے وجود میں سرایت کرگئی۔ وہ تھر تھر کانپنے لگا تھا۔ وہ خوف سے آنکھیں پھاڑے ان بالوں کے پیچھے دیکھ رہا تھا اس پراسرار آدمی نے دوبارہ پتوں کو ہٹانا شروع کیا۔ پھر چند ہی سیکنڈ بعد پتوں کے ڈھیر سے ایک عورت کی برہنہ کمر جھانکنے لگی۔ ضرغام تھوڑا سا آگے ہوا۔ اسے تجسس ہو رہا تھا کہ آخر یہ کیا ماجرا ہے، وہ جیسے ہی آگے کی جانب جھکا تو اس عورت نے جو اوندھے منہ لیٹی ہوئی تھی اس نے سر اٹھا کر ضرغام کی طرف دیکھا تو ضرغام حیرت کے مارے دنگ رہ گیا۔

وہ بلاشبہ ایک حسین و جمیل چہرہ تھا لیکن اس وقت اس کے چہرے پر کرب کے آثار نمایاں تھے اچانک ضرغام کی نظر اس حسین و جمیل عورت کی کمر کی طرف اٹھی تو ضرغام کو متلی ہونے لگی۔ کیوں کہ اس عورت کی بائیں پسلی سے لے کر کولہے تک پیٹ میں کیڑے پڑ چکے تھے۔ اس میں ہزاروں کی تعداد میں حشرات الارض کلبلا رہے تھے۔ ضرغام کو کراہیت محسوس ہونے لگی۔ اسے ابکائی آئی تو اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا۔

اس پراسرار آدمی کی شخصیت اور اس عورت کے خوف ناک وجود نے ضرغام کو ورطہ حیرت میں ڈال دیا تھا ”تت.... تم کون ہو؟ ضرغام نے بمشکل اس آدمی سے پوچھا۔

اس آدمی نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ”سوال یہ نہیں ہے کہ میں کون ہوں.... بلکہ سوال یہ ہے کہ تم نے مجھے کیوں بلایا۔“ ”میں نے.... ضرغام نے حیرت سے کہا۔ ”نہیں میں نے تمہیں نہیں بلایا.... میں تو تمہیں جانتا ہی نہیں ہوں۔“

اس آدمی نے ضرغام کی بات سننے کے بعد کہا۔ ”بالکل ٹھیک کہا تم نے لیکن تم اکثر مجھے یاد کیا کرتے تھے، سو چودماغ پر زور دو۔“

”یہ کیا بکواس ہے۔“ ضرغام کو غصہ آ گیا تھا۔ ”میں تم جیسے عفریت کو بھلا کیوں یاد کروں گا۔“

ضرغام کی بات سنتے ہی اس پراسرار آدمی نے زور سے قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”ایک تو تم انسانوں کو بھولنے کی بہت بیماری ہوتی ہے۔ چلو میں تمہیں وقت دیتا ہوں سوچ لو ویسے بھی ہمارے پاس بہت وقت ہے۔“

ضرغام نے کہا۔ ”لیکن میرے پاس نہیں ہے، میں زخمی ہوں مجھے اسپتال لے چلو۔“ ضرغام نے رک کر سانس بحال کیا اور پھر بولا۔ ”اور رہی بات تمہیں یاد کرنے کی یا بلانے کی تو میں نہیں جانتا کہ تم کون ہو؟“

”چلو میں تمہیں بتاتا ہوں۔“ اس آدمی نے ضرغام کی مشکل آسان کرتے ہوئے کہا۔ ”پتا ہے تم جیسے انسان مجھے کب یاد کرتے ہیں۔ جب وہ موت و

بھول جاتا ہوں

صحت یاب ہوں تو ”اللہ“ کو بھول جاتا ہوں۔

مصروف ہوں تو ”نماز“ بھول جاتا ہوں۔

برائی کروں تو ”انجام“ بھول جاتا ہوں۔

دیکھوں تو ”حیا“ بھول جاتا ہوں۔

کھاتا ہوں تو ”بسم اللہ“ بھول جاتا ہوں۔

کھالوں تو ”الحمد للہ“ کہنا بھول جاتا ہوں۔

کسی سے ملوں تو ”سلام“ بھول جاتا ہوں۔

سوتے ہوئے ”توبہ“ بھول جاتا ہوں۔

غصے میں تو ”برداشت“ بھول جاتا ہوں۔

سفر پر جاؤں تو ”دعا“ بھول جاتا ہوں۔

کیا شان ہے میرے ”اللہ“ کی وہ پھر بھی نوازتا ہے وہ نہیں بھولتا۔

پیارے نبی کی پیاری باتیں

مسلمان کو گالی دینا فسق اور قتل کرنا کفر ہے۔

ہمیشہ حق بات کہو اگر چہ لوگوں کو تلخ معلوم ہو۔

ہر حالت میں بلا اور مصیبت پر صبر کرنا چاہئے۔

میری امت میں جو چیز فتنہ ہے وہ مال ہے۔

جنت ماں کے قدموں کے نیچے ہے۔

اپنے آپ کو مظلوم کی بددعاؤں سے بچاؤ۔

(عمران ملک۔ کراچی)

گلے لگانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ مگر بہانے تلاش کرتے ہیں کیوں کہ وہ اس حقیقت سے آشنا ہوتے ہیں کہ خودکشی کے بعد ان پر کیا عذاب نازل ہوگا مگر وہ دل میں سوچتے ہیں کہ انہیں جلد ہی موت آ جائے وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی ختم نہیں کرنا چاہتے۔''

ضرغام ہونقوں کی طرح اسے دیکھ رہا تھا۔

''تمہاری کوئی بھی بات میرے پلے نہیں پڑ رہی۔''

''ٹھیک ہے......'' اس آدمی نے خشمگیں نظروں سے ضرغام کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''کیا تم اکثر یہ نہیں سوچتے تھے کہ اس زندگی سے بہتر تو موت ہے۔''

ضرغام نے سوچ کر جواب دیا۔ ''ہاں...... کبھی کبھی من میں خیال ابھرتا تھا لیکن اس وقت جب میں غصے میں ہوتا تھا۔''

''اور یہی وہ وقت ہوتا تھا جب تم مجھے یاد کرتے تھے۔'' اس آدمی نے فخر سے کہا۔

''یہ کیا تک ہے...... میں تمہیں نہیں جانتا پھر تمہیں یاد کیوں کروں گا اور میری موت یا زندگی سے تمہارا کیا لنک ہوسکتا ہے۔'' ضرغام ابھی تک حیرت میں ڈوبا ہوا تھا۔

''حکومت......'' اس آدمی نے غصے سے کہا۔ ''میں تمہاری وجہ سے کئی راتوں کو سو نہیں سکا۔ مجھے بار بار اندھیر نگری کا دوار کھولنے بھیج دیا جاتا تھا اور تم کہتے ہو کہ تم مجھے جانتے نہیں، تمہارا مجھ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' ضرغام سہم گیا اسے خوف محسوس ہو رہا تھا۔

''دیکھو......'' اس آدمی نے کہتے ہوئے اپنی آنکھیں سختی سے بھینچ لیں، یوں لگتا تھا جیسے اسے ضرغام کی کم عقلی پر غصہ آ رہا ہو وہ پھر بولا۔ ''تم جیسے انسان جب موت کو گلے لگانے کا فیصلہ کر لیتے ہیں تو میں ان کے لئے ایک وجہ بنتا ہوں، موت کی وجہ۔'' اس کا لہجہ پراسرار تھا۔ ''تاکہ تم لوگوں کی دلی خواہش کو پورا کیا جا سکے اور پھر جب تم لوگ زندگی اور موت کے درمیان جو جی رہے ہو تو میری تم جیسوں کے ساتھ ملاقات ہوتی ہے اور تبھی میں اندھیر نگری کا دوار کھول کر مرنے سے پہلے انسانوں کو اندھیر نگری کی عذاب ناک زندگی سے آشنا کرواتا ہوں۔''

اب ضرغام کو سمجھ آ رہی تھی۔ ''یہ اندھیر نگری کون سی جگہ ہے۔''

وہ آدمی بولا۔ ''یہ وہ دنیا ہے جو زمین کے نیچے ہے جہاں صرف اندھیرا ہی اندھیرا ہے یہاں پر صرف تکلیفیں ہیں بھول بھلیاں ہیں پچھتاوے ہیں آنسو ہیں اس دنیا کی شروعات تو ہے مگر اختتام نہیں ہے...... ہے تو بس اندھیرے کی دیوار جسے کوئی پار نہیں کر سکتا۔''

ضرغام نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ''کیا میں مر چکا ہوں؟''

اس آدمی نے لاپرواہی سے کہا۔ ''نہیں بس تم چند ہی منٹوں کے مہمان ہو۔''

''اس کا مطلب ہے کہ میں زندہ ہوں۔''

ضرغام نے خوشی سے کہا اور آہستہ آہستہ اس پراسرار آدمی سے دور ہٹنے لگا۔ وہ جیسے اس لیمپ کی سفید دودھیا روشنی سے دور جا رہا تھا اور سردی کا احساس کم ہوتا ہوا محسوس ہو رہا تھا حالانکہ دھند جوں کی توں برقرار تھی مگر اس آدمی کے قریب ایک عجیب طرح کی سردی محسوس ہوتی تھی جیسے مردہ انسانوں کے سرد جسم، اس آدمی نے چلا کر کہا۔ ''تم جتنی بھی بھاگ دوڑ کر لو اب یہی تمہاری زندگی ہے۔''

''نہیں ایسا نہیں ہوسکتا۔'' ضرغام نے روہانسی لہجے میں کہا۔

''میں زندہ ہوں مجھے پتا ہے۔''

اس آدمی نے ضرغام کے اوسان خطا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم موت اور زندگی کے درمیان جی رہے ہو، تمہارے گھر والوں نے تمہیں موبائل پر رنگ کی مگر جواب نہ پا کر انہوں نے تمہارے موبائل کو ٹریس کروایا تو پتا چلا تم اس جگہ پر ہو وہ یہاں پہنچے تو تمہیں اٹھا کر لے گئے اس وقت تمہارا جسم تو اسپتال میں ہے مگر تمہاری روح اس جگہ پر رہے گی، جب تک تم مر نہیں جاتے اور مرنے کے بعد میں تمہیں روندتا، گھسیٹتا اندھیر نگری کی

سیاہ دیوار کے پار لے جاؤں گا۔''

نہیں خدا کے لئے مجھے چھوڑ دو کہہ دو کہ یہ سب جھوٹ ہے۔ ضرغام نے منت کی تو وہ شخص مسکرانے لگا۔ ''پلیز مجھے سچ بتاؤ... مجھے لگتا ہے کہ میں زندہ ہوں اور کوئی روح وغیرہ کا چکر نہیں ہے۔''

''اچھا تو تمہیں لگتا ہے کہ تم روح نہیں ہو۔'' اس آدمی نے طنزیہ لہجے میں کہا تو ضرغام نے اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

اس آدمی نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''تم ذرا یہ گاڑی کا دروازہ بند کرو۔''

ضرغام کا ہاتھ غیر ارادی طور پر دروازے کی جانب بڑھ گیا، ضرغام نے دروازہ بند کردیا، ضرغام کو بہت خوشی ہوئی، اس نے فوراً پلٹ کر جواب دیا۔ ''دیکھا... دیکھا میں نے دروازہ بند کردیا اب بتاؤ کیا کوئی روح ایسا کام کرسکتی ہے۔''

مگر اس آدمی نے بولنے کے بجائے دروازے کی طرف اشارہ کیا اور ضرغام نے گردن گھما کر دروازے کی سمت دیکھا تو دنگ رہ گیا دروازہ جوں کا توں کھلا تھا۔

''نہیں یہ نہیں ہوسکتا میں نے دروازہ بند کیا تھا۔'' وہ خود کلامی کے سے انداز میں کہہ رہا تھا۔ ضرغام نے غصے سے دوبارہ دروازہ بند کیا لیکن دوسرے ہی لمحے دروازہ اپنی پہلی حالت میں تھا۔ ضرغام کے تن بدن میں آگ سی بھڑک اٹھی۔ اس نے غصے سے گاڑی کے دونوں دروازے بند کئے اور پھر گھوم کر دوسری طرف کے دروازے بھی بند کردیئے، ضرغام واپس اپنی جگہ آ کر کھڑا ہوگیا پھر اس نے دروازوں کی طرف دیکھا، دروازے جوں کے توں کھلے تھے، ضرغام کی آنکھوں میں آنسو امڈ آئے۔

کہتے ہیں بے بسی انسان کو چڑچڑا بنادیتی ہے اور یہ ہی اس وقت ضرغام کے ساتھ ہورہا تھا۔ روتے ہوئے ضرغام کی نظر زمین پر پڑی اسے ایک نوک دار پتھر نظر آیا اس نے وہ پتھر اٹھا کر اس پراسرار آدمی کو مارنے کے لئے پھینکا مگر وہ آدمی اپنی جگہ سے ٹس سے مس نہیں ہوا اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے پتھر بھی ہوا میں ہی کہیں معلق ہوکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ ضرغام نے نیچے دیکھا تو پھر اپنی جگہ پڑا ہوا تھا۔

اچانک ضرغام کو موٹر سائیکل کی آواز سنائی دی۔ ضرغام نے آواز کی سمت دیکھا تو ایک لائٹ جنگل میں تیزی سے اس کی جانب بڑھتی ہوئی دکھائی دی۔ وہ یقیناً کوئی موٹر سائیکل سوار تھا، ضرغام کھڑا ہوگیا اور لنگڑاتا ہوا اس موٹر سائیکل کی جانب بڑھنے لگا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ وہ ایک روح ہے وہ ناامید نہیں ہونا چاہتا تھا جبکہ وہ آدمی اطمینان سے اپنی جگہ کھڑا ہوا تھا۔ جیسے اسے یقین ہو کہ ضرغام اس کی دسترس سے باہر نہیں جاسکتا۔

موٹر سائیکل سوار، ضرغام کے بہت ہی قریب پہنچ چکا تھا، ضرغام نے چلانا شروع کردیا۔ ''مجھے بچاؤ پلیز ہیلپ می... رک جاؤ۔'' وہ موٹر سائیکل سوار ضرغام کے قریب پہنچ کر رک گیا تو ضرغام نے سکھ کا سانس لیا۔ موٹر سائیکل سوار موٹر سائیکل کی فرنٹ لائٹ کی وجہ سے واضح نظر نہیں آرہا تھا پھر موٹر سائیکل سوار نے سوئچ آف کیا تو ضرغام کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ کیوں کہ وہ کوئی نارمل انسان نہیں تھا اس کے دھڑ پر سر الٹا تھا۔ یعنی چہرہ کمر کی طرف اور بال سینے کی طرف تھے۔ پھر الٹے سر والے آدمی نے موٹر سائیکل اسٹارٹ کی اور جنگل میں غائب ہوگیا۔

اچانک ہی ضرغام کو زمین ہلتی ہوئی محسوس ہوئی اور درختوں کے گرنے کی آواز سنائی دینے لگی اس نے گھوم کر آواز کی سمت دیکھا تو خوف سے ضرغام کے پسینے چھوٹ گئے۔ ضرغام نے آج تک ایسا انسان نہیں دیکھا تھا اس کے پاؤں دیوہیکل تھے جبکہ دھڑ اور ہاتھ نارمل انسان جیسے تھے اور پھر سر بھی پاؤں کی مناسبت سے دیوہیکل تھا اور اس کی شکل بد ہیبت تھی اس کے منہ سے خون رال کی طرح بہہ رہا تھا اور وہ تیزی سے درختوں کو گراتا ہوا ضرغام کی جانب بڑھ رہا تھا۔ اس

نے اپنے ہاتھ میں ایک بہت بڑا تیز دھار والا کلہاڑا پکڑا ہوا تھا۔

ضرغام کو جیسے سکتہ ہوگیا تھا وہ اپنی جگہ جم گیا تھا اس عفریت نما انسان نے قریب پہنچ کر اپنا کلہاڑے والا ہاتھ سر سے بلند کیا تو وہی پراسرار آدمی چلا کر بولا۔

”ضرغام محمود یہ سب اندھیر نگری کے عفریت ہیں۔ تم ان سے بچ نہیں پاؤ گے۔“

اور دوسرے ہی لمحے اس ہیبت انسان نے چنگھاڑتے ہوئے کلہاڑا ضرغام کو مارنے کے لئے اپنے ہاتھوں کو نیچے کیا تو ضرغام اندھیرے کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبنے لگا.....!

ضرغام پر نیم بے ہوشی طاری تھی۔ کچھ آوازیں ضرغام کی سماعت سے ٹکرا رہی تھیں مگر ضرغام انہیں سمجھنے سے قاصر تھا۔ ضرغام نے نیم وا آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کی تو اسے انسانی ہیولے دکھائی دیئے جو آپس میں باتیں کرر ہے تھے۔

تھوڑی کوشش کے بعد ضرغام اپنی آنکھیں کھولنے میں کامیاب ہوگیا تو خوشی سے ضرغام کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے کیوں کہ وہ اسپتال کے بیڈ پر لیٹا ہوا تھا اور اس سے کچھ ہی دوری پر اس کا فیملی ڈاکٹر، ڈاکٹر زیدی کھڑا ہوا تھا اور اس کے ساتھ توقیر حسن اور ضرغام کی بہنیں نائلہ اور انیلہ کھڑی ہوئی تھیں جبکہ ایک مرد بھی کھڑا ہوا تھا جس کی پشت ضرغام کی جانب تھی۔ اس لئے ضرغام اسے پہچان نہیں پایا۔

ڈاکٹر کہہ رہا تھا۔ ”توقیر صاحب آپ کا بیٹا موت کے منہ سے باہر آیا ہے اور میری آپ سے التجا ہے کہ آئندہ اس کا خصوصی خیال رکھیں۔“

توقیر صاحب بولے تو ان کا لہجہ روہانسی تھا لگتا تھا وہ مسلسل روتے رہے ہوں۔ ”ڈاکٹر زیدی میں نے تو ہمیشہ ضرغام کو خوش رکھنے کی کوشش کی ہے، بس میں تو یہ چاہتا تھا کہ میرا بیٹا پڑھ لکھ کر ایک مہذب انسان بنے، لوگ اس کی عزت کریں، یہ مجبور انسان بن جائے مگر میرے بیٹے نے ہمیشہ مجھے غلط سمجھا حالانکہ وہ میری خوشی کے برخلاف کام کرتا تھا پھر بھی میں نے اسے روپے پیسے کی کمی نہیں آنے دی، اور اگر میرے بیٹے کو میری نصیحتیں بری لگتی ہیں تو میں اس کی خوشی میں خوش ہوں۔“

ڈاکٹر زیدی نے ہمدردی سے توقیر حسن کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا۔ ”پولیس والے بتا رہے تھے کہ جائے وقوعہ کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کچھ غلط نہ ہوگا کہ آپ کا بیٹا خودکشی کی نیت رکھتا تھا حالانکہ میں آپ کی بات سے متفق ہوں ہر باپ اپنے بیٹے کو فرمانبردار دیکھنا چاہتا ہے لیکن ہر باپ کو یہ خوشی دیکھنا نصیب نہیں ہوتی۔“ ڈاکٹر زیدی خاموش ہوگیا۔

تو نائلہ نے روتے ہوئے آنسو صاف کرتے ہوئے کہا۔ ”پاپا اگر بھائی کو میری شادی پر اعتراض ہے تو مجھے نہیں کرنی حامد سے شادی کیوں کہ میں اپنے بھائی کو زندہ دیکھنا چاہتی ہوں تاکہ وہ میری وجہ سے موت کو گلے لگائے۔“ نائلہ جیسے ہی خاموش ہوئی۔ تو ضرغام کی جانب پشت کرکے کھڑا آدمی بولا تو ضرغام کو پتا چلا کہ وہ حامد تھا۔

”تایا ابو اگر ضرغام کی پسند نہیں ہے تو اس کی خوشی میں ہم سب خوش ہیں۔ بے شک نائلہ میری محبت ہے مگر ضرغام کے سامنے میں اپنی محبت بھی قربان کرنے کے لئے تیار ہوں۔“

ان کی باتیں سن کر ضرغام کو اپنے رویہ پر غصہ آنے لگا وہ کتنا خودغرض انسان تھا جس نے کبھی اپنے گھر والوں کو خوشی نہیں دی، وہی گھر والے اس کی خوشی کے لئے اپنا سب کچھ داؤ پر لگانے کے لئے تلے ہوئے تھے اور ضرغام ان کا سہارا بننے کے بجائے ان کے لئے عذاب بن گیا تھا، اب اس نے دل میں سوچ لیا کہ آج کے بعد اپنے باپ کی ہر خواہش کا احترام کرے گا اور نائلہ کی شادی حامد سے کروائے گا اور ساتھ ہی وہ اپنے رب العزت کے حضور شکر گزار بھی تھا جو اس نے اسے دوبارہ زندگی بخش دی تھی۔

سفید موت

ساجدہ راجہ۔ ہندواں سرگودھا

قدم قدم پر روح قبض کرنے والی موت کھڑی تھی مگر پھر بھی وہ آگے ہی آگے بڑھتے رہے اور پھر ایک وقت آیا کہ وہ موت سے نبرد آزما ہوگئے تو ایک انہونی دہشت ناک واقعہ سے واسطہ پڑگیا، حقیقت کہانی میں ہے۔

خوف و دہشت سے رگوں میں خون کو منجمد کرتی ناقابل فراموش حیرت انگیز خوفناک کہانی

فریڈرک اور جیکسن مہم جو طبیعت کے مالک تھے، کئی مہمات سر کر چکے تھے لیکن ابھی تک کسی برفانی علاقے میں جانے کا اتفاق نہیں ہوا تھا اور یہ خواہش ان کے ساتھ ہی پل کر جوان ہوئی تھی۔

گرین لینڈ..... ان کے خوابوں کا جزیرہ، وہاں جانے کی تیاری میں وہ دن رات مشغول تھے لیکن اپنے والدین سے چھپ کر کیونکہ اگر والدین کو پتہ چلتا کہ وہ اس علاقے میں جا رہے ہیں جہاں برف کے علاوہ کچھ نظر نہیں آتا اور بھٹکنے کے بعد راستہ نہیں ملتا تو وہ کبھی ان کو وہاں جانے نہ دیتے، یہی وجہ تھی کہ وہ دونوں چپکے چپکے اپنی تیاریوں میں مشغول تھے اور اس راز میں انہوں نے کسی کو بھی شریک نہیں کیا تھا۔ دولت کی کمی نہیں تھی اس لئے ہر چیز کا انتظام جلد اور عمدہ طریقے سے ہوگیا۔

انہوں نے اپنے سفر کا آغاز شمالی آئس لینڈ کی بندر

گام سے گیا، آئس لینڈ اور گرین لینڈ کے درمیان واقع آبنائے ڈنمارک میں مغرب کی طرف سفر شروع کیا اس مقصد کے لئے نہایت مضبوط جہاز ان کے پاس تھا اور ماہر ملاح کی خدمات بھی انہیں میسر تھیں اس لئے انہوں نے پرسکون انداز میں سفر شروع کیا اور دن رات کے سفر کے بعد انہیں گرین لینڈ کا جزیرہ دکھائی دے گیا۔

ان کے جوش میں اضافہ ہوگیا جن بیگز میں انہوں نے ضرورت کا سامان اور خوراک لے کر جاتا تھا، وہ پہلے سے ہی تیار تھے، سردی کی شدت سے دانت بج رہے تھے حالانکہ ان کے پاس سردی سے بچاؤ کے لئے مناسب انتظام تھا۔

بہرحال انہیں معلوم تھا کہ وہ جس جزیرے پر آرہے ہیں وہاں شدید سردی، بارش برف کا طوفان ٹھنڈی ہوا کے جھکڑ کا سامنا کرنا پڑے گا اس لئے انہوں نے ہر طرح کا انتظام کر رکھا تھا۔ کھانے کا سامان ضرورت سے زائد تھا کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ انہیں توقع سے زیادہ وقت بھی وہاں لگ سکتا تھا، ناگہانی حالات سے نمٹنے کے لئے بھی اسلحے کا مناسب بندوبست تھا، غرض کسی چیز کی کمی نہیں تھی، بس وہ جلد از جلد جزیرے پر پہنچ جانا چاہتے تھے۔

گرین لینڈ کو وائٹ لینڈ کہہ کر پکارا جاتا تو بالکل ٹھیک تھا کیونکہ وہ سب سے بڑا جزیرہ تھا اور برف سے اٹا ہوا، صرف دس فیصد جنگلات گرین لینڈ کے حصے پر واقع تھے یا یوں کہہ لیں کہ گرین لینڈ کا صرف دس فیصد حصہ سرسبز تھا تو نہ جانے گرین لینڈ کس وجہ سے کہا جاتا ہے؟؟؟

جہاز کی رفتار خاصی کم ہوچکی تھی کیونکہ جگہ جگہ برف کے تودے جہاز کی رفتار میں کمی کا باعث بن رہے تھے اور ہر تودہ اتنا بڑا تھا کہ اگر جہاز سے ٹکرا جاتا تو کافی نقصان پہنچتا جہاز کو.....!

جہاز راں رچرڈ کافی ماہر تھا اور پہلے بھی بہت سے مہم جوؤں کے ساتھ یہاں کا سفر کرچکا تھا اس لئے وہ اتنی مہارت سے جہاز کو کنٹرول کر رہا تھا کہ ان دونوں کو کوئی فکر نہ ہوئی۔

جون کا مہینہ تھا اس کے باوجود یہاں دسمبر جنوری جیسا ہی موسم تھا لیکن اتنا ضرور ہوا کہ انہیں جہاز سے کسی چھوٹی کشتی میں جزیرے تک نہ جانا پڑا۔

رچرڈ بھی حیران تھا کیونکہ آج تک جب بھی وہ آیا، جہاز کو جزیرے سے کافی فاصلے پر روک دینا پڑا تھا اور آگے کا سفر چھوٹی کشتیوں میں کرنا پڑا تھا۔ بہرحال جو بھی تھا یہ ایک خوش آئند بات تھی.....!

تقریباً ایک ڈیڑھ ہفتے کے سفر کے بعد وہ لنگر انداز ہوئے۔ جہاز راں رچرڈ نے ان کے ساتھ جانے سے انکار کردیا کیونکہ اس کی صحت اتنا پیدل چلنے کی اجازت نہیں دیتی تھی۔ جہاز میں چونکہ خوراک وغیرہ کا وافر انتظام تھا اس لئے انہوں نے رچرڈ کو بغیر کسی بے فکری کے الوداع کہا اور آگے روانہ ہوگئے، یہ مہم محض شوقیہ تھی اس لئے وہ جزیرے کے وسط تک دیکھ کر واپس آنا چاہتے تھے۔

''سفید موت'' ہر جانب بکھری پڑی تھی۔ برف موت ہی تو ہے اگر اس سے بچنے کا مناسب انتظام نہ ہو۔

بحراوقیانوس کے شمال میں واقع گرین لینڈ دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ ہے جس کا کل زمینی رقبہ 21 لاکھ 75 ہزار 6 سو مربع کلومیٹر، شمالاً جنوباً لمبائی 2700 کلومیٹر درمیان سے چوڑائی 1300 کلومیٹر ساحلوں کی لمبائی، 44 ہزار کلومیٹر اور آبادی ایک لاکھ کے قریب ہے۔

اونچے نیچے نیلے برف اور دھند سے اٹے کہر برساتے بہت پراسرار محسوس ہوتے ہیں اور یہی پراسراریت جیکسن اور فریڈرک کو یہاں کھینچ لائی تھی.....!

موسم نہایت خطرناک تھا، تند ہوا کے جھونکے مزید تیز اور ٹھنڈ سے بھرپور ہوتے جارہے تھے وہ سر سے پیر تک نہایت گرم کپڑوں میں ملبوس تھے لیکن ٹھنڈ پھر بھی محسوس ہورہی تھی، اگر وہ نارمل گرم کپڑوں میں ہوتے تو اب تک ٹھنڈ کی شدت سے جم چکے ہوتے۔ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا سہ پہر ڈھلنے لگی تھی لیکن گہرے بادلوں نے رات کا سماں پیدا کردیا تھا۔

عجیب پراسرار سا موسم تھا، ہر جانب گہری خاموشی تھی صرف تیز ہوا کانوں کے قریب سے سیٹیاں بجاتی گزر جاتی تو چہل پہل کا گماں ہوتا لیکن اس کے باوجود خاموشی گہری خاموشی کا طلسم ہر سو طاری تھا۔ وہاں ان کے علاوہ کسی آدم

خوش تھی کہ چرند پرند تک کا وجود نہیں تھا۔ انہوں نے بہت سے ویرانے دیکھے تھے بہت سی جگہوں کے سناٹوں کو محسوس کیا تھا لیکن ایسے سناٹے جو دل کو لرزانے کا باعث ہوں، پہلی بار دیکھ رہے تھے اور محسوس تو اتنی شدت سے کر رہے تھے کہ خود بولنے کی بھی ہمت ان میں نہیں تھی۔

اوپر اوپر سے برف نرم تھی یعنی کچھ وقت پہلے ہی برف باری ہوئی تھی، اس لئے ان کے پیر برف میں دھنس رہے تھے اور یہ اس لئے بھی اچھی بات تھی کہ چکنی برف پر ان کے پھسلنے کا بھی خطرہ تھا اور چڑھائی اور بھی مشکل کام۔

اس جزیرے کے طول و عرض کو اوسطاً 500 فٹ موٹی برف کی تہہ نے گھیر رکھا ہے اور جزیرے کے وسط میں اس کی موٹائی کا اندازہ اوسطاً گیارہ ہزار فٹ ہے۔ گرین لینڈ کی مشرقی مغربی اور جنوبی پٹی سرسبز زمینوں پر مشتمل ہے، یعنی جزیرے کا صرف دس فیصد....!

وہ اس سرسبز جگہ پر نہیں جاسکتے تھے کیونکہ اس میں مہینوں لگ سکتے تھے اور ان کے پاس بہت محدود عرصے کے لئے خوراک کا انتظام تھا۔ پانی کا اتنا مسئلہ نہیں تھا کیونکہ سردیوں میں اتنی پیاس نہیں لگتی لیکن وہ چونکہ حالت سفر میں تھے اس لئے انہیں تھوڑی بہت پیاس محسوس ہوتی تو وہ برف کو پگھلا کر بھی اپنی ضرورت پوری کر سکتے تھے۔

رات ڈھلی تو انہوں نے مناسب جگہ پر خیمہ نصب کیا اور کھانا کھانے کے بعد وائن سے لطف اندوز ہوئے، کچھ دیر باتوں کے بعد وہ سونے کے لئے لیٹ گئے۔ اب تک وہ کافی فاصلہ طے کر چکے تھے اس لئے کافی تھکن ہوگئی تھی۔

صبح تک خوب سوئے اور ناشتے کے بعد آگے کا سفر شروع کردیا اور دوپہر تک وہ ایسی جگہ پہنچ گئے جہاں کچھ غار واقع تھے پہلے تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی لیکن پھر ان کی خوشی پر مایوسی غالب آگئی کیونکہ ان غاروں میں خطرناک جانوروں کی موجودگی یقینی تھی وہ ان کے اندر نہیں جاسکتے تھے ورنہ بپھرے ہوئے جانور ان کی تکا بوٹی کرنے میں دیر نہ لگاتے۔

وہ آگے بڑھ گئے اور پھر انہیں طوفان نے گھیر لیا۔ اتنی شدت کا طوفان اچانک ہی آیا کہ اگر وہ دونوں ایک دوسرے سے چمٹ کر لیٹ نہ جاتے تو تیز و تند ہوا انہیں کہاں کا کہاں لے کر جاچکی ہوتی۔

لیکن کب تک ....؟ وہ یہاں اتنی شدت کے طوفان میں بغیر کسی پناہ کے لیٹ نہیں سکتے تھے۔ اتنی تیز ہوا میں خیمہ نصب کرنا ناممکن تھا۔ اور برف کے بلاکس کاٹ کر وہ عارضی پناہ گاہ بھی نہیں بنا سکتے تھے، ایک آخری صورت تو یہی تھی کہ وہ برف کو کافی گہرائی میں کھود کر اس میں دبک جائیں اور انہوں نے ایسا ہی کیا۔

اور پھر جو بارش شروع ہوئی تو رکنے کا نام بھی نہ لیا، پورے دو دن طوفان جاری رہا تھا اور رات کو بجلی کی کڑک دار چمک بہت ہی خوفناک محسوس ہوتی تھی۔ گڑھے میں دبکے ہونے کی وجہ سے کھانا کھانے میں بھی دشواری پیش آتی۔ وائن پی کر کچھ پرسکون ہونے کی کوشش کرتے۔

وہ کافی کے شوقین تھے لیکن اس حالت میں وہ کافی نہیں بنا سکتے تھے اس لئے وائن پہ گزارہ تھا اور دو دن بعد جب وہ گڑھے سے نکلے تو انہیں لگا جیسے وہ نخلستان میں آگئے ہوں، اکڑے ہوئے جسم کو سیدھا کرکے جو انہیں سکون ملا وہ بیان سے باہر تھا۔ بادل اب بھی تھے لیکن پرسکون..... اس خطے میں بارش کا تو پتہ نہیں تھا لیکن فی الحال تو وہ تیزی سے آگے بڑھنے لگے جب تک کہ اگلا طوفان نہ آجائے۔

اور طوفان اس خطے میں عام سی بات تھی۔ جس دن بھول چوک کے سورج نکل آتا تو بادل اسے ڈھانپنے کو جلدی سے لپکتے تھے۔ دن کی روشنی میں برف چاندی کی مانند چمکتی تھی اور ان خطوں میں رہنے والے اندھیرے کے لئے ترسا کرتے تھے، آنکھوں کو چبھنے والی روشنی جب رات کے اندھیرے میں بدلتی تو لوگ گویا ایک دوسرے کو مبارکباد دیتے کہ مبارک ہو، رات آگئی، آنکھوں کو سکون بخشنے والا اندھیرا آگیا!

ان علاقوں میں خوراک کا مکمل طور پر انحصار شکار پر ہوتا ہے۔ شکار کئے گئے جانوروں کا گوشت محفوظ کرلیا جاتا اور کافی عرصہ چلایا جاتا اور جب شکار کیا گوشت ختم ہوجاتا تو نئے شکار کی تلاش جاری ہوجاتی۔ گویا گوشت کے علاوہ انہیں کسی اور خوراک کا معلوم ہی نہیں تھا، سفید ریچھ ان

خطوں میں بکثرت پائے جاتے ہیں کافی خونخوار قسم کے تو ان سے بھی کافی احتیاط برتنی پڑتی ہے۔

وہ دونوں ان خطوں کے بارے میں بہت کچھ جانتے تھے لیکن صرف اتنا ہی جتنا انہوں نے معلوماتی کتابوں اور سفرناموں میں پڑھا، باقی سب کا اندازہ تو ان خطوں میں رہنے کے بعد ہوتا ہے۔

دو دن بخیر گزرے، تیسرے دن انہیں برفانی طوفان نے پھر گھیر لیا وہ ایسے علاقے میں تھے جہاں چٹانیں تھیں اور غار بھی.....! وہ چیتے کی مانند غار میں جانے سے ہچکچا رہے تھے لیکن طوفان اس غضب کا تھا کہ انہیں وہاں پناہ لینے کے علاوہ کوئی دوسرا راستہ نظر نہ آیا.....!

وہ دونوں بغیر آہٹ کیے خاموشی سے اندر داخل ہوئے اور غار کے دہانے سے تھوڑا آگے ہوکر بیٹھ گئے۔ غار میں داخل ہو کر انہیں لگا جیسے وہ کسی پرشور علاقے سے اچانک خاموشی میں آگئے ہوں۔

طوفانی ہوائیں غار سے باہر رہ گئیں۔ ان کی چیخی چیخی آواز اندر آرہی تھی۔ وہ دونوں اس غار میں کافی سکون محسوس کررہے تھے لیکن یہ سکون بھی چند لمحوں کا تھا وہ سوچ رہے تھے کہ اگر انہیں یہ غار نہ ملتا تو وہ اب تک پتہ نہیں کس طوفان میں کہاں پہنچے ہوتے.....؟

وہ غار میں آگے تک بالکل نہ گئے کہ اگر غار میں کوئی جانور ہو بھی تو اسے پتہ نہ چلے اور وہ طوفان کے تھمنے تک وہاں رہ سکیں۔ ان کی کوئی باقاعدہ منزل تو تھی نہیں۔ انہیں ہر حال میں وہاں تک جانا ہوتا اس لئے انہوں نے واپس لوٹنے کا فیصلہ کیا۔

طوفان رکتا تو وہ واپس لوٹ جاتے کیونکہ واپسی میں بھی انہیں کافی وقت لگ جاتا اور اگر اسی طرح طوفان آتے رہتے تو انہیں جہاز تک پہنچنے میں بہت دن لگ جاتے۔

فریڈرک ادھیڑ عمر جہاز راں تھا اس کی صحت اب اتنی قابل رشک نہیں تھی کہ وہ اتنی سردی برداشت کرپاتا اس لئے وہ واپسی کا مصمم ارادہ کرچکا تھا، یہ جانے بغیر کہ دونوں کی واپسی ابھی ناممکن ہے.....!

آنے والے حالات اور وقت کا کس کو پتہ ہوتا ہے..... انہیں بھی آنے والے بدترین حالات کا اندازہ نہیں تھا تبھی وہ مطمئن تھے.....!

انہیں سوئے ہوئے نہ جانے کتنی دیر ہوئی تھی کہ غرانے کی آواز سن کر ان کی آنکھ کھل گئی..... انہوں نے لرزتے دل سے غار کے اندرونی طرف دیکھا اور ان کی آنکھیں فرط خوف سے پھیل گئیں۔ سرخ سرخ آنکھیں اندھیرے میں انہیں ہی گھور رہی تھیں وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے۔ فریڈرک کی سانس رک گئی۔

وہ برفانی چیتے تھے جن کی پھرتی اور خونخواری ضرب المثل ہے۔ انسانوں کے تو وہ بدترین دشمن ہیں۔ ان دونوں کی آنکھیں اندھیرے سے مانوس ہوچکی تھیں اور انہوں نے دیکھ لیا کہ وہ تعداد میں دو تھے۔ لیکن اور بھی ہوسکتے تھے۔ فریڈرک کا ہاتھ بے اختیار ہپ پاکٹ کی طرف چلا گیا۔ جس میں ریوالور محفوظ تھا۔

جیکسن ابھی تک سکتے کی سی کیفیت میں تھا اسے ریوالور کا بھی ہوش نہیں تھا۔ دونوں چیتے حملے کے بالکل تیار تھے اور کسی وقت بھی ان پر چھلانگ لگا سکتے تھے۔

فریڈرک نے چیخ کر جیکسن کو متنبہ رہنے اور اپنا ریوالور نکالنے کا کہا اس سے پہلے کہ جیکسن کوئی حرکت کرتا، دونوں چیتے حملہ کرچکے تھے۔

فریڈرک کے ریوالور سے شعلہ نکلا اور آگے والے چیتے کی کھوپڑی میں گھس گیا!

پیچھے والا ٹھٹک کر رکا۔ ان دونوں کو بھاگنے کا موقع مل گیا۔ وہ طوفان کی پرواہ کیے بغیر اندھا دھند گرتے پڑتے بھاگ رہے تھے اور وہ چیتا ان کے تعاقب میں بھاگا آرہا تھا۔

رک کر فائر کرنے کا موقع نہیں تھا۔ جیکسن کو پہلے ریوالور نکالنے کا موقع نہیں مل سکا تھا اب بھاگتے بھاگتے وہ رکا اور ہپ پاکٹ سے ریوالور نکالنے لگا۔

فریڈرک نے چیخ کر اسے ایسا کرنے سے روکا اور بھاگنے کا کہا لیکن دیر ہوچکی تھی چیتا جیکسن کے سر پر پہنچ چکا تھا اور اس نے جیکسن پر چھلانگ لگادی۔ جیکسن گرا اور چیتے نے اس کا ہاتھ اپنے منہ میں لے لیا۔

فریڈرک نے فائر کیا لیکن نشانہ خطا گیا۔ جیکسن چیخ

رہا تھا اور فریڈرک وہ بدحواس کیے دے رہا تھا۔ لباس چونکہ کافی موٹا تھا اس لئے ابھی تک وہ اس کے خونخوار دانتوں سے بچا ہوا تھا اور پھر اس کا دستانہ ایک جگہ سے ادھڑ گیا اور چیتے کے خونی دانت اس کی انگلیوں میں پیوست ہوگئے.....!

جیکسن کی چیخیں قرب و جوار دہلا رہی تھیں۔ فریڈرک نے نشانہ لے کر فائر کیا۔ اور چیتے کی کھوپڑی اڑ گئی۔ جیکسن کا ہاتھ چیتے کے خونخوار دانتوں سے آزاد ہو چکا تھا اور وہ دانت بھینچے دوسرے ہاتھ سے زخمی ہاتھ کو پکڑے ہوئے تھا اور گھٹنوں کے بل بیٹھا ہوا تھا۔

فریڈرک فکرمندی سے اس کے قریب آیا اور اس کا حال دریافت کیا۔

اس کا ہاتھ کافی زخمی تھا اور خون کے قطرے سفید برف پر بہت واضح تھے۔ فریڈرک پریشان ہوگیا اس نے جلدی سے بیگ اتارا اور فرسٹ ایڈ بکس نکالا۔ پہلے مرہم لگا کر پٹی باندھی پھر درد رفع کرنے کا انجکشن لگایا۔

جیکسن نے کچھ سکون محسوس کیا، تھوڑی دیر بعد فریڈرک نے جیکسن کو وہاں سے چلنے کو کہا کیونکہ اسے خطرہ تھا کہ مزید چیتے فائر کی آواز سن کر اور ان کی بو پاتے ہوئے وہاں آجائیں گے ایسے میں ان کے لئے جان بچانا مشکل ہو جائے گا دوسرا جیکسن کی حالت ٹھیک نہیں تھی وہ نیم غنودگی میں تھا یقیناً یہ انجکشن کا اثر تھا۔

فریڈرک اس کی طرف سے بہت فکر میں ہوگیا وہ اسے مسلسل جاگتے رہنے کی تلقین کر رہا تھا لیکن جیکسن کی حالت سے لگتا تھا کہ وہ زیادہ دیر جاگ نہیں سکے گا.....!

فریڈرک اسے لے کر کسی محفوظ جگہ پر پہنچنا چاہتا تھا چیتوں کی دسترس سے دور.... ایک گھنٹے بعد طوفان کی شدت میں کمی آگئی اور وہ اس علاقے سے کافی دور نکل آئے تھے اس لئے چیتوں کا خوف اب نہیں تھا۔

آدھی رات گزر چکی تھی اس کے علاوہ کوئی چارہ نہیں تھا کہ وہ عارضی خیمہ لگاتا۔ جیسے تیسے اس نے اکیلے خیمے کو نصب کیا اور بے سدھ پڑے جیکسن کو اندر لٹا دیا۔ رات گزر گئی لیکن جیکسن کو ہوش نہ آیا

فکرمندی کی بات تو یہ تھی کہ وہ انجکشن صرف درد رفع کرنے کے لئے تھا سلانے کے لئے نہیں، پہلے پہل تو فریڈرک نے سمجھا کہ درد کی کمی کی وجہ سے اسے نیند محسوس ہو رہی ہے اس لئے وہ فکرمند نہ ہوا لیکن آدھی رات بھی گزر چکی تھی اور جیکسن کو ہوش نہیں آیا تھا۔

فریڈرک نے اسے ایک انجکشن اور لگایا تا کہ اس کی غنودگی ختم ہو اور اس کا خاطر خواہ اثر ہوا، وہ آہستہ آہستہ ہوش میں آ گیا۔ فریڈرک نے اسے ناشتہ پیش کیا اور انگلیوں کی دوبارہ مرہم پٹی کی...... جیکسن اس دوران مکمل خاموش تھا، اس کا جسم بہت گرم تھا شاید بخار تھا اور یہ بہت ہی خطرے والی بات تھی، جیکسن کو کچھ دوائیں دیں اور خیمہ اکھاڑ کے بیگ میں رکھ دیا.....!

فریڈرک نے کافی بار جیکسن کو بلانے کی کوشش کی لیکن وہ خاموش رہا اس کی نظریں جھکی ہوئی تھیں اگر فریڈرک اس کی آنکھوں میں دیکھ لیتا تو اسے کچھ غلط ہونے کا احساس ہو جاتا...... چونکہ اس نے نظریں جھکائی ہوئی تھیں اس لئے وہ اس کی تبدیلی کو محسوس نہ کر پایا

کچھ دور چلنے کے بعد فریڈرک کو کچھ عجیب سا احساس ہوا اس نے جیکسن کی طرف دیکھا اور چونک پڑا۔

جیکسن تیز تیز سانس لے رہا تھا اور اس کا چہرہ ضبط کے مارے سرخ پڑتا جا رہا تھا۔ فریڈرک نے اس سے خیریت پوچھی لیکن وہ کچھ نہ بولا، یکایک اس نے اپنا بیگ اتار کر پھینک دیا اور ادھر ادھر دوڑنے لگا اس کے منہ سے کچھ عجیب سی آوازیں نکل رہی تھیں۔ کبھی وہ کھڑا ہو جاتا، کبھی بیٹھ کر برف کھودنے لگتا، اس کے زخمی ہاتھ سے پٹی اتر چکی تھی اور خون پھر بہنا شروع ہو چکا تھا۔

فریڈرک جو دم سادھے حیرت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا ایک دم چونک پڑا اور دوڑ کر اس تک آیا اور اس کے ہاتھوں کو سختی سے پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ بہت گرم تھے اور برف کھودتے رہنے کے باوجود بھی ٹھنڈے نہیں ہوئے تھے۔

فریڈرک سخت تشویش کا شکار ہوگیا، جیکسن نے صرف اسے اتنا بتایا کہ "جب سے چیتے نے اسے کاٹا ہے

اس کے اندر کی تپش بڑھتی جارہی ہے اور اتنے غضب کی ٹھنڈ میں بھی وہ گرمی محسوس کررہا ہے باقی اسے کچھ خبر نہیں۔''

کچھ دیر وہ نارمل رہا لیکن اس کا جسم اسی طرح گرم اور چہرہ بھی پہلے کی طرح سرخ تھا لیکن وہ کافی دیر تک اپنا بیگ دوبارہ اٹھائے چلتا رہا اور پھر جب اسے پانی کی چھوٹی سی جھیل نظر آئی جس میں برف کے ٹکڑے تیر رہے تھے۔

تو نہ جانے اسے کیا ہوا کہ اس نے بیگ کو نیچے پھینکا اور پہلے اپنے پاؤں کو جوتوں کی قید سے آزاد کیا پھر اپنے کپڑے اتارنے لگا۔

فریڈرک مسلسل اسے ایسا کرنے سے روک رہا تھا۔ لیکن وہ اس کی کسی بات کو نہیں سن رہا تھا، کوٹ کا بنا موٹا لباس اتارنے کے بعد اس نے عام گرم کپڑے بھی اتار دیئے صرف جانگیہ رہ گیا جسم پر تو اس نے فریڈرک کو سوچنے کا کوئی بھی موقع دیئے بغیر جھیل کے یخ ٹھنڈے پانی میں چھلانگ لگادی۔

فریڈرک ساکت کھڑا دیکھ رہا تھا۔ درحقیقت اسے سمجھ نہیں آرہی تھی کہ جیکسن کیا کررہا ہے۔ پانی کی سطح پر برف کی ہلکی سی تہہ جمی ہوئی تھی۔ جیکسن کے چھلانگ لگانے پر وہ سطح چیخ گئی اور جیکسن کے گہرے پانی میں جانے کے بعد وہ سطح پھر سے جمنے لگی۔

فریڈرک کو ہوش آیا اس نے بیگ اتار پھینکا اور جیکسن کو پکارتا ہوا اس کی طرف دوڑا۔

ہلکی سی جمی ہوئی برف کو اس نے توڑا اور ڈوبتے ابھرتے جیکسن کا بازو اپنی طرف کھینچا اور پھر جو کچھ ہوا اس نے فریڈرک کو اندر تک لرزا کر رکھ دیا۔

جب اس نے جیکسن کو ہاتھ سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچا تو جیکسن تو باہر نہ آیا بلکہ اس کے بازو کی کھال ادھڑی ہوئی اس کے ہاتھ میں چلی آئی اور بغیر کھال کا بازو پانی میں نیچے اترتا چلا گیا۔ برف کی موٹی تہہ نے پانی کی سطح کو پھر سے ڈھانپ لیا۔

فریڈرک خوف سے آنکھیں پھاڑے اپنے ہاتھ میں موجود جیکسن کے بازو کی کھال کو یک ٹک دیکھے جارہا تھا اور پھر وہ چونک اٹھا، اس نے جیکسن کی تلاش میں پانی میں نظر دوڑائی لیکن جیکسن اسے کہیں دکھائی نہ دیا کیونکہ پانی کے اوپر برف کی اتنی موٹی تہہ جم چکی تھی کہ اسے توڑنا ناممکن تھا۔

فریڈرک زور زور سے چلاتا رہا لیکن جیکسن بھلا کیسے جواب دیتا، وہ تو جھیل کے یخ پانی میں شاید دم توڑ چکا تھا۔

اچانک اتنا بڑا حادثہ، اس کے حواس گویا سلب ہو چکے تھے۔ اپنے گھر سے میلوں دور اتنے خوفناک علاقے میں جہاں وہ دونوں تھے لیکن اب ایک نہیں رہا تھا تو اسے کچھ سمجھ نہیں آرہی تھی کہ کرے تو کیا کرے.....؟

وہ زور زور سے رونے لگا۔ ''وہ جانتا تھا کہ مرد روتے اچھے نہیں لگتے لیکن اس ویرانے میں اسے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا۔

اور بہت سے لوگ صرف دکھ کی وجہ سے ہی نہیں روتے بلکہ کبھی کبھار وہ مضبوط رہتے ہوئے بھی تھک جاتے ہیں.....!''

جیکسن اور اس کا بچپن کا ساتھ تھا وہ ہمیشہ ساتھ رہتے تھے لیکن اب جیکسن کبھی بھی اس کے ساتھ نہیں ہوگا.... یہ سوچ اسے رونے پر مجبور کررہی تھی۔ خوب رو چکنے کے بعد وہ اٹھا اور گہری برف کھود کر بازو کی کھال کو اندر دبا دیا اور واپسی کے لئے پلٹ آیا.....!

اور پھر نہ جانے کتنے طوفانوں کا سامنا کرتا اور کئی بار راستہ بھٹک کر پھر سیدھے راستے پر آنے کے بعد وہ جہاز تک پہنچنے میں کامیاب ہوا۔ کپتان رچرڈ اسے اکیلا آتا دیکھ کر سمجھ گیا کہ جیکسن کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آگیا ہے اور پھر فریڈرک کے منہ سے تفصیل سن کر وہ بھی ساکت رہ گیا۔

فرسٹ مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ کسی برفانی چیتے کے کاٹنے سے کسی انسان کی یہ حالت ہوئی۔ ''ہوسکتا ہے وہ چیتا کتے کی مانند پاگل پن کا شکار ہو اور اس کے جراثیم جیکسن کو منتقل ہوگئے ہوں۔'' لیکن یوں کھال کا ادھڑنا انہیں سمجھ نہ آیا.....؟ بہرحال جیکسن کی المناک موت کے بعد فریڈرک کا دل بھی ہر چیز سے اکتا گیا اور اس نے آئندہ کسی بھی مہم پر جانے سے توبہ کرلی.....!

عشق ناگن

قسط نمبر: 22

ایم الیاس

چاہت خلوص اور محبت سے سرشار دلوں کی انمٹ داستان جو کہ پڑھنے والوں کو ورطۂ حیرت میں ڈال دے گی کہ دل کے ہاتھوں مجبور اپنی خواہش کی تکمیل کے لئے بے شمار جن لیوا اور ناقابل فراموش مراحل سے گزرتے ہوئے بھی خوشی محسوس کرتے ہیں اور اپنے وجود کے مٹ جانے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ یہ حقیقت کہانی میں پوشیدہ ہے۔

یہ دنیا رہے نہ رہے لیکن کہانی محبت کی زندہ رہے گی۔ انہی الفاظ کو احاطہ کرتی دلگداز کہانی

آکاش کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا کہ آخر شیوناگ نے یہ کیا کھیل کھیلا ہے، کچھ عجیب سی بات تھی، بلکہ خطرناک بھی...... کیا...... ؟ نہیں شیوناگ کے اس طرح تعاون کرنا اس کے لئے کوئی اور مصیبت نہ کھڑی کردے۔ کچھ بھی نہیں کہا جاسکتا ہے۔

''شیوناگ......! تو نے میرا راستہ کاٹ کر اچھا نہیں کیا؟'' دوسرے لمحے امرتا رانی اپنے سابقہ روپ میں آچکی تھی۔ وہ نفرت اور غصے سے بے قابو ہو رہی تھی اور اس کی آنکھیں شعلے برسانے لگی تھیں۔

شیوناگ اپنی بھونڈی اور مکروہ آواز میں قہقہہ مار کے اتنے زور سے ہنسا کہ ساری فضا دہل اٹھی تھی۔

''سن میری جانی! تو یہ بات اچھی طرح جانتی ہے کہ بلالپور کی اس ویران حویلی میں تیرے مقدر کا فیصلہ ہوچکا ہے۔ ناگ راجہ بھی تجھ سے متنفر ہے۔ آخر تو کس بات پر طنطنا رہی ہے...... اب تو میری غلام اور کٹھ پتلی بن کے رہے گی...... تیرے انسانی روپ جو اب تک میں دیکھتا آیا ہوں، وہ کتنے سندر تھے اور اب میں ان سے سرفراز ہوتا اور من بہلاتا رہوں گا...... میرے دن رات تیرے قرب سے کیسے لطف اندوز ہوتے رہیں گے۔''

''تو خونی بھیڑیا ہے...... اس بار بھی مرجانا پسند کروں گی لیکن اس روز کی طرح تو نے مجھے اپنی گرفت سے زیر کرکے جس طرح مجھے بھن بھوڑ دیا تھا وہ حسرت پوری ہونے نہیں دوں گی۔ تو نے مکاری سے میری کمزوری سے فائدہ اٹھایا تھا۔'' امرتا رانی نے بگڑ کے برہمی سے کہا۔ ''کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تو پھر مجھ پر غالب آجائے گا۔ میرے قریب آنے کی حماقت نہ کرنا۔''

''میں جب چاہوں...... جتنی بار چاہوں۔ میں اپنی ہر خواہش اور حسرت پوری کرسکتا ہوں۔ دیکھ اب تجھے کیسے فتح کرتا ہوں۔''

شیوناگ اپنی طاقت کے زعم میں بڑے گھمنڈ اور غرور سے بولا۔ اندھا ہونے کے باوجود اس پر مستی کا نشہ طاری تھا۔

شیوناگ کے سر پر ایک عجیب ساخت کی ٹوپی تھی جسے اس نے اچھال کے دور پھینک دی۔ اس کا سر ننگا ہوتے ہی آکاش نے دیکھا کہ اس کے سر پر سیاہ سانپ ستاروں کی روشنی میں چمکنے اور لہرانے لگے۔

پھر وہ اپنے دونوں بازو پھیلا کر امرتا رانی کو اپنی آغوش میں لینے کے لئے لپکا تا کہ اپنی گھناؤنی آرزو پوری کرسکے۔

امرتا رانی اس کے تیور بھانپ کر تیزی کے ساتھ ایک سمت دوڑ پڑی۔ وہ اس کے تعاقب میں بھاگا جا رہا تھا۔

''میری ناگ رانی ...! تو مجھ سے بچ کے جا نہیں سکتی اور نہ ہی میں تجھے اپنے ارمان پورے کئے بنا جانے دوں گا... ٹھہر جا... رُک جا... آ جا... میری آغوش میں...''

شیوناگ اپنی برتری اور ہوس کے نشے میں اندھا ہو چکا تھا اور اسے کچھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ امرتا رانی کے پامال خون آلود بدن کی نسوانی کشش میں ڈوب کر وہ آکاش کو فراموش کر چکا تھا۔ اسے آکاش کا بالکل بھی خیال نہیں رہا تھا۔

گو کہ آکاش کو اب اس بات کا قطعی احساس ہو چکا تھا کہ شیوناگ کے ہاتھوں سے اب دنیا کے کسی بھی چپہ میں پناہ ملنا ناممکن سا ہے۔ لیکن اس میں اب بھی اتنا دم اور حوصلہ تھا کہ کتے کی موت مرنے والے انسپکٹر سے بہتر ہے کہ آخری سانس تک مقابلہ کرے۔ وہ کر بھی سکتا تھا۔ اس انسپکٹر کی جیپ چند قدم پر موجود تھی۔ پھر اس نے اپنے زخمی ہاتھ اور خستہ حالی کی پروا نہیں کی۔ پھر وہ بجلی کی سی سرعت سے لپک کے بڑھا اور اس میں سوار ہو گیا۔

اتفاق سے چابی اگنیشن میں موجود تھی۔ پہلی ہی کوشش میں انجن غرایا اور اس میں زندگی آ گئی۔ سڑک دور تک روشنی کے سیلاب میں نہا گئی اور ذرہ ذرہ چمک اٹھا۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے جیپ دوڑنے لگی۔

شیوناگ کے خوف اور دھڑکے کے باعث اس کے ہاتھ اسٹیئرنگ پر کانپ رہے تھے اور پیر ایکسی لیٹر پر۔ ہر موڑ پر جیپ اسے حادثوں سے محفوظ رکھتی اور بچتی بچاتی لے جا رہی تھی پھر وہ شملہ سے کا نکا ہو کر انبالہ جانے والی سڑک پر نکل آیا۔

اس وقت اس کے سامنے کسی بھی منزل کا نام و نشان تھا اور نہ ہی کوئی منزل تھی۔ بس وہ ہر قیمت پر شیوناگ کی دسترس سے نکل جانا چاہتا تھا۔ پیٹرول والی ٹنکی سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اینڈ حسن پورا بھرا ہوا ہے۔

اسے اندیشہ تھا کہ اس کی یہ مہلت اس وقت تک جب تک شیوناگ امرتا رانی میں الجھا رہتا ہے۔ اس کو بے بس کرنے کے بعد پھر وہ اس کی خبر لے گا۔

اسے شملہ سے روزانہ ہوئے تین چار گھنٹے بیت گئے۔ لیکن شیوناگ نہ آیا۔ اس کے یوں روپوش ہو جانے پر ایک طرف خوشی ہوئی تو دوسری طرف فکر اور اندیشہ بھی لاحق ہو گیا تھا کہ جانے یہ ذلیل، کمینہ اس پر کون سا وار کرنے کے لئے پر تول رہا ہوگا...!

کیا امرتا رانی اس کے قابو میں نہیں آئے گی... اسے وہ بے بس نہ کر سکا ہوگا؟ شاید امرتا رانی نے اس کا بھرکس نکال دیا ہوگا یا پھر اس کی موت بن گئی ہوگی۔ ورنہ شیوناگ اس کے تعاقب میں چلا آتا۔

یہ ٹوٹی ہوئی سڑک تھی۔ جا بجا گڑھے بھی تھے۔ اسے اچانک ایک ٹوٹی سڑک پر جیپ کی رفتار دھیمی کرنی پڑی۔ اگر وہ فوراً ہی رفتار پر قابو نہ پاتا تو اس کی جیپ گہری کھڈ کی آغوش میں چلی جاتی اور موت کی عفریت اسے نگل لیتی۔ اس نے اطمینان کا سانس ٹھیک سے لیا بھی نہ تھا کہ عقب سے سنائی دیتی استہزائیہ آواز نے اسے لرزا سا دیا۔

''خود کو قابو میں رکھ کے جیپ چلاؤ۔'' وہ مکروہ انداز سے قہقہہ مار کے ہنسا۔ ''کیوں بے موت مرجانا چاہتے ہو، میری خواہش ہے کہ تم اتنی آسانی سے موت کا مزا چکھ لو جس طرح کھانے کا ذائقہ چکھا جاتا ہے۔ اس لئے کہ میں ایک دم سے میرے دشمن کے مرجانے سے مجھے خوشی نہیں دکھ ہوتا ہے۔''

اس نابکار کی آواز سنتے ہی اس کے ہاتھ بے جان سے ہو گئے۔ وہ اس قدر سراسیمہ سا ہو گیا کہ اس کے پیر ایکسی لیٹر پر غیر ارادی طور پر دباؤ یک بیک بڑھانے لگے۔ جیسے نادیدہ طاقت اسے ایسا کرنے پر مجبور کر رہی ہے... اور پھر ساتھ ساتھ اسٹیئرنگ پر ہاتھ بہکنے اور جیپ بے قابو سی ہو کر سڑک پر اچھلنے لگی۔ بدحواسی اور جھٹکوں کے باعث ایکسی لیٹر کو وہ قابو میں نہ کر سکا۔ اس

سے پہلے کسی نہ کسی طرح جیپ کو قابو میں کرتا وہ بائیں جانب گھوم کے کھائی میں جھکتی چلی گئی۔

گہری تاریکی ہونے کے سبب گہرا کھڈ تیز روشنی میں نہا گیا تو اس کے حلق سے ایک دل خراش سی چیخ نکلی۔ اس کے نصیب میں جو لکھا تھا وہ رنگ لے آیا۔ جیپ آخری چٹان سے اچھل کے اور تیزی سے کھڈ کی پستی میں جانے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جیپ کے کھلے دروازے سے اچھل کے فضا میں قلا بازی کھاتی پستی میں گرنے لگا۔

آکاش نے جان لیا تھا کہ وہ موت کے منہ میں جارہا ہے اور اس کا سر کسی پتھر سے ٹکرا کے پاش پاش ہوجائے گا۔ نیچے گرتے گرتے اس کے وجود کو ایک برقی جھٹکا سا لگا۔ اسے ایسا لگا کہ کسی نے اسے اپنے ہاتھوں پر سنبھال لیا ہو۔ اس سے اس کے کانوں میں شیوناگ کی آواز گونجی۔ جس میں زہر بھرا ہوا تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''تو اتنی جلد اور آسانی سے مرجائے گا آکاش.... نہیں.... نہیں.... یہ تیری بھول ہے۔ میں تجھے سسکا سسکا کر مارنا چاہتا ہوں۔''

شیوناگ کچھ اور کہنا چاہ رہا تھا چوں کہ وہ بے ہوشی میں ڈوب رہا تھا اس سے آگے کچھ اور سن نہ سکا تھا۔

جب اسے ہوش آیا تو اس نے اپنا سر کسی نرم اور گداز آغوش میں محسوس کیا۔ چند لمحوں کے بعد وہ اک دم سے ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھا۔ اسے یقین نہ آیا۔ اس نے امرتا رانی کو دیکھا جو اس کے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ چونک سا گیا۔ امرتا رانی کا چہرہ خوف سے دھواں دھواں ہو رہا تھا۔ چہرے پر ہلدی کی سی رنگت چھائی ہوئی تھی۔ جہاں اس کے وہ دونوں موجود تھے۔ وہ ایک عجیب و غریب ساخت کا ایک ہیبت ناک کمرا تھا جس کی دیواروں پر ہندو رانی دیوی دیوتاؤں کی ابھری ہوئی ڈراؤنی تصویریں کندہ تھیں۔ چھت پر بھی گولائی میں ایسی مورتیں تراشی گئی تھیں۔ ان تمام مورتوں میں تشدد، ایذا رسانی، مَن مانیوں کے ساتھ ہی بے حجابی اور نامناسب آوازوں کے ہولناک پہلو زیادہ نمایاں تھے۔

ایسا لگتا تھا کہ مرد اور عورت کی حیوانیت مقدم ہے اور یہ کمرا کسی ویران اور قدیم مندر کی عبادت گاہ کا سا سماں پیش کر رہا تھا۔

''اس وقت ہم نہ صرف بے بس بلکہ مجبور ہو کر رہ گئے ہیں آکاش جی.....!'' امرتا رانی کا لہجہ نہ صرف سپاٹ بلکہ کرخت سا تھا۔ ''کیوں کہ یہ کمرا سون مندر کا خاص پوجا پاٹ گھر ہے اور یہاں کی زمین تک ہی نہیں بلکہ ذرہ ذرہ بھی اس کمینے کے اشاروں کا غلام ہے۔

''سون مندر....؟'' آکاش کی آواز میں خوف بول اٹھا۔ وہ دہشت زدہ سا ہو گیا۔

''ہاں....'' اس نے اپنے سر کو شکست خوردہ انداز میں ہلایا۔ ''شیوناگ یہاں لانے کے بعد اس نے کئی بار میری آبرو پر ہاتھ ڈالنے کی کوشش کی.... لیکن میں ایک چکمہ اور فریب دینے میں کامیاب ہوگئی۔ میں نے ایک بازار حسن کی ناری کو اپنے جادو منتر سے اس پر اپنا روپ بھر کے اس کی آغوش میں ڈال دیا.... اسے خبر بھی نہ ہوسکی اور نہ ہی اس عورت کو.... وہ رذیل خوش ہے کہ اس نے مجھے محلوقہ بنالیا.... میرا منکہ شاید بالاپور کی اس ویران حویلی میں رہ گیا تھا۔ جہاں شیوناگ نے تمہیں زیر کیا تھا۔ میں نے بڑی مشکل سے اور شیوناگ کی بند آنکھوں میں دھول جھونک کر اور منتر کے کارن مہلت نکال کے سنگیت کو بالاپور بھیجا ہے۔ کیوں کہ اب سارا دارومدار سنگیت پر رہ گیا ہے۔ لیکن تمہاری اجازت کے بغیر وہ اس منکے کو چھو نہ سکے گی اور پھر شیوناگ کے خون خوار گرگے بھی اس منکے کی حفاظت کر رہے ہوں گے۔ تمہاری اجازت کے بغیر بھی سنگیت کو ان سے نمٹنا خاصا بھاری تو پڑے گا۔ یوں کہ وہ ذہین، بہادر اور نڈر بھی ہے۔ کامیاب ہوجائے گی۔''

''میری طرف سے اسے پوری پوری اجازت ہے میری جان امرتا!'' آکاش نے فوراً ہی کہا۔

''پھر ایسا کرو اپنی انگلیاں اس کے سراپا کے فراز سے مس کرلو۔'' امرتا رانی نے پاربتی دیوی کے عریاں مجسمے کی طرف اشارہ کیا۔ ''جس کے ساتھ شیو

دیو اور وہ جذباتی انداز میں نظر آرہے تھے۔ ’’اسے چھوتے ہی تمہاری انگلیوں کے زخم چند لمحوں میں مندمل ہوجائیں گے۔‘‘

آکاش نے ایک نظر امرتا رانی کے سراپا پر ڈالی پھر پاربتی دیوی کے مجسمے پر نظریں جماتے ہوئے اس کی طرف بڑھنے لگا۔ پھر وہ تیزی سے کئی قدم آگے بڑھ گیا۔ لیکن آکاش اور دیوار کے درمیان فاصلہ برقرار رہا جس پر پاربتی کا مجسمہ کندہ تھا۔ آکاش نے محسوس کیا۔ اس کمرے کی دیوار غیر محسوس طریقے پر پیچھے کی طرف سرکتی جارہی ہے۔

آکاش نے ہراس کے عالم میں امرتا رانی کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا تو امرتا رانی سر ہلا کر آگے بڑھنے کا اشارہ دے رہی تھی۔ وہ اور آگے بڑھا۔ پھر یکایک اس کے اور پاربتی کے سنگی مجسمے کے درمیان ایک حسین نسوانی پیکر حائل ہوگیا اور اس کے قدم زمین پر جم گئے۔

اس نوجوان لڑکی کی شکل وصورت پاربتی کے مجسمے سے حیرت ناک حد تک مشابہ تھی جو دیوار پر شیو دیو کے بازوؤں کی گرفت میں تھی۔ اس کے بدن پر سیندور ملا ہوا تھا۔ بڑی بڑی مستی بھری خمار آلود آنکھوں میں کاجل کے ڈورے تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے سرخ ونداز ہونٹوں پر انجانی مسکراہٹ ناچ رہی تھی پیشانی پر وسط میں سرخ رنگ کا تلک لگایا ہوا تھا۔ پتلی کمر پر ننھی ڈوریوں سے بنا ہوا عجیب سا لبادہ وہ تھا جو سحر زدہ سا کررہا تھا۔

وہ اپنی جگہ ہی ٹھہرا رہا پاربتی کی اس ہم شکل نے اپنا بھرا بھرا ہاتھ لہرا کے اسے قریب آنے کا اشارہ کیا تو سحر انداز سے وہ اس کی طرف بڑھا۔ جیسے ہی وہ اس کی طرف بڑھ کے چھونا چاہا تو وہ ایک طرف سرعت سے ہٹ گئی۔

آکاش چاہتا تھا کہ اسے دبوچ لے لیکن وہ ارادے میں ناکام رہا۔ ان کے درمیان خاصی دیر تک آنکھ مچولی ہوتی رہی۔ وہ چھلاوہ بنی رہی۔ آکاش نے اسے قریب پاکر دبوچنا چاہا تو وہ گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہوگئی اور وہ سنگی مجسمے سے جا ٹکرایا۔

پاربتی کے مجسمے سے ٹکراتے ہی وہ فرط حیرت سے مبہوت رہ گیا۔ پتھر کے اس بت کا بدن کسی لڑکی کے زندہ بدن کی طرح نرم اور حرارت آگیں تھا۔ جیسے اس کے بائیں ہاتھ کی انگلیوں میں سکون کی لہر سرایت ہوئی پاربتی کا بدن اپنی نرماہٹ، گداز پن اور حرارت کھو بیٹھا اور وہ ایک بار پھر پتھر کا سرد اور بے جان مجسمہ تھی۔

وہ پیچھے پلٹا۔ دوسرے لمحے اسے امرتا رانی نظر آئی جو اس دوران وہ پاربتی کی طرف متوجہ تھا اور اس کے شباب بھرے بدن کو قابو میں کرکے بے بس کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس مجسمہ کا عکس کسی پاربتی نے اسے ایسا دیوانہ بنادیا تھا کہ اسے امرتا رانی کا خیال نہیں رہا اور اس کے حسن کی کرشمہ سازیاں بھول کے اس مجسمے کے زندہ عکس میں کھو گیا تھا۔ وہ کرتا بھی تو کیا کرتا اس مجسمے کے عکس نے اسے ایسا دیوانہ بنادیا تھا کہ اس کے جذبات قابو میں نہیں رہے تھے۔ اس عکس نے اسے ناچ نچادیا تھا۔ وہ قابو میں نہیں آرہی تھی۔ ادھر آکاش کو بھی ضد آگئی تھی کہ اسے عکس کو ہر قیمت پر قابو میں کرکے رہے گا۔ امرتا رانی کھڑی سارا کھیل اور اس نوجوان لڑکی سے اس کی آنکھ مچولی دیکھتی رہی تھی۔

آکاش پیچھے ہٹ کر امرتا رانی کے پاس گیا۔ اس نے امرتا رانی کے چہرے پر اس کا دلی کرب اور خوب صورت آنکھوں میں حسد کی جھلک دیکھی تو اسے تاسف سا ہوا کہ امرتا رانی کو یکسر نظر انداز کرکے اس لڑکی کی طرف متوجہ ہوجانا امرتا رانی کو جیسے ناگوار سا لگا تھا۔ کیوں کہ وہ اس لڑکی کو کسی نہ کسی طرح قابو کرکے بے بس کرنا چاہتا تھا۔

اسے ایک روز امرتا رانی نے بتایا تھا کہ شیو دیو دا صدی قبل اس علاقے کا سب سے خوب صورت راج کمار تھا۔ جس کا اندازہ اس کے مجسمے سے ہوتا ہے۔ جتنا خوب صورت، وجیہہ اور دراز تھا۔ اتنا ہی مکار، ظالم اور ہوس پرست تھا۔ اس علاقے میں جو لڑکی جوانی کی دہلیز

پارکرتی تھی وہ اس سے منہ کالا کرتا تھا۔ اس کے ہاتھوں سے کوئی نوجوان، جواں سال اور شادی شدہ عورت بھی محفوظ نہ تھی۔ اس سے رعایا بہت تنگ آ گئی تھی۔ اتفاق سے ایک سادھو اس طرف آ نکلا۔ جب اس نے شیو دیو کی کارستانیاں سنیں تو پاربتی سے کہا کہ وہ شیو دیو کو مندر میں کسی بہانے لے آئے۔ پاربتی جیسی حسین لڑکی اس علاقے میں کوئی نہ تھی۔ چوں کہ اس نے ابھی نوجوانی کی دہلیز پر قدم نہیں رکھا تھا۔ اس لئے وہ شیو دیو کی دست برد سے محفوظ تھی۔ اس نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھتے ہی شیو دیو اسے مندر میں اور اس کے کمرے میں لے آیا۔ سادھو نے پاربتی سے کہا تھا کہ وہ جادو کے زور سے ان دونوں کو مجسمہ بنا دے گا۔ لیکن پاربتی کی آتما اور اس کا جسم آزاد رہے گا۔ لیکن اس کا شریر کوئی بھی مرد آلودہ نہ کر سکے گا۔ اگر کسی نے اسے آغوش میں لے کر اپنی آرزو پوری کرنا چاہی تو وہ غائب ہو جائے گی۔ جب شیو دیو اور پاربتی غلاظت کے دلدل کی لپیٹ میں تھے تب سادھو نے ان دونوں کو مجسمے بنا دیا۔ پتھر کے ان مجسموں کو دیکھ کر لوگ سمجھتے تھے کہ یہ کسی سنگ تراش کا فن ہے۔ گو کہ پاربتی ظاہر ہو جاتی تھی۔ لیکن اسے کوئی مرد اس لئے قابو میں کرنے سے بے بس نہیں کر سکتا تھا کہ اس کا محبوب ایک غریب کسان تھا۔ وہ محبوب بھی موجود تھا۔ پھر اس سادھو نے پاربتی کو دیوی بنا دیا اور اسے اتنی شکتی دی کہ شیو دیو بھی اس کا غلام ہو کر رہ گیا۔

اس لئے آکاش کی حسرت پوری نہ ہو سکی۔ پھر اس نے درد بھری آواز میں کہا۔

''تمہیں اس بات پر صدمہ ہو رہا ہے کہ تم ایک حسین ترین اور نوجوان دوشیزہ کو قابو کرنے میں ناکام رہے؟''

''میں تم سے جھوٹ نہیں بولوں گا میری رانی......؟'' آکاش نے جواب دیا۔ ''تم بتاؤ کہ وہ اس قدر حسین اور پرکشش نہیں تھی کہ مرد بہک جائے.... اس کے حسن نے جیسے مجھ پر جادو کر دیا تھا۔''

''سوان مندر میں ہر چیز سراب ہے میرے دیوتا!'' امرتا رانی کہنے لگی۔ ''اگر تم دل پر قابو نہ رکھو گے تو یہ سراب تمہاری جان لے لے گا.... وہ تمہیں اس طلسم میں پتھروں سے ٹکرا ٹکرا کے مار دینا چاہتا ہے۔''

''مگر یہ سب کچھ کیا ہے امرتا رانی....؟ وہ لڑکی کون تھی....؟ یہ مجسمہ کیسے روپ بدل لیتا ہے؟'' آکاش نے اس کے پاس بیٹھ کر خوف زدہ نظروں سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔ ''اس نے میرے حواس کو معطل کر کے ہر سوچ سے محروم کر دیا تھا۔''

''میں تمہیں کسی سمے بتاؤں گی.... سوان مندر کا ذرہ ذرہ شیو ناگ کا غلام ہے۔'' امرتا رانی بولی۔ ''میں اس کے خلاف کوئی قدم اٹھانے سے اس وقت تک قاصر ہوں جب تک منکا نہیں مل جاتا۔'' امرتا رانی کے لہجے میں شکست خوردگی عیاں تھی۔

آکاش نے اس کے زخمی بدن کو دیکھا۔ شیو ناگ رزمیں نے اپنی ہوس کی پیاس بجھانے کے لئے جو تشدد کیا تھا۔ امرتا رانی کے دفاع اور مزاحمت پر اسے بری طرح زخمی کر دیا تھا اور اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا تھا۔

آکاش نے اس کی کمر میں ہاتھ ڈال کے قریب کر لیا اور اس کے زخموں پر ہاتھ رکھ دیئے۔ امرتا رانی نے کچھ ایسا عجب سا سکون محسوس کیا تو اپنی آنکھوں پر گھنی پلکوں کی چلمن ڈال کے میٹھی آواز میں بولی۔

''کتنا سکون ہے تمہاری بانہوں میں آکاش! کہ میرے زخموں کا سارا درد جذب کر لیا ہے۔''

پھر انہیں ایسا لگا کہ پاربتی کا عکس ان دونوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھ رہا ہے.... لیکن شیو دیو کے چہرے پر نفرت چھپی ہوئی ہے اس کی آنکھیں شعلے برسا رہی ہیں۔ کیوں کہ وہ پاربتی کو زیر کرنے میں ناکام رہا تھا۔

امرتا رانی نے طوفان گزر جانے کے بعد آکاش کا چہرہ اپنے زانو پر رکھ کے اس کے بالوں کو سہلانے لگی۔ اس کمرے میں جو روشنی پھیلی ہوئی تھی۔ وہ دھیمے

دھیمے ماند پڑنے لگی تھی۔ وہاں سے نکل جانے کا راستہ بظاہر کوئی راستہ نہیں تھا۔ نہ ہی ہوا یا روشنی کی آمد کا راستہ نظر آیا تھا لیکن اس کے باوجود میں ٹھنڈک میں رچی ہوئی تھی۔

جب ماند پڑتی ہوئی روشنی کا نپتی لرزتی روشن شعاعوں میں مغا اسے خیال آیا کہ سون مندر سے ایک راستہ کالی راج دھالی کی پراسرار سرزمین کو جاتا ہے جس کے کئی نام ہیں۔

کالی راج دھالی جس کا پتا کوئی نہیں جانتا تھا اور اس کا نام لیتے ہوئے بھی آدمی وحشت زدہ ہو جاتا تھا..... اسے ناگ بھون اور اوٹی نگر کے نام سے بھی موسوم کیا جاتا تھا..... جو اماوس کی تاریک راتوں میں نظر آنے والے بھیانک خوابوں کی دھرتی تھی۔ جہاں قدم قدم پر مہلک خطرات کے ہولناک عفریت منہ پھاڑے اجنبیوں کی گھات میں لگے رہتے ہیں۔ جہاں تاریکیوں میں پروان چڑھنے والے اژدھے جانوں کا آزار ہیں اور جہاں اس کی بیوی قید کی صعوبتیں جھیل رہی ہے۔

''میں تمہیں ایک بڑی عجیب اور پراسرار بات بتاؤں۔'' امرتا رانی نے دبی دبی سرگوشی کی۔ ''میں تمہیں بتا چکی ہوں کہ سون مندر کی زمین شیو ناگ کے اشاروں کی غلام ہے اور ہر آن غیر محسوس انداز سے سرکتی رہتی ہے مگر میں یہ نہیں کہہ سکتی کہ وہ کہاں واقع ہے..... یہ ایک سربستہ راز سا ہے۔''

''میری جان..... ! کیا تم بتا سکتی ہو کہ کالی راج دھالی یا ناگ بھون یہاں سے کتنی مسافت پر ہے؟''

آکاش نے پھر سوال دہرایا۔

امرتا رانی کے مجسموں نے فوراً ہی اس کے ہونٹوں پر مہر لگادی۔ چند لمحوں کے بعد اس کی آواز میں لرزش سی تھی۔

''کالی راج دھالی یا ناگ بھون میں نے کہا تا کہ یہ ایک راز ہے اور تم میرے منکے کی قوت سے محروم ہو چکے ہو..... سنو! سون مندر میں تم اس کا نام زبان پر کبھی دل میں تک نہ لاؤ..... ورنہ اس سرزمین کے بھیانک اور شقی القلب رکھوالے تمہیں اپنے ہی ہاتھوں تمہاری بوٹیاں نوچ ڈالنے پر مجبور کردیں گے۔ منہ واپس ملنے تک اسے بھول جاؤ۔''

آکاش خوف و دہشت سے کانپ اٹھا اور اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔

خاصی دیر تک تاریکی میں ڈوبتے ہوئے اس کمرے میں آسیب زدہ سکوت مسلط رہا۔ اس کی اور امرتا رانی کی سانسوں کی آواز ایک دوسرے کو صاف سنائی دیتی تھی۔ پھر یکبارگی فضا خوفناک سیٹی کی آواز سے گونج اٹھی۔ جیسے کوئی دیو پیکر اژدہا غیض و غضب کے عالم میں ان کے قریب ہی پھنکار رہا ہو۔

وہ جہنمی پھنکار اب تیزی کے ساتھ قریب سے قریب تر آتی جارہی تھی۔ پھر وہ کمرا اس آواز سے لرز اٹھا۔ کمرے میں کسی آتشی مخلوق کے نتھنوں سے نکلنے والی گرم گرم ہوا کے جھونکے جھلسانے لگے اور اس نے ایک دیوی کے مجسمے کی پشت سے دو گول گول چمکیلی آنکھیں ابھرتی دیکھیں جن سے نکلنے والی روشنی کی مدھم شعاعوں میں ایک چوڑے چپکلے سیاہ پھن کے گوشے سے دہکتی چمکیلی زبانیں بار بار بے چینی سے فضا میں لہرا رہی تھیں۔

کمرے میں پھیلی ہوئی سیاہی اور گھمبیر ہوگئی۔ اس کے اعصاب میں اینٹھن شروع ہوگئی۔ زبان خشک ہو کر تالو سے جا لگی۔ اس کی دہشت زدہ نگاہیں سیاہی میں رینگتی ہوئی ایک گہری سیاہ لکیر پر جمی ہوئی تھیں جو ایک دیوی کے پتھریلے مجسمے عقب سے طلوع ہو کر اب فرش پر رینگ رہی تھی۔

گرم ہوا کے بگولے کمرے میں ناچتے رہے۔ آنے والا اژدھا بل کھا کر یوں پھنکارا جیسے وہ زخمی ہو گیا ہو۔ اس کا پھن اور اس کی ٹھٹھری آتشیں آنکھیں فرش سے کافی بلندی پر معلق تھیں۔

وہ گھپ اندھیرے میں اس سیاہ ناگ کے سوا اور کوئی چیز دیکھنے سے معذور ہو چکا تھا۔ اس کی آنکھوں

سے نکلنے والی نادیدہ لہروں کی چبھن اپنے ذہن کی گہرائیوں میں محسوس کر رہا تھا جو بڑی اذیت ناک تھی۔

پھر وہ سیاہ ناگ ایک ہی جگہ رک کر بار بار اپنا پھن فضا میں دائیں بائیں لہرانے لگا۔

اس کی غضب ناک پھنکاروں سے اس کے کان کے پردے پھٹے جا رہے تھے۔ ادھر ناگ رانی کی حالت بھی ابتر تھی۔ وہ اس کے پہلو سے کسی خودرو جنگلی بیل کی طرح چپکی ہوئی تھی۔ جس کے کارن وہ خوف پر دہشت پر قدرے قابو پایا ہوا تھا۔ لیکن امرتا رانی خوف سے اس کے بدن سے جونک کی طرح چمٹ جانا ناقابل یقین سا تھا۔

اس ناگ نے اپنا پھن لہراتے لہراتے ایک بار فرش کی جانب اس کا رخ کیا۔ اگلے ہی لمحے وہ تیرہ و تار کمرا روشنی سے جگمگا اٹھا جیسے بیک وقت ہزاروں چاند اس کمرے میں اتر آئے ہوں۔

وہ اپنا من کمرے کے فرش پر اگل چکا تھا۔ جس سے پھوٹنے والی ہزاروں برقی قمقموں سے کہیں تیز اور طاقتور تھی جس سے نگاہیں تاب نہیں لاسکتی تھیں۔ وہ خیرہ ہونے لگیں۔ چندھیا گئیں۔

آکاش کو اس لمحے ایک دم سے موذی جانوروں سانپوں کے بارے میں سنی ہوئی سینہ بہ سینہ چلنے والی تمام روایات یاد آ گئیں۔ پرانے ناگوں اور ناگوں کے قبضے میں یہ روشن من ہوتا ہے۔ جسے اندھیری راتوں میں ویرانی اور ان مقامات پر اگل کر جہاں انسانوں کا وجود تو کیا بو تک نہیں ہوتی ہے۔ مستی کے عالم میں اکیلے یا ناگنوں کے ساتھ ہم رقص ہوتے ہیں۔ پھر وہ جذبات میں بہکتے چہکتے رہتے ہیں۔ ان کی ایسی ہیجان کیفیت ہوتی ہے کہ وہ گھنٹوں کیا دنوں تک بھی اس میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان میں بھی جنسیت، حسد و جلن اور رقابت ہوتی ہے۔ محبت اور پسندیدگی بھی ہوتی ہے۔ اگر اتفاق سے کوئی حسین ناگن ادھر سے گزری تو ناگ اس کے ساتھ اپنے جذبات کی فراوانی کا نشانہ بناتا اور اپنی خواہش پوری کرتا ہے..... اگر ناگن نے جو کسی اور کی ملکیت ہوتی ہے اور ناگ کی پرواہ نہیں کرتی تو پھر ناگ اسے زیر کرنے کے لئے اپنی پوری طاقت صرف کر دیتا ہے۔ اس کی کوشش ہوتی ہے کہ ناگن کو قابو میں کر کے بے بس کر دے۔ ناگن نہ صرف انکاری ہو جاتی ہے بلکہ اپنی طرف سے پوری مزاحمت اور دفاع کرتی ہے۔ ایسی صورت میں ان دونوں کے درمیان ایک خوف ناک جنگ شروع ہو جاتی ہے۔ ناگ ضد، غصے اور نفرت سے اس وقت تک باز نہیں رہتا جب تک اپنی حسرت پوری نہ کر لے۔ کچھ ناگنیں ایسی بھی ہوتی ہیں کہ وہ ناگ کو زخمی یا موت سے ہمکنار کر دیتی ہیں۔ ناگ اور ناگنوں میں کئی مختلف قسم کی نسلیں، قبیلے اور طبقات بھی ہیں ان میں ازلی نفرت اور دشمنی، رقابت ہوتی ہے، لہٰذا ناگنیں نفرت کی بنیاد پر ان ناگوں کو اپنے آپ کو ان کے سپرد نہیں کرتی ہیں۔

جب ناگ یا ناگن جشن منا رہے ہوتے ہیں اور اس روشنی کے قریب میں کوئی شامت کا مارا ادھر آ نکلے تو پھر اسے وہ چشم زدن میں ڈس لیتے ہیں۔ وہ اس بات کو پسند نہیں کرتے ہیں کہ کوئی انسان یا جانور بھی انہیں جذبات کی افراتفری میں ڈوبا اور بہکا اور دور جاتے ہوئے دیکھے۔

اکثر سپیرے جو بین بجانے میں ماہر، استاد اور فن کار اور شکاری ہوتے ہیں پرانے ناگوں کو اپنے بین کی مدھر تانوں پر مست کر کے ایسا دیوانہ بنا دیتے ہیں کہ وہ من اگلنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ جب وہ یہ دیکھتے اور محسوس کرتے ہیں کہ ناگ مست اور غافل ہو گیا ہے تو بین کا سانس توڑ کے من پر گوبر اور آہنی کانٹے ڈال دیتے ہیں۔ بین کا سرور اور من کی روشنی غائب ہوتے ہی ناگ اشتعال میں پاگل ہو کر گوبر کے ڈھیر اور آہنی کانٹوں کے نیچے چھپے ہوئے من کی تلاش میں اپنا پھن مارتا ہے۔ حتیٰ کہ زخموں سے اس کا پھن چھلنی ہو جاتا ہے۔ اور جب وہ آخری آخری سانسوں پر سسک رہا ہوتا ہے تو اس کے مرنے سے قبل ہی سپیرے اس کے من پر قابض ہو جاتے ہیں۔

سانپوں کے من کے متعلق بہت سی داستانیں، قصے، کہانیاں اور افسانے زد عام تھے جن کے مطابق من پر قابض ہونے والے اکثر پرکھوں نے اور سپیروں کے باپ دادؤں نے ناگوں کے من کو ہی پارس پتھر قرار دیا ہے۔

من کی روشنی میں اس نے سیاہ ناگ کو فرش پر بلکورے لیتے دیکھا۔ یہ کئی فٹ لمبا، موٹا اور طاقت ور قسم کا ناگ تھا۔ اس کے بدن پر سیاہ آبنوس کی چمک تھی۔ من اگلنے کے بعد ساتھ ہی اس کی غضب ناک پھنکاروں کا زور ٹوٹ چکا تھا۔ اور وہ اپنا پھن اٹھائے آکاش کو تیز نظروں سے گھور سے جا رہا تھا۔

پھر اچانک ایک جانب سے مکروہ صورت شیوناگ انسانی روپ میں نمودار ہوا۔

اس کی چال میں فاتحانہ شان اور غرور نمایاں تھا۔ اس کے سر پر اگے ہوئے باریک باریک سیاہ سانپ اس طرح بے جان لٹکے ہوئے تھے جیسے وہ بال ہی رہے ہوں، اور اس نے انہیں کسی کنگھے سے مولد ہوا ہو۔ شاید سون مندر کی دہشت سے ان پر سکوت مسلط ہو کر رہ گیا تھا۔

''تجھے ایک خوش خبری سنا دوں آکاش!'' وہ اس کے پاس رک کر بولا تو اس کا لہجہ تحقیر آمیز تھا اور آنکھوں سے نفرت جھانک رہی تھی۔ ''یہ تو سن کر ناچنے نہ لگ جانا... اور نہ ہی آپے سے باہر ہو جانا، ناگ دیوتا نے تیرا سایہ لوٹا دیا ہے۔''

آکاش کی نگاہ غیر ارادی طور پر فرش پر پڑی تو اسے یقین نہ آیا۔ اس کا خیال یہ تھا کہ شیوناگ نے اسے ذلیل اور مذاق کا نشانہ بنانے کے لئے جھوٹ بولا ہے۔ یہ جھوٹ نہیں تھا۔ اس نے سچ ہی کہا تھا۔ واقعی اس کا سایہ لوٹ چکا ہے۔ امرتا رانی کے ساتھ بلا پور ویران حویلی میں ایک خاص پوجا دیکھنے کے بعد وہ ایسے حالات کا شکار ہوا تھا کہ سائے کی طرف دھیان دینے کی نوبت نہ آسکی تھی۔ جب دھیان آیا تو ہراساں اور پریشان بھی تو ہوتا رہا تھا۔

''اب تو اپنی چتی نیلم کا خیال دل سے نکال دے۔'' اندھا شیوناگ کا لہجہ زہر آلود تھا۔ ''اس کی کوکھ سے تیرا لڑکا تیرا خون اور تیری نشانی جنم لے چکی ہے..... اور بہت جلد جل کماری کے گرگے اسے جل منڈل لے جائیں گے جہاں جل کماری اس پر اپنی مرضی چلائے گی..... تو اس کی مرضی اور خواہش کیا ہے سمجھ رہا ہے.....؟ اس پر ایسا جادو منتر کرے گی کہ وہ جوان ہو جائے گا... وہ تجھ سے بھی کہیں خوب صورت ہے... اتنا خوب صورت کہ تو تصور بھی نہیں کر سکتا...... پھر وہ اسے کٹھ پتلی بنا لے گی... ایک ایسا کھلونا ہوگا جس سے کبھی اس کا دل نہیں بھرے گا... تو نے جل کماری سے جیسا فائدہ اٹھایا وہ بھی ایسا ہی فائدہ اٹھائے گی..... اور ہاں جلد ہی ناگ بھون میں چکر پوجا ہوگی اور اس میں ناگ راجہ تیری چتی نیلم کو اپنی سیج پر لے جائے گا...''

آکاش یہ سن کر برداشت نہ کر سکا۔ نفرت اور غصے سے کانپ اٹھا۔ لیکن وہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ اس کے بس میں ہوتا تو وہ شیوناگ کی گردن کسی پرندے کی طرح مروڑ کے رکھ دیتا..... وہ چکر پوجا کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ یہ تقدس کے لبادے میں لپٹے ہوئے درندہ صفت پنڈتوں اور پجاریوں کا ایک ہوس ناک کھیل تھا جو وہ شیو دیوی پوجا کے نام پر ناریوں کی آبرو لوٹنے کے لئے رچاتے تھے..... لیکن یہ وہ شیو دیو نہ تھا جو پاربتی کے دور میں تھا۔ اس پوجا میں نفس کی آگ بھڑکتی تو پھر رشتوں کا کوئی احترام باقی نہ رہتا تھا۔ نہ جانے ناگ بھون میں یہ چکر پوجا کس طرح منعقد ہونے والی تھی۔ آکاش سمجھنے سے قاصر تھا۔

اپنی بات ختم کر کے شیوناگ نے زور سے تالی بجائی اور اس کے ساتھ کمرے کے در و دیوار سے خوب صورت لڑکیوں کے غول امڈ پڑے۔ وہ تعداد میں اکیس تھیں اور ہر ایک کے بدن پر مختلف اور انداز کا مکمل لباس یونی فارم کی طرح تھا جو نظر آتا تھا۔ انہوں نے ایک قطار میں کھڑے ہو کر شیوناگ کو ہاتھ جوڑ کر بڑے مودبانہ اور ہندوانی انداز سے پرنام کیا اور پھر سر جھکا کے

اس کے حکم کا انتظار کرنے لگیں۔

''اس پاپی کے جسم پر زیتون اور زعفران کی ایسی مالش کرو کہ اس کے پسینے میں بھی اس کی رچ بس جائے۔'' آخر کار شیو ناگ نے ان لڑکیوں سے تحکمانہ لہجے میں کہا۔ ''دیکھو کوئی کسر نہ اٹھا رکھنا۔''

''میں سون مندر میں تیرے سامنے بالکل بے بس ہوں اور تو میری بے بسی سے فائدہ اٹھا رہا ہے۔'' امرتا رانی نے کہا تو اس کے لہجے میں لرزیدگی سی تھی۔ جیسے وہ لرزہ بر اندام ہو رہی ہو۔ ''میں تجھ سے اتنی پرارتھنا کرسکتی ہوں کہ تو آکاش جی پر ظلم وستم کے پہاڑ نہ توڑ... تو نے مجھ پر زیادتیاں توڑی تھیں تو میں نے مزاحمت کی تھی۔ لیکن تو میرے ساتھ جو چاہے کرتا ہے کرکے دل کے ارمان پورے کرلے۔''

''میں جب کسی کا احسان نہیں لیتا ہوں تو تیرا کیوں لینے لگا۔'' وہ بھڑک کے بولا۔ ''سون مندر میں تو کیا تیری آتما بھی میرا ہر حکم ماننے پر مجبور ہوگی... میں بہت جلد ذلیل و رسوا کرکے ناگ بھون لے جاؤں گا... کالی راج دھانی کی دھرتی پر وہاں تیری اداؤں کے مارے ہوئے بے شمار ناگ تیرے خون سے اپنی رقابت کی آگ سرد کرنے کے لئے بے چین ہیں۔ تڑپ رہے ہیں۔''

وہ اکیس عدد لڑکیاں کالی دیوی کے مجسمے کے قریب گئیں اور اس کے قدموں میں سے ایک بڑا سا برتن اٹھا کے اس کے پاس لائیں۔ بعد میں امرتا رانی نے اسے جو کہانی شو دیو اور پاربتی کی سنائی تھی وہ بڑوں کہ بدحواسی میں تھی۔ لیکن اب اس وقت یہ کہانی یک سر مختلف ہی تھی۔ اس وقت وہ جو برتن لائی تھیں وہ برتن زیتون کے تیل سے بھرا ہوا تھا۔

اس کمرے میں پھیلی ہوئی من کی روشنی میں ان لڑکیوں نے نرمی کے ساتھ اس کے ہاتھ پیر تھام کر اسے فرش پر لٹا دیا اور پھر اس کی توقعات کے برعکس اس کا سارا لباس تار تار کرکے بدن سے الگ کردیا۔

ان کے چہرے خوب صورت، بدن گداز اور خدو خال پرکشش تھے۔ تعجب خیز بات یہ تھی کہ مردوں کی طرح بے حد سرد تھا۔ اس غیر فطری اور پراسرار لمس سے اس کے دل میں کراہت پیدا ہونے لگی وہ ان کے نرغے میں بے بس تھا۔ ان میں سے ایک لڑکی اس کے سینے پر سوار ہوئی اور زیتون کے تیل میں ہاتھ تر کرکے اس کے چہرے کی مالش کرنے لگی۔ بقیہ لڑکیاں بھی اس کے جسم کے ہر حصے پر تیل ملنے میں مصروف ہوگئی تھیں۔

پھر زیتون کی بو میں زعفران کی تیز خوشبو بھی شامل ہوئی۔ پہلے تو اس پر زعفران کی بو سے نشہ سا چھانے لگا۔ لیکن ذرا سی دیر میں وہ بو ناقابل برداشت ہونے لگی۔ پھر اس کے نتھنوں میں تیز جلن ہونے لگی تھی۔ اس دوران میں وہ کالا ناگ زعفران کی بو سے بے چین ہوکر اس کے سامنے آگیا۔ جس نے اس کمرے کے فرش پر من اگلا تھا۔ وہ پھن پھیلائے مستی کی سی کیفیت سے جھومنے لگا۔

اس وقت اس نے اپنی ناک میں خون کی گرم گرم لکیروں کو محسوس کیا۔ زعفران کی تیز بو کے باعث اس کی نکسیر بہہ نکلی تھی۔ نتھنوں سے خون رواں ہوتے ہی۔ وہ تمام لڑکیاں اس سے الگ ہوگئیں۔

جب اس کی نکسیر سے بہتا خون فرش پر گرنے لگا تو اس کے قریب لہراتا ہوا سیاہ ناگ بدمستی کے عالم میں فرش پر سرسرایا... اور پھر اس کی پتلی پتلی، بے چین زبانیں فرش سے اس کا خون چاٹنے لگیں۔

اس کی نکسیر سے خون کافی دیر تک پانی کی طرح بہتا رہا۔ نقاہت کے باعث اس کا بدن بری طرح کانپا ٹوٹنے لگا۔ جیسے اب اس کے بدن میں لہو کی ایک بوند بھی نہ رہی ہو۔ کالا ناگ خون رک جانے کے بعد لہراتا ہوا اپنے من کی جانب چلا گیا تو شیو ناگ اس کے قریب آ بیٹھا۔

''میں اسی طرح تیری ساری قوت نچوڑ لوں گا۔'' وہ سرد سفاک اور سپاٹ آواز میں بولا۔ ''تو نے امرتا رانی کو اپنے فریب میں پھنسا کر مجھے جو اذیت پہنچائی ہے میں اس کا بھیانک انتقام لوں گا تیرا خون بہہ

چکا ہے اور اب میں تجھے زخمی کئے بغیر تیری ہڈیوں کا گودا تک کھینچ لوں گا۔ تیرا بدن گوشت اور ہڈیوں کا ایسا عبرتناک ڈھانچا بن جائے گا کہ گدھ بھی تیری لاش کو سونگھ کر چھوڑ دیں گے۔ وہ اکیس لڑکیاں جو تیرے ناپاک بدن پر تیل اور زعفران کی مالش کر رہی تھیں وہ پاربتی کی پجارنیں ہیں۔ میں نے چن چن کر سون مندر میں ان لڑکیوں کو جمع کیا ہے۔ آج کی رات تو اس کمرے کی تاریکی میں ان کے ساتھ رہے گا۔ ان میں ہر ایک باری باری تیرے پہلو میں آئے گی۔ تجھے ان کا حسن عذاب معلوم ہوگا۔ ان کے قرب میں تجھے موت نظر آئے گی۔ تیرا دل بہت کرے گا...... چاہے گا تو ان کے حسن اور قرب سے سرفراز ہو جائے۔ لیکن تیری ہر حسرت تیرے دل میں دم توڑتی رہے گی......

تیری حالت مردوں سے بھی بدتر ہوتی جائے گی۔ جب صبح ہوگی تو تو...... موت کی آرزو کرے گا لیکن زندہ رہے گا اور اب تو آخری سانس تک سون مندر میں قید رہے گا۔ تیرا بدن گل جائے گا...... اور تو زندہ رہے گا اور بے بسی سے یہ منظر دیکھتا رہے گا...... پھر تیری نسلیں تک شیوناگ کے نام سے لرزتی رہیں گی۔'' شیوناگ کی نفرت، غصے اور حقارت آمیز باتیں سن کر آکاش کے بدن میں سردی کی شدید لہر خنجر کی نوک بن کر کاٹتی رہی۔ اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھانے لگا۔ اس نے لحظہ کے لئے سوچا کہ کیوں نہ وہ اس سے رحم کی بھیک مانگ لے۔ اپنی نیلم اور اپنے بچے کی خاطر جسے نیلم جنم دے چکی تھی چوں کہ بہت زیادہ خون بہہ جانے کے باعث اس کی زبان مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ زبان نے جنبش ضرور کی لیکن لبوں سے کوئی آواز نکل نہ سکی۔

''اور تم امرتا رانی۔ میرے دل کی رانی جاؤ...'' وہ اس کے پاس سے اٹھتے ہوئے بولا تو اس کے لہجے میں طنز کا زہر بھرا ہوا تھا۔ ''تم اپنا زہر بالا پور کی ویران حویلی میں دودھ کے پیالوں میں ضائع کر چکی ہو۔ تمہارا منکا اب تمہارے قبضے میں نہیں رہا...... جب تک میں چاہوں سون مندر میں جس طرح میں چاہوں میرا دل بہلاتی رہو...... کسی بات سے انکار کرو گی نہ دفاع اور مزاحمت...... تمہارا فیصلہ کالی راج دھانی کے ناگ بھون میں پہنچ کر کروں گا۔''

وہ کمرہ یک دم سے ایسی گھپ تاریکی میں ڈوب گیا کہ ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ بے بس، لاچار اور بے دم سا زمین پر پڑا رہا۔ یہ بھیانک اندھیرا اس لئے چھا گیا تھا کہ کالا ناگ نے اپنا من نگل لیا تھا اور اس کی زہریلی پھنکار سے کمرا لرز اٹھا تھا۔ پھر اس نے چاپیں سنیں۔ شیوناگ امرتا رانی سے کہہ رہا تھا۔

''چل...... آج تو مجھ سے ایسا عشق کرے گی کہ آکاش سے بھی نہیں کیا ہوگا...... ؟ میں اس حرام زادے سے کہیں زیادہ خوب صورت بن جاؤں گا۔''

آکاش نہ جانے کتنی دیر تک وہ اس مہیب تنہائی میں بے حس و حرکت پڑا رہا۔ پھر اچانک وہ کمرا موجود لڑکیوں کے زہریلے قہقہوں سے گونجنے لگا۔ ان قہقہوں نے اسے بری طرح سہما سا دیا تھا۔ یہ قہقہے ان حسین و جمیل، نوجوان لڑکیوں کے تھے جو پاربتی کی پجارنیں تھیں لیکن اسے ایسا لگا تھا کہ چڑیلیں ہنس رہی ہوں۔

پھر اس نے ان کے جسموں کا قرب محسوس کیا لیکن اب ان کے جسم میں سرد سفاک پن نہ تھا۔

پھر اس نے محسوس کیا کہ کوئی لڑکی اس کے چہرے پر جھک کر پوچھ رہی ہے۔

''کیا تم زندہ ہو......!'' اس کے لہجے میں شوخی تھی۔

''آکاش کو نہ تو اس کے قرب، بوسے اور لمس کی ضرورت تھی۔ اس وقت اسے سخت پیاس لگ رہی تھی۔ وہ یہ کہنا چاہتا تھا کہ مجھے پانی پلا دو...... کیسی پیاس لگ رہی ہے...... تم اس کا احساس نہیں کر سکتی ہو...... نقاہت نے اسے بولنے نہیں دیا۔

''میں نے اس کے خشک ہونٹوں سے محسوس کیا کہ وہ شاید سخت پیاسا ہے۔'' ایک لڑکی نے اپنی ساتھی لڑکیوں سے کہا۔

''ایسا کرو اس کی پیاس کسی گدھی کے دودھ سے

بجھادو۔“ دوسری لڑکی نے مشورہ دیا۔

چند لمحوں کے بعد ایک لڑکی نے کہا۔ ”اب تم منہ کھول کر اس دودھ سے اپنی پیاس بجھالو۔“

آکاش کو بڑی کراہیت محسوس ہوئی۔ اپنی زندگی میں وہ بکری، اونٹنی، بھینس اور گئو ماتا کا دودھ پی چکا تھا۔ اس کی طبیعت مائل نہیں ہو رہی تھی نجانے کیوں..... اس پیاس کی حالت میں وہ زہریلا پانی پینے کو تیار تھا..... اس لئے وہ گدھی کا دودھ پینا نہیں چاہتا۔ ان لڑکیوں نے جبر و زیادتی سے اس کا منہ کھول کر ایک کٹورہ بھرا دودھ اس کے حلق میں انڈیل دیا تھا۔

جانے یہ دودھ کیسا تھا.....؟ کیا واقعی کسی گدھی کا ہی تھا۔ وہ چاہتے ہوئے بھی قے نہ کرسکا تھا۔ لیکن رات کئی بار اس پر غشی کے دورے پڑتے رہے۔ ہر بار وہ جیسے موت کی بانہوں میں خود کو محسوس کرتا رہا اور موت اس سے جیسے ہرجائی پن سے پیش آتی رہی۔ وہ چاہتا تھا کہ اسے موت اپنی آغوش میں لے لے۔ یہ جینا بھی کوئی جینا ہے۔

بے ہوشی کے آخری دورے کے بعد وہ ہوش میں آیا تو سر پر سورج چمک رہا تھا۔

سون مندر اور اس کے بیت کدے کا کہیں نام و نشان تک نہیں تھا۔ شیو ناگ نے اسے مردہ سمجھ کر سون ہاٹ کے جنگلات میں پھنکوا دیا تھا۔ ایک کتا بڑی بے تکلفی کے ساتھ اس کا منہ سونگھ رہا تھا۔

رات کی اذیت ناک سزا اپنا اثر دکھا رہی تھی۔ اس کی تمام رگوں اور پٹھوں میں کھنچاؤ طاری تھا۔ اس کے جسم کا کون سا جوڑ ایسا تھا جو درد نہ کر رہا ہو۔ بدن میں اتنی سکت بھی نہیں رہی تھی کہ وہ اپنے ہاتھ پیر ہلا سکے۔

کرب ناک اذیت، بے چارگی اور بے بسی کے ان لمحات میں نیلم کی یاد اس کے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی اور دوسری طرف چکر یوجا کا تصور ذہن پر ہتھوڑے برسا رہا تھا..... اس کا لخت جگر اس دنیا میں آتے ہی پراسرار اور بے رحم غیر انسانی قوتوں کے چنگل میں پھنس چکا تھا۔ اس کے نیلم کے ساتھ ہی اس معصوم کا مستقبل غیر یقینی ہوچکا تھا۔

”اب وہ ایک ہی کنبے کے تین افراد تھے وہ اپنی دنیا میں آلام و مصائب کے بھنور میں گرفتار تھا۔ نیلم کالی راج دھانی کی ناگ حویلی میں قید تھی اور اس کا لڑکا جل منڈل کی دنیا کا قیدی ہونے والا تھا۔

وہ اب امرتا رانی سے مایوس اور ناامید ہو چکا تھا۔ جو بھی آس تھی ٹوٹ ٹوٹ کے ریزہ ریزہ ہو چکی تھی۔ شیو ناگ نے اس پر بھرپور وار کیا تھا۔

ایک سنگیت تھی جو گھپ اندھیرے میں امید کی ایک مدھوم سی کرن تھی جس سے اس کی آس بندھی ہوئی تھی۔ گوکہ اس کی پراسرار قوتیں امرتا رانی کے مقابلے میں کم تھیں لیکن اس وقت وہ ایک ایسی ہستی تھی جو اس کے کام آسکتی تھی۔ اس سے مایوس اور ناامید نہیں ہوا تھا۔ امرتا رانی نے اسے منکے کی تلاش میں بالاپور بھیجا ہوا تھا۔ نہ جانے وہ وہاں کسی افتاد میں مبتلا ہوگئی تھی۔

آکاش بھوک اور پیاس سے نڈھال وہیں جھاڑیوں کے درمیان پڑا رہا۔

وہ جگہ اس قدر ویران، سنسان اور وحشت میں ڈوبی ہوئی تھی کہ دور دور تک کسی آدم یا آدم زاد کا پتا نہیں تھا۔ دراصل شیو ناگ نے اسے یہاں اس لئے لاڈالا تھا کہ وہ ایڑیاں رگڑ رگڑ کر بے موت مارا جائے۔

جب سورج کا آتشیں گولہ طلائی کرنوں کا جال بچھاتا سر پر آپہنچا تو نقاہت سے اس پر غنودگی چھانے لگی۔ اسی عالم میں اسے قریب سے کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی۔ وہ باوجود کوشش کے آنکھیں نہ کھول سکا۔

وہ آہٹیں لمحہ بہ لمحہ اس کے قریب ہوتی گئیں۔ پھر ایک تحیر زدہ سی آواز اس کے کانوں میں رس گھول گئی۔

”میری جان..... میری تمنا..... میرا من میری محبت.....!!“

دوسرے لمحے اس نے محسوس کرلیا اور سمجھ گیا کہ یہ سنگیت ہے۔ وہ اس سے لپٹ گئی۔

وہ سنگیت کی آواز اور لمس اور قرب سے سرشار ہو

کر جھوم سا اٹھا۔ چونکہ اس پر نقاہت طاری تھی اور پلکیں منوں بھاری تھیں اس لئے وہ آنکھیں نہ کھول سکا۔ اس کی کیفیت ایک نشہ باز کی سی تھی جو نشے کے غلبے میں اونگھ رہا ہو۔ اور اپنے گردوپیش میں انسانی اور محبت بھری آواز سن کر بھی آنکھیں نہ کھول سکا۔ ایسا جیسے وہ کسی قوت حرکت سے محروم ہوگیا ہے۔

اور وہ بولی۔ ''میرے دیوتا! میں ابھی آئی۔''

سنگیت اسے چھوڑ کر جانے کس سمت کیوں اور کس لئے گئی۔ اس کا بے اختیار جی چاہا کہ وہ اسے آواز دے کر روک لے۔ نہ تو وہ آنکھیں کھول سکا اور نہ ہی آواز دے کر روک سکا۔

سنگیت کی واپسی کوئی ڈیڑھ گھنٹہ بعد ہوئی۔ اس وقت بھی اس پر غشی طاری تھی۔ پھر اس نے آکاش کا سر اٹھا کے اپنے زانو پر رکھا۔ پھر اس نے اپنے حلق میں ٹھنڈے میٹھے پانی کی فرحت بخش نمی محسوس کی۔ پھر اس کی سوکھی ہوئی زبان میں جان پڑ گئی اور پھر اس نے آہستہ آہستہ آنکھیں کھول دیں۔ پہلے تو اسے سنگیت کا چہرہ دھندلا دھندلا سا لگا۔ اسے آنکھیں کھولتا دیکھ کر سنگیت اس کے چہرے پر جھک گئی۔ یہ جذباتی کیفیت بڑی والہانہ، پرجوش اور خوب چڑھی ہوئی تھی۔

''میرے دیوتا۔۔۔! یہ تمہیں کیا ہوگیا۔۔۔ کس نے تمہاری یہ حالت کردی۔ تمہیں مردوں سے بھی بدتر کردیا۔۔۔ مجھ سے تمہارا یہ حال دیکھا نہیں جارہا ہے۔۔۔!'' اس نے توقف کرکے مٹی کے کٹورے سے اس کے حلق میں پانی ڈال دیا۔۔۔ یہ کسی چشمے کا پانی تھا جس سے آکاش کی طاقت عود کر آتی جارہی تھی۔

''وہ۔۔۔ شیوناگ۔۔۔!'' وہ صرف اتنا ہی بتا سکا اس کے حلق میں آواز پھنس سی رہی تھی۔

''بالاپور کی حویلی شیوناگ نے خاکستر کردی ہے۔۔۔ ناگن رانی کا منکا۔۔۔ اس ملبے میں کہیں دبا پڑا ہوا ہے۔۔۔ شیوناگ کے گرگے وہاں دن رات سخت پہرہ دے رہے ہیں۔ چڑیا بھی پر نہیں مار سکتی۔''

آکاش نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا تو وہ اس کا سر سہلاتے ہوئے کہنے لگی۔

''میں نے ہر طرح سے سر توڑ کوشش کرلی تھی لیکن باوجود کوشش کے گھسنے میں کامیاب نہ ہوسکی۔ جب اس کمینے نے تمہاری یہ درگت بنادی ہے تو اس نے امرتا رانی کا نہ جانے کیا حشر نشر کیا ہوگا؟''

وہ آکاش کی حالت زار پر بڑی دیر تک آنسو بہاتی رہی اور کہتی جارہی تھی کہ۔۔۔ ''کاش۔۔۔! یہ شیوناگ، رذیل کمینے نے مجھ پر یہ ظلم ڈھایا ہوتا۔۔۔ میں کتنی بدبخت ہوں کہ تمہاری یہ درگت دیکھ کر میرا کلیجہ منہ کو آرہا ہے۔''

آکاش نے اشاروں سے دلاسا دیا اور کہا۔ ''میں کئی دنوں کا بھوکا پیاسا ہوں۔''

پھر وہ لپک کے گئی۔ لوٹی تو اس کے دونوں ہاتھ رسیلے پھلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ ان پھلوں کا رس وہ اس کے حلق میں ٹپکاتی رہی۔ کچھ کمزوری دور ہوگئی۔ توانائی آئی کہ بات کرسکے۔

''امرتا رانی۔۔۔ سون مندر میں قید ہے۔'' اس نے نحیف آواز میں سنگیت کو بتایا۔

''سون مندر۔۔۔'' اس کے ہونٹوں سے خوف زدہ اور تحیر انگیز سی بلی سرگوشی نکلی اور دوسرے لمحے اس کا حسین چہرہ متغیر ہوتا گیا جیسے اس کے لئے یہ اطلاع غیر متوقع ہو۔

''اور میں بھی اس حال کو پہنچا ہوں اور میری گت اس رذیل کمینے اور شیطان نے بنائی ہے۔''

لیکن مجھے اس بات پر شدید حیرت ہورہی ہے۔ اور یقین نہیں آیا ہے کہ وہ موذی تمہارا بدترین دشمن ہوتے ہوئے بھی اس نے تمہیں زندہ کیوں چھوڑ دیا۔۔۔؟ زخم کھا گیا۔ وہ تو اپنے دشمن کو معاف کرنا جانتا ہی نہیں ہے۔''

سنگیت نے اس کا چہرہ اپنے نرم و گداز ہاتھوں کے پیالے میں بھرلیا اور اس طرح جھانکنے لگی جیسے کوئی بھیانک خواب دیکھ رہی ہو۔ پھر محبت بھرے انداز سے اس کے گالوں کے زخموں پر اپنے ہاتھ اس طرح رکھنے

گئی جیسے مرہم رکھ دی ہو اور ہاتھوں سے ساتھ ساتھ اس نے اپنا سر اس کے چوڑے چکلے اور مضبوط زخمی سینے پر رکھ دیا۔ پھر اس کی آنکھوں سے چند موتی نکل کے آکاش کے سینے میں جذب ہونے لگے۔ وہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔

''اگر میرے پاس امرتا رانی اتنی شکتی ہوتی تو شاید میں مر جاتی یا اسے موت کی آغوش میں پہنچا دیتی آکاش..... اور تمہیں شاید سسکا سسکا کر مارنے پر تلا ہوا تھا..... اس لئے اس نے تمہیں اس حال کو پہنچا دیا۔''

''ہاں.....'' وہ شگیت کے چہرے کو دیکھتے ہوئے بولا۔ پھر اس نے اپنی رام کہانی رک رک سنا دی۔ کہانی سنتے سنتے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی تھی۔ آکاش کی درد بھری کہانی نے اس کا سینہ چھید دیا تھا۔

''تم مجھ سے اتنی شدید اور جذباتی محبت کیوں کرتی ہو.....'' آکاش نے گہری سانس لے کر کہا۔ ''مجھے ایسا لگ رہا ہے کہ تم کسی جنم میں میرے جنم جنم کی ساتھی اور میری محبت اور میری زندگی رہی ہو۔''

''جنم جنم.....؟'' وہ بڑے غور سے چونکی اور پھر بولی۔ ''ہاں..... ہاں..... میری جان..... یہ ایک راز تھا جو میرے من میں دفن تھا۔ یہ تمہارا دوسرا نہیں بلکہ تیسرا جنم ہے..... تم نے جو دوسرا جنم لیا تھا میں اس دور میں تھی..... وہ بھی میرا دوسرا جنم تھا.....''

''لیکن شگیت.....؟'' آکاش بھونچکا سا ہو گیا۔ ''کیا یہ سچ ہے؟ مجھے تو صرف اپنا پہلا جنم اور پہلی محبت یاد ہے۔''

''ہاں..... ہاں..... میں تمہارا دوسرا جنم اور دوسری محبت ہوں۔'' وہ اس کے بازوؤں سے تڑپ کے نکلی۔ ''ایک منٹ ٹھہرو میں تمہیں ایسا ثبوت دیتی ہوں کہ تمہیں یقین آ جائے گا..... یہ پچاس برس پہلے کی بات ہے۔''

شگیت کسی دوسرے کمرے کے اندر گئی۔ وہ لوٹی تو اس کے ہاتھ میں ایک طلسماتی گولہ تھا۔ اسے سامنے رکھ دیا۔ اس نے پھر آکاش کا سر زانو پر رکھ لیا اور کہنے لگی۔

''میرا اور تمہارا جنم..... اور ماضی کی سپنے..... کسی فلم کی طرح دکھائی دے گا۔ تم خاموشی سے دیکھتے رہو..... ایک لمبی اور عجیب و غریب کہانی اور داستان ہے..... بے حد خوف ناک اور پراسرار بھی..... پاپ اور نیکی کی.....'' شگیت نے اس طلسماتی گولے پر کوئی منتر پڑھ کر پھونکا تو دوسرے لمحے اس گولے میں کوئی فلم سی چلتی نظر آنے لگی۔

☆ ☆ ☆

جب آکاش نے گاڑی رام دیال کے مکان کے سامنے روکی تو اس وقت ایک بج چکا تھا..... ہر طرف رات کا اندھیرا تھا اور ویرانی کا راج کسی عفریت کی طرح دکھائی دیتا تھا، بادل میں برس رہے تھے جیسے کسی بچی کی مرگ ناگہانی پر دکھوا عورت کی آنکھوں سے آنسو بہتے ہیں۔ اس نے گاڑی کا انجن بند کر کے گھر کی کھڑکی کی طرف دیکھا۔ روشنی کے پس منظر میں کھڑکی کے شیشوں پر دکھائی دینے والا مجسمہ سا ایک مرد کا تھا۔

آکاش نے اسے پہچان لیا۔ وہ رانو تھا۔ جب بھی کسی کو اتم بابو موت کی نیند سلانے کا فیصلہ کر لیتے تو وہ رانو کو فرشتہ اجل بنا کر بھیجتا تھا۔ وہ ایک بے رحم اور سفاک ترین پیشہ ور قاتل تھا۔ ایک قصائی جس کے دل میں جانوروں کے لئے رحم کا کوئی گوشہ نہیں ہوتا اور یہ شقی القلب آدمی پر رحم نہیں کھاتا تھا۔ اسے قربانی کے جانور کی طرح ذبح کر دیتا تھا۔

آکاش کو یہاں پہنچنے میں موسلا دھار بارش کی وجہ سے دیر ہو گئی تھی اور اس کی گاڑی راستے میں بند نہ ہوتی ہوتی وہ یہاں پہنچ کر اتم بابو کو نکاس کر لے جاتا۔ اس نے اپنی گاڑی آگے بڑھا دی اور گلی کے نکڑ پر درخت کے نیچے کھڑی کر دی اور اس کی تمام بتیاں ایک ایک کر کے گل کر دیں۔

تھوڑی دیر کے بعد رانو گھر سے باہر نکلا۔ اس نے برساتی پہن رکھی تھی اور اس کے سر پر ہیٹ تھا اس نے ادھر ادھر دیکھنے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ وہ برساتی کی

جیبوں میں ہاتھ ڈالے مخالف سمت چل پڑا۔ کچھ فاصلے پر اس کی موٹر سائیکل ایک دکان کے باہر کھڑی کے چھجے کے نیچے کھڑی ہوئی تھی۔ اس پر بیٹھ کے اسے اسٹارٹ کیا اور تیزی سے روانہ ہوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اس نے اپنی گاڑی اتم بابو کے مکان کے سامنے لے جا کر روک دی اور چند لمحوں کے بعد وہ اس کے مکان میں داخل ہوا۔ وہ اندر والے کمرے کی دہلیز پر ٹھٹک کے رک گیا۔ کمرے میں ہر طرف ہلاکت خیزی اور تباہ کاری کے آثار نمایاں تھے۔ میز کی درازوں اور الماریوں کے سب خانوں سے ہر چیز نکال کر باہر پھینک دی گئی تھی۔ تکیے اور کشن بے دردی سے پھاڑ دیئے گئے تھے اور تمام کتابیں شیلف سمیت فرش پر ڈال دی گئی تھیں۔

اس کمرے کو شہر مفتوح کی طرح تاخت و تاراج کر جانے والا اپنی فتح و نصرت کا نشان ایک مسخ شدہ لاش کی صورت میں چھوڑ دیا گیا تھا۔ نحیف و نزار اور بوڑھے جسم کے ہر زخم سے رسنے والا خون، پر تشدد اور اذیت ناک موت کی تحریر بن کر نیلے قالین پر پھیل گیا تھا۔ اس کی بے نور آنکھیں اب نفرت اور حقارت سے اسے خالی کرسی پر جمی ہوئی تھیں جہاں شاید اجل کا کوئی نامہ بر اس سے آخری بار یہ پوچھنے کے لئے بیٹھا تھا کہ وہ اپنی زندگی کی حفاظت چاہتا ہے یا اس راز کو پولیس کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ جو زندگی کے ہم پلہ ہے؟

وہ اتم بابو کو جانتا تھا۔ وہ نریندر مودی کے گروہ کا سب سے پرانا، قدیم اور معمر کارکن تھا اس نے کئی بار آکاش سے کہا تھا۔

''آکاش! وقت کا ہر لمحہ ناقابل اعتبار ہے...

زندگی وہ اچھی ہوتی ہے جو عزت اور خودداری کی ہو۔

میں ہرگز یہ نہیں چاہتا تھا کہ میری حالت کی خبر سن کر دنیا والے کہیں کہ ایک جرائم پیشہ، ظالم اور بے ضمیر شخص مرگیا... لوگ اس کی سمادھی پر پھول بھی نہ ڈالیں۔ اب وہ اپنے گناہوں اور جرائم کی تلافی کرنا چاہتا ہے۔ تاکہ اس کے سینے میں کوئی خلش نہ رہے۔

اس نے پوچھا تھا۔ ''تم اس کا کس طرح تلافی کرو گے؟''

''میں نریندر مودی کے راز قانون کے حوالے کردوں گا...''

''نریندر مودی ایک طاقت اور با اثر شخص ہے... نیچے سے اوپر تک لوگ اس کے ٹکڑوں پر کتوں کی طرح پل رہے ہیں... اس بات کی اسے خبر ہوجائے گی۔

''پروا نہیں... فکر نہیں... لیکن یہ بہت ضروری ہے کہ اس غلاظت کو صاف کیا جائے۔ ورنہ انسانیت کا نام و نشان نہیں رہے گا... ورنہ ایسے شیطان جنم لیتے رہیں گے۔''

''یہ کام اتنا آسان نہیں ہے جیسا کہ تم سوچ رہے ہو؟''

''میں یہ جانتا ہوں کہ یہ بہت ہی خطرناک کام ہے جس کا میں آغاز کررہا ہوں۔ اگر میں کسی وجہ سے ناکام ہوگیا تو تم اس مشن کو پایہ تکمیل تک پہنچانا...''

''کون؟ میں...؟ میں اتم بابو...! میں شاید تمہارا مشن آگے بڑھا سکوں۔''

''میں ستر برس کا ہوچکا ہوں... بیمار رہنے لگا... میرے لئے زندگی کی مہلت یوں بھی تمام ہورہی ہے... مگر تم ابھی جوان ہو... باہمت ہو، ذہین ہو... یہ کام تمہیں میرے بعد کرنا ہے... اور دیکھو... جس صبح کا آفتاب میری زندگی کا چراغ گل ہوجانے کے بعد طلوع ہو، اس شب کے اندھیرے کو پناہ کی غنیمت سمجھنا اور دیش سے کچھ عرصے کے لئے اتنی دور چلے جانا کہ دست قاتل کی رسائی تمہاری زندگی تک نہ ہوسکے۔''

اس نے اتم بابو سے کہا تھا کہ وہ جلد بازی نہ کرے... ہر کسی کو اعتماد میں نہ لے... ان پیشہ ور مجرموں، قاتلوں پر بھروسا کرنا دراصل اپنے پیروں پر کلہاڑی مارنے کے مترادف ہے۔ لیکن اتم بابو نے آکاش کی بات نہیں مانی، ایک نہ سنی۔ معلوم نہیں اتم بابو

نے کس کو اعتماد میں لیا۔ نریندرا مودی نے اس سے کہا تھا کہ ''اتم بابو غداری کرنے پر تل گیا ہے۔ اس کی سزا موت ہے۔ اگر وہ بوڑھا نہ ہو گیا ہوتا تو میں اسے شکاری کتوں کے آگے ڈال دیتا۔ اب وہ صرف ایک دن کا مہمان ہے۔''

آکاش کو اتم بابو سے بہت محبت، ہم دردی، اور احترام اس لئے تھا کہ اتم بابو نے اس سے ہمیشہ ایک سگے بیٹے کی طرح سلوک کیا اور بے پناہ محبت کی تھی... کبھی اس کے ذمے ایسے کام نہیں سونپے جو خون خرابے، دہشت گردی، لڑکیوں عورتوں کو اغوا، انہیں فروخت کردینا اور سنگین نوعیت کے ہوں۔ یوں تو اسے ہر طرح کی تربیت دی تھی۔ وہ چاقو زنی کا ماہر تھا۔ بیک وقت تین تین اور ان سے زیادہ بدمعاشوں سے مقابلہ کرکے انہیں موت کے منہ میں باآسانی پہنچا سکتا تھا۔ وہ ہر قسم کے مہلک اور جدید سے جدید اسلحے کا استعمال بھی جانتا تھا۔ اس کے باوجود وہ اس سے زیادہ اسمگلنگ کا کام لیتا تھا۔

اس کی محبت، ہم دردی اور خلوص کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ اس کے باپ کے بچپن کا دوست اور محلے دار تھا۔ اس کا باپ سائیکل رکشا چلاتا تھا۔ باپ کی موت کے بعد وہ اتنی بڑی دنیا میں تنہا رہ گیا اور اپنی تعلیم مزید جاری نہ رکھ سکا۔ جب اس کی ماں کا دیہانت ہوا اس وقت وہ دس برس کی عمر کا تھا۔ بنگال کی آبادی اور بے روزگاری میں بہت اضافہ ہو گیا تھا بلکہ وہ عفریت بن کر غریبوں کو نگل رہی تھی۔ ایسا کوئی کام نہیں رہا تھا جس سے دو وقت کی دال بھات بھی پیٹ بھر کے کھا سکے۔ پھر اتم بابو نے اسے نریندرا مودی مافیا کے گروہ میں شمولیت اختیار کرنے پر راضی کیا۔ جب وہ دس برس سے اتم بابو کی محبت کی گھنی چھاؤں میں تھا اس کی بدولت نریندرا مودی کے قریبی اور پراعتماد کارکنوں میں شامل کرلیا گیا تھا۔ کیوں کہ اس نے کبھی نہ تو جھوٹ بولا اور نہ بددیانتی کی تھی۔

اب اسے اس لمحے ایسا محسوس ہو رہا تھا کہ وہ کڑی دھوپ میں کھڑا جل رہا ہے۔ اور اب شب کے ویران ماتمی اندھیرے میں نریندرا مودی کے پالتو پیشہ ور قاتلوں کی آنکھیں ہر سمت سے اسے اپنی طرف دیکھتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ فضا کا ہولناک سکوت ایک سرگوشی بن گیا تھا۔ جس کی بازگشت ہر سمت سے پکارتی تھی کہ موت اس کے گرد اپنا حصار قائم کررہی ہے۔ اس نے اتم بابو کی شکستہ لاش کو دیکھا اور اسے ایسا لگا جیسے کھلی آنکھوں کی التجا کو بے اثر دیکھ کر مردہ لبوں نے پکارا ہو۔ اس کے کانوں میں اتم بابو کی آشنا آواز کہیں اور سے آئی۔

''آکاش...! مجھے تمہارے آنسوؤں کی نہیں بلکہ تمہارے عزم و حوصلے کی ضرورت ہے۔ میرے مشن کی یہ امانت اب تمہارا ورثہ ہے۔''

اسے یک لخت ہوش آ گیا اس نے اتم بابو کی لاش کے پاس گھٹنوں کے بل بیٹھ کر اتم بابو کی کھلی آنکھوں کو بند کیا۔ پھر وہ وہاں سے اپنے گھر چلا آیا۔ وہ اس واردات کی اطلاع کسی کو دینا نہیں چاہتا تھا۔ انجان بنے رہنے میں اس کی بہتری اور سلامتی پوشیدہ تھی۔ نریندرا مودی کیا اس گروہ کا ہر شخص جانتا تھا کہ اتم بابو کی باپ کی سی شفقت صرف اس کے لئے مخصوص تھی۔

اتم بابو کی عبرتناک اور بربریت انگیز موت کے دس دنوں کے بعد نریندر مودی نے اسے طلب کیا۔ پھر اس نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔

''میں چاہتا ہوں کہ تمہاری بے پناہ صلاحیتوں اور قابلیت کا امتحان لوں۔ بولو... کیا تم تیار ہو؟''

''باس...! میں انکار کرنے کی جرات کیسے کرسکتا ہوں... میں حاضر ہوں... حکم کریں۔'' آکاش نے جواب دیا۔

''تم دس برس سے میرے ساتھ ہو... مگر تم نے آج تک ایک مرغی بھی ذبح نہیں کی۔''

''آپ نے حکم نہیں دیا... ورنہ مرغی کیا دس مویشی کو بھی مرغیوں کی طرح ذبح کرسکتا ہوں۔''

''مرغی نہیں... مویشی نہیں... تمہیں ایک شخص

کو ذبح کرتا ہے۔''

آکاش کے سارے جسم میں سنسنی دوڑ گئی۔ دل اچھل کر حلق میں دھڑکنے لگا۔ اس نے پھنسی پھنسی آواز میں پوچھا۔

''کسے......؟'' آکاش صرف اتنا ہی کہہ سکا۔ وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔

''چوہدری سبھاش دت کو......'' نریندرا مودی نے بڑی بے پروائی سے کہا۔

''کیا......؟'' آکاش پر کوئی بجلی سی آگری...... اسے اپنی سماعت پر فتور کا احساس ہوا۔ سکتہ سا چھا گیا۔

''ہاں...... اس شخص کو......'' نریندرا مودی نے اسے زہر بھری نظروں سے گھورا۔ وہ اس کی نظروں کی تاب نہ لا سکا۔ نظریں نیچی کرلیں۔ اس کی حالت ایک ایسے مجرم کی سی ہورہی تھی جو رنگے ہاتھوں پکڑا گیا ہو۔

''تم اس طرح اچھل کیوں پڑے ہو جیسے بجلی کا جھٹکا لگا ہو......؟ تمہیں حیرت اور خوف کس لئے ہورہا ہے؟''

''اس لئے کہ چوہدری سبھاش دت مشہور و معروف سماجی کارکن ہیں...... ان کا تعلق کسی سیاسی جماعت یا گروہ سے نہیں ہے...... نہ ہی انہوں نے ہماری تنظیم کے خلاف کوئی کام کیا...... نہ وہ ہمارے دشمن ہیں...... وہ صرف اپنے کام سے کام رکھتے ہیں...... غریبوں اور انسانیت کی بقا کے لئے ہر وقت کوشاں رہتے ہیں۔''

''تو تم ان کے بارے میں بہت معلومات رکھتے ہو؟'' اس نے طنزیہ لہجے میں کہا۔

''ان کے بارے میں کیا بنگال کا بچہ بچہ جانتا ہے...... میں بھی ان کے بارے میں وقتاً فوقتاً بہت کچھ سنتا رہتا ہوں۔''

''کیا تم یہ بھی جانتے ہو کہ وہ پولیس انسپکٹر گپتا داس کا بڑا بھائی ہے؟'' نریندرا مودی نے سوالیہ نظروں سے گھورا۔

وہ انسپکٹر گپتا داس جو کولکتہ سے اپنا تبادلہ کرا کے آیا ہے اور اس نے میرے تین آدمیوں کو حوالات میں بند کیا ہوا ہے۔''

''ہاں...... یہ اس کا بھائی ہے۔'' نریندرا مودی نے زہر خند لہجے میں کہا۔ ''اس نے ہمارے تین آدمیوں پر تشدد کرکے زبان کھولنے پر مجبور کیا لیکن انہوں نے زبان نہیں کھولی...... وہ ہماری تنظیم کا قلع قمع کرنا چاہتا ہے۔ اسے میرے خلاف ثبوت نہیں مل رہا ہے اور نہ وہ ہمارے اڈوں کا پتا چلا سکا ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں ممبروں کی فہرست ہے۔ وہ اس لئے ہم پر ہاتھ نہیں ڈال سکا کہ میرا اثر آڑے آرہا ہے۔ اگر میری پہنچ نہ ہوتی تو ہم سب اب تک اندر ہوتے۔''

''آپ اس کا تبادلہ کیوں نہیں کروا دیتے......؟''

آکاش نے مشورہ دیا۔

''اس کا تین ماہ تک تبادلہ نہیں ہوسکتا...... کیوں کہ وہ بہت اوپر سے آیا ہوا ہے صرف ہماری تنظیم کا نام و نشان صفحۂ ہستی سے مٹانے کے لئے...... وہ جس طرح کی منصوبہ بندی ہمارے خلاف کررہا ہے اس کی وجہ سے وہ دو تین ہفتے میں اپنے ارادوں میں کامیاب ہوجائے گا۔''

''ہاں...... کیا آپ نے اس کے آگے چارہ نہیں ڈالا جیسا کہ آپ ہمیشہ دریا دلی کا مظاہرہ کرتے ہیں؟''

''میں نے کل ہی اسے ایک کروڑ ٹالا کا...... ڈیفنس سوسائٹی کے علاقے میں چار سو گز پر بنی ہوئی کوٹھی جس کی مالیت سات کروڑ ہے پیشکش کی تھی لیکن اس نے صاف انکار کردیا...... اس کے علاوہ شو بزنس کی مشہور و معروف اداکارہ چندا جو اس کا دل بھرنے تک دل بہلاتی رہے گی...... چندا کے لئے ایک دنیا پاگل ہے...... چوں کہ وہ اپنے بڑے بھائی اور بھابی کو بہت چاہتا ہے اور انہیں ماں باپ کا درجہ دیتا ہے اس لئے میں نے اس کی محبت کو سدا چھین لینے کا فیصلہ کیا ہے۔ بس اسی طرح وہ راہ راست پر آسکتا ہے۔''

''پھر بھی اس نے ہٹ دھرمی کا دامن نہیں چھوڑا اور اپنے اصول پر کسی چٹان کی طرح جما رہا تو......؟''

''پھر اسے دنیا سے رخصت کردینا تمہاری ذمے داری ہوگی...... میں ابھی اسے اس راستے سے ہٹا نہیں رہا ہوں کہ اس کے دل پر ایک گھاؤ لگے اب تم جاؤ...... ! چوہدری سبھاش دتہ کو قتل کرنے کا منصوبہ بناؤ... دو دن میں بے عیب منصوبہ بنا کر میرے سامنے پیش کرو تاکہ میں تمہاری مدد کے لئے رانو اور شترو کو ساتھ کردوں۔'' نریندر امودی نے کہا۔

میں اس رات سونے کے لئے بستر پر دراز ہوا تو ایک پل کے لئے بھی سو نہیں سکا۔

میں بستر پر اس طرح کروٹیں بدلتا رہا جیسے مجھے باس نریندرا مودی سفاک اور شقی انقلاب اور درندہ صفت نے مجھے دہکتے انگاروں پر ڈالا ہو...... اگر یہ کہتا کہ تم خودکشی کرلو تو میں شاید خودکشی کرلیتا لیکن میں چوہدری سبھاش دتہ کے قتل کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتا تھا۔ وہ ایک عظیم اور غیر معمول شخص تھا جو بے غرض اور مخلص بھی تھا اور انسانیت کی بھلائی، بقا اور سالمیت کے لئے کوشاں رہتا تھا۔ اس لئے وہ لوگوں کے دلوں پر حکومت کررہا تھا۔ وہ ایک بے تاج راجا تھا۔ اگر وہ لوگوں کو حکم دے کہ گھروں سے نکل آؤ اور حکومت کا تختہ الٹ دو تو لوگ لحظہ بھی دیر نہ کریں گھروں سے نکل کر سڑکوں پر آجائیں۔ لوگ اسے کسی دیوتا کی طرح پوجتے تھے۔ اس کی نظریں ہر شخص جس کا تعلق کسی بھی رنگ ونسل، دھرم اور مذہب پر تھا۔ انسان کے لئے صرف اور صرف انسانیت درکار ہے وہ سیاست اور حکومت سے اتنی دور تھا اور اس نے زمین آسمان جتنا فاصلہ برقرار رکھا ہوا تھا۔

انسپکٹر چوہدری گپتا داس نے جب سے کلکتہ سے آکر یہاں چارج سنبھالا تھا تب سے اس کے گروہ کی سرگرمیاں بہت بری طرح متاثر ہوگئی تھیں۔ اس بات نے نریندرا مودی کو تشویش میں مبتلا کردیا تھا کہ انسپکٹر گپتا داس مجرموں کے لئے بڑا سخت گیر اور ان کا زبردست دشمن تھا۔ اس لئے کہ وہ ایک فرض شناس، دیانت دار اور با اصول افسر تھا...... حسین عورت...... کروڑوں کی رشوت اور بڑے سے بڑے لالچ سے اس کے فرض اور ضمیر کو خریدا نہیں جاسکتا تھا۔

پھر آکاش کے کانوں میں کہیں دور سے اتم بابو کی آشنا آواز سنائی دی۔

''تم کیا سوچ رہے ہو...... ؟ نریندرا مودی کے گروہ کا قلع قمع ہوگیا تو اس دیش پر تمہارا بھی احسان ہوگا...... تمہیں انسانیت کی خاطر اپنی زندگی داؤ پر لگانا ہوگی... زندگی کا ایک اولین مقصد انسانیت کے لئے کام آنا ہوتا ہے۔ ورنہ عام آدمی اور جانور میں کیا فرق رہ جاتا ہے... اس شبھ کام میں دیر نہ کرنا۔''

☆......☆......☆

اب دنیا بہت بدل گئی تھی اور برق رفتاری سے بدلتی جارہی تھی...... پہلے مافیا کا کوئی پتا اور نام ونشان نہ تھا۔ لیکن دنیا میں اب ایسا کوئی خطہ یا ملک نہیں رہا تھا جہاں کوئی مافیا نہ ہو۔ جادو...... پراسراریت اور جادوگر اس دنیا سے مختص ہوگئے۔ اور قصہ پارینہ بن گئے تھے... سائنس نے اس سے کہیں زیادہ اپنا راج، طاقت اور اثر قائم کرلیا تھا۔

بنگال میں نریندر مودی کی بھی ایک مافیا تھی۔ کون سا شعبہ ایسا تھا جس میں اس کی شاخیں نہ ہوں۔ سیاست، صنعت، منشیات، کاروبار اور اسمگلنگ کا وہ بے تاج بادشاہ بنا ہوا تھا۔ اس کے پاس لانچیں، اسٹیمر، ہیلی کاپٹر اور چھوٹے طیارے موجود تھے۔ بظاہر وہ کامیاب بزنس مین لیکن پس پردہ وہ ایک مافیا اور دہشت گرد بھی تھا اور بلیک میلر بھی۔ وہ ان حسین اور نوجوان لڑکیوں کو بلیک میل کرتا تھا جو خوابوں کے پیچھے اندھا دھند دوڑتی تھیں۔ انہیں غلاظت کے دلدل میں دھکیل کے ان کی ایسی تصاویر بناتا تھا کہ وہ اس کی ہر بات، حکم اور کہنا ماننے پر مجبور ہوتی تھیں۔ جو لڑکیاں لڑکے ایک بار اس کے چنگل میں پھنس جاتے موت ہی سے نجات ملتی تھی جس سے عام لوگ اس سے بہت پریشان اور ہراساں تھے۔

آکاش نے نہ صرف نریندر مودی کے اڈوں کی

بلکہ اس مافیا گروہ کے ممبروں کی ایک فہرست انسپکٹر گپتا داس کے حوالے کردی تھی۔ وہ بہروپ بھر کے رات کے وقت اس کے ہاں پہنچا تھا۔ انسپکٹر گپتا داس بہت خوش ہوا۔ اس نے آکاش کو بتایا تھا کہ نریندر مودی پر فوری طور پر ہاتھ ڈالنا آسان نہیں ہے۔ اس میں کچھ وقت درکار ہے۔ اس لئے کہ اور بھی ٹھوس ثبوت حاصل کرنے ہیں۔ ٹھوس ثبوت کے بغیر مافیا کو زیر کرنا آسان نہیں ہوتا ہے۔

دوسرے دن رات کے تین بجے دروازے پر کسی نے دستک دی۔ وہ تھوڑی دیر پہلے ہی نیند سے پیاس کی وجہ سے بیدار ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھولا تو اسے نظروں پر یقین نہیں آیا۔ نریندر مودی کی نوجوان سیکریٹری نمرتا کھڑی تھی۔ وہ دروازہ کھلتے ہی سرعت سے گھس آئی جیسے کوئی اس کے تعاقب میں ہو۔ اس نے دروازہ بند کر کے چٹخنی لگادی۔

''نمرتا...! تم؟'' اس وقت... اتنی رات گئے؟'' آکاش نے تحیر زدہ نظروں سے اوپر سے نیچے دیکھا۔ ''خیریت تو ہے؟''

''خیریت ہی نہیں ہے اس لئے نا وقت آئی ہوں... تمہاری جان خطرے میں ہے۔'' وہ پھولی ہوئی سانسوں پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

''وہ کس لئے...؟'' آکاش کی حیرت دو چند ہوگئی۔

''اس لئے کہ تم نے نریندر مودی کے خلاف پولیس انسپکٹر گپتا داس سے جو مخبری کی ہے اس کی اطلاع اسے ہوگئی ہے۔ اس کے تھانے کے حوالدار نے ٹیلی فون پر باس کو بتایا کہ تم نے غداری کی ہے۔ وہ اب رانو کے انتظار میں ہے۔ جو جمشید پور ٹاٹا نگر گیا ہوا ہے... وہ صبح چھ بجے یہاں پہنچے گا۔ اس کے پہنچتے ہی وہ اسے جو کام سونپے گا تمہیں ذبح کرنے کا ہوگا۔''

''تمہارا بہت بہت شکریہ نمرتا...!'' اس نے ممنونیت سے کہا۔ ''میں تمہارا یہ احسان کبھی نہیں بھول سکوں گا؟''

''تم جتنا جلد ہوسکے اس شہر سے نکل جاؤ... لیکن ریل گاڑی، ہوائی جہاز یا بس سے سفر نہیں کرنا۔'' نمرتا نے اسے تاکید کی۔

''وہ کس لئے...؟'' آکاش نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ ''اس میں حرج کیا ہے؟''

''باس نے فون پر اپنے تمام آدمیوں کو تمہارے بارے میں بتادیا ہے۔'' نمرتا نے بتایا۔

''پھر میں کس راستے سے فرار ہوں؟'' اس نے بدحواسی سے پوچھا۔

''تم گھاٹ پر جاؤ... وہاں سے موٹر بوٹ لے کر ہندوستان کی طرف نکل جاؤ۔ تمہارے لئے کلکتہ ہر طرح سے محفوظ شہر ہوگا... گو سفر لمبا ہے لیکن راستے میں دو تین جزیرے آتے ہیں۔ تم وہاں ٹھہر اور ستا کے اپنا سفر جاری رکھ سکتے ہو؟''

''نمرتا...! ایک بات تو بتاؤ کہ تم نے مجھ پر یہ احسان کیوں کیا...؟'' آکاش نے حیرت اور تجسس سے پوچھا۔

''اس لئے کہ تم بابو مجھے اپنی بچی کی طرح چاہتے تھے اس ناتے میں تمہیں اطلاع دینے آئی۔'' نمرتا نے جواب دیا۔

☆☆☆

نمرتا نے ایک اور بڑا زبردست خطرہ مول لیا اور اپنی زندگی کی پروا نہیں کی۔ موت کے دہانے پر کھڑی ہوگئی تھی۔

اس نے اپنی گاڑی میں مجھے بندرگاہ کے قریب چھوڑا۔ اس نے بڑی محبت اور جذباتی انداز سے الوداع کہا۔ اس وقت وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ وہ ٹرمینل پر اس جگہ پہنچا جہاں نریندر مودی کی لانچیں، اسٹیمر اور موٹر بوٹس کھڑی ہوئی تھیں... اس نے ایک چھوٹی اور تیز ترین موٹر بوٹ لی۔ جس میں چپو بھی رکھے ہوئے تھے۔ اس میں سوار ہوکر رات کے اندھیرے میں آگے نکل گیا۔ اس وقت وہاں کوئی موجود نہیں تھا۔ اگر کوئی تھا۔ کسی کی نظر اس پر پڑی تھی تو اسے اس کی خبر نہ ہوسکی۔ اور

پھر اسے اس کی کوئی پروا اور فکر نہ تھی۔

اسے نہ صرف موٹر بوٹ بلکہ لانچ اور اسٹیمر بھی چلانا آتا تھا۔ وہ منشیات کی اسمگلنگ کے لئے انہیں استعمال کرتا تھا۔ وہ صبح ہونے تک گھاٹ کے ساحل سے بہت دور نکل آیا تھا۔ اسے خوف ودہشت، عجلت اور بدحواسی میں کھانے پینے کی چیزیں لینے کا بالکل خیال نہیں رہا تھا۔ کیوں کہ اس وقت اپنی جان پیاری تھی۔ نمرتا نے ایک بسکٹ کا ڈبا اور جو منرل واٹر کی بوتل اس کی گاڑی میں موجود تھی وہ اسے دے دی تھی۔ دوپہر تک بسکٹ ختم ہوچکے تھے اور پانی کے چند گھونٹ رہ گئے تھے..... دور دور تک کوئی جزیرہ اور ساحل نظر نہیں آیا تھا کہ جہاں وہ کچھ دیر آرام کرتا اور ستالیتا۔

رات تو جیسے تیسے کرکے گزر گئی تھی۔ دوسرا دن طلوع ہوا تو اس کے لئے کسی قیامت سے کم نہیں تھا۔ صبح ہی اسے اندازہ ہوچکا تھا کہ ساون، بادوباراں کا طوفان ساتھ شروع ہونے والا ہے اور پھر فیول تو کل شام ہی ختم ہوچکا تھا۔ چپو چلاتے چلاتے اس کے بازو شل ہوجاتے تو وہ چپو کشتی میں رکھ کے لیٹ جاتا اور کشتی کو لہروں کے رحم وکرم پر چھوڑ دیتا۔ اسے کچھ اندازہ نہ تھا کہ اس کی موٹر بوٹ کس سمت جارہی ہے..... اس کی منزل کون سی ہے.....؟

سہ پہر کے وقت اس کی حالت ایک مردے سے بھی بدتر تھی۔ بھوک وپیاس نے اسے نڈھال کردیا تھا۔ گرمی اس قدر تیز تھی کہ پیاس سے برا حال ہورہا تھا۔ حلق میں کانٹے چبھنے لگے تھے۔ سمندر کا پانی بہت ہی کھارا تھا اور وہ پینے کے ہرگز قابل نہیں تھا۔ اگر وہ غلطی اور پیاس سے بے تاب ہوکر پی لیتا تو اس کے پیٹ کا سارا نظام الٹ جاتا اور انتڑیاں زہر آلود ہوجاتیں۔ وہ جانتا تھا۔ کیوں کہ اسے اس بات کا تجربہ ماضی میں ہوچکا تھا۔ وہ ہر دس پندرہ منٹ کے بعد چاروں اطراف دیکھتا تھا کہ شاید کسی سمت ساحل نظر آجائے۔ دل میں ایک خوف دامن گیر تھا کہ اس کے پالتو کتے اس کی تلاش میں نہ نکل آئیں۔

اس کے باس کے نزدیک مخبری اور غداری نہایت سنگین نوعیت کے جرم تھے۔

وہ اب تک دس مخبروں کو بے رحمی اور درندگی سے موت کی نیند سلا چکا تھا۔ اس کے نزدیک یہ ناقابل معافی جرم تھا۔ وہ اپنے دشمن کے ساتھ کوئی رعایت نہیں کرتا تھا اور اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھتا تھا جب تک اس کی لاش قبر کی سی گہرائی میں دفن کردی نہ جائے یا پھر اس کی لاش کے ٹکڑے کرکے مچھلیوں کی خوراک نہ بنادی جائے۔

آکاش نے دل میں سوچا..... باس کو علم ہوچکا ہوگا کہ وہ سمندر کے راستے موٹر بوٹ سے فرار ہوچکا ہے۔

ایک موٹر بوٹ گھاٹ پر گم پاکر اس کے آدمیوں نے اطلاع دے دی ہوگی۔ اس کے آدمی اس لئے اس کے تعاقب میں نہیں آئے کہ وہ جانتے ہوں گے موٹر بوٹ میں یہ سفر سمندر اور تیز گرمی میں اس کے لئے دردناک موت کا باعث ہوگا..... حقیقت بھی یہی تھی کہ وہ بھوک، پیاس اور دھوپ کی شدت کے باعث لمحہ بہ لمحہ موت کے قریب ہوتا جارہا ہوگا۔ نظروں کے سامنے فرشتہ اجل کھڑا مسکراتا دکھائی دے رہا تھا۔ جیسے وہ اسے خوش آمدید کہہ رہا ہو۔

جب اس کے لئے پیاس ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ یہ جانتے ہوئے بھی کہ سمندر کا پانی کسی زہر سے کم نہیں ہے اس نے دونوں ہاتھوں کے پیالے میں بھر کے پی لیا۔

پانی حلق میں پہنچا بھی نہیں تھا کہ اسے بڑے زور کی ابکائی آئی اور اس نے قے کردی..... قے ہوتے ہی وہ مزید نڈھال ہوگیا۔ پھر اس نے ایسی نقاہت محسوس کی کہ اس پر موت کی سی غنودگی طاری ہونے لگی۔

سمندر میں تیز ہوائیں چلنے کی وجہ لہروں میں طغیانی آنے لگی..... آسمان کے افق گہرے بادل چھانے لگے تو اندھیرا پھیل گیا..... اسے صرف اتنا یاد رہا کہ ایک بڑی لہر نے کشتی کو اس طرح اوپر اٹھالیا.....

جس طرح ایک پہلوان اپنے حریف کو پھینکنے کے لئے اوپر اٹھالیتا ہے۔ پھر اس لہر نے ایک کھلونے کی طرح پھینک دیا تو اسے لگا کہ وہ سمندر کی قید میں نہیں موت کی آغوش میں جارہا ہو۔

وہ ہوش میں آنے لگا تو سب سے پہلے اسے یہ خیال آیا کہ وہ کسی قبر کی گہرائی میں لیٹا ہوا ہے۔

اس نے ایک گہری سانس لی..... پھر اس نے محسوس کیا کہ وہ کسی نرم ونازک چیز پر لیٹا ہوا ہے..... اسے جو دوسرا خیال آیا وہ یہ کہ کہیں وہ پرلوک میں تو موجود نہیں ہے.....؟ اس نے اپنے چہرے پر تمازت محسوس کی..... چند لمحوں کے بعد اسے یہ محسوس ہوا کہ وہ ریت پر لیٹا ہوا تھا۔ اٹھ کر بیٹھنے کے لئے اس نے اپنی ساری طاقت جمع کررہا تھا کہ ایک بڑی موج آئی اور اس نے آکاش کو اپنی آغوش میں لے کر مزید دور پھینک دیا۔

چند ثانیوں کے بعد اس نے ایک اور بڑی موج کو اپنی طرف آتے دیکھا تو کسی نہ کسی طرح ہمت کرکے اٹھا کہ کہیں یہ موج اسے واپس سمندر میں نہ پھینک دے۔ اس کی آغوش میں نہ ڈال دے۔ پھر وہ چند قدم بمشکل چلا تھا کہ نقاہت سے گر پڑا۔ لیکن اب خطرے والی کوئی بات نہ تھی کہ موج شکار کرلے۔ اب وہ سمندر کی موجوں کی دسترس سے باہر ہوچکا تھا۔

پھر اس پر غشی طاری ہوگئی۔ اس پر اس وقت تک غشی طاری رہی جب تک دن خاصا چڑھ نہ آیا۔ اب کچھ کچھ سی توانائی محسوس ہورہی تھی۔ پھر وہ اٹھا۔ آسمان کے سینے اور کسی سمت کے افق پر بادل کا ایک ٹکڑا تک نہ تھا۔ صاف وشفاف نیلا آسمان چمک رہا تھا۔ سمندر کے کنارے سفید براق پرندے فضا میں پرواز کررہے تھے۔ اس نے اطراف کا جائزہ لیا۔ ساحل کی لمبائی ایک میل سے بھی زیادہ ہوگی۔ ایک طرف چٹانیں تھیں اور دوسری طرف ناریل، سپاری اور تاڑ کے پتلے اور لمبے درخت تھے۔ اسے معاً خیال آیا کہ کہیں وہ سری لنکا کے کسی جزیرے میں تو نہیں پہنچ گیا.....؟ وہ کوئی دو تین مرتبہ اسمگلنگ کی غرض سے بڑی لانچ لے کر کولمبو جاچکا تھا۔ لیکن تیز رفتار لانچ میں چار دنوں کی مسافت تھی۔ کوئی بعید نہیں تھا کہ وہ سری لنکا کی حدود میں واقع کسی جزیرے میں پہنچ گیا ہو۔ یہ اس کا قیاس تھا۔

یہ دیکھ کر اس کی رگوں میں لہو منجمد ہوگیا کہ درختوں کے جھنڈ میں سمندری چٹانوں کی نوکیں چوروں کی طرح چھپی ہوئی تھیں۔ اسے سمندر کی موجوں نے انہی چٹانوں کے درمیان سے باہر پھینکا تھا۔ اگر وہ کسی ایک چٹان سے بھی ٹکرا جاتا تو اس کے زندہ بچنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ معجزانہ طور پر شاید اس لئے بچ گیا تھا کہ اس کی کوئی نیکی کام آگئی تھی۔

ابھی تک اس کے حواس قدرے معطل تھے۔ اس نے کھڑے ہوکر متلاشی نظروں سے چٹانوں کے درمیان دیکھا کہ شاید وہاں اس کی موٹر بوٹ موجود ہو..... وہاں اور نہ سمندر میں اس کا کوئی نام ونشان نظر نہ آیا۔ وہ نجانے کس سمت نکل گئی تھی...؟ پھر سمندر کی تہہ میں چلی گئی تھی۔ اب وہ اس جزیرے کا قیدی ہوکر رہ گیا تھا۔

اب جو بھی صورت حال اس سے نمٹنا اس کا کام تھا۔ اس لئے وہ کھڑا ہوگیا۔ اب وہ نقاہت نہیں تھی جس کا اس پر کچھ دیر غلبہ تھا۔ جسم میں کچھ حرارت آگئی تھی۔ پھر وہ درختوں کی سمت چل پڑا۔ جب اس نے محسوس کیا کہ اس کے پیروں میں کمزوری محسوس نہیں ہورہی ہے تو اس نے اپنی رفتار قدرے تیز کردی تاکہ مسافت جلد سے جلد طے ہوجائے۔

اس نے جنگل کی حدود میں قدم رکھا تھا کہ دفعتاً خاموش فضا میں دور سے ایک آواز سنائی دی..... یہ آواز ہیلی کاپٹر کی تھی۔ وہ اس آواز سے آشنا تھا..... یہ مانوس آواز تھی۔ اس کے باس کے پاس تین ہیلی کاپٹر تھے جو اسمگلنگ اور اسلحہ کی ترسیل کے لئے ہندوستان کی کسی سرحد کے قریب اتارے جاتے تھے۔ وہ لپک کر درختوں کے پیچھے جاچھپا۔ ہیلی کاپٹر کم بلندی پر پرواز کرتا ہوا کنارے پر اتر گیا۔ اس میں سے دو مسلح

بدمعاش اترے۔ ان میں سے ایک کے ہاتھ میں جدید ترین امریکی ساخت کی دوربین رائفل تھی۔ جو رانو تھا...... اور دوسرا موتی لال تھا۔ موتی لال کے ہاتھ میں ایک جدید ترین دور تک مارنے والی شارٹ گن تھی۔

موتی لال جلاد قسم کا تھا۔ اس کے سینے میں دل نہیں پتھر تھا۔ وہ ایذا رسانی میں شقی القلب تھا۔ وہ دشمن کی گردن میں لوہے کا تار ڈال کر اسے بل دے کر اس کی جان لے کر خوشی سے دیوانہ وار رقص کرتا تھا۔ آدمی کو اذیت پہنچا کر تسکین ہی محسوس کرتا تھا۔ وہ دونوں کھڑے دوربین سے بڑی دیر تک چاروں سمتوں اور سمندر کا جائزہ لیتے رہے۔ اچھی طرح اطمینان کرنے کے بعد پھر ہیلی کاپٹر میں سوار ہوگئے۔ پھر وہ شمال کی جانب نیچی پرواز کرتا ہوا چلا گیا۔

اس کا باس اس کی تلاش میں تھا۔ وہ شاید اس سے یہ معلوم کرنا چاہتا ہوگا کہ اس نے انسپکٹر گپتا اس کو گروہ کے بارے میں کیا کچھ بتایا؟ پھر معلوم کرنے کے بعد وہ اسے موت کی نیند سلا دینا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر کے واپس جانے کے بعد اس کی جان میں جان آئی۔ اگر وہ ان کی نظروں میں آجاتا تو وہ دونوں شاید اسے گرفتار کر کے لے جاتے، یا بھون دیتے۔ شاید اس کا باس ہیلی کاپٹر میں بیٹھا تھا۔ اور پھر اسے اس بات کا اندازہ ہوگیا کہ یہ جزیرہ بنگال کے قریب ہے۔ سری لنکا کی حدود میں نہیں......

ہیلی کاپٹر نظروں سے اوجھل ہونے کے بعد وہ اس چٹان کی طرف بڑھ گیا جو سب سے اونچی تھی۔ جہاں سے اس علاقے کا جائزہ لیا جاسکتا تھا۔ چاروں طرف ایک پرسکون سا سناٹا طاری تھا۔ فضا میں چرند پرند نغمہ سرا تھے جس سے ایک حسن پیدا ہوگیا تھا۔

اب چونکہ آکاش کو کسی بات کا خوف وخطرہ نہیں رہا تھا اس لئے وہ بے فکر وہ کر اطمینان سے چٹان پر چڑھنے لگا۔ پھر بھی چوکنا تھا کہ کہیں ہیلی کاپٹر دوبارہ واپس نہ آجائے۔ اس جزیرے پر آبادی کا امکان تھا۔ لیکن ایسے کوئی آثار نظر نہیں آئے۔ پھر وہ چٹان سے اتر کے ایک سمت چل پڑا۔ اسے ایک جگہ کالے انگور کی بیل نظر آئی۔ یہ جنگلی انگور تھا۔ یوں کہ پیاس کی شدت سے حلق میں کانٹے چبھ رہے تھے اس لئے اس نے ایک انگور توڑ کر اسے چوسا۔ اس میں اتنا رس نہیں تھا کہ جو پیاس بجھا سکے۔ پھر بھی کسی حد تک حلق تر ہوگیا۔ پھر اس نے مزید انگور اور چوس کر پیاس بجھائی۔

اس نے ایک راستہ دیکھا جو چٹان سے جارہا تھا۔ جہاں شاید لوگوں کی آمد و رفت رہی تھی۔ یہ راستہ دو گز آگے جا کر بائیں جانب مڑ گیا اور قدرے اوپر کی جانب چلا گیا تھا۔ جب وہ اس بلندی پر پہنچا تو خاصے فاصلے پر قدرے اونچائی پر ایک مکان نظر آیا جس میں ایک بڑا سا برآمدہ تھا۔ تین چار کمرے دکھائی دیئے تھے۔ مکان کچھ زیادہ قدیم نہ تھا۔ اس مکان کے اردگرد میدان تھا اور جنگل سے خاصے فاصلے پر تھا۔

وہ تھوڑی دیر تک کھڑا اس مکان کا جائزہ لیتا رہا۔ اس خیال سے کہ اس میں کوئی رہتا ہو تو وہ باہر آئے۔ ویسے باہر سے کوئی اندر جاتا دکھائی نہ دیا۔ اسے اس مکان میں زندگی کے آثار دکھائی نہیں دیئے۔ اندر سے ویرانی اور خاموشی جھانک رہی تھی۔ پھر بھی وہ ہوشیار اور چوکنا اور محتاط تھا۔ برآمدے اور مکان کی کھڑکیوں میں سے اندر جھانکتا ہوا اس کی طرف بڑھتا رہا۔ دو ایک کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ وہ اپنی مزید تسلی کے لئے اس کے عقبی حصے کی طرف گیا۔ عقبی دروازہ بند تھا۔ پھر گھوم کر برآمدے میں آیا تو ہولناک سکوت ڈسنے لگا۔

اندر گھستے ہوئے اسے ایک انجانا سا ڈر اور خوف محسوس ہونے لگا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اندر کوئی عفریت موجود ہو جو کہ اس کے داخل ہوتے وہ اسے دبوچ لے گی۔ سامنے والے دروازے پر ایک ٹوٹی ہوئی بائیسکل پڑی تھی۔ اس کے قریب ٹوٹی ہوئی تپائی اور بید کی کرسی پڑی تھی۔ پھر وہ دبے پاؤں بڑھا اور ایک کمرے کی کھڑکی سے اندر جھانکنے لگا۔ شاید کسی کی آواز سنائی دے۔ لیکن اندر جو سکوت تھا وہ اس قدر ہیبت ناک تھا کہ اندر قدم رکھنے کی بالکل بھی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔

اسے ایسا محسوس ہورہا تھا کہ اندر موجود لوگوں نے اس کی آہٹ سن کر اپنی سانسیں روک لی ہیں۔ اسے بڑی پراسراریت سی لگ رہی تھی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس کے اندر گھستے ہی گھر میں موجود لوگ اس سے جارحانہ انداز سے پیش آئیں......؟''

آکاش نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں کبھی کسی خوف اور ڈر کو قریب پھٹکنے نہیں دیا تھا۔ ہر طرح کے خطرات اور دہشت گردی کا ہمیشہ مردانہ وار مقابلہ کیا تھا۔ لیکن نجانے کیا بات تھی کہ اس خالی مکان نے اس کے دل میں طرح طرح کے وسوسے اور اندیشے پیدا سا کردیئے تھے اور پیروں میں جیسے بیڑیاں ڈال دی تھیں۔ اس میں اندر جانے کی ہمت نہیں ہورہی تھی۔

پھر اس نے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہوکر جو کھلا ہوا تھا، آواز دی۔

''کیا اندر کوئی ہے......؟''

اس کی آواز اندر کے کمروں میں گونج گئی۔ اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ پھر اس نے پہلے سے بھی بلند آواز میں کہا۔

''کوئی اندر ہے تو باہر آجائے...... میں ایک اجنبی مسافر ہوں۔''

دوسری مرتبہ بھی اسے جواب نہیں ملا تو اس نے دروازہ بری طرح پیٹ ڈالا۔

''آخر آپ لوگ باہر کیوں نہیں آرہے ہیں؟''

اب اسے پوری طرح اندازہ ہوگیا کہ مکان کے اندر کوئی نہیں ہے...... اگر کوئی ہوتا تو جواب ضرور ملتا اور پھر وہ باہر آتا۔

اس نے ایک مرتبہ پھر مکان کے باہر کے ماحول اور اطراف کا سرسری جائزہ لیا اور پھر دوسرے کمرے کی سیڑھیاں چڑھ گیا۔ معاً اس کی نگاہ ایک درمیانہ سائز کے ٹین کنستر پر پڑی۔ قریب جاکر دیکھا تو وہ بارش کے شفاف پانی سے بھرا ہوا تھا۔ اسے یہ یہاں دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی۔ پھر اس نے کنستر سے پانی پینے لگا۔ پانی پینے کے بعد اس نے اپنا واہمہ دور کرنے کے لئے پھر ایک بار مکان کے گرد چکر لگایا۔ پھر برآمدے کی طرف آگیا۔ اسے مکان کے بائیں جانب قریب ہی پھولوں کی کیاریاں نظر آئیں۔ یہاں شاید پھولوں کے دلدادہ لوگ رہتے تھے۔ معلوم نہیں کیوں اور کہاں چلے گئے تھے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ انہیں دہشت گرد پکڑ کے لے گئے ہوں یا پھر وہ دہشت گردوں کے خوف سے بھاگ نکلے ہوں۔ وہ مکان کے اندر گھسنے سے پہلے پھر ایک بار مکان کا جائزہ لے کر اپنا اچھی طرح سے اطمینان کرنا چاہتا تھا۔

اس مکان کے قریب ایک اور چٹان بھی تھی۔ وہ وہاں گیا تو اسے کچھ دور جھونپڑیاں دکھائی دیں اور ان سے تھوڑی دور سمندر دکھائی دیا۔ یہ جھونپڑیاں ماہی گیروں کی ہوسکتی تھیں۔ اس نے جھونپڑیوں کے پاس جاکر نہیں دیکھا۔ وہ غیر آباد تھیں۔ اسے وہاں ایک کشتی بھی دکھائی نہیں دی۔ یہاں جو لوگ تھے وہ شاید کسی وجہ سے اس جزیرے سے چلے گئے تھے۔ ان کے جانے کی وجہ اس کے کچھ سمجھ میں نہیں آئی۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ دوبارہ مکان کے پاس آیا تو یک دم سے اس کی بھوک کھل اٹھی۔

اب تک بھوک اس لئے قابل برداشت اور قابو میں تھی کہ اس کی ساری توجہ مکان کی طرف لگی ہوئی تھی اور اس کے علاوہ وہ خوف اور دہشت سے بھی دوچار تھا۔ اس کے دل میں جو ہیبت تھی اب وہ دور ہوچکی تھی۔

وہ نہ صرف سیر ہوکر کھانا کھانا چاہتا تھا بلکہ آرام کی بھی ضرورت محسوس کررہا تھا۔ وہ سب سے پہلے اپنے ان دونوں مسئلوں کو حل کرنا چاہتا تھا۔ آرام تو ممکن تھا لیکن جب تک پیٹ میں ایندھن نہ پڑ جائے اس وقت تک آرام نہیں ہوسکتا...... بھوک کا مسئلہ اس ویران جزیرے پر کیسے حل کرے......؟ اس کی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔

پھر وہ بے خوفی سے اس مکان میں بالآخر گھس گیا۔ اسے اپنے قدموں کی آواز کچھ سنائی نہیں دیا تھا۔ اس مکان کے اندر کل تین کمرے تھے جبکہ باہر سے چار کمرے معلوم ہوتے تھے۔ ان کمروں میں اخبارات کی

ردی بھری ہوئی تھی۔ یہ اخبارات بنگلہ زبان اور انگریزی کے تھے اور بنگال سے ہی شائع ہوتے تھے۔ اس نے ایک کمرے کی کھڑکی کے باہر جھانکا۔ مکان کچھ بلندی پر واقع تھا۔ اسے یہاں سے بندرگاہ نظر آ رہی تھی اور اس کے قریب اس مکان کی ساخت کا ایک اور مکان تھا۔ وہ ابھی وہاں نہیں گیا تھا۔

اس مکان میں کھانے کے لئے کچھ نہ تھا۔ اس نے اس مکان کا باورچی خانہ اور تمام کمرے بھی چھان مارے۔ پھر ایک آس لے کر شاید وہاں کھانے کے لئے کچھ مل جائے۔ دوسرے مکان کی طرف چل پڑا۔

وہ کئی بار بری طرح چونکا... کیوں کہ اسے ایسا محسوس ہوا تھا جیسے کوئی غیر محسوس انداز سے اس کے تعاقب میں چلا آ رہا ہو۔ جب بھی وہ ایسا محسوس کر کے مڑ کے دیکھتا تو کسی کو نہیں پاتا۔ حالاں کہ وہ وہمی شخص نہیں تھا۔

کہیں یہ جزیرہ آسیبی تو نہیں ہے...؟ بنگال میں سائنس کی حیرت انگیز ترقی اور ایجادات کے باوجود ابھی بھی جادو کی باقیات موجود تھیں۔ ماضی میں مصر اور افریقہ اور بنگال بھی جادوگروں کے لئے مشہور تھا۔ بنگال کے جادوگروں کو مانا جاتا تھا۔ آج بھی بنگال کے مختلف گوشوں بلکہ ویران اور سنسان علاقوں اور دور افتادہ بستیوں میں بس گئے تھے۔ اس جزیرے پر ان کے وجود کے امکان کو نظر نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اسے ایک اور خیال بھی آیا تھا کہ شاید بدروحیں بھی نہ موجود ہوں؟

وہ دو ایک قدم چل کر رک جاتا... پھر کسی جگہ چھپ جاتا... پھر اپنی تسلی کر کے قدم آگے بڑھاتا۔ اس طرح اسے دس منٹ کی مسافت آدھے گھنٹے میں طے کرنا پڑ رہی تھی۔ وہ اس مکان پر پہنچا۔ یہ مکان بھی خاصی بلندی پر تھا۔ وہ اپنے آپ کو چھپاتا اور محتاط انداز سے قدم اٹھاتا ہوا عقبی حصے کی طرف بڑھ گیا۔

پھر وہ عقبی حصے کی طرف پہنچ کر زور زور سے آوازیں دینے لگا۔ ''کیا اندر کوئی ہے؟''

اسے کوئی جواب نہیں ملا۔ کیوں کہ اندر گہرا سکوت محسوس ہو رہا تھا۔ اس کے لئے اب وہاں کھڑے ہو کر مزید پکارنا فضول ہی تھا۔ پھر وہ مکان کے بیرونی حصے کی طرف چلا گیا۔ برآمدے میں رک کر سوچتا رہا کہ وہ اندر جائے یا نہیں...؟ کیا اس بات کی امید ہے کہ یہاں کچھ کھانے کو مل جائے گا؟ وہ فیصلہ نہیں کر پا رہا تھا۔ نہ چاہتے ہوئے بھی وہ دوسرے لمحے اس مکان میں گھس گیا۔ جب کہ اسے یہ مکان بھی پراسرار اور آسیبی سا لگ رہا تھا۔

یہ بات اس کے لئے ناقابل فہم تھی کہ مکانات کے ہوتے ہوئے بھی آدمی کا وجود نہیں ہے...؟ وہ سب گدھے کے سر سے سینگ کی طرح غائب ہیں...

کیا وہ اس بات کو نظر انداز کرسکتا ہے کہ یہاں جو باشندے رہتے تھے انہیں بدروحوں نے خوف زدہ ہراساں اور پریشان کر کے بھگا دیا ہوگا تاکہ اپنا راج مسلط کرسکیں۔ اگر ایسا ہے تو وہ ہیں کہاں!

اندر کے ایک کمرے کے فرش پر اس نے بسکٹوں کا ڈبا اور ایک ٹوٹی ہوئی چھری پڑی دیکھی۔ اس نے لپک کر ڈبا اٹھالیا۔ جیسے کوئی نادیدہ ہستی نہ اٹھالے۔ ڈبا آدھا خالی تھا۔ باقی نصف میں خاصے بسکٹ موجود تھے۔ بڑے خستہ بھی تھے۔ پھر اس نے پل بھر کی تاخیر بھی نہیں کی ان پر ٹوٹ پڑا۔ پھر جلدی جلدی ایک ایک کر کے ندیدوں کی طرح تمام بسکٹ کھا لئے۔ جو اس کے لئے کسی من وسلویٰ سے کم نہ تھے بسکٹ اس قدر لذیذ تھے جیسے ابھی ابھی کسی بیکری میں بنے ہوں۔ اس نے بسکٹوں کا خالی ڈبا اس لئے نہیں پھینکا کہ ایسی بے سروسامانی میں ایسی چیزیں بہت کام آتی ہیں۔ پھر اس نے ڈبا ایک جگہ سنبھال کر بڑی احتیاط سے رکھ دیا۔ پھر وہ پہلے والے مکان میں آ گیا۔ مکان میں جا کر لیٹنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے نیند آ جائے اور کوئی نادیدہ ہستی یا بدروح آ کر اس کا گلا دبادے۔ اس لئے مکان سے باہر آ کر گھنی جھاڑیوں میں چھپ کر لیٹ گیا۔ یہ جگہ ہر لحاظ سے بہت محفوظ تھی۔ اب وہ کسی آدم زاد یا پھر زمیندار اموری کے پالتو غنڈے یہاں اس کی تلاش میں آ نہیں سکتے تھے۔ زمین پر جو خود رو گھاس تھی اس قدر نرم تھی کہ لیٹتے

ہی اسے نیند نے دبوچ لیا۔

جب وہ بیدار ہوا تو دیکھا کہ دن ڈھل چکا ہے۔ سورج جو مشرق سے مغرب کی طرف سفر کررہا تھا۔ وہ اب مغرب کے قریب تقریباً پہنچ چکا تھا۔ موسم بھی بہت بہتر ہوگیا تھا۔ دھوپ میں تمازت نہیں رہی تھی۔ جو تھی وہ دم توڑ چکی تھی۔ ہوا بھی خوش گوار چل رہی تھی۔ وہ ایک لمبی جماہی لے کر اٹھ بیٹھا۔ لمبی گہری نیند لینے سے طبیعت خاصی ہلکی پھلکی ہوگئی تھی۔ بسکٹ کھانے سے پہلے اس نے جو نقاہت محسوس کی تھی وہ بھوک اور پیاس کی وجہ سے تھی۔ اب وہ اپنے آپ کو قدرے بہتر اور توانا محسوس کررہا تھا۔

پھر وہ کھانے کی تلاش میں نکلا۔ اسے افسوس اور پچھتاوا تھا کہ اس نے سارے بسکٹ کیوں کھالیے۔ اس میں سے کچھ بچا کر تو رکھتا۔ اس وقت کام آتے۔ لیکن اس وقت ناقابل برداشت بھوک نے اسے کچھ سوچنے کی مہلت ہی نہیں دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ کوئی ایسی چیز مل جائے جو کھانے کے کام آسکے۔ اس نے کچھ مسافت طے کی تھی کہ زمین پر ناریل گرا ہوا دکھائی دیا۔ اس نے اسے توڑ کے اس کا پانی پیا..... اور پھر اس کا گودا کھرچ کے کھالیا جو ملائی کی طرح تھا جس سے جسم میں ایک قوت آگئی۔

اسے اچانک یاد آیا کہ مکان کے قریب سے گزرتے ایک راستے کو دیکھا تھا۔ یہ راستہ کہیں جاتا تو ہوگا۔ یہ ایک رہ گزر سی لگتی تھی۔ اسے اس پراسرار اور غیر آباد جزیرے کی ویران اور تنہائی سے دہشت ہونے لگی..... اس نے سوچا، کاش! کوئی ہوتا جس سے وہ باتیں کرتا۔ پھر جانے کیا ہوا کہ وہ خود کلامی کرنے لگا بلند آواز سے اس طرح کہا جیسے کوئی سننے والا موجود ہو.....

''کیا تم بتا سکتے ہو یہ راستہ کہاں جاتا ہے.....؟ ابھی..... ! تم نہیں جانتے..... یہ کیسے ہوسکتا ہے میرے بھائی! حیرت ہے یہ راستہ یقیناً کہیں ضرور جاتا ہے..... میرے ساتھ چلو..... تمہیں بتاتا ہوں..... چلو گے؟''

اسے اپنی آواز بڑی عجیب، ویران، کھوکھلی اور کہیں دور سے آتی محسوس ہوئی۔ اسے لگا جیسے یہ کسی اجنبی کی آواز ہو۔

اسے اب اس راستے پر چلنے کے سوا چارہ نہیں رہا تھا۔ وہ چلتا رہا۔ اب اس کا کام چلنا ہی رہ گیا تھا۔ یہ راستہ اسے گھنے جنگل میں لے گیا۔ وہاں بلی کی جسامت سے دگنے بڑے بڑے چوہے..... چھپکلیاں اور ایسے ایسے اقسام کے زہریلے کیڑے مکوڑے اور ادھر ادھر بھاگ رہے تھے جو اس نے اپنی زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے..... یہی مخلوق اس جزیرے کی آبادی معلوم ہوتی تھی۔ پھر اس خیال سے اس کے جسم میں ڈر اور خوف سنسنی بن کر دوڑ گیا۔ سانپ ہوئے تو وہ کیا کرے گا؟ اس کے پاس بچاؤ کا کوئی ہتھیار بھی تو نہیں تھا..... چوں کہ اس راستے پر ایک سانپ بھی نظر نہیں آیا اس لئے وہ چلتا گیا۔

بنگال میں جب کوئی سیلاب اور طوفان آتا تو وہاں امراض پھوٹ پڑتے تھے۔ ان امراض کی وجہ سے بعض گاؤں اور دیہات اور جزیرے خالی ہوجاتے تھے۔ اس جزیرے پر بھی شاید کوئی وبائی مرض پھوٹ پڑا تھا جس کی وجہ سے لوگ جزیرہ خالی کرکے چلے گئے تھے۔ اس پر آبادی نہ ہونے کا سبب یہی نظر آیا تھا۔

وہ چوں کہ خاصی دور نکل آیا تھا۔ اس نے واپسی کا ارادہ ملتوی کردیا۔ سورج مغرب کی وادی میں غروب ہونے کے لئے نیچے ہوتا جارہا تھا..... کچھ آگے جاکر راستہ بلندی کی طرف جانے لگا۔ اب جنگل کم گھنا ہوگیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد سورج غروب ہونے والا تھا۔ اس کے ساتھ ہی دن بھی اس کی آغوش میں سما جاتا۔ راستہ بھی ختم ہوگیا تھا۔ اب اس کے سامنے چاروں اطراف ویرانی ہی ویرانی تھی کہ جو برس رہی تھی۔ دکھائی دے رہی تھی۔ وہ ایک جگہ رک گیا۔ اس پر حیرت چھائی ہوئی تھی۔ پھر اس حیرت کی جگہ خوف نے لے لی۔ رات آنے میں کوئی دیر نہیں تھی اور نہ ہی اسے رات کا کوئی خوف تھا..... خوف اس بات کا تھا کہ وہ رات کہاں گزارے گا۔ پھر وہ چاروں طرف دیکھنے لگا۔ پھر اس کی

نگاہ مخالف سمت اٹھ گئی اور ایک جگہ مرتکز ہوگئی۔ سامنے ایک ندی بہہ رہی تھی اور اس پر لکڑی کا ایک پل بنا ہوا تھا۔ اس پل سے قدرے فاصلے پر ایک باغیچہ بنا ہوا تھا۔ جس کی کیاریوں کی سینڈھوں میں سمندری گھونگھے اور سیپ سجے ہوئے تھے جو کسی نے بڑے قرینے سے رکھے تھے... باغیچے کے ساتھ ایک چھوٹا اور خوب صورت سا مکان بھی تھا۔ جس میں صرف ایک ہی کمرہ تھا۔ کمرے کے سامنے برآمدہ تھا۔ اس مکان کی وضع قطع کسی عبادت گاہ کی سی تھی۔ اس دروازے کے آگے تین سیڑھیاں تھیں۔

وہ یک لخت چونک پڑا۔ اسے اپنی نظروں پر یقین نہیں آیا۔ نیچے والی سیڑھی پر ایک لڑکی بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ گہرے بھورے رنگ کی ساڑی میں ملبوس تھی۔ لیکن اس کا سر سفید براق دوپٹے کی محراب میں تھا۔ سورج کی آخری سنہری کرنیں اس پر پڑ رہی تھیں جس سے اس کی عمر ظاہر ہو رہی تھی۔ اس نے دوپٹا اسکارف کی طرح باندھا ہوا تھا۔

اس نے دیکھا کہ وہ صرف جوان ہی نہیں بلکہ غیر معمولی طور پر حسین بھی ہے۔

وہ اس لڑکی کو دیکھ کر خوش ہونے کے بجائے ڈر گیا کیوں کہ یہ لڑکی ہرگز ہرگز انسان نہیں ہوسکتی۔

وبائی امراض جو دو ماہ پیشتر پورے دیش میں پھوٹے تھے شاید اس کے کارکن یہاں بھی زیادہ اموات ہوگئی تھیں۔ جس کے باعث جزیرہ خالی ہوگیا تھا... یہ جزیرہ جو پراسرار اور غیر آباد تھا اور اس پر آسیبی ہونے کا گمان ہو رہا تھا... یہ تنہا لڑکی کسی کی بدروح بھی ہوسکتی تھی... وہ توہم پرست نہ تھا۔ لیکن بدروحوں کا قائل تھا۔ بدروحوں کے بارے میں بہت ساری کہانیاں زد عام تھیں... طرح طرح کے قصے مشہور تھے۔ بہت سارے جادوگروں اور جادوگرنیوں نے بدروحوں کو اپنا موکل اور تابع بنایا ہوا تھا۔ وہ ان سے کام لیتے تھے

بنگال کی حسین اور جوان جادوگرنیاں خوب صورت، وجیہہ اور جوان لڑکوں کو مکھی، جانور اور نہ جانے کیا کیا بنادیا کرتی تھیں... وہ ان سے عشق کرتیں اور دل بھی بہلاتی تھیں... اس بات میں کوئی مبالغہ نہیں تھا اور یہ ہی من گھڑت باتیں تھیں یہ عورت کوئی بدروح ہی ہوسکتی تھی۔ اس کی رگوں میں لہو منجمد ہونے لگا۔

اس نے وہاں سے بھاگنے کا قصد کرلیا۔ پھر اس نے سوچا کہ اسے اچھی طرح تسلی کرلینی چاہئے۔ اسے اس قدر دہشت زدہ اور ہراساں ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ کیا اسے کھا جائے گی؟ اور پھر اسے ایک جوان شخص ہونے کے ناتے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے؟ وہ کیوں اس قدر بزدل اور ڈرپوک بن رہا ہے؟ اور پھر وہ ایک جرائم پیشہ بھی تو ہے؟ کبھی بھی موت اور سنگین حالات سے نہیں ڈرتا تھا اور ان کا مردانہ وار مقابلہ کرچکا تھا۔ اس نے دوسرے لمحے خود پر قابو پالیا۔ ڈر اور خوف کو دل کے ہر کونے سے نکال دیا۔

پھر وہ بجلی کی سی سرعت سے آگے بڑھ گیا... ندی کا پل عبور کرکے ایک گھنے درخت کی اوٹ میں کھڑا ہوگیا۔ اور پھر لڑکی کو چوروں کی طرح دیکھنے لگا۔ وہ اس کے اس قدر قریب تھا کہ اسے اس سفید دوپٹے میں سے جھانکتے ہوئے خوب صورت ریشمی سیاہ بال ہی دکھائی دے رہے تھے۔ اس قدر حسین لڑکی جو تصور سے کہیں زیادہ حسین ہو وہ یقیناً اس دنیا کی لڑکی نہیں ہوسکتی تھی۔ اس نے اپنی زندگی کیا سپنوں میں اتنی حسین لڑکی نہیں دیکھی تھی۔

اسے جنگل کی خاص تربیت اتم بابو نے دی تھی۔ وہ اسے دو تین مرتبہ سندر بن بھی ساتھ لے گئے تھے۔ اتم بابو نے اسے بتایا تھا کہ بعض جنگل ایسے ہیں جن میں انسان داخل نہیں ہوسکا۔ وہاں جاؤ تو قدم قدم پر حسین واہمے دکھائی دیتے ہیں... یہ لڑکی بھی حسین واہمہ ہی لگ رہی تھی۔ اپنے حسن سے فریب دے کر اس کا حشر نشر کرنا چاہتی ہوگی... ! اب اس امر میں کوئی شک وشبہ نہیں کہ یہ کوئی چڑیل ہے جو حسین لڑکی کا بہروپ بھر کے ہے تاکہ اس کا خون پی جائے... ورنہ ایک ایسی حسین اور نوجوان لڑکی اس ویران جزیرے پر اکیلے کیوں ہے؟

(جاری ہے)

قوسِ قزح

قارئین کے بھیجے گئے پسندیدہ اشعار

نہ جانے کیوں لوگ بے وفائی کر جاتے ہیں
پہلے جینے کے خواب دکھاتے ہیں پھر چھوڑ جاتے ہیں
پہلے یقین دلاتے ہیں کہ وہ صرف اور صرف ہمارے ہیں
خود دکھائے خواب پھر وہ خود ہی توڑ جاتے ہیں

(صبا محمد اسلم ... گوجرانوالہ)

تمام عمر میں ہر صبح کی اذان کے بعد
اک امتحان سے گزرا ہوں میں اک امتحان کے بعد
خدا کرے کہ کہیں اور گردش تقدیر
کسی کا گھر اجاڑے میرے مکان کے بعد

(محمد عثمان علی ... میاں چنوں)

تیری خاموشی سے لب اٹھتے ہیں شرارے بھی
کاش کوئی پھر دیکھے آج آنسو ہمارے بھی
غم اٹھائے تھے تیری وفا کے لئے ہم نے
مشکل لمحات میں پھر کوئی یوں کسے پکارے بھی

(محمد اسلم جاوید ... فیصل آباد)

عروج پر تھیں محبتیں تو کبھی جواب اذاں تک نہ دیا ہم نے
آج صنم جو روٹھا ہے تو موذن نہیں پھرتے ہیں

(ابوہریرہ بلوچ ... بہاولنگر)

کہتا ہے کوئی نغمات لکھوں میں جھیل سی اُس کی آنکھوں پر
کہتا ہے کوئی اشعار لکھوں میں پھول سی اس کی باتوں پر
آنکھوں کی زبانی نظم کہوں چپکے چپکے ہنستے ہنستے
کہتا ہے کوئی لکھوں میں غزل اُس شوخ کے سندر پاؤں پر

(آصف شہزاد ... فیصل آباد)

کیا کہیں کچھ کہا نہیں جاتا
تمہاری جدائی کا دکھ سہا نہیں جاتا
یہ تھکی ہوئی سانسیں تمہیں آواز دے رہی ہیں
لوٹ آؤ ابو جان کہ تم بن رہا نہیں جاتا

(آصف سراج ... لاہور)

عجب طرح سے گزری ہے میری بھی زندگی
ہنستے ہوئے عذاب یا کرتے ہوئے حساب
اسی کشمکش میں ہوئی عمر ہی تمام
نہ کر سکا حساب نہ تھم سکا عذاب

(محسن عزیز حلیم ... کوٹھا کلاں)

میں نے دل کی گہرائیوں سے تجھے آواز دی ہے
میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی تجھ کو صدا دی ہے
تجھ کو بھول جاتا ہی میری دسترس میں نہیں محسن
اگرچہ تم نے شاید میری محبت ٹھکرا دی ہے

(عبدالحلیم بھٹی اینڈ محسن ... کوٹھا کلاں)

اس دور کو دور حجازی بنادے
میرے مسلم کو پھر سے غازی بنادے
اس دین کی عز و شرف کی خاطر
مجھ کو شہید غازی بنادے

(حافظ چند عزیز ... کوٹھا کلاں)

دھوپ کڑی تھی اور سر پر کوئی سایہ نہ تھا
رہگزر تھی ویران میرے سوا کوئی دوسرا نہ تھا
جب شام ہوتی ہے سوچوں کے تر سلسلے ہوں
میں کیسے مسکراؤں زندگی کا کوئی ہمنوا نہ تھا

(فاطمہ نسیم ... حیدرآباد)

ان کی محبت کا نشان ابھی باقی ہے
نام لب پر ہے کہ جان باقی ہے
کیا ہوا اگر دیکھ کر منہ پھیر لیتے ہیں
تسلی ہے کہ ابھی صورت کی پہچان باقی ہے

(محمد بلال سعید ... میاں چنوں)

مجھے یقین تو نہیں ہے مگر یہی سچ ہے
میں تیرے واسطے عمریں گزار سکتی ہوں
یہی نہیں کہ تجھے جینے کی خواہش ہے
میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتی ہوں

(نسیم ... قصور)

میں تیرے واسطے خود کو بھی ہار سکتی ہوں

(نسیم ... قصور)

☆☆

غزل

آسماں تسخیر کرکے دیکھنا ہے
آپ کو تقدیر کرکے دیکھنا ہے
چاند تارے سب ہمارے ہی ہیں لیکن
ان کو اب زنجیر کرکے دیکھنا ہے
رائیگاں ہوں کیوں مرے جذبات آخر
عشق پہ تاثیر کرکے دیکھنا ہے
مجھ کو اب اپنے خیالوں کی چمک سے
چارہ گر تصویر کرکے دیکھنا ہے
سحر کرتا ہے نگہ سے اس طرح اب
زہر کو اکسیر کرکے دیکھنا ہے
جس قدر بھی خواب دیکھے میں نے خانم
سب کو اب تعبیر کرکے دیکھنا ہے
(فریدہ خانم..... لاہور)

آنکھوں میں کوئی خواب اترنے نہیں دیتا
یہ دل کہ چین سے مجھے مرنے بھی نہیں دیتا
بچھڑے تو عجب پیار جتاتا ہے خطوں میں
مل جائے تو پھر حد سے گزرنے نہیں دیتا
وہ شخص خزاں رت میں محتاط ہے کتنا
سوکھے ہوئے پھولوں کو بکھرنے نہیں دیتا
ایک روز تیری پیاس خریدے گا وہ گبرو
پانی تجھے پنگھٹ سے جو بھرنے ہیں دیتا
وہ دل میں تبسم کی کرن کھولنے والا
روٹھے تو روتوں کو بھی سنورنے نہیں دیتا
میں اس کو مناؤں کہ غم دہر سے الجھیں
واجد وہ کوئی کام بھی کرنے نہیں دیتا
(پروفیسر ڈاکٹر واجد نگینوی..... کراچی)

ہماری چاہت کی تجھے نہ کچھ خبر ہوگی
تڑپتے ہوئے یوں ہی یہ شب بسر ہوگی
تیری وفا سے ہے یہ جہاں پھر روشن
تمہاری دید کے لائق نہ یہ نظر ہوگی
یہ تو ممکن نہیں اپنی وفا کو رسوا کریں
نہ یہ زبان کھلے گی نہ آنکھ تر ہوگی
رواں ہے کون سی منزل کو کارواں دل کا
تیری یاد صرف اس کی ہمسفر ہوگی
میری خاموشی کا سبب نہ جانا تو نے کبھی
میرے بچھڑنے کے بعد پھر تجھے قدر ہوگی
تیرے پیار کے چراغ ہوں اس طرح فروزاں
نہ ہوگی شام کبھی اس کی نہ سحر ہوگی
وہ تو ہیں سنگدل ان سے کیا گلہ جاوید
پھر تمہاری آہ فغاں بے اثر ہوگی
(محمد اسلم جاوید..... فیصل آباد)

اس نے کہا تم میں پہلے سی بات نہیں
میں نے کہا انسان ہوں سائنس کی ایجاد نہیں
اس نے کہا اب بھی کسی کی آنکھوں میں ڈوب جاتے ہو
میں نے کہا دھوکہ ہو گیا؟ آنکھیں ہیں کوئی تالاب نہیں
اس نے کہا کیوں ٹوٹ کے چاہا تھا مجھے اتنا
میں نے کہا دماغ سے پیدل تھا جس کا کوئی جواب نہیں
اس نے کہا کیا میں بے وفا ہوں
میں نے کہا تو اتنا دھوکے باز ہے جس کا کوئی حساب نہیں
اس نے کہا بھول جا مجھ کو
میں نے کہا تو ہے کون مجھے تو یہ بھی یاد نہیں
(ایس امتیاز احمد..... کراچی)

ساحل پہ طوفان کا انتظار کرتا ہوں
میرے من کا طوفان کوئی نہیں دیکھتا
دل میں میرے ارمان تو بہت ہیں لیکن
ان کے پورے ہونے کا خواب نہیں دیکھتا
کوئی تو سبب ہوجائے یارب تیرے دربار سے
ورنہ یہاں تو کوئی مجبوریاں نہیں دیکھتا
بہت مشکل میں جی رہا ہوں اس دنیا میں
میری ان مشکلوں کا حل کوئی نہیں دیکھتا
زندگی گزر رہی ہے وقت کی قید میں
قیدی کے دلوں کا حال کوئی نہیں دیکھتا
(سلیم بیگ ہمدانی..... کراچی)

غم ناک ہیں آنکھیں تو کوئی بات نہیں
دکھ درد سے محروم کوئی ذات نہیں ہے
اے چارہ گر کچھ میرے زخموں کی خبر لو
ساون کا مقدر تو برسات نہیں ہے
پھولوں کے شفق رنگ سے خوشبو کے سفر تک
کب میں نے کہا اس میں تری ذات نہیں ہے
خوابوں میں تو آتا ہے مگر گاہے بہ گاہے
ہر شب تو رفاقت کی مری رات نہیں ہے
کھو کر اسے پانے کی تمنا بڑھی دل میں
اس پیار کی بازی میں کبھی مات نہیں ہے
اس نے بھی راہی آج تک پلٹ کر نہیں دیکھا
شاید تیرے اخلاص میں وہ بات نہیں ہے
(محمد یونا راہی.... واں بھچراں)

جب سے اس نے شہر کو چھوڑا ہر رستہ سنسان ہوا
اپنا کیا ہے سارے شہر کا اک جیسا نقصان ہوا
میرے حال پہ حیرت کیسی درد کے تنہا موسم میں
پتھر بھی رو پڑتے ہیں انسان تو پھر انسان ہوا
اس کے زخم چھپا کر رکھے خود اس شخص کی نظروں سے
اس سے کیا شکوہ کیجئے وہ تو ابھی نادان ہوا
یوں بھی کم آمیز تھا، وہ اس شہر کے لوگوں میں
لیکن میرے سامنے آ کر اور بھی کچھ انجان ہوا
(انتخاب: امین .... کنگن پور)

راز دل ہم دل میں چھپایا نہیں کرتے
ہر کسی کو مگر ہم بتایا نہیں کرتے
کرتے ہیں ہم لوگوں سے بے لوث محبت
آنکھوں سے ہم کسی کو گرایا نہیں کرتے
جو چاہت کی نگاہ سے نہ دیکھتے ہوں ہمیں
ہم بھی پلکوں پہ ان کو بٹھایا نہیں کرتے
جن کی عادت ہو پل پل میں روٹھ جانے کی
ہم بھی بار بار ان کو منایا نہیں کرتے
بن کر ہمسفر جو کھاتے ہیں قسمیں
کھا کر قسمیں وہ وعدے نبھایا نہیں کرتے
جو چیز ہوتی ہے قابل نفرت دوست
اس کی طرف دوبارہ ہم لوٹ کر جایا نہیں کرتے
دل دینے سے پہلے اک بار سو لو جانم
کسی کو اپنا بنا کر یوں ستایا نہیں کرتے
دل اپنا ٹوٹا تو سمجھ میں آیا حبیب
زخم دینے والے تو کبھی مرہم لگایا نہیں کرتے
(رانا حبیب الرحمٰن..... سینٹرل جیل لاہور)

زندگی تجھ کو جیا ہے کوئی افسوس نہیں
زہر خود میں نے پیا ہے کوئی افسوس نہیں
میں نے مجرم کو بھی مجرم نہ کہا، اس دنیا میں
بس یہی جرم کیا ہے کوئی افسوس نہیں
میری قسمت میں جو لکھے تھے انہیں کانٹوں سے
دل کے زخموں کو سیا ہے کوئی افسوس نہیں
اب ریزہ کے شیشوں کی بارش پا کے
اب کفن اوڑھ لیا ہے کوئی افسوس نہیں
(سنبل ماہین..... سرگودھا)

ایسی کیا خطا ہوئی تھی مجھ سے جو اس نے مجھے بیوفا کہا
اس کی خاطر ہی تو میں نے سارے زمانے سے بیوفائی کی تھی
آج اس کی مجھے یاد بہت آئی ہے
جس نے کی میرے ساتھ بے وفائی ہے
وہ میرے ساتھ تھا تو زمانہ بھی تھا ہمسفر میرا
اب زمانے میں بھی ہوئی میری جگ ہنسائی ہے
(صبا محمد اسلم..... گوجرانوالہ)

کچی دیوار ہوں ٹھوکر نہ لگانا مجھ کو
اپنی نظروں میں بسا کر نہ گرانا مجھ کو
تم کو آنکھوں میں تصویر کی طرح رکھتا ہے
دل میں دھڑکن کی طرح تم بھی بسانا مجھ کو
بات کرنے میں جو مشکل ہو تمہیں محفل میں
میں سمجھ جاؤں گی نظروں سے بتانا مجھ کو
پیار اتنا ہی کرو جتنا نبھا سکتے ہو
خواب پورا جو نہ ہو وہ نہ دکھانا مجھ کو
اپنے رشتے کی طرح نزاکت کا بھرم رکھ لینا

میں خود دیوانی ہوں پاگل نہ بناتا مجھ کو
(سیدہ صباشرمین ... جاتی، ہجاول)

اے سنگدل ظالم ستم گر بادشاہ
مجھے یوں بیدردی سے دیوار میں نہ چنوا
محبت تو اک جذبہ بے اختیاری ہے
اس میں میری آخر میری ہے کیا خطا
میں ہوں انار کلی بہت ہی نرم و نازک
میرے کلی جیسے اس جسم پہ رحم فرما
میرے مرجانے سے تمہیں کچھ فائدہ نہ ہوگا
ہاں مگر عاشق پہ میرے اس کا اثر گہرا ہوگا
پاگل ہی نہ ہوجائے ولی عہد تیرا
اس نے آہوں، سسکیوں میں رو رو کر کہا
ظالم محبت کا قاتل تھا وہ اک بادشاہ
انارکلی کی آہ وزاری کا اس پہ نہ کچھ اثر ہوا
آخر اس نے انار کلی کو دیوار میں چنوادیا
اور یوں محبت کی اک دلکش کہانی کا خاتمہ ہوا
(طارق محمود ... کامرہ کلاں اٹک)

درد بڑھتا ہے کیوں تیرے جانے سے
چین آتا ہے کیوں تیرے آنے سے
برسوں قبر میں لیٹا رہا میں اے ظالم
آج پھر زندہ ہوں کیوں تیرے آنے سے
محبت ہے ظالم چیز تو مجھے انکار نہیں
میں تو تجھے چاہتا ہوں زمانے سے
میری پیاس تیرے ہونٹوں میں ہے چھپی
بجھے گی یہ ہونٹوں کے ٹکرانے سے
ویران لگتا ہے جہاں تیرے بن مگر
جنت بن جائے تیرے مسکرانے سے
(محمد عثمان علی ... میاں چنوں)

تو کسی اور کی جاگیر ہے اے جان غزل
لوگ طوفان اٹھا دیں گے میرے ساتھ نہ چل
پہلے حق تھا تیری چاہت کہ چمن پہ میرا
پہلے حق تیرے خوشبو بدن پہ میرا
اب کسی اور کے سانسوں پہ ہے تیرا آنچل
لوگ طوفان اٹھادینگے میرے ساتھ نہ چل
میری قسمت میں نہیں پیار کی خوشبو شاید
میرے ہاتھوں کی لکیروں میں نہیں تو شاید
اپنی تقدیر بنا میرا مقدر نہ بدل
لوگ طوفان اٹھا دیں گے میرے ساتھ نہ چل
(عثمان غنی ...... پشاور)

سوچا ہے بارہا مگر ایسا نہیں ہوا
شفاف اپنے دل کا شیشہ نہیں ہوا
ہر صاحب اقتدار کو بس یہ گمان ہے
کہ اس جیسا کائنات میں پیدا نہیں ہوا
بدنام کرکے مجھ کو سارے شہر میں
افسوس کررہے ہیں چرچا نہیں ہوا
دشمن نے ارض پاک کی شہ رگ ہی کاٹ دی
اب بھی کہو گے قوم سے دھوکہ نہیں ہوا
مجھ سے تم جو یہ پوچھو تو ہے یہ عمل کی سزا
وعدہ کیا تھا جو خدا سے وہ پورا نہیں ہوا
(انتخاب: محمد ابوہریرہ بلوچ ... بہاولنگر)

رات ہوجائے گی تو چاند دکھائی دے گا
تیرا چہرہ میرے خوابوں کی گواہی دے گا
یہ محبت نے ذرا احتیاط سے کرنا ....!
اک آنسو بھی گرا تو سنائی دے گا
ٹھکرایا جس کی خاطر سارا زمانہ میں نے
سوچا نہ تھا وہ شخص مجھے تنہائی دے گا
میرے پہلو میں بیٹھ وہ کرتی ہے رقیبوں کی باتیں
امید نہ تھی یہ وقت ایسی بھی رسوائی دے گا
وہ پری چہرہ کہ جس کے عشق نے اندھا کیا ہے مجھ کو
میری ضد ہے کہ اب وہ ہی آ کر مجھے بینائی دے گا
صبح و شام میری نظروں کے سامنے بیٹھنے والا
آثار نظر آتے ہیں اک روز جدائی دے گا
اے رقیبو تم بھی وہ شخص صائم سے لے لینا
جس دن خدا کسی اور کو اپنی خدائی دے گا
(ظہور احمد صائم ..... مانگا منڈی، لاہور)

☆☆

نہیں ڈرتا میں کانٹوں سے
مگر پھولوں سے ڈرتا ہوں
چبھن دے جائیں جو دل کو
میں ان باتوں سے ڈرتا ہوں
انا کا میں نہیں قائل
محبت ہے مجھے سب سے
جو دل میں بغض رکھتے ہیں
میں ان اپنوں سے ڈرتا ہوں
مجھے تو نیند بھی اچھی نہیں لگتی حقیقت میں
دکھائیں خواب جو جھوٹے
میں ان نیندوں سے ڈرتا ہوں
مجھے احساس ہے سب کا
میں سب کے کام آتا ہوں
مگر جو کینہ رکھتے ہیں
میں ان رشتوں سے ڈرتا ہوں
میں بندہ ہوں اللہ کا
اور اللہ کا خوف ہے مجھ کو
جو ڈرتے ہی نہیں رب سے
میں ان بندوں سے ڈرتا ہوں
(انتخاب: محمد علی... کراچی)

پھر آیا برسات کا موسم
بچھڑے ہوئے جذبات کا موسم
آج بھی چشم تر میں رقصاں
تجھ سنگ میں ملاقات کا موسم
ذکر بہاراں خوب ہے لیکن
اپنے لئے ہے مات کا موسم
شاید کوئی جان سے جائے
سرد ہے کتنا رات کا موسم
یاد ہے مجھ کو اب تک رانا
تیری ہر اک بات کا موسم
(قدیر رانا... راولپنڈی)

میرا سوچنا تیری ذات تک
میری گفتگو تیری بات تک

نہ تم ہو جو مجھے کبھی
میرا ڈھونڈنا تجھے پار تک
میں نے اپنا سب کچھ گنوادیا
میرے نفرتوں سے پیار تک
کبھی فرصت ملے تو آجا
میری زندگی کے حصار تک
میں نے جانا کے میں کچھ نہیں
تیری پہل سے تیری بعد تک
(بلقیس خان... پشاور)

محبت کرکے اے ہمدم
سنو اعتبار کرتے ہیں
بھلا کے نفرتوں کو اب
سنو ہم پیار کرتے ہیں
عشق کرکے ہم اور تم
نئی داستان سنتے ہیں
راج ہجر کا قصہ لمبا ہوا
چلو ہم ساتھ چلتے ہیں
چلو ہم ساتھ چلتے ہیں
(سید عبادت راج... ڈیرہ اسماعیل خان)

اب بھول کر بھی نہ سوچنا
ہم آئیں گے تیرے شہر میں!
کبھی موت کے بعد زندگی
بھی آئی ہے سوچنا
اب عمریں گزار شوق سے
جیتو یا ہارو!
لیکن ہم جیسا نہیں ملے گا
جو زندگی سے ہار گیا
جیسے موت نے جیت لیا
(اسحاق انجم... قصور)

آغاز یوں ہوا تھا
اس نے گلاب بھیجا
میں نے کتاب کھولی

اور اس میں دکھ دیا وہ
سب سے اسے چھپایا
انجام یہ ہوا ہے
کچھ خشک پتیاں ہیں
تھوڑی سی ہے مہک بھی
بس اور کچھ نہیں ہے
(عثمان غنی... پشاور)

خواب بکھرے ہیں سہانے کیا کیا
لٹ گئے اپنے خزانے کیا کیا
صرف اک ترک تعلق کے لئے
تو نے ڈھونڈے ہیں بہانے کیا کیا
مڑ کے دیکھا ہی تھا ماضی کی طرف
آ ملے یار پرانے کیا کیا
شکریہ اے غم احباب کی رات
ہم سے گزرے ہیں زمانے کیا کیا
کس کس سے کہیں تیری چاہت میں
ہم پہ گزرے ہیں زمانے کیا کیا
رات صحرا کی ردا میں جاناں
حرف لکھے تھے ہوا نے کیا کیا
(بلقیس خان... پشاور)

مٹے منزلوں کے نشان کیسے کیسے
زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے
بتاؤں میں کیا جب تری یاد آئی
ہوئے زخم دل کے عیاں کیسے کیسے
اکیلا مجھے زیست کی رہگزر میں
چلے چھوڑ کر مہرباں کیسے کیسے
غم ہجر الفت کے لمحات دیر
وہ لیتا رہا امتحان کیسے کیسے
کسی میں بھی جذبۂ ہمت نہیں ہے
ہیں اس دور کے نوجوان کیسے کیسے
نہ بخشا خوشی کا کسی نے بھی لمحہ
مرے ساتھ ہیں مہرباں کیسے کیسے
بس اک روشنی کی تمنا میں راتا

جلائے گئے آشیاں کیسے کیسے
(انتخاب: ہمانصیر ... کراچی)

ادھورے خواب!
آنکھوں میں سجا کر
جئیں کیا مر نہیں سکتے کبھی ہم
حدوں کے درمیاں
پابند رہ کر
محبت کر نہیں سکتے کبھی ہم!
چلو
اک دوسرے کو بھول جائیں!!!
(امجد بخاری ..... مظفرگڑھ)

سوچتے اور نکھارے پھول
کتنے ہیں کتنے پیارے پھول
ہیں مٹی کے عرق میں شامل
تیرے اور ہمارے پھول
شاید قدرت نے چن چھوڑے ہیں
سب اچھے اور پیارے پھول
شوق کی دھرتی بانجھ نہ ہو تو
پیار میں ہیں انگارے پھول
روزانہ میں چاند سے پوچھوں
روز کیوں رستہ بدلے پھول
ہر اک شخص کو پیار ہے ان سے
ہر اک آنکھ کے تارے پھول
تیرے نام لگا ڈالے ہیں
بوبی نے عشق کے سارے پھول
(ملک وارث ..... دریا خان)

ساری دنیا سے بے رخی کرلی
تیری یادوں سے دوستی کرلی
اک فقط تیرے پیار کی خاطر
دوستوں سے بھی دشمنی کرلی
شمع جیسے تمہاری الفت میں
نذر آتش یہ زندگی کرلی
خود کو رسوا کیا زمانے میں

بے وفا سے جو دل لگی کرلی
اپنے دل کو جلا کے تنہا نے
تیرے جیون میں روشنی کرلی
بے وفا پہ جو اعتبار کیا
بھول میں نے بہت بڑی کرلی
(شریف الدین جیلانی ..... منڈی بہاؤالدین)

میرے بس میں ہوا گرتو !
تیری زندگی سے چن کر سارے غم
سمندر میں بہاؤں میں کبھی
تیری چاندنی روشن پیشانی پر
مقدر کا ستارہ چمکاؤں میں کبھی
تیرے ہو بہو روئے اشکوں کو
اپنی پلکوں سے اٹھاؤں میں کبھی
میرے بس میں ہوا گرتو ..... !
خوشیوں کے سارے پل اکٹھے کر کے
تیرے دامن میں رکھوں میں کبھی
تیری ہلکی ہنسی کے موتی چن کر
تیرے ہونٹوں پر سجاؤں میں کبھی
میرے بس میں ہوا گرتو ..... !
خواہشوں کی ساری تتلیاں
امیدوں کے سارے جگنو
خوابوں کی سچی تعبیریں
آسمان پر جگمگاتے سبھی تارے
اپنی مٹھی میں بھر کر
تیرے سرہانے میں رکھوں میں کبھی
میرے بس میں ہوا گرتو ..... !
گلاب کے پھول چن کر
تیری سر راہ میں بچھاؤں میں کبھی
خوشیوں کو تیرا رستہ دکھاؤں میں کبھی
بہاررنگوں سے تیرا آنگن سجاؤں میں کبھی
میرے بس میں ہوا گرتو !
(ادیبہ انا ..... چکوال)

رات کے بیکراں اندھیرے میں
جب ستاروں کی انجمن کے سوا

اور کچھ بھی نظر نہیں آتا
ایسا لگا ہے ایک جنت جمال
وادی ماہتاب سے آ کر
میری تنہائیوں کے صحرا میں
اپنی زلفیں بکھیر دیتی ہے
چار سو نکہتیں برستی ہیں
زندگی جھوم جھوم اٹھتی ہے
سارا ماحول جگمگاتا ہے
درد کی لہر میرے سائے سے
ہر قدم پہ گریز کرتی ہے
زندگی مجھ سے پیار کرتی ہے
ناگہاں سلسلہ بکھرتا ہے
یہ حسین خواب ٹوٹ جاتا ہے
زخم دل پھر سے مسکراتا ہے
اور اس فتنہ خیال کے بعد
پھر وہی موت کی سی خاموشی
پھر وہی خوف ناک تاریکی
پھر وہی دل خراش سناٹا
اور پھر اس سیاہ دریا میں
دل مرا ڈوب ڈوب جاتا ہے
(انتخاب: نادیہ یاسمین ..... شاہ پور چاکر، کھڈرو)

ہم بھی یارو کتنے بھلے تھے
خوشیاں بانٹنے چلے تھے
یاد کرو جب ہم ملے تھے
دنیا والے کتنے جلے تھے
غیر تو تھے ہی لوٹنے والے
مگر اپنے بھی ان تلے تھے
میں کس کس کی صفائی دیتا
جرم سارے مرے گلے تھے
دسمبر کی لمبی شب تھی اور
اس کی یادوں کے سلسلے تھے
میری طرح اس نے بھی موہن
ہاں بعد میں ہاتھ ملے تھے
(انتخاب: عارفہ عمر دراز ..... نوابشاہ)

☆☆

خناس

وجیہہ سحر

آخری قسط

خوف و ہراس کی وادی میں خراماں خراماں سرگرداں دل گرفتہ دل شکستہ حالات سے پر اپنی نوعیت کی ناقابل یقین و ناقابل فراموش حالات سے دو چار عجیب و غریب دل و دماغ کو مسوستی حیرت سے روشناس کراتی سوچ کے افق پر جھلمل کرتی تحیر انگیزی میں سب سے آگے ویران و اجاڑ وادی کے نشیب وفراز میں چنگھاڑتی و دندناتی ذہن سے محو نہ ہونے والی ایڈونچر شاہکار کہانی

اچھی کہانیوں کے متلاشی قارئین کیلئے حیرت انگیز خوفناک حیرتناک حقیقی کہانی

ساحل نے بیوقوفانہ انداز میں جواب دیا۔ ''مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ میں نے تھوڑی بتائی ہے۔''

اسامہ نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔ ''پہلے میں جاتا ہوں پھر تم تینوں کو بلالوں گا۔''

یہ کہہ کر اسامہ کی بندر کی طرح تیزی سے رسی سے لٹکتا ہوا گرل تک پہنچ گیا۔

گرل کے بالکل ساتھ ہی اس خاص کمرے کی کھڑکی تھی جہاں زرغام اپنا خاص عمل کرتا تھا۔ اس نے کھڑکی سے اندر جھانکا تو پردہ پیچھے ہٹا ہوا تھا جس کی وجہ سے کمرے کا ماحول صاف دکھائی دے رہا تھا۔

کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے اطراف میں بھی نظر دوڑائی تو آس پاس کوئی نہیں تھا۔ اس نے بالکونی سے نیچے جھانکتے ہوئے ان سب کو اوپر آنے کا اشارہ کیا اور خود اس جگہ کے قریب بیٹھ گیا جہاں کانٹا اٹکا ہوا تھا۔ ساحل اور عارفین تو آرام سے رسی سے اوپر آگئے مگر عمارہ کو یہ سب بہت مشکل لگ رہا تھا۔

اسامہ نے اسے اشارے سے سمجھایا کہ اگر کانٹا پھسل گیا تو وہ رسی تھام لے گا اس لیے وہ ہمت کرے۔

جب اس نے خود کو تنہا پایا تو ہمت کر کے رسی سے اوپر چڑھنے کی کوشش کرنے لگی بالآخر وہ بھی بالکونی تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئی۔ ساحل نے کمرے کی ونڈو سے اندر جھانکا۔

''شیشے کی ونڈو ہے اندر جالی بھی نہیں لگی، پیچ کھول کر آسانی سے اندر داخل ہوسکتے ہیں۔''

اسامہ نے نفی میں سر ہلایا۔ ''کمرے میں کوئی نہیں ہے تو دروازہ باہر سے لاک ہوگا۔''

''لاک کھول لیں گے یار....'' عارفین نے لاپروائی سے کندھے اچکائے۔

''اگر نہ کھول سکے تو.... تم میرے پیچھے آؤ۔''

اسامہ دھیرے دھیرے چلتا ہوا دوسرے کمرے کی کھڑکی تک پہنچ گیا۔

اس نے ان تینوں کو ہاتھ سے اشارہ کیا تو وہ تینوں بھی آہستہ آہستہ چلتے ہوئے اسامہ کے قریب آگئے۔

یہ ونڈو بھی شیشے کی تھی اور بغیر جالی کے تھی۔ اسامہ اور ساحل نے اندر جھانکا تو ساحل نے سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''کمرے میں باہر سے روشنی آرہی ہے شاید دروازہ کھلا ہے مگر کوئی دکھائی نہیں دے رہا۔''

''ہاں مجھے بھی یہی لگتا ہے میرا خیال ہے کہ ونڈو کے پیچ کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' یہ کہہ کر اسامہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''تم ادھر ونڈو کے قریب کھڑے ہوکے اندر نظر رکھو میں اور ساحل ونڈو کے پیچ کھولتے ہیں۔''

عمارہ وینڈو کے قریب پیچھے کی طرف ہو کے کھڑی ہو گئی۔ عارفین بالکونی کے قریب کھڑا نیچے کے حالات پر نظر رکھ رہا تھا۔

ساحل اور اسامہ نے بہت مہارت سے وینڈو کے پیچ کھول لیے۔

عمارہ نے مسکراتے ہوئے اسامہ کی طرف دیکھا۔

''بہت خوب .....فوج سے ریٹائرمنٹ کے بعد آپ کہیں ڈاکے تو نہیں ڈالتے رہے۔''

اسامہ نے عمارہ کی طرف گھور کر دیکھا اور پھر اندر نظر ڈالتے ہوئے شیشہ احتیاط سے اُتار کر ایک طرف رکھ دیا۔

وہ چاروں باری باری کمرے میں داخل ہو گئے۔ کھڑکی کے قریب زرغام کا پلنگ پڑا ہوا تھا عمارہ ارد گرد نظر دوڑاتے ہوئے پلنگ کے پاس سے گزر کر ڈریسنگ ٹیبل کی طرف بڑھی تو بے ساختہ اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔

اسامہ، عارفین اور ساحل تیزی سے اس کی طرف بڑھے تو وہ بھی دم بخود رہ گئے۔ زمین پر دو لاشیں پڑی تھیں ایک زرغام کی تھی جسے دیکھ کر صاف پتہ چل رہا تھا کہ اسے یا تو سانپ نے ڈس لیا ہے یا زہر دے دیا گیا ہے اور دوسری لاش کسی بوڑھے کی تھی جو خون میں لت پت تھا۔

اسامہ اور ساحل لاشوں کے قریب بیٹھ گئے۔ زرغام کا چہرہ اور پورا جسم نیلا پڑ گیا تھا۔ عمارہ نے سفید رومال سے شیشے کا گلاس اُٹھایا اور اسامہ کو دکھایا جس میں تھوڑا سا اورنج جوس ابھی باقی تھا۔

اسامہ نے گلاس لیا اور اسے اپنی ناک کے قریب لاتے ہوئے سونگھا، زہر کی باس ابھی باقی تھی۔

''اسے زہر اس اورنج جوس میں ملا کے دیا گیا ہے، یہ زہر کچھ دیر بعد اثر کرتا ہے اس لیے اسے جوس پیتے وقت Smell نہیں آئی ہوگی اور وہ غٹاغٹ اسے پی گیا ہوگا۔''

''اس قدر ہوشیار آدمی جو دوسروں کے ذہن پڑھ لیتا ہو، وہ کس طرح کسی سے دھوکہ کھا گیا۔''

ساحل نے تشویش بھرے انداز میں کہا۔ ''بھروسا اور اعتماد بڑے سے بڑے ہوشیار آدمی کو مات دے دیتا ہے۔'' اسامہ نے ساجد کی لاش کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''یہ کون ہے۔'' عمارہ نے سوالیہ نظروں سے اسامہ کی طرف دیکھا اور پھر خود بھی ساجد کی لاش کے قریب بیٹھ گئی۔

''یہ ساجد ہے زرغام کا وفادار ملازم.....''

''ہم یہ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ اسی نے زہر دیا ہوگا یہ کام کوئی اور بھی تو کر سکتا ہے اور پھر اسے قتل کس نے کیا؟'' عمارہ نے لاش کو سرتا پا دیکھا جس سے کوئی اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ اسے کس طرح قتل کیا گیا ہے۔

اسامہ نے ساجد کی لاش کو دوسری طرف کروٹ دیتے ہوئے چیک کیا اس کے سر پر پیچھے کی طرف شدید چوٹ تھی جس سے خون بہہ رہا تھا۔ اس نے لاش کو دوبارہ سیدھا لٹایا اور اپنے ہاتھ کو اس کے سینے پر رکھ کے چیک کرنے لگا۔ ''اوہ مائی گاڈ.....''

اسامہ کے منہ سے بے ساختہ نکلا۔ اس کے چہرے پہ گھبراہٹ کے تاثرات عیاں ہو گئے۔ وہ کھڑا ہو کے چاروں طرف نظریں گھمانے لگا پھر اس کی نظر ڈریسنگ ٹیبل کے ٹوٹے ہوئے شیشے پر پڑی۔

''کیا بات ہے کچھ ہمیں بھی تو بتاؤ.....؟'' عمارہ اسامہ کے قریب آ گئی۔

اسامہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''تم جانتی ہو کہ کسی نے ساجد کو چھت کی طرف لے جا کے زمین پر پٹخا ہے اور مارنے والا اس قدر طاقتور تھا کہ جب اس نے اس کے سینے پر ہاتھ رکھا تو اس کے سینے کی ہڈیاں چکنا چور ہو گئیں۔''

''مارنے والا کون ہو سکتا ہے۔'' عارفین بھی تعجب خیز انداز میں آگے بڑھا۔

''زرغام کا ہمزاد جو جاتے ہوئے اپنا غصہ اس آئینے پر نکال گیا۔''

تینوں کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔ ''کیا.....؟ زرغام کا ہمزاد یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔'' عمارہ نے بوکھلائے ہوئے کہا۔

اسامہ نے ان تینوں کی طرف دیکھا۔ ''فی الحال یہاں سے نکلو اس سے پہلے کہ کوئی آ جائے میں رستے میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گا۔''

وہ تینوں جس طرح اوپر چڑھے تھے اسی طرح سے باری باری نیچے اتر گئے۔ اسامہ نے رسی بھی کھینچ لی اور وہ

چاروں اپنی گاڑی میں بیٹھ کر وہاں سے نکل گئے۔

اسامہ تو جیسے گاڑی کو بھگانے کے چکر میں تھا۔ مگر زرغام کی موت کے پُراسرار واقعہ کی مخفی حقیقت کی طرف ان تینوں کی سوچیں مرکوز تھیں۔

''آخر ایسی کون سی حقیقت ہے جسے بتانے میں تم اتنا وقت لگا رہے ہو؟'' عمارہ پوچھے بغیر نہ رہ سکی۔

اسامہ کی پیشانی پہ شکنیں اُبھر آئیں۔ ''خاموش بیٹھی رہو، مجھے اس علاقے سے نکلنے دو یہ نہ ہو کہ ہم غیبی مخلوق سے بچتے بچتے انسانوں کے شکنجے میں پھنس جائیں۔''

''کیا مطلب.....؟'' عمارہ نے بغیر سوچے سمجھے سوال کیا۔

اس کے سوال کا جواب اسامہ کے بجائے ساحل نے دیا۔ ''ڈاکٹر صاحبہ! پولیس کا شکنجہ..... اب سمجھ میں آیا۔'' عمارہ نے ایک لمبا سانس کھینچا۔

سب کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ اس وقت اسامہ سے کوئی بات نہ کی جائے۔

عمارہ کی نظر اس کے پیروں کے قریب پڑی ہوئی بوتلوں پر پڑی جو اسے بوتلیں بھری بھری سی لگیں..... اس نے انہیں چیک کیا تو وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ ''اسامہ! بوتلوں میں پانی ہے۔''

''کیا واقعی؟'' ساحل بھی خوشی سے چلایا سارے پانی پر ٹوٹ کے پڑے۔

کھانے کی کچھ اشیاء تو ساحل نے پھینک دی تھیں جو چیزیں گاڑی میں تھیں وہ بھی پہلے کی طرح فریش حالت میں تھیں۔

عمارہ نے سب کو پیزے کا ایک ایک ٹکڑا تھمایا۔ ''مگر یہ سب کیسے ہوا؟'' عارفین نے پیزا کھاتے ہوئے پوچھا۔

اسامہ نے پچھلی نشست کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اس کا مطلب ہے کہ ہم شیطان ہمزاد کے ہر طرح کے جادوئی اثرات سے آزاد ہیں۔ ہمارے آس پاس اس وقت شیطانی قوتیں موجود نہیں ہیں۔ شاید زرغام کی موت نے ان بدروحوں کو بھی یہاں سے دور بھیج دیا ہے۔ مجھے تو یہی لگ رہا ہے کہ ان کا شیطانی کھیل بگڑ چکا ہے وہ فی الحال ہمارے راستے میں نہیں آئیں گی۔ مگر پھر بھی ہمیں محتاط رہنا ہوگا۔''

''مجھے تو کچھ سمجھ نہیں آرہا۔'' عمارہ نے کہا۔ اسامہ نے عمارہ کی طرف دیکھا اور تحمل سے جواب دیا۔

''میں چاہتا ہوں کہ ہم ان جنگلات سے نکل کر کسی شہر میں داخل ہو جائیں پھر کسی ہوٹل میں رُکیں گے، کھانا بھی کھائیں گے اور میں تم سب کو ساری بات بھی سمجھا دوں گا۔ دعا کرو کہ جو میں سوچ رہا ہوں وہ درست ہو وہ تینوں ہمزاد ہمارا راستہ نہ روکیں۔''

گاڑی ویران جنگلات سے گزر رہی تھی۔ خوف کے تصوراتی سائے ابھی بھی ان کے ساتھ تھے۔ سڑک کے دونوں اطراف سے سڑک کی طرف جھکے ہوئے درخت، حملہ کرتے دیو کی مانند دکھائی دے رہے تھے۔

''ہم ان خطرناک جنگلات کے بجائے کسی دوسرے راستے سے بھی تو جا سکتے تھے۔'' عارفین نے ونڈ اسکرین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

اسامہ نے سامنے سے نظریں ہٹائے بغیر جواب دیا۔ ''ہم جہاں جا رہے ہیں وہاں یہی راستہ جاتا ہے۔ امید ہے کہ ایک گھنٹے کے بعد ہم شہر میں داخل ہو جائیں گے۔''

ایک گھنٹے کا سن کر سب چپ سادھ کے بیٹھ گئے۔ دھوپ بہت تیز تھی سورج جیسے آگ برسا رہا تھا مگر گاڑی کے AC کی وجہ سے وہ سکون سے سفر کر رہے تھے۔

گاڑی کا اس طرح ٹھیک ہو جانا ان کے لیے کسی معجزے سے کم نہیں تھا۔

35 کلومیٹر کے سفر کے بعد خوفناک جنگلات کا سلسلہ ختم ہو چکا تھا۔ چھوٹے سے قصبے کے نام کا بورڈ نظر آرہا تھا جو اب تقریباً 18 کلومیٹر تھا۔

ابھی بھی گاڑی ویران علاقے سے ہی گزر رہی تھی مگر تسلی کے لیے یہ کافی تھا کہ سڑک کے دونوں اطراف پر ٹائر پنکچر کی چھوٹی چھوٹی دکانیں دکھائی دے رہی تھیں۔ تھوڑے فاصلے کے بعد ایک پٹرول پمپ بھی دکھائی دیا۔

سڑک کے دونوں اطراف چھوٹے چھوٹے ہرے بھرے کھیت بھی دکھائی دے رہے تھے۔ آبادی کے اس احساس سے ان کا خوف ختم ہو چکا تھا۔

10 کلومیٹر سفر کے بعد چھوٹے چھوٹے ہوٹل بھی دکھائی دیئے مگر وہ ان کے بیٹھنے کے قابل نہیں تھے پھر انہیں ایک ہوٹل دکھائی دیا جس کے اوپر سرائے ہوٹل لکھا ہوا تھا وہاں رہائش کا بندوبست بھی تھا اور معقول سٹنگ سسٹم بھی تھا۔

اسامہ نے ہوٹل کے قریب گاڑی پارک کی اور وہ چاروں گاڑی سے اُتر گئے۔ وہ ہوٹل میں داخل ہوئے تو ماحول ان کے مطابق تھا صرف ایک ہی ٹیبل پر تین اشخاص بیٹھے تھے باقی تمام ٹیبل خالی تھے۔

مناسب سی جگہ دیکھ کر وہ چاروں بیٹھ گئے۔ ویٹر Menue لے کر عمارہ کے قریب آیا۔ عمارہ نے Menue کارڈ لیا اور لسٹ پر اچٹتی نگاہ ڈال کر اسامہ کی طرف دیکھا۔

''ابھی کھانے کا وقت تو نہیں ہے ایسا کرتے ہیں چائے منگوا لیتے ہیں اور ساتھ تھوڑے سینڈوچ منگوا لیتے ہیں۔'' اسامہ نے ساحل اور عارفین کی طرف دیکھا۔ ''کیا خیال ہے۔''

انہوں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسامہ نے چائے کے ساتھ سینڈوچ کا آرڈر دے دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد ویٹر چائے اور سینڈوچ لے آیا۔ چائے پی کر وہ کافی فریش ہو گئے۔ اسامہ نے ویٹر کو بلایا۔

''یس سر!'' ویٹر اسامہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ''تم ایسا کرو کہ دس کولڈ ڈرنکس دس جوس کے ڈبے اور کچھ چپس اور نمکو کے پیکٹس گاڑی میں رکھوا دو۔''

''ٹھیک ہے سر!'' کہہ کر ویٹر وہاں سے چلا گیا۔

پھر اس نے اسامہ کے کہنے کے مطابق سامان گاڑی میں رکھ دیا۔

''اب تو بتاؤ کہ زرغام کی موت کیسے ہوئی ہوگی یعنی تمہیں کیا لگتا ہے'' عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

اسامہ نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔

''اس میں کوئی شک والی بات نہیں سارے ثبوت صاف صاف بتا رہے ہیں کہ زرغام کی موت کیسے ہوئی۔ اس کے اپنے ہی ملازم نے اسے زہر دے دیا۔ میں جانتا تھا کہ زرغام نے اپنا ہمزاد مسخر کر رکھا ہے اسی لیے میں کسی خاص طریقے سے مارنا چاہتا تھا جب سورج کی شعاعیں اس کے جسم پر پڑ رہی ہوتیں وہ ایسی حالت میں مرتا تو اس کا شیطان ہمزاد اس کے تابع نہ ہوتا وہ ایسے ہی ہوتا جیسا ایک عام انسان کا ہمزاد مگر ساجد اپنی بیوقوفی کی وجہ سے خود بھی جان سے گیا اور اس نے دوسروں کے لیے بھی خطرہ بڑھا دیا ہے۔

یعنی سمجھ لو کہ زرغام کا مادی جسم غیر مرئی باطنی جسم میں بدل گیا ہے۔ قسمت اس کا ساتھ دے گئی وہ اپنے ناپاک ارادوں سمیت روپ بدل چکا ہے۔'' اسامہ بول رہا تھا مگر بدلے میں کسی کی زبان سے کوئی بات نہ نکلی سب کے لب سلب ہو گئے۔ سینڈوچ ان کے ہاتھوں میں ہی رہ گئے۔

وہ اس طرح مایوسی سے سر جھکائے بیٹھ گئے جیسے وہ جنگ شروع کرنے سے پہلے ہی ہار گئے۔ ساحل تھکے تھکے سے لہجے میں بولا۔ ''اس درندے کی موت کے ساتھ اس کے شیطانی منصوبے بھی ختم ہو جاتے مگر اب۔''

''اب کیا ہوا ہے۔ ہماری جنگ تو ہمزاد سے ہی تھی نا ایک اور بڑھ گیا تو کیا ہوا ہم ہار نہیں مانیں گے۔''

اسامہ کی بات پر عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھا۔

''ہم انسان ہیں کس طرح ان بدروحوں سے مقابلہ کر سکتے ہیں۔''

''ہم ان سے مقابلہ کر سکتے ہیں کیونکہ وہ روحیں انسانوں کی ہی ہیں۔ ایک لڑکی کو ساتھ لانا ہی نہیں چاہیے تھا جو ہم سب کو کمزور کرے۔'' ساحل بے تکان بولا۔

عمارہ کی آنکھیں بھیگ گئیں، اس نے سر جھکا لیا۔

اسامہ نے ساحل کی طرف دیکھا جو ابھی تک غصے میں ہی تھا۔

''اس طرح چھوٹی چھوٹی باتوں پر آگ بگولہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم اچھی طرح سے جانتے ہو کہ عمارہ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہے وہ ایک سائیکاٹرسٹ اور عاملہ بھی ہے۔

وہ روحوں کو بلا سکتی ہے ان سے بات کر سکتی ہے مگر اس طرح شیطان ہمزاد کے ایک خوفناک گروپ سے اعلانِ جنگ کرنا کوئی معمولی بات نہیں اس سے تو کوئی بھی خوفزدہ ہو سکتا ہے۔ سچ پوچھو تو یہ جو چھوٹی چھوٹی باتوں پر تم لوگ تپ رہے ہو تو اس کے پیچھے بھی وجہ یہ ڈر ہی ہے۔ اس لیے میں تم تینوں سے کہتا ہوں کہ جو واپس جانا چاہے جا سکتا ہے کیونکہ جہاں ہم جا رہے ہیں وہاں سے کبھی واپسی ہو سکتی ہے اگر ہم

اپنے مشن میں کامیاب ہو جائیں۔ تم میں سے جو چاہے اپنی خوشیوں بھری زندگیوں کی طرف لوٹ سکتا ہے۔ میں تنہا ہی اس مشن کے لیے روانہ ہو جاؤں گا۔"

عمارہ نے اسامہ کے ہاتھ کے اوپر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔

"ایسی خوشیاں کس کام کی جہاں ہر پل موت کے سائے منڈلا رہے ہوں، ہمیں تو خوف کی گھمبیر تاریکی میں امید کا دیا جلانا ہے۔"

عمارہ کے ہاتھ پہ ساحل نے اپنا ہاتھ رکھا اور ساحل کے ہاتھ پر عارفین نے اور پھر دونوں نے مسکراتے ہوئے اسامہ کو اپنے ساتھ کا یقین دلایا۔

اسی دوران ویٹر اسامہ کے پاس آیا۔ "سر آپ کا سامان گاڑی میں رکھوا دیا ہے اور کوئی چیز رکھنی ہو تو بتا دیں۔"

"نہیں اور کچھ نہیں چاہیے۔" اسامہ نے کہا۔ ویٹر وہاں سے چلا گیا۔

"آگے کیا پلان ہے۔" ساحل نے پوچھا۔

"ہم اب مری کے لیے روانہ ہوں گے اب یہ جو کچھ ہوا ہے امید ہے کہ سفر میں یہ بدروحیں ہمیں تنگ نہیں کریں گی فی الحال تو زرغام کی موت نے ان کا طلسم توڑ دیا ہے۔" اسامہ نے کہا۔

"تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ ہمزاد ہمارا تعاقب نہیں کریں گے۔" عمارہ نے پوچھا۔

"ہاں کیونکہ مجھے پورا یقین ہے کہ وہ ہمزاد اس جگہ پہنچ گئے ہوں گے جو ان کا اصل مسکن ہے۔" اسامہ کی اس ادھوری سی بات پر عمارہ نے اس سے پوچھا۔

"کہاں.... کون سی جگہ۔"

"مری میں جہاں ہم جا رہے ہیں۔" اسامہ نے پر یقین لہجے میں کہا۔

"مری میں.... مگر کہاں؟" عارفین نے پوچھا۔

اسامہ نے ہاتھ سے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ "ہم مری پہنچ جائیں کسی اچھے سے ہوٹل میں کمرے لے لیں، پھر ساری پلاننگ کریں گے۔"

تھوڑی دیر کے بعد اسامہ نے ویٹر کو بلایا۔ اور بل ادا کر کے وہ سب وہاں سے نکل گئے۔ وہ ایک بھرپور ارادے کے ساتھ اپنی منزل کی طرف محو سفر تھے۔

انہیں کسی قسم کی رکاوٹ پیش نہیں آ رہی تھی۔ سب کچھ نارمل تھا اس لیے وہ پرسکون انداز میں سفر کر رہے تھے۔ تھکا دینے والے سفر کے بعد وہ اسلام آباد پہنچ گئے۔

سفر کے دوران ہی سب نے اپنے اپنے گھر والوں سے بات چیت کر لی تھی۔ انہوں نے اپنے گھر والوں کو تسلی دے دی تھی۔

تقریباً دو گھنٹے کے بعد وہ مری کے قریبی چھوٹے چھوٹے علاقوں سے گزر رہے تھے۔

عارفین نے چھتر پارک کا بورڈ پڑھا تو اس نے اسامہ سے پوچھا۔ "مری کا کتنا فاصلہ رہ گیا ہے۔"

"یوں سمجھو کہ ہم مری پہنچ گئے ہیں۔ یہاں سے مری کا بس تھوڑا سا ہی فاصلہ ہے۔" اسامہ نے جواب دیا۔

ساحل جو ڈرائیونگ کر رہا تھا، اس کا دھیان سامنے کی طرف ہی تھا۔ اس نے اسامہ کی طرف دیکھا جو اس کے ساتھ ہی بیٹھا تھا۔ "میری معلومات کے مطابق یونیورسٹی کی بس میں جو حادثہ ہوا تھا وہ پترو کس کے علاقے میں ہوا تھا جو چھتر پارک سے تھوڑے سے فاصلے پر ہے۔"

"ہاں ہم پترو کس میں ہی ٹھہریں گے۔" اسامہ نے جواب دیا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد پترو کس کا بورڈ دکھائی دینے لگا۔

پترو کس کا علاقہ شروع ہوتے ہی اسامہ سڑک کے دونوں اطراف دیکھنے لگا۔

"تم کیا ڈھونڈ رہے ہو؟" عمارہ نے پوچھا۔

"دیکھ رہا ہوں کہ کوئی ہوٹل یا فلیٹ نظر آ جائے۔"

"ہوٹلز کے لیے یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔" ساحل نے کہا۔

"بات اچھے یا برے کی نہیں ہے۔ ہمیں اسی جگہ کام ہے یہیں ٹھہر جائیں تو کافی آسانی ہو جائے گی۔"

"اسامہ! ادھر فلیٹس ہیں۔" عمارہ نے اپنی کھڑکی سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ اسامہ نے بھی اس طرف نظر دوڑائی۔ "ہاں فلیٹس تو ٹھیک لگ رہے ہیں۔ پتہ کرتے ہیں۔"

ساحل نے مناسب سی جگہ گاڑی پارک کی۔

''تم لوگ گاڑی میں ہی رہو میں پتہ کر کے آتا ہوں۔'' اسامہ نے گاڑی سے اُترتے ہوئے کہا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسامہ گاڑی کی طرف آیا۔

''سامان نکال لو ایک فلیٹ مل گیا ہے۔'' ان سب نے گاڑی سے اپنا سامان نکالا اور فلیٹ کی طرف بڑھے۔

اسامہ کے ہاتھ میں فلیٹ کی چابی تھی۔ اس نے فلیٹ کا دروازہ کھولا اور سب اندر داخل ہوگئے۔

انہوں نے کمرے کے ایک طرف سامان رکھا اور تھکاوٹ سے قالین پر ہی ڈھیر ہوگئے۔ اسامہ پورے فلیٹ کا جائزہ لے کر آیا۔

''یہ چھوٹا سا فلیٹ دو کمروں، ایک باتھ اور ایک کچن پر مشتمل ہے۔ ایک کمرے میں ہم تینوں ٹھہر جائیں گے اور ایک کمرہ عمارہ کو دے دیں گے۔'' یہ کہہ کر اسامہ بھی ان کے ساتھ قالین پر بیٹھ گیا۔

عارفین اور ساحل نے صوفے کی گدیاں اٹھائیں اور اپنے سر کے نیچے رکھ کے قالین پر لیٹ گیا۔

''یہ کیا ابھی پہلے سامان تو ترتیب سے رکھ دو۔''

اسامہ کی بات پر ساحل نے نفی کے انداز میں ہاتھ ہلایا۔

''ابھی کچھ مت کہو بہت تھکے ہوئے ہیں۔'' اسامہ نے بھی صوفے سے گدی کھینچی اور ان کے ساتھ لیٹ گیا۔

اس کی عمارہ پر نظر پڑی جو قالین پر بیٹھی صوفے پر سر رکھے بیسے گری پڑی تھی۔ اسامہ دھیرے سے مسکرایا اور پھر دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گیا۔

تھکاوٹ کے باعث کب ان سب کی آنکھ لگ گئی انہیں پتہ بھی نہ چلا۔ سارا سامان بھی کمرے میں بے ترتیب گرا پڑا تھا۔ جسمانی تھکاوٹ سے زیادہ ذہنی تھکاوٹ تھی، انہوں نے دوپہر کا کھانا بھی نہیں کھایا تھا۔ تقریباً دو گھنٹے گزر گئے تو انٹرکام کی بیل بجی۔ سب گہری نیند سوئے ہوئے تھے۔ بیل کی آواز سے عمارہ کی آنکھ کھلی تو اس نے بے خوابی کی حالت میں ادھر اُدھر دیکھا، کارنر ٹیبل پر ریڈ کلر کا PTCL Set پڑا تھا جس کی بیل بج رہی تھی۔

وہ ڈھیلی ڈھیلی چال سے چلتی ہوئی فون تک پہنچی اس نے فون ریسیو کیا۔ ریسپشن سے منیجر بات کر رہا تھا۔ ''میڈم آپ نے کچھ کھانے کا آرڈر دینا ہو یا چائے منگوانی ہو تو بتا دیں۔'' عمارہ نے اپنی کلائی پر بندھی گھڑی کی طرف دیکھا شام کے پانچ بج رہے تھے۔

''اوہ..... اتنا وقت ہوگیا ہے۔'' اس نے خود کلامی کی۔

''جی میڈم آپ نے مجھ سے کچھ کہا۔'' منیجر نے پوچھا۔

''آپ ایسا کریں کہ مینیو بھیج دیں میں آرڈر دے دوں گی۔''

''ٹھیک ہے میڈم!'' منیجر نے کہا۔

فون رکھ کر عمارہ نے ان تینوں کی طرف دیکھا جو اس طرح بے ترتیبی سے گرے ہوئے تھے کہ عمارہ ہنس پڑی۔ پھر اس نے بھنویں اچکاتے ہوئے سامان کی طرف دیکھا اور ٹھنڈی آہ بھر کر سامان کی طرف بڑھی اور سب چیزیں ترتیب سے اپنی اپنی جگہوں پر رکھنے لگی۔ کھانے پینے کی چیزیں کچن میں اور کپڑے وغیرہ الماری میں رکھ دیئے۔ دروازے پر دستک ہوئی۔

''آ جائیں۔'' عمارہ نے جوس کے ڈبے اٹھاتے ہوئے کہا۔

ویٹر اندر داخل ہوا اس نے Menue Card عمارہ کی طرف بڑھایا۔ عمارہ نے جوس کے ڈبے ٹیبل پر رکھے اور اس سے کارڈ لے کر پڑھنے لگی۔

''دو ڈشز.....''

''دو ٹرے ایک فرائیڈ رائس، چھ کباب، سلاد اور رائتہ.....'' یہ کہہ کر عمارہ نے کارڈ ویٹر کو دے دیا۔

ویٹر کے جانے کے بعد عمارہ نے جوس کے ڈبے اٹھائے اور فریج میں رکھ دیئے۔

سارا سامان سیٹ کرنے کے بعد عمارہ اسامہ کے پاس آئی، اس نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ کے ہلایا۔

''اسامہ.....''

اس نے معمولی سی جھرجھری لی اور پھر سو گیا۔ عمارہ نے اسے زور سے جھنجھوڑا۔ ''اٹھو بھئی کیا ہوگیا ہے۔''

اس بار اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ ''کیا ہو گیا ہے کیوں اتنا ظلم ڈھا رہی ہو۔''

''پانچ بج رہے ہیں۔'' عمارہ کی زوردار آواز پر اسامہ اُٹھ کے بیٹھ گیا۔

''اتنا وقت ہو گیا ہے۔''

''اب تم ان دونوں کو بھی اُٹھاؤ میں نے کھانے کا آرڈر دے دیا ہے۔ تم سب اُٹھ کے فریش ہو جاؤ۔'' یہ کہہ کر عمارہ اُٹھ گئی۔ اسامہ نے ساحل اور عارفین کو بھی اُٹھایا اور وہ تینوں ہاتھ منہ دھو کے فریش ہو گئے تھوڑی دیر کے بعد ویٹر کھانا لے کر آ گیا عمارہ نے اس کے ساتھ مل کر ٹیبل پر کھانا لگایا۔ کھانے کے ساتھ ویٹر نے کولڈ ڈرنکس بھی رکھ دی۔

''میڈم کسی اور چیز کی ضرورت ہوئی تو فون پر بتا دیجیے گا۔'' یہ کہہ کر ویٹر چلا گیا۔

تینوں جلدی سے آکر کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

''یہ تم نے بہت نیک کام کیا عمارہ..... بہت بھوک لگ رہی تھی۔'' ساحل نے سب سے پہلے پلیٹ اُٹھائی۔ عمارہ نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔

''تبھی اتنی میٹھی نیند سو رہے تھے اگر میں نہ اُٹھاتی تو تم سب جا کے رات کو اُٹھتے۔''

''جی نہیں..... ایسی بھی کوئی بات نہیں ہماری بھوک نے ہمیں اُٹھا ہی دینا تھا۔'' ساحل نے رائس پلیٹ میں ڈالتے ہوئے کہا۔

عارفین نے سلاد کی پلیٹ پر ہاتھ صاف کرتے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''ایک نیک کام اور کر دینا، اس کھانے کا بل بھی دے دینا۔''

عمارہ نے عارفین کے ہاتھ سے سلاد کی پلیٹ لے کر میز پر رکھ دی۔ ''آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ اس مشن پر جو بھی خرچہ ہو گا وہ ہم آپس میں بانٹیں گے۔ ہم میں سے کوئی بھی خرچہ کرے بعد میں ہم حساب کر لیں گے۔''

عارفین نے سلاد کی پلیٹ دوبارہ اُٹھائی۔ ''اگر زندہ بچے تو..... ورنہ فرشتے تو حساب کتاب کر ہی لیں گے۔''

عمارہ ہنستے ہوئے کرسی پر بیٹھ گئی۔ ''توبہ ہے پورے جوکر ہیں دونوں.....''

اسامہ بھی ان کی باتوں پر مسکرائے جا رہا تھا۔

''بھئی مذاق چھوڑو، عمارہ ٹھیک کہہ رہی ہے کہ ہم بعد میں سارا خرچہ آپس میں تقسیم کر لیں گے۔ فی الحال سارا خرچہ میں کروں گا۔'' اسامہ نے کہا۔

''اچھا تو پھر..... دو تین ڈشز اور منگوا لیتا ہوں۔'' عارفین ایک بار پھر چہکتا ہو گیا۔

ساحل نے اس کے سر پر تھپکی دی۔ ''ٹک کر بیٹھ۔'' اسی ہنسی مذاق میں انہوں نے کھانا ختم کر لیا۔ اسامہ نے ویٹر کو بلایا کہ برتن لے جائے اور ساتھ چائے کا آرڈر بھی دے دیا۔

ویٹر ٹرالی لے کر آیا تو عمارہ نے برتن سمیٹ کر ٹرالی میں رکھ دیئے۔ ویٹر نے ٹیبل صاف کیا اور پھر برتن لے گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد سامان میز پر رکھا اور چلا گیا۔

عمارہ نے تینوں کو چائے سرو کی۔ عمارہ نے کیتلی سے اپنے لیے چائے ڈالی اور پھر آدھا چمچ چینی ڈال کر مکس کرنے لگی۔ عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھا۔ ''ہم پتروس کے علاقے میں ٹھہرے ہیں۔ مری تو اس سے کافی دور ہے۔''

''نہیں..... مری اس سے زیادہ دور نہیں ہے۔ بس چند کلومیٹر کا فاصلہ ہے۔'' اسامہ نے چائے کا سپ لیتے ہوئے کہا۔

''تمہاری انفارمیشن کے مطابق ان چاروں نے پتروس کے علاقے میں پہاڑ سے چھلانگ لگائی تھی، ان پُرخطر پہاڑوں میں ہم ان کا سراغ کیسے لگائیں گے، ہمیں کیسے معلوم ہو گا کہ کالا جادو کرنے کے لیے انہوں نے کس جگہ کا انتخاب کیا ہو گا۔''

''میں سب جانتا ہوں.....'' اسامہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

عمارہ کی نظریں متعجب ہو گئیں، اس نے مضطرب سی کیفیت میں سر جھکا لیا۔ ساحل اور عارفین بھی سوالیہ نظروں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ آخر عمارہ سوال کیے بغیر نہ رہ سکی۔ ''تم اتنا سب کیسے جانتے ہو.....''

عمارہ کے سوال پر اسامہ تپ گیا۔ وہ جھٹکے سے اُٹھا تو چائے کا کپ اُلٹ گیا۔ گرم چائے اس کے ہاتھ پر گر گئی۔ عمارہ جلدی سے ٹشو لے کر اس کا ہاتھ صاف کرنے لگی تو اس

سے ہاتھ پیچھے جھٹک دیا۔

اس نے عمارہ کو شانوں سے پکڑا اور اپنی دہکتی آنکھیں اس کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ''میں تو تمہیں اس سے بھی زیادہ حیران کرنے والا ہوں۔ میں تو یہ بھی جانتا ہوں کہ وہ سب کتنی بار روئے تھے اور کتنی بار ہنسے تھے۔ جب زندگی ان سے دامن چھڑا رہی تھی تو وہ کتنا تڑپے تھے۔ ان کی آخری چیخیں تک میری سماعت میں گونج رہی ہیں۔'' اسامہ کی آنکھوں کا کلر بدل چکا تھا۔ اس کی آنکھیں نیلی ہوگئی تھیں۔ عمارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے پلکیں جھپکائے بغیر پوچھا۔

''تم ہو کون؟''

اسامہ خاموشی سے عمارہ کی طرف دیکھتا رہا اور پھر اس نے اس کے شانوں سے ہاتھ ہٹا لیے اور دوسرے کمرے میں چلا گیا۔

عمارہ اپنے شانوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ اسامہ کو اندازہ ہی نہ ہوا تھا کہ اس نے کتنی سختی سے عمارہ کو شانوں سے پکڑا تھا۔

ساحل اور عارفین عمارہ کے قریب بیٹھ گئے۔ ''تم جانتی ہو کہ اسامہ نے مشن پر آنے سے پہلے ہی یہ بات ہم سب سے کہی تھی کہ اس سے کوئی سوال نہ کیا جائے۔'' ساحل نے عمارہ سے کہا تو عارفین نے منہ بسورتے ہوئے ساحل کی طرف دیکھا۔

''چھوڑو یار، تم اس کی حمایت مت کرو، لڑکیوں سے بات کرنے کا کوئی طریقہ ہوتا ہے۔ اسے عمارہ سے اس انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔''

''پلیز تم لوگ آپس میں بحث مت کرو۔'' یہ کہہ کر عمارہ اپنی جگہ سے اٹھی اور باہر بالکونی میں جا کے کھڑی ہوگئی۔

شام کا وقت تھا، دھنکی ہوئی روئی جیسے سفید بادلوں نے پہاڑوں کو چھپا لیا تھا مگر یہ دلفریب منظر عمارہ کی بھیگی آنکھوں میں دھندلا گیا تھا۔ جتنی جلدی اسامہ کو غصہ چڑھا اتنی ہی جلدی اتر بھی گیا۔

وہ واش روم میں گیا اور چہرے پہ پانی کے چھینٹے مارنے لگا پھر کسی سوچ میں گم آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتا رہا، اسے شدت سے اپنی غلطی کا احساس ہو رہا تھا۔ اس نے تولیے سے چہرہ خشک کیا تو من ہی من میں خود کو برا بھلا کہتا رہا۔

''نہ جانے مجھے کیا ہو جاتا ہے مجھے اس قدر غصہ کیوں آ گیا۔ مگر یہ سب بھی تو بار بار مجھ سے سوال کرتے ہیں جبکہ یہ سوال مجھے خود بے چین کیے رکھتا ہے کہ میں ان چار مزاروں کے بارے میں اتنا کچھ کیسے جانتا ہوں۔'' خود کلامی کرتا ہوا وہ واش روم سے باہر آ گیا اس نے اچٹتی نگاہ ساحل اور عارفین پر ڈالی وہ دونوں منہ بسورے بیٹھے ہوئے تھے۔

ان کی شکلوں سے اسامہ کو اندازہ ہو گیا کہ وہ دونوں بھی اس سے ناراض ہیں۔ ''آج تو بری طرح پھنس گئے...'' اسامہ نے خود سے سرگوشی کی۔ وہ دھیرے دھیرے کمرے کی کھڑکی کی طرف بڑھا، اس نے کھڑکی سے باہر جھانکا، عمارہ بالکونی میں کھڑی تھی۔ وہ کمرے سے باہر بالکونی میں چلا گیا۔ عمارہ ریلنگ کے پاس کھڑی تھی جس کے ساتھ ساتھ خوبصورت سی باڑ لگی تھی۔ اسامہ اس کے قریب کھڑا ہو گیا۔

اسامہ کو قریب دیکھ کر عمارہ وہاں سے جانے لگی تو اسامہ اس کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

''سوری......''

''آگے سے ہٹ جاؤ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی۔'' عمارہ غصے میں بولی۔

''مگر مجھے تو بات کرنی ہے۔''

''مجھے تمہاری بات نہیں سننی......'' عمارہ جھٹکے سے پاؤں رکھتے ہوئے وہاں سے چلی گئی۔ اسامہ بالکونی میں ہی کھڑا رہا۔ اس کی طبیعت بہت بے چین تھی۔

فلیٹ کے باہر چھوٹا سا لان تھا۔ اس نے دیکھا کہ عمارہ لان میں ٹہل رہی ہے، اسامہ بھی اس کے پیچھے پیچھے لان کی طرف چل پڑا۔ عمارہ نے اسے آتے ہوئے دیکھا تو منہ بنا کر بنچ پر بیٹھ گئی۔

اسامہ اس کے قریب بنچ پر بیٹھ گیا۔ عمارہ نے اس کی طرف گھور کر دیکھا۔ ''جب میں نے کہہ دیا کہ مجھے تم سے کوئی بات نہیں کرنی تو پھر کیوں میرا پیچھا کر رہے ہو۔''

”عمارہ! میرا یقین کرو میں خود بھی نہیں جانتا کہ میں کس طرح اس قدر تیغ پا ہو گیا۔ میں تمہیں بار بار کہتا ہوں کہ یہ سوال مجھے بہت تنگ کرتے ہیں پلیز مجھ سے سوال مت کیا کرو میں نے تمہیں اذیت دی ہے تاہم بھی مجھے اذیت دے دو، حساب برابر۔“

اسامہ نے اپنے لانگ شوز سے نوکدار خنجر نکالا اور عمارہ کی طرف بڑھایا۔”یہ لو تم بھی میرے بازوؤں پر جتنے چاہو زخم لگا دو۔“

عمارہ نے اپنی نمدار آنکھوں سے اسامہ کی طرف دیکھا۔”بس اتنی ہی محدود سوچ ہے تم مردوں کی، عورت کے ایک اشک کی قیمت تم ادا نہیں کر سکتے مگر ایک عورت تم مردوں کے بدلے روتی بھی ہے اور اپنے حصے کی خوشیاں بھی انہیں سونپ دیتی ہے۔ عورت پر اپنی طاقت دکھا کر اسے اس کی کمتری کا احساس ہی دلاتا ہے نا۔“

اسامہ بھی عمارہ کی طرح سنجیدہ ہو گیا۔”تم نے مجھے معاف نہیں کرنا تو نہ کرو مگر اس طرح کی باتیں مت کرو، میں نے کبھی بھی عورت کو مرد سے کمتر نہیں سمجھا۔ انسان اپنی خصوصیات کی وجہ سے پہچانا جاتا ہے چاہے مرد ہو یا عورت۔“

اسی دوران میں ساحل بھی ان میں آ گیا۔ وہ ان دونوں کے قریب آیا۔ عمارہ اپنی جگہ سے اٹھ کر جانے لگی تو اسامہ نے اسے ایک بار پھر پکارا۔”پلیز عمارہ! میں سوری کہہ رہا ہوں نا.....“

اس بار ساحل نے عمارہ کا راستہ روک دیا۔”عمارہ! ہم یہاں لڑنے کے لیے نہیں آئے، ایک خاص مشن پورا کرنے آئے ہیں ایسا مشن جس میں ہم نے زندگی کا جوا کھیلنا ہے۔ ہم میں سے کون لقمہ اجل ہو جائے یہ ہم نہیں جانتے۔“

عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھا جو بینچ پر بیٹھا ہوا تھا۔ ”ٹھیک ہے ایک شرط پر معاف کروں گی کہ تم اس طرح کے سوال پوچھنے پر بھڑ کو گے نہیں۔“

اسامہ مسکراتا ہوا کھڑا ہو گیا۔”میں سوال کا جواب دینے کا وعدہ نہیں کرتا مگر کوشش کروں گا کہ خود پر قابو رکھوں۔“

تھوڑی دیر کے بعد عمارہ وہاں سے چلی گئی۔ ساحل اسامہ کے قریب آیا۔”کیا پروگرام ہے۔“

”ہمارا خیال ہے کہ ہمیں نکلنا چاہیے پہلے ہی ہمارا بہت سا وقت برباد ہو گیا ہے۔ اندر کمرے میں جاتے ہیں پھر سمجھاتا ہوں کہ ہم نے کہاں جانا ہے اور کس طرح جانا ہے۔“ اسامہ نے کہا اور پھر وہ دونوں اندر فلیٹ میں چلے گئے۔ وہ دونوں کمرے میں داخل ہوئے تو عارفین اور عمارہ اپنے اپنے بیگ میں کچھ چیزیں رکھ رہے تھے۔

اسامہ نے ان دونوں کی طرف دیکھا۔”اچھی بات ہے تیاری کر لو۔ ہم بس ان پندرہ منٹ کے بعد نکلتے ہیں۔ تم دونوں ادھر آؤ۔“ عارفین اور عمارہ اسامہ کے قریب آ گئے۔ اسامہ نے میز پر ایک کاغذ پھیلایا۔ اس نے کاغذ پر چھوٹا سا دائرہ بنایا۔

”یہ ہمارا ہوٹل ہے جو پیڑوکس کے علاقے میں ہے پیڑوکس سے چند کلومیٹر کے فاصلے پر کھڑتک پہاڑی سلسلہ ہے۔ یہی ہمارا ٹارگٹ ہے پیڑوکس کی گہری کھائیوں کے کھڑتک پہاڑوں کے بیچ میں ہی کہیں وہ ریسٹ ہاؤس ہے جہاں وہ چاروں لڑکیاں چھپے تھے۔ ہمیں اسی ریسٹ ہاؤس تک پہنچنا ہے۔ جن لوگوں نے ان چاروں کو ڈھونڈنے کی کوشش کی وہ دراصل اس ریسٹ ہاؤس تک نہیں پہنچ سکے۔ فی الحال ہم یہاں سے نکلتے ہیں پھر آگے کا راستہ بھی ڈھونڈ لیں گے۔ تم سب کو پتہ ہے کہ ہم نے اپنے سامان میں کیا کیا رکھنا ہے، ٹارچ اور ماچس زیادہ تعداد میں رکھو کیونکہ ہمیں وہاں بجلی کا بہت پرابلم ہوگا۔ کھانے پینے کی اشیاء بھی رکھ لینا۔ جتنا وہاں جانا مشکل ہے اتنا ہی وہاں سے نکلنا بھی مشکل ہے۔“

سب نے اسامہ کی ہدایات پر عمل کرتے ہوئے پیکنگ کی۔ تقریباً پندرہ منٹ کے بعد وہ سب وہاں سے نکل گئے۔ ڈرائیونگ سیٹ پر ساحل بیٹھ گیا اور اس کے ساتھ اگلی سیٹ پر عمارہ بیٹھ گئی۔ اسامہ اور عارفین پیچھے بیٹھ گئے۔

بسم اللہ پڑھ کر وہ وہاں سے روانہ ہو گئے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ چیڑ کے درختوں کے جھنڈ بادلوں میں جیسے غائب ہو گئے تھے۔ عمارہ کی نظریں تو اطراف میں تیزی سے گزرتے مناظر پر ہی جمی تھیں۔ سڑک سانپ کی طرح بل کھاتی، پہاڑوں پر اونچائیوں کو چھوتی جا رہی تھی۔

چند کلومیٹر کے بعد ہی دیو ہیکل پہاڑ دکھائی دینے لگے۔ جس کے ساتھ ہی گہری خطرناک کھائیوں کا سلسلہ شروع ہوگیا، تھوڑا سا آگے جانے کے بعد اسامہ نے ساحل سے گاڑی روکنے کو کہا۔

ساحل نے سڑک سے اُترتے ہوئے ایک گھنے درخت کے قریب کچی جگہ پر گاڑی پارک کی۔ وہ سب گاڑی سے باہر نکل آئے۔

اسامہ درخت کے قریب کھڑا ہوگیا۔ ''یہی وہ جگہ ہے جہاں ان چار لڑکے لڑکیوں نے کالج بس سے چھلانگ لگائی تھی۔''

''یہ تو بہت گہری اور خطرناک کھائیاں ہیں۔ ان سب نے کس طرح چھلانگ لگا دی۔ اس طرح چھلانگ لگانے کے بعد کسی کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔''

''وہ چاروں زندہ رہے اور انہوں نے ایک کھنڈر نما ریسٹ ہاؤس میں پناہ لی اور ناپاک سفلی عمل بھی کیے۔''

''مگر کیسے؟ یہاں نیچے تو کوئی راستہ دکھائی نہیں دے رہا....'' ساحل نے حیرت میں ڈوبے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

اسامہ نے انگلی سے نیچے کھائی کی طرف اشارہ کیا۔ ''تم وہ پہاڑ نہیں دیکھ رہے اور ساتھ یہ لمبے لمبے چیڑ کے درخت، بے شک انہوں نے چھلانگ مار کے زندگی اور موت کا جوا کھیلا مگر تقدیر نے ان کا ساتھ دیا اور وہ لقمہ اجل نہیں ہوئے، وہ کسی پہاڑ پر لٹک گئے ہوں گے یا کسی درخت سے لٹک گئے ہوں گے لیکن یہ بات طے ہے کہ وہ چاروں پہاڑوں کی غاروں کے ذریعے اس ریسٹ ہاؤس تک پہنچے۔''

عارفین نے خوف سے کندھے اچکائے۔ ''ہمیں بھی کیا ان غاروں کے ذریعے ریسٹ ہاؤس تک پہنچنا ہوگا۔''

''ہاں.... ہم ان غاروں کے ذریعے ہی اس پُراسرار ریسٹ ہاؤس تک پہنچیں گے لیکن ہم اُن چاروں کی طرح یہاں سے چھلانگ نہیں ماریں گے تھوڑا سا آگے جا کے نیچے جانے کا پیدل راستہ ہے۔''

''چلو پھر گاڑی میں بیٹھتے ہیں تھوڑا آگے جاکے رُکتے ہیں۔'' ساحل نے کہا اور پھر وہ چاروں گاڑی میں بیٹھ گئے۔

تھوڑا آگے جاکے ساحل نے گاڑی روکی اور چاروں اپنا اپنا بیگ بیک پہن کے نیچے اُتر گئے۔

عمارہ نے لانگ میرون شرٹ کے نیچے بلیک جینز پہن رکھی تھی ان چاروں نے جوگرز پہن رکھے تھے جس کی وجہ سے انہیں پتھریلے راستے دشوار نہیں لگ رہے تھے۔ اُترائی خاصی گہری اور مشکل تھی وہ گویا بلند ترین پہاڑ سے نیچے اُتر رہے تھے۔ وہ چاروں ایک قطار کی شکل میں آہستہ آہستہ قدم جما جما کر نیچے اُتر رہے تھے۔ سب سے آگے ساحل تھا اس کے پیچھے عارفین اور ان دونوں سے پیچھے اسامہ اور عمارہ تھے۔

عمارہ اسامہ کے پیچھے آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ باریک باریک پتھر راستے میں منوں کی طرح بکھرے ہوئے تھے۔ بہت احتیاط سے چلنے کے باوجود عمارہ کا پاؤں پھسل گیا۔ اسامہ نے تیزی سے آگے بڑھ کر اسے تھام لیا۔ عمارہ کے چہرے پر ابھی تک تناؤ تھا وہ ابرو میں چڑھا کے بولی۔ ''تم اپنا خیال رکھو میں اپنا خیال رکھ سکتی ہوں۔''

اسامہ نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا۔ ''یاد رہے کہ میں نے تمہیں دوبارہ نہیں بچانا....''

''ابھی بھی کس نے کہا تھا بچانے کو میں خود سنبھل جاتی....''

اسامہ نے عمارہ کے خفگی بھرے چہرے کی طرف مسکراتے ہوئے دیکھا اور دوبارہ نیچے اُترنے لگا۔

عمارہ کی ان باتوں کے باوجود اس کی پوری توجہ عمارہ کی طرف تھی کہ وہ دوبارہ نہ پھسل جائے۔ تقریباً بیس منٹ کے بعد اسامہ نے انہیں ایک پہاڑ کے قریب رُکنے کا اشارہ کیا۔ وہ چاروں اس پہاڑ کے قریب بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئے ان کا سانس پھولا ہوا تھا وہ لمبے لمبے سانس لے رہے تھے۔ ان چاروں نے پانی پیا۔

عمارہ نے اپنا حلق تر کرتے ہوئے پوچھا۔ ''ہمیں مزید نیچے تو نہیں جانا۔''

''نہیں.... یہ سامنے جو پہاڑ ہے اس میں ایک غار ہے وہ غار ہمیں ڈھونڈنی ہے، اس غار کے راستے ہم آگے

جائیں گے۔'' اسامہ نے پہاڑ کی طرف اشارہ کیا۔

عارفین فوراً عمارہ سے مخاطب ہوا۔'' عمارہ! تم جانتی ہو نا کہ غاروں میں کیا کچھ ہوتا ہے چھپکلیاں، بچھو، سانپ، چمگادڑیں وغیرہ وغیرہ......''

''چپ ہو جاؤ مجھے مت ڈراؤ......'' عمارہ غصے سے بولی۔

اسامہ نے عارفین کی طرف دیکھا۔'' تم عمارہ کا خوف بتا رہے ہو یا اپنا...... بہرحال غاروں میں یہ چیزیں ہوتی ہیں اس لیے اپنی اپنی ٹارچیں سیٹ رکھنا، احتیاط سے قدم رکھنا۔''

ساحل وہاں سے اُٹھ گیا اور پہاڑ کا جائزہ لینے لگا۔

''اتنے بڑے پہاڑ میں ہم سرنگ کہاں سے ڈھونڈیں گے۔''

اسامہ بھی کھڑا ہو کے ساحل کی طرف بڑھا۔''ہمیں سرنگ ڈھونڈنے میں مشکل نہیں ہوگی کیونکہ وہ ادھر قریب ہی ہے تم پہاڑ کے بائیں جانب اس کے ٹوٹے ہوئے حصوں کی طرف دیکھو۔''

اسامہ پہاڑ کے ٹوٹے ہوئے نوکیلے حصوں کی طرف بڑھا تو اس نے بلند آواز میں کہا۔'' ہاں یہاں ایک سرنگ ہے۔''

عمارہ اور عارفین اسامہ کے ساتھ ساحل کی طرف بڑھے۔ اسامہ نے اثبات میں سر ہلایا۔'' ہاں یہی وہ غار ہے۔''

عمارہ نے پریشان کن انداز میں اسامہ کی طرف دیکھا۔'' دیکھ لو اسامہ ہم ان غاروں میں کہیں بھٹک نہ جائیں۔''

''مجھ پر بھروسا رکھو ہم نہیں بھٹکیں گے۔'' اسامہ نے پُراعتماد لہجے میں کہا۔

''یہ تم پر بھروسا ہی ہے جو ہم یہاں تک آ گئے ورنہ تمہاری باتیں تو عقل تسلیم نہیں کرتی۔'' یہ کہہ کر عمارہ نے قدم آگے بڑھا دیئے۔

اسامہ سب سے پہلے غار میں داخل ہوا پھر تینوں اس کے پیچھے پیچھے غار میں داخل ہو گئے۔ غار کی زمین غیر ہموار تھی اور پتھروں سے بھری ہوئی تھی۔ چھت کے حصے پر بھی پتھر اس طرح اٹکے ہوئے تھے جیسے ابھی سر پر آ گریں گے۔

غار کھلی اور کشادہ تھی جس کی وجہ سے وہ سارے باآسانی آگے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ جوں جوں آگے بڑھتے جا رہے تھے غار میں تاریکی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ ٹارچوں کی روشنی میں آگے بڑھ رہے تھے غار کی تاریکی کے ساتھ ان کا خوف بھی بڑھتا جا رہا تھا۔ ہر قدم پہ واہمہ ہوتا کہ کوئی خطرناک جانور ان کے سامنے آ جائے گا۔

اس خوف کے ساتھ وہ چلتے رہے پھر غار کا راستہ دائیں طرف کو مڑ گیا۔ اسامہ دائیں طرف جانے لگا تو ساحل نے اس کا بازو پکڑا۔'' آگے کوئی راستہ بھی ہے کہیں ہم سب پھنس نہ جائیں......''

اسامہ نے اثبات میں سر ہلایا۔'' پریشان نہ ہو آگے راستہ ہے۔'' یہ کہہ کر اسامہ دائیں طرف خم کھاتے راستے کی طرف بڑھا تو باقی تینوں بھی اس کے ساتھ خم دار راستے کی طرف بڑھے۔

جونہی وہ سب دائیں طرف کو مڑے سیاہ چمگادڑوں کا غول ان پر جھپٹ پڑا۔ ان کے ہوش اُڑ گئے۔

''اپنی اپنی ٹارچیں بند کر دو۔'' ساحل بلند آواز میں چلایا۔ سب نے اپنی اپنی ٹارچیں بند کر دیں۔ اور وہ سب گھٹنوں کے بل زمین پر بیٹھ گئے۔ چمگادڑیں تیزی سے اوپر سے گزر گئیں۔

عمارہ نے سکون کا لمبا سانس کھینچا تو اسامہ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا۔'' ان چمگادڑوں سے ٹاکرا پھر بھی ہو سکتا ہے۔ یہی طریقہ اختیار کرنا......''

عمارہ کے اس سوال کا جواب عارفین نے دیا۔'' کوئی مسئلہ ہی نہیں، ان سے ان کی کمزوری پوچھ لیں گے۔''

''اچھا...... اب باتوں میں وقت برباد نہ کرو، آگے بڑھو۔'' ساحل، عارفین کی طرف متوجہ ہوا۔

''ایڈونچر میں باتیں نہ ہوں تو ایڈونچر کا کیا مزا۔'' عارفین نے ساحل کو سنائی۔

ساحل نے اسے دھکا دیتے ہوئے آگے دھکیل دیا۔

وہ اپنی ٹارچیں آن کر چکے تھے آگے راستہ تقریباً صاف دکھائی دے رہا تھا مگر اب راستہ ایک سرنگ کی طرح تنگ ہو گیا تھا۔

سب آگے کی طرف روشنی مارتے ہوئے چلتے جا رہے تھے کہ اچانک عمارہ بری طرح چیخی اور ٹارچ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ اسامہ اس کے قریب ہی تھا وہ تیزی سے عمارہ کی طرف بڑھا عمارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے غار کے اوپر چھت کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اسامہ نے چھت پر ٹارچ ماری۔ چھت کا وہ حصہ سانپوں سے بھرا ہوا تھا جو گچھوں کی شکل میں ادھر ادھر منڈلا رہے تھے۔ اس گچھے میں سے تین سانپ ان کے چہروں کے قریب آ گرے۔

سب خوف سے پتھرائی ہوئی آنکھوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔ ''اپنے اپنے قدموں کو ان سانپوں سے بچاتے ہوئے دیوار کے ساتھ آگے بڑھتے رہو۔ ہم ان پر وار نہیں کریں گے تو یہ بھی ہم پر وار نہیں کریں گے۔'' اسامہ کی ہدایت پر سب نے عمل کیا اور وہ غار کے اس خطرناک حصے سے نکل گئے۔

تقریباً آدھا گھنٹہ وہ اس سرنگ نما غار میں چلتے رہے، چھوٹے چھوٹے زہریلے جانور راستے میں دکھائی دیتے رہے مگر کسی خطرناک جانور کا سامنا دوبارہ نہیں ہوا۔ غار میں تھوڑی تھوڑی سی روشنی دکھائی دی۔

''لگتا ہے کہ یہ غار باہر کھل رہی ہے، دیکھو آہستہ آہستہ روشنی پھیل رہی ہے۔''

وہ سرنگ نما غار ایک بڑے سے کھلے حصے میں جا کے ختم ہوگئی۔ ساحل سب سے آگے تھا اس کا دھیان اسامہ کی طرف تھا۔

اس نے اگلا قدم رکھا تو وہ جھیل کے پانی میں جا گرا۔ پانی تین فٹ تک تھا اس لیے اس نے خود کو سنبھال لیا۔ اس کا چہرہ غصے سے سرخ ہوگیا جب سب کے قہقہوں کی آوازیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔

''تم سب کو میرا مذاق اڑانے کی ضرورت نہیں ہے، تم سب کو بھی اس پانی سے گزر کر ہی آگے جانا پڑے گا کیونکہ آگے بھی سارا پانی ہے۔''

یہ سن کر سب کی ہنسی غائب ہوگئی۔ عارفین نے ساحل کا ہاتھ پکڑ کے اسے باہر نکالا اور ارد گرد کے ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ غار کا یہ حصہ نہ صرف وسیع ترین تھا بلکہ دن کی چلچلاتی روشنی بھی پہاڑ پر چھوٹے چھوٹے شگافوں سے چھن کر اندر آ رہی تھی۔

پانی چل رہا تھا شگافوں سے چھن چھن کر آنے والی روشنی سے پانی چمک رہا تھا۔

''یہ پانی پہاڑ کے کسی حصے سے آبشار بن کے پھوٹ رہا ہوگا۔'' عمارہ نے مسکراتے ہوئے چمکدار پانی کی طرف دیکھا۔

عارفین نے منہ بسورتے ہوئے کہا۔ ''مجھے اس وقت اس پانی کی خوبصورتی متاثر نہیں کر رہی، میں تو یہ سوچ رہا ہوں کہ اس پانی میں سے گزریں گے کیسے۔''

''کوئی راستہ ڈھونڈتے ہیں۔'' اسامہ نے چاروں طرف نظر دوڑائی۔

''تم عمارہ کے پاس ہی ٹھہرو، میں اور ساحل آگے جا کے دیکھتے ہیں کہ راستہ ہے یا نہیں۔'' عارفین نے اسامہ سے کہا۔

ساحل اور عارفین پانی میں پہاڑ کے ابھرے ہوئے حصوں پر قدم جماتے ہوئے آگے بڑھنے لگے۔ تین بڑے بڑے پتھروں پر جس طرح وہ دونوں چھلانگیں مارتے گئے ویسے ہی واپس آ گئے۔ عارفین پھولے ہوئے سانس کے ساتھ بمشکل بولا۔

''کوئی اور راستہ نہیں ہے ہمیں پانی سے ہی گزرنا ہو گا۔ غار سے باہر جانے کے راستے تک پانی ہے لیکن راستہ زیادہ نہیں ہے، بس تھوڑا سا اور راستہ ہے اس کے بعد ہم اس غار سے باہر نکل جائیں گے۔''

''اوہ.... ہم کس طرح اس پانی میں سے گزریں گے۔'' عمارہ نے کہا۔

''اپنے اپنے جوگرز ہاتھوں میں اٹھا لو اور چل پڑو۔'' اسامہ نے کہا۔

عمارہ نے اپنے جوگرز کی طرف دیکھا اور اسامہ سے متوجہ ہوئی۔ ''میں ان نوکیلے پتھروں پر ننگے پاؤں کس طرح چلوں گی۔''

''آج ثابت کر دو کہ لڑکیاں کسی طرح بھی لڑکوں سے کم نہیں ہیں۔''

عمارہ نے گھورتے ہوئے اسامہ کی طرف دیکھا۔

''تم ہمارے چیف ہو اس لیے تمہاری بات تو ماننی پڑے گی۔''

یہ کہہ کر اس نے اپنے جوگرز اُتار کر ہاتھ میں پکڑ لیے اور اپنی پینٹ کے پائنچوں کو تھوڑا تھوڑا موڑ لیا۔

ساحل اور عارفین پانی میں اُتر گئے۔ ''ہائے ٹھنڈا برفیلا پانی ہے۔''

اسامہ بھی ان کے پیچھے پیچھے پانی میں اُتر گیا۔

عمارہ ابھی تک پتھر پر کھڑی تھی۔ اسامہ نے اس کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عمارہ بھی اسامہ کا ہاتھ پکڑ کے آہستہ آہستہ پانی میں اُتر گئی۔

وہ بھی چلا اُٹھی۔ ''اتنا ٹھنڈا پانی۔''

''چلو جی..... ایڈونچر میں ٹھنڈے پانی کا مزا بھی لو۔'' اسامہ نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سب ہمت کرکے چلتے رہے۔ ننگے پیروں پر نوکیلے پتھروں کی چبھن برداشت کرتے رہے۔ وہ کانپتے ٹھٹھرتے بالآخر غار کے آخری سرے تک پہنچ گئے۔ یہ سرنگ نما حصہ پانی سے کافی اونچا تھا۔

وہ چاروں باری باری اس حصے تک پہنچے اور اپنے پانی سے بھرے کپڑوں کو نچوڑنے لگے۔ پھر وہ غار سے باہر آ گئے۔ کھلا آسمان دکھائی دیا تو دل کو عجیب سا سکون ملا۔

غروب آفتاب کا وقت ہو گیا تھا۔ دن کی تیز روشنی دھیرے دھیرے سرخی مائل مدھم سی روشنی میں بدل گئی تھی۔

''اسامہ! مغرب کا وقت ہو گیا ہے۔ وہ ریسٹ ہاؤس اور کتنی دور ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد تو اندھیرا ہو جائے گا۔'' عمارہ نے اسامہ سے کہا۔

''سمجھو کہ ہم پہنچ گئے، اسی پہاڑ کے پیچھے وہ ریسٹ ہاؤس ہے۔ وہاں پہنچنے میں ہمیں دیر نہیں لگے گی۔'' یہ کہہ کر اسامہ اس پہاڑ کے ساتھ ساتھ موڑ کاٹتے راستے کی طرف چل پڑا۔ وہ تینوں بھی اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد ہی انہیں وہ کھنڈر نما ریسٹ ہاؤس دکھائی دینے لگا۔ اس جگہ کے قریب پہنچے تو سب ساکت ہو گئے۔

''واؤ..... Amazing یہ جگہ تو کسی عجوبے سے کم نہیں۔ کس طرح لینڈ سلائیڈنگ سے ان پہاڑوں نے ریسٹ ہاؤس کو چھپا لیا ہے اور اس طرح ایک دوسرے کے اوپر ٹک گئے ہیں کہ ریسٹ ہاؤس کو زیادہ نقصان نہیں پہنچا۔'' عمارہ نے مبہوت نظروں سے اس جگہ کو دیکھا۔

عارفین ریسٹ ہاؤس کے دروازے کی طرف بڑھا۔ اس نے دروازے کو دھکا دیا مگر دروازہ نہیں کھلا۔

اس نے دروازے کے شگافوں سے اندر جھانکا تو دروازہ اندر سے بند نہیں تھا۔ لوہے کی زنجیر دروازے کے ساتھ ہی لٹک رہی تھی۔ ساحل نے بھی عارفین کے ساتھ مل کر دروازے کو دھکا دیا مگر دروازہ اس طرح تھا جیسے کوئی بڑا سا پتھر دروازے کے آگے پڑا ہو جبکہ دروازے کے آگے کوئی چیز نہیں تھی۔ اسامہ اور عمارہ بھی ان دونوں کے قریب کھڑے تھے۔

اسامہ نے انہیں دروازے سے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ وہ دونوں پیچھے ہٹ گئے۔ اسامہ نے دروازے پر اپنا ہاتھ رکھا، اس کے صرف چھونے سے ہی دروازہ چرچراہٹ سے دو حصوں میں کھل گیا۔

''یہ کیسے.....'' ابھی الفاظ عارفین کے منہ میں ہی تھے کہ ساحل نے اپنی انگلی لہراتے ہوئے اشارہ کیا ''سوال نہیں۔''

وہ سب اندر داخل ہو گئے۔ دروازہ چرچراہٹ سے خود بخود بند ہو گیا۔ عمارہ نے حیرت سے پیچھے مڑ کر دیکھا اور پھر چل پڑی۔

ریسٹ ہاؤس نہایت خستہ حال تھا، فرش اور دیواروں پر دراڑیں اس قدر گہری تھیں کہ چلتے ہوئے عجیب سا خوف دل دہلا رہا تھا۔ وہ برآمدے سے ایک بڑے ہال نما کمرے میں داخل ہو گئے۔

یہ کمرہ بھی بہت خستہ حال تھا۔ دراڑوں سے بھری دیواروں اور چھت پر سیاہ جالے لٹک رہے تھے۔ کمرے کے فرنیچر کو سیاہ سفید کپڑے سے ڈھانپا ہوا تھا اور وہ سفید کپڑا بھی اس طرح گل سڑ گیا تھا کہ اندازہ ہو رہا تھا کہ فرنیچر کا کیا حال ہوگا۔ ان میں سے دو کرسیوں کا کپڑا اُترا ہوا تھا جن کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے فرش پر گرے ہوئے تھے۔

اسامہ کی حالت بہت عجیب تھی وہ جوں جوں اس کمرے کا جائزہ لے رہا تھا، کسی گہری سوچ میں ڈوبا چلا جا رہا

تھا۔ کچھ بھولے بسرے کردار، کچھ مبہم آوازیں تھیں جو اس کی سماعت میں گونج رہی تھیں۔ اسی سوچ میں اس کی زبان سے لفظ ادا ہوئے۔

''جیسا بھی ہے ایک کمرہ تو مل کر صاف کرنا ہوگا تاکہ ہم یہاں رات گزار سکیں۔''

عمارہ نے تعجب سے اسامہ کی طرف دیکھا۔ ''ہم نے تو یہاں رات گزارنے کی بات نہیں کی''

پھر وہ اسامہ کے قریب آئی۔ اسامہ کی آنکھوں کی رنگت تبدیل ہوچکی تھی۔

''یہ تم نہیں تمہارے اندر کوئی اور بول رہا ہے، جب بھی موقع ملا میں تمہارے اندر چھپے ہوئے اس دوسرے شخص کو ضرور ڈھونڈوں گی۔'' وہ من ہی من میں بڑبڑائی۔

اسامہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی اس نے اپنی نیلی آنکھوں سے عمارہ کی آنکھوں میں جھانکا اور دھیرے سے کہا۔

''تمہیں اسے ڈھونڈنے کی ضرورت نہیں پڑے گی وہ بہت جلد تمہارے سامنے آئے گا۔''

عمارہ ٹھٹھا گئی کہ اسامہ نے اس کا ذہن کیسے پڑھ لیا۔ کچھ سوچیں ایک بار پھر اس کے لیے پہیلی بن گئیں۔

''ایک ہمزاد ہی کسی کے دماغ میں گھس کر اس کا ذہن پڑھ سکتا ہے لیکن اسامہ تو ایک جیتا جاگتا انسان ہے۔'' ساحل کی آواز نے عمارہ کو اس سوچ سے باہر نکال دیا۔

''عمارہ آؤ ریسٹ ہاؤس کے باقی حصے دیکھتے ہیں۔''

عمارہ ساحل کے ساتھ آگے بڑھی، کمروں میں بہت اندھیرا تھا۔ وہ ٹارچوں کی مدد سے آگے بڑھتے جارہے تھے۔ انہوں نے ریسٹ ہاؤس کے سارے کمرے دیکھے۔ کمروں میں پڑا فرنیچر گل سڑ گیا تھا۔ سینکڑوں سالوں سے جیسے کوئی اس ریسٹ ہاؤس میں نہیں آیا۔

''یہ ریسٹ ہاؤس تین کمروں، ایک کچن اور ایک باتھ روم پر مشتمل ہے۔'' عمارہ نے ساحل سے کہا، وہ چاروں اس ریسٹ ہاؤس کے مختلف حصوں میں بکھر گئے۔

ساحل اور عمارہ ایک کمرے میں داخل ہوئے جو غالباً بیڈ روم تھا۔ جس کے فرش پہ مٹی کی اتنی موٹی تہہ تھی کہ اندازہ نہیں ہورہا تھا کہ اس مٹی کی تہہ کے نیچے کس طرح کا فرش ہو گا۔ ہر کمرے میں داخل ہوتے ہوئے پورے جسم سے خوف کی سنسنی سی دوڑ جاتی تھی کہ جن ہمزاد کو وہ ڈھونڈنے آئے ہیں نہ جانے وہ کب اور کس روپ میں ان کے سامنے آجائیں۔

عمارہ کمرے کی گمبھیر تاریکی میں ٹارچ سے روشنی ڈالتے ہوئے آگے بڑھ رہی تھی۔ ایک پلنگ دکھائی دے رہا تھا جس کے اوپر بھی مٹی کی پوری تہہ تھی۔ لکڑی دیمک نے بُری طرح سے کھوکھلی کردی تھی۔

چی چی کی آواز کے ساتھ اس کے پیروں سے کچھ ٹکرایا جیسے بہت سے کانٹے اس کے پیروں پر سے گزر گئے۔

عمارہ نے اپنے پاؤں جھٹکتے ہوئے چیخی تو ساحل نے اس کے پیروں پر لائٹ ماری، بے شمار چھوٹے چھوٹے چوہے ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔

''اس طرح کی جگہیں کیڑے مکوڑوں یا اس طرح کے جانوروں کی آماجگاہ ہی بن جاتی ہیں۔'' ساحل نے بیزاری سے منہ بنایا۔

عمارہ نے سائیڈ کارنر پر پڑے کینڈل اسٹینڈ پر روشنی ڈالی اور پھر اینٹیک پرانی طرز کی وال کلاک پر پھر وہ ساحل سے مخاطب ہوئی۔ ''ہمیں تو ان کمروں میں ایسی کوئی چیز نظر نہیں آئی جس سے ظاہر ہو کہ یہ جگہ پُراسرار قوتوں کا مسکن ہے۔''

ساحل نے مضحکہ آمیز انداز میں سر کو جھٹکا۔ ''بدروحیں کسی ٹھوس چیز کا استعمال تھوڑی کریں گی۔ وہ تو اس ہوا میں کہیں بھی موجود ہوسکتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس وقت بھی ہماری باتیں سن رہی ہوں......''

''ساحل! تم نہیں جانتے کوئی نہ کوئی نشانی مل جاتی ہے ان بدروحوں کی۔'' یہ کہہ کر عمارہ نے اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا اے میٹر ساحل کو دکھایا۔ ''یہ دیکھو اس کی سوئیاں بھی ساکت ہیں۔''

ساحل کو ایک بار پھر مذاق سوجھا۔ ''ان کمروں میں کوئی چیز ہو یا نہ ہو مگر ہم اپنے ساتھ ایک پُراسرار چیز ضرور لائے ہیں۔''

''ساحل تم کس کی بات کررہے ہو۔'' عمارہ ساحل سے پوچھ رہی تھی کہ عارفین اور اسامہ کمرے میں داخل ہوئے۔

"جس کو یاد کیا وہ آ گیا۔" ساحل نے اسامہ کی طرف دیکھ کر کہا۔

عمارہ نے ساحل کی طرف گھور کر دیکھا۔ اچانک اے میٹر کی تیز تیز آواز نے اسے اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ ریڈ لائٹ کے ساتھ اے میٹر کی سوئیاں تیز تیز ہل رہی تھیں۔

اس نے سہمی سہمی نظروں سے اسامہ کی طرف دیکھا، ایک پل کے لیے اسے یوں لگا جیسے ساحل کا مذاق سچ میں بدل گیا ہے۔ اس نے اے میٹر کا رخ کمرے کی طرف کیا اور آہستہ آہستہ چلنے لگی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی اے میٹر کی آواز بند ہوگئی۔

اسامہ عمارہ کے قریب آیا۔ "اس اے میٹر کے بھروسے مت رہنا۔ یہ اے میٹر جنات یا دوسری غیبی مخلوقات کی اس ہوا میں موجودگی پر خاص ریڈیشن پڑھتا ہے یہ بھی چیزیں کسی ٹھوس وجود میں داخل ہو جائیں تو یہ آلہ ان کی موجودگی نہیں پڑھ سکتا۔" عمارہ کو یوں لگا جیسے اسامہ اسے اپنے بارے میں بتا رہا ہے۔ اس نے کچھ سوچ کر اے میٹر کو اپنے بیک بیگ میں واپس ڈال دیا۔

"ریسٹ ہاؤس کے صحن میں جاتے ہیں۔ وہاں ہم اکٹھے جائیں گے، ایک دوسرے سے الگ نہیں ہونا۔ وہاں ہمارے لیے خطرہ ہوسکتا ہے۔" اسامہ نے کہا۔

وہ سارے مل کر ہال نما کمرے سے گزرتے ہوئے کمرے کے دروازے سے صحن کی طرف داخل ہوئے ایک انجانے سے خوف نے ایک بار ان کے قدم روک دیے، بظاہر وہاں کچھ بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا مگر کچھ باتوں کی دہشت من میں پھن پھیلائے بیٹھی تھی جو اس ریسٹ ہاؤس سے منسوب تھیں۔ بہت اندھیرا تھا کچھ اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ یہ حصہ کس طرح کا ہے۔ بس اتنا ہی اندازہ ہو رہا تھا کہ صحن کافی بڑا ہے وہ چاروں آگے بڑھتے جا رہے تھے۔

کچھ گھنے درخت بھی تھے مگر اندازہ نہیں ہو رہا تھا کہ کس چیز کے درخت ہیں، مگر ہر قدم پر خوف کی سرسراہٹیں ساتھ تھیں وہ چاروں ایک دوسرے سے بھی ٹکراتے تو ڈر جاتے۔ صحن کے وسط میں گھنے درختوں کے قریب اسامہ کھڑا ہو گیا۔

وہ تینوں بھی اس کے قریب آ گئے۔ اسامہ نے اوپر کی طرف دیکھا۔ "وہ دیکھو آسمان نظر آ رہا ہے نا۔"

"ہاں..." عمارہ نے کہا۔

اسامہ نے ایک بار پھر اوپر کی طرف دیکھا "اس صحن کے آدھے حصے کے اوپر پہاڑ کے تودے نے اپنی جگہ سے سرک کر چھت سی بنا دی ہے جبکہ آدھے حصے سے آسمان دکھائی دیتا ہے۔" پھر اس نے اپنی ٹارچ کا رخ زمین کی طرف کیا۔

"یہ وہی جگہ ہے جہاں ان چار لڑکے لڑکیوں نے کالے جادو کا خوفناک عمل کیا تھا۔ باقی باتیں تم سب کو اندر کمرے میں جا کے بتاتا ہوں۔"

وہ چاروں واپس اندر کمرے کی طرف آ گئے۔ یہ ہال نما کمرہ انہیں کچھ دیر بیٹھنے کے لیے بہتر لگ رہا تھا۔

عمارہ آتش دان کے قریب کھڑی ہوگئی۔ "یہاں سے تھوڑی سی جگہ صاف کر لیتے ہیں۔" عمارہ اور ساحل دونوں مل کر وہاں سے فرش صاف کرنے لگے اور اسامہ اور عارفین آتش دان میں لکڑیاں جوڑ کر آگ جلانے کی کوشش کرنے لگے۔

کچھ ٹوٹی ہوئی کرسیوں کے ٹکڑے گرے ہوئے تھے۔ عارفین نے وہ ٹکڑے بھی آتش دان میں جوڑ دیئے۔ اسامہ نے لائٹر سے آگ لگا دی۔

آتش دان میں آگ بھڑک اٹھی۔ جس سے نہ صرف ان کو حرارت ملی بلکہ کمرے میں سرخی مائل دھیمی دھیمی سی روشنی بھی پھیل گئی۔ تھوڑا سا حصہ صاف کرنے کے بعد وہ چاروں سردی سے ٹھٹھرتے ہوئے آتش دان کے قریب بیٹھ گئے۔

عمارہ نے اپنی کمر سے بیک بیگ اتارا اور اس میں سے پانی کی بوتل نکالی۔ عارفین نے اپنے کندھے سکیڑتے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔ "ہمیں سردی لگ رہی ہے اور تمہیں پیاس لگی ہوئی ہے۔"

"حلق خشک ہو رہا ہے۔" عمارہ نے پانی کا ایک گھونٹ لیا اور پھر بوتل کا ڈھکن بند کر دیا۔ ساحل عمارہ کے قریب ہو کے بیٹھ گیا۔

"تم تو ایک عاملہ ہو، تمہیں تو کچھ محسوس ہوا ہوگا کہ وہ

شیطان ہمزاد ہمارے آس پاس موجود ہیں یا نہیں...!‘‘

عمارہ آگ کی طرف اپنے ہاتھوں کو پھیلاتے ہوئے معنی خیز انداز میں بولی۔ ’’میں خاص عمل سے ان کی موجودگی کا اندازہ لگا سکتی ہوں لیکن میں چاہتی ہوں کہ وہ خود ہمارے سامنے خود کو ظاہر کریں۔ یہ ہمارے لیے زیادہ بہتر ہوگا، ہمیں انتظار کرنا چاہیے کہ وہ خود اپنی موجودگی کا اشارہ دیں کیونکہ ابھی ان جنگ صرف ہم نے ہی نہیں کیا، وہ بھی خاص تیاری کے ساتھ ہمارے سامنے آئیں گے۔ ہماری لڑائی ہونی وجود سے ہے جو کسی بھی روپ میں ہمارے سامنے آسکتے ہیں۔ ہمیں ان کے پھیلائے ہوئے جال میں پھنسنے سے بچنا ہے خاص طور پر وشا، تمہیں اپنی طرف مائل کرنے کی کوشش کریں گی تم نے اس کے جھانسے میں نہیں آنا۔ یقیناً وہ ہمزاد ہمارے آس پاس موجود ہوں گے۔ ہم نہیں جانتے کہ وہ کس شکل میں ہمارے سامنے آئیں گے۔‘‘

اسامہ نے بھی عمارہ کی تائید کی۔ ’’عمارہ ٹھیک کہتی ہے ہمیں ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کرنا ہوگا۔‘‘

’’تم ہمیں اس عمل کے بارے میں بتاؤ جو ریسٹ ہاؤس کے صحن میں ان چار نوجوانوں نے کیا تھا۔‘‘ عمارہ نے اسامہ سے پوچھا جو غالباً خود بھی ان تینوں کو اس عمل کے بارے میں بتانا چاہتا تھا۔

ساحل نے مشکوک نظروں سے اسامہ کی طرف دیکھا۔ ’’اس پُراسرار ریسٹ ہاؤس میں ہونے والے خطرناک عمل کے بارے میں آپ کیسے جانتے ہیں؟‘‘

عمارہ اور عارفین نے حیرت سے ساحل کی طرف دیکھا کہ ہمیں منع کیا کہ اسامہ سے کوئی سوال نہ کرنا اب خود اس سے سوال کررہا ہے۔

اس بار اسامہ نے انتہائی اطمینان سے جواب دیا۔ ’’جب وہ چار ہمزاد خود کو ظاہر کریں گے تو تمہیں تمہارے سوال کا جواب بھی مل جائے گا ابھی فی الحال توجہ سے میری بات سنو۔ اپنے اپنے ذہنوں کو سوالوں میں مت اُلجھاؤ بس یہ یاد رکھو کہ میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔‘‘

’’تم یہ باتیں چھوڑو، ہمیں اس عمل کے بارے میں بتاؤ۔‘‘ عمارہ نے بے چینی سے پوچھا۔

اسامہ سر جھکائے جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوب گیا۔ اس کی آنکھوں میں نمی تیرنے لگی۔ ’’جب وہ چاروں اس ریسٹ ہاؤس میں آئے تو وہ ہماری طرح جیتے جاگتے انسان تھے۔ احساسات و جذبات ان کو بھی کبھی رلاتے اور کبھی ہنساتے، وہ باغی تھے۔ انہوں نے اپنے والدین کا تصوراتی سراپا وجود خود سے ہی اپنے دل میں بنایا تھا۔ وہ ان کی سوچ میں اپنی سوچ اور ان کے احساسات میں اپنے احساسات دیکھنا چاہتے تھے۔ مگر جب ان کی امیدوں کا یہ مجسمہ کرچی کرچی ہوا تو وہ خود بھی بکھر گئے۔ انہوں نے انہیں سمیٹنے کے بجائے انہیں دھتکارا اور ان کی ذات کھوکھلی ہوئی تو ذہن شیطانی منصوبوں کی آماجگاہ بن گیا..... وہ کفر کرنے لگے۔‘‘

’’کفر کرنے لگے.....؟ مطلب.....‘‘ عمارہ نے پوچھا۔

اسامہ نے ٹھنڈی آہ بھری۔ ’’خود کو منوانے کے لیے انہوں نے غلط راستہ اختیار کیا، وہ کالے جادو جیسا ناپاک شغل کرنے لگے۔ اسی ناپاک علم کی لگن انہیں ریسٹ ہاؤس تک لے آئی۔‘‘

جوں جوں رات بڑھتی جارہی تھی سردی میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔ آتش دان کی آگ بجھ رہی تھی۔ عارفین اور ساحل نے چھاور لکڑیاں ڈال کر آتش دان کی آگ تیز کی۔

اسامہ اس طرح خاموش ہوگیا تھا جس طرح اس میں کچھ اور بتانے کی ہمت نہ ہو۔ عمارہ نے اسامہ کے شانے پر ہاتھ رکھا۔

’’تم تو ہمیں ان نوجوان لڑکیوں کی بات بتارہے ہو تو خود کیوں اتنے رنجیدہ ہوگئے ہو.....‘‘

اسامہ نے عمارہ کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ ’’جب یہ سوچتا ہوں کہ ان چاروں نے کس طرح انسانیت کی تذلیل کی تو میرے رونگٹے کھڑے ہوجاتے ہیں۔ یہ بدن جو اس رب کی امانت ہے، اسے انہوں نے اپنی مرضی سے خاکستر کردیا۔ جو بھیانک عمل انہوں نے اس ریسٹ ہاؤس میں کیا، اس کے بعد اپنی زندگیوں کو ختم کرکے انہوں نے وہی روپ لیا جو وہ چاہتے تھے مگر.....‘‘

’’مگر کیا.....‘‘ ساحل نے پوچھا۔

''وہ نہیں جانتے تھے کہ زرغام کے چنگل میں پھنس چکے ہیں۔'' اسامہ ایک بار پھر خاموش ہوگیا۔

''اسامہ ہمیں پوری بات تفصیل سے بتاؤ، اس سے ہمیں ان چار ہمزاد کو ختم کرنے میں مدد ملے گی۔'' عمارہ نے کہا۔

اسامہ نے انہیں سب کچھ تفصیل سے بتایا کہ کس طرح ان چاروں نے کالے جادو کا خطرناک عمل کیا اور کس طرح زرغام نے ان کے سامنے خود کو ظاہر کیا۔

جوں جوں اسامہ باتیں بتا رہا تھا، عارفین اور ساحل کے ذہنوں میں خوف کی سیٹیاں سی گونجنے لگی تھیں۔

عمارہ کا خوف بھی مزید بڑھ گیا تھا۔ اس نے سہمی سہمی نظروں سے اردگرد دیکھا۔ ''زرغام تو ایک انسان تھا۔ اس نے کس طرح اس بوڑھے کا روپ لیا اور وہ کس طرح غائب وجود کے ساتھ ان لوگوں سے باتیں کرتا رہا۔''

''یہی تو وہ سارا شیطانی کھیل تھا جس نے ان چاروں کی عقل کو دنگ کر دیا تھا۔ وہ پُراسرار طاقت جو ان چاروں سے اپنی مرضی کا بھیانک عمل کروا رہی تھی وہ کوئی آسیب نہیں تھا بلکہ زرغام کا ہمزاد تھا۔ میں نے تمہیں بتایا تھا نہ کہ زرغام نے اپنا ہمزاد مسخر کر رکھا ہے۔ وہ اپنے گھر بیٹھے بیٹھے اپنے ہمزاد کے ذریعے یہ شیطانی کھیل کھیل رہا تھا۔ فواد، حوریہ، وشاء اور خیام کالے جادو کے اس خطرناک عمل میں ناکام ہوگئے۔ زرغام نے انہیں اپنے اعتماد میں لے کر ان سے اپنی مرضی کا عمل کروایا۔ ان چاروں کی آخری چیخیں فضا میں گونجیں اس کے بعد انہوں نے اپنی مرضی کے روپ لے لیے مگر زرغام نے فواد، وشاء اور حوریہ کے ہمزاد کو اپنے قابو میں کر لیا۔''

''خیام کا کیا ہوا؟'' عمارہ نے پوچھا۔

اسامہ نے کھوئے کھوئے سے انداز میں جواب دیا۔ ''یہ میں خود بھی نہیں جانتا کہ خیام اس شیطان کے چنگل سے کیسے بچ گیا۔ شاید خیام کے دل و دماغ پر اس کا شیطان ہمزاد پوری طرح حاوی نہ ہوسکا ہو۔ ایمان کی کوئی کرن اس کے من میں باقی ہو، کچھ بھی ہوا ہو مگر خیام کا ہمزاد زرغام کے قابو میں نہیں آسکا۔ اس لیے آج خیام بھی برائی کے خلاف لڑ رہا ہے۔''

''خیام تو جیسے کہیں کھو گیا ہے اس نے تو دوبارہ خود کو ہمارے سامنے ظاہر نہیں کیا۔'' ساحل نے کہا۔

اسامہ نے مسکراتے ہوئے تحمل سے جواب دیا۔ ''وہ خود کو ظاہر کرے یا نہ کرے مگر وہ برائی کے خلاف لڑ رہا ہے۔''

عارفین نے اپنے اردگرد دیکھتے ہوئے اپنے کندھے سکیڑ لیے۔ ''ابھی تک تو ہمت کر کے اس ریسٹ ہاؤس میں بیٹھے رہے مگر اب اپنے آس پاس انجانے سے خوف کی سرسراہٹیں محسوس ہو رہی ہیں۔''

''واقعی اسامہ کی باتوں سے دل دہل کے رہ گیا ہے لیکن ہمارے لیے یہ سب جاننا بہت ضروری تھا۔ یہ حقائق جاننے کے بعد اس بات کا بھی احساس ہو رہا ہے کہ زرغام کی طاقت کے آگے ہم کچھ بھی نہیں مگر یہ بھی سچ ہے کہ ایمان کی طاقت سے بڑی کوئی طاقت نہیں۔ اب میدان میں کود پڑے ہیں تو کیا ڈرنا۔ نیکی کی راہ پر نکلے ہیں بچ گئے تو غازی، مر گئے تو شہید کہلائیں گے۔ بس اُمید کا دیا جلائے رکھنا ہے تاکہ ہمیں راستے ملتے رہیں۔'' عمارہ نے کہا۔

ساحل نے پیچھے ہٹتے ہوئے دیوار سے پشت نکالی۔ ''کوئی ایسا اشارہ نہیں مل رہا جس سے ان چاروں کی موجودگی ظاہر ہو۔ ہم یہاں اس طرح رات کیسے گزار سکتے ہیں اگر ہماری آنکھ لگ گئی تو وہ ہمزاد ہمیں سوتے سوتے ہی موت کی نیند سلا دیں گے۔''

اسامہ نے ساحل کے بازوؤں پر تھپکی دی۔ ''بیوقوفوں والی باتیں مت کرو۔ ہم ان کے ظاہر ہونے کا انتظار کریں گے۔ ہم میں سے کوئی نہیں سوئے گا۔ رہی بات ہم پر حملہ آور ہونے کی تو اس کا بندوبست ابھی کر دیتا ہوں۔ تم سارے ذرا اُٹھو۔''

سارے کھڑے ہوگئے۔

اسامہ نے اپنے بیگ سے ایک چاک نکالا اور ایک چھوٹی سی کتاب نکالی، اس نے چاک عمارہ کو پکڑایا اور ساتھ ایک چھوٹی سی زیتون کے تیل کی بوتل بھی دی۔ پھر اس نے ساحل اور عارفین سے کہا۔ ''تم دونوں سامنے دیوار کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔'' پھر وہ عمارہ سے مخاطب ہوا۔

"عمارہ! میں اس کتاب سے کوئی دُعا پڑھتا رہوں گا تم ساتھ ساتھ ادھر ہی آتش دان کے قریب اتنا بڑا دائرہ کھینچو کہ ہم سب آرام سے اس میں بیٹھ جائیں۔" یہ کہہ کر اسامہ بلند آواز میں اس کتاب سے کوئی دُعا پڑھنے لگا۔ عمارہ ساتھ ساتھ دائرہ کھینچتی رہی۔ دُعا مکمل ہونے تک دائرہ کھینچ لیا۔

اسامہ نے ساحل سے کہا۔ "وہ سامنے چھوٹا ٹیبل دیکھو ٹھیک حالت میں ہے۔"

ساحل نے چھوٹا ٹیبل اُٹھا کر دیکھا۔ "ہاں ٹھیک ہے۔"

"اسے اُٹھا کر یہاں رکھ دو دائرے کے درمیان میں۔" ساحل نے وہ چھوٹا سا ٹیبل دائرے کے درمیان میں رکھ دیا۔ وہ سب اس دائرے کے اندر بیٹھ گئے۔

"ہم جب تک اس دائرے میں ہیں وہ ہمزاد ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔" اسامہ نے ایک نظر سب کی طرف دیکھا۔

رات بہت ہوگئی تھی، پورا ریسٹ ہاؤس گمبھیر تاریکی میں ڈوبا ہوا تھا۔ اس پُرسکون خاموشی میں بھیانک راز پنہاں تھے۔ ہوا بھی جیسے اس سازش میں شامل ہوگئی تھی اور گھنے درختوں کے جھنڈ بھی، جن میں کچھ تھا اور اس کے پتوں میں معمولی لرزش تک نہ تھی۔ ڈھیرے ڈھیرے شیطانی قوتیں جیسے اس ریسٹ ہاؤس کو اپنی لپیٹ میں لے رہی تھیں۔

عمارہ نے اپنے بیگ سے ایک پلاسٹک کا ڈبہ نکالا۔ اس نے ڈبہ کھولا تو اس میں چھ شوارمے رول تھے۔ اس نے وہ رول اپنے تینوں ساتھیوں کو دیئے۔

"ہم نے تو کھانے کا کچھ اور سامان رکھا تھا یہ شوارمے کہاں سے آ گئے۔" ساحل نے شوارما لیتے ہوئے کہا۔

عمارہ بھی اپنا شوارما لے کر آلتی پالتی مار کے بیٹھ گئی۔

"میں نے یہ ہوٹل سے ہی لے لیے تھے میرا خیال تھا یہ کھانے کی کمی پوری کردے گا۔"

اسامہ نے اس کا لقمہ لیا۔ "ہوں ویری ٹیسٹی یہ اچھا کیا تم نے......"

چاروں مزے لے لے کے شوارما کھانے لگے۔

دائرے میں بیٹھنے کے بعد انہیں عجیب سا اطمینان تھا۔ اسامہ نے مسکراتے ہوئے عمارہ کی طرف دیکھا۔

"ویسے تمہارے ساتھ ہونے سے یہ فائدہ تو ہے کہ ڈھنگ سے کچھ کھانے کو مل جاتا ہے، ایک بات تو بتاؤ....."

"کیا..." عمارہ نے لاپروائی سے کہا۔

اسامہ اس کے تھوڑا قریب ہوکے بیٹھ گیا۔ "تم اب تو مجھ سے ناراض نہیں۔"

عمارہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی، اس نے شوارما کھاتے ہوئے ترچھی نظروں سے اسامہ کی طرف دیکھا۔

"میں یہ نہیں کہوں گی کہ تم سے ناراض نہیں ہوں کیونکہ تم نے اپنی حرکتوں سے باز نہیں آنا اور پھر دوبارہ ایسی ویسی بات کہنی ہے۔"

اسامہ نے اپنا شوارما تھامتے ہوئے ہاتھ کی طرف دیکھا۔ "میرا دوسرا ہاتھ نہیں ہے ورنہ میں کان ضرور پکڑتا۔"

عمارہ کی ہنسی چھوٹ گئی۔ اس نے اپنائیت سے اسامہ کی طرف دیکھا۔ "تھوڑے پیچیدہ ہو مگر انسان اچھے ہو۔"

اسامہ نے اپنی آنکھیں بند کرکے کھولیں۔ "شکریہ....."

کھانے سے فارغ ہوکے وہ چاروں کچھ نہ کچھ پڑھنے لگے کوئی سورہ یٰسین تو کوئی چاروں قل۔ انہیں مصیبت کی اس گھڑی میں اپنے رب کا سہارا ہی تھا۔ جو ہر ڈر پر حاوی تھا۔ وہ اپنے ساتھ چھوٹی چھوٹی کتابیں لائے تھے جن میں بے شمار دعائیں تھیں۔

"میرا خیال ہے کہ ہم سب کو مل کر چاروں قل پڑھنے چاہئیں۔ اس طرح کے مسائل میں ان کی بہت فضیلت بتائی گئی ہے۔" عمارہ کے کہنے پر سب نے مل کر چاروں قل پڑھنا شروع کردیئے۔

ان سب کی آنکھیں نیند سے بوجھل ہورہی تھیں۔

عمارہ نے چاروں قل پڑھے اور پھر میز پر سر ٹکا کر بیٹھ گئی۔

ٹیک لگانے کی کوئی جگہ تو تھی نہیں اس لیے ساحل اور عارفین نے بھی میز پر اپنا سر رکھ دیا۔ اسامہ کی بھی آنکھیں نیند سے بوجھل تھیں لیکن وہ خود کو چوکنا رکھنے کی کوشش کررہا تھا وہ

جانتا تھا کہ وہ آرام کی حالت میں بیٹھا تو اسے نیند آجائے گی۔

عمارہ، ساحل اور عارفین کی آنکھ لگ گئی۔ اسامہ نے دعاؤں کی کتاب اپنے بیگ میں رکھی۔ اس نے ایک نظر ان تینوں پر ڈالی جو گہری نیند سو گئے تھے۔ اس نے ایک گہری سانس بھری اور اردگرد نظر دوڑائی پھر اس نے پانی کی بوتل اٹھائی اور ہاتھ میں بمشکل تھوڑا سا پانی ڈالا اور اپنی آنکھوں پر پانی کے چھینٹے مارے۔ اس کی پوری کوشش تھی کہ وہ جاگتا رہے۔ وہ تھوڑی دیر ہی اس کوشش میں کامیاب رہا بالآخر اس کا تھکا ہوا جسم ہار گیا اور وہ دھڑام سے زمین پر گر کے سوگیا۔

تھوڑی دیر کے بعد اسامہ کے جسم سے روشنی کی ایک شعاع نمودار ہوئی جو اوپر بڑھتی ہوئی غائب ہوگئی اور پھر کمرے میں ایک سایہ چلتا پھرتا دکھائی دیا۔ جس طرح کوئی ان کی حفاظت کررہا ہو۔

طلوع آفتاب کی من چلی شعاعیں جب ان کے ساتھ اٹھکیلیاں کرنے لگیں تو عمارہ کی آنکھ کھل گئی۔ باقی تینوں گہری نیند سو رہے تھے۔

وہ آنکھیں ملتی ہوئی اٹھ کے بیٹھی تو جہاں اس کی نظر تھی وہیں رہ گئی اس کے جسم کی حرکت ایک بار ساکت ہو گئی۔ اس نے خود کو سنبھالتے ہوئے دھیرے دھیرے چاروں طرف نظر دوڑائی۔ اس کی آنکھیں عجیب نظارہ دیکھ رہی تھیں۔ سب کچھ بدل چکا تھا رات ورات کسی نے اس کمرے کو چمکا دیا تھا۔

دھول اور پتھروں سے اٹی جس زمین پر عمارہ سوئی تھی اب وہ صاف اور ملائم سنگ مرمر کا فرش تھا۔ گندے کپڑوں میں چھپا ہوا سڑا ہوا فرنیچر نئے فرنیچر میں بدل چکا تھا۔ عمارہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے سب کچھ دیکھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ وہ ماضی میں پہنچ گئی ہے۔

جب یہ ریسٹ ہاؤس نیا نیا تعمیر ہوا ہو۔ اس نے ساحل کو جھنجھوڑا۔ ''ساحل اٹھو.....''

اس کی آواز سے ساحل کے ساتھ عارفین اور اسامہ بھی اٹھ گئے۔ اس سے پہلے کہ عمارہ انہیں کچھ بتاتی، ان کی حالت بھی عمارہ جیسی ہوگئی وہ بھی مبہوت نظروں سے کمرے کی چیزیں تکتے ہی رہ گئے۔

''یہ سب کیسے ہوگیا.....؟'' ساحل نے عمارہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

عمارہ گم سم بیٹھی تھی۔

عارفین نے اپنی آنکھیں ملتے ہوئے ساحل سے کہا۔ ''یار میرے سر پر ایک تھپڑ تو مار کہ میں جاگ چکا ہوں یا کوئی خواب دیکھ رہا ہوں۔''

ساحل کو تو جیسے موقع مل گیا اس نے عارفین کے سر پر ایک زوردار تھپڑ لگایا کہ وہ چکرا کے رہ گیا۔

''تو نے تو میرے چاروں طبق روشن کردیئے۔'' عارفین نے سر کو جھٹکا مارا۔

اسامہ بھی یہ سب دیکھ رہا تھا مگر اس کے چہرے پہ حیرت کے تاثرات نہیں تھے۔ مگر اس کا ذہن ایک سال پیچھے چلا گیا تھا، اس کے منہ سے بے اختیار نکل گیا۔ ''ان چاروں کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔''

کسی کا بھی اس کی بات کی طرف دھیان نہیں گیا۔ وہ سب تو حیرت میں گم اردگرد کے ماحول کو دیکھے جارہے تھے۔ چاروں نے اپنا اپنا بیگ سنبھالا اور کھڑے ہوگئے۔

''ریسٹ ہاؤس کا باقی حصہ دیکھتے ہیں۔'' ساحل نے کہا۔

وہ چاروں ریسٹ ہاؤس کے مختلف کمروں میں بکھر گئے ہر کمرے کا نقشہ بدلا ہوا تھا۔ فرشوں سے لے کر ڈیکوریشن پیس تک ہر چیز چمک رہی تھی۔ صحن کا نظارہ تو بہت خوبصورت تھا۔ پتھریلی زمین والی خالی کیاریوں میں خوبصورت پودے لگے ہوئے تھے جن کے اردگرد بہت نفاست سے باڑ لگائی گئی تھی۔ ان کیاریوں میں گلاب کے پودے زیادہ تھے جن پر سرخ، گلابی اور سفید گلاب کے پھول کھلے ہوئے تھے۔

وہ چاروں صحن میں کھڑے تھے۔ اس خوبصورتی سے مسرور ہونے کے بجائے وہ خوفزدہ تھے۔ ساحل الٹے قدموں سے پیچھے ہٹنے لگا۔ ''کوئی ایک رات میں یہ سب کیسے کرسکتا ہے۔ مجھے تو یوں لگ رہا ہے جیسے سینکڑوں سال پہلے فوت ہونے والے لوگ بھی ہمیں یہاں چلتے پھرتے دکھائی دیں گے۔''

عمارہ کمرے میں داخل ہونے کے بعد کچن میں داخل ہوئی۔ عمارہ خوفناک انداز میں چیخی تو وہ تینوں کچن کی طرف بھاگے۔

وہ کچن میں پہنچے تو عمارہ نے سامنے دیوار کی طرف اشارہ کیا۔ تازے چپچپاتے خون سے دیوار پر لکھا تھا۔

''طلسماتی اور سنسناتی دنیا میں خوش آمدید۔''

دیوار کے قریب ہی میز پر گرم گرم ناشتہ سجا ہوا تھا۔

وہ سب جیسے سن ہو گئے۔ سہمی سہمی نظروں سے ان چاروں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ ''یہ سب کیا ہے اسامہ.....'' عمارہ نے پوچھا۔

اسامہ نے بلند آواز میں کہا۔ ''یہ ہمزاد کی موجودگی کا اعلان ہے مگر ہم وہ سب نہیں کریں گے جو فواد اور اس کے دوستوں نے کیا۔ ہم اعلانِ جنگ کریں گے۔'' یہ کہہ کر اسامہ نے اپنے بیگ سے خنجر نکالا اور عمارہ کی طرف بڑھایا۔

''یہ خنجر پکڑو اور میرے بازو پر کٹ لگاؤ.....''

عمارہ نے خنجر نہیں پکڑا۔ ''یہ مجھ سے نہیں ہوگا۔''

اسامہ ساحل کی طرف بڑھا۔ ''تم کٹ لگاؤ.....''

ساحل نے نفی کے انداز میں سر ہلایا تو اسامہ بھڑک کے بولا۔ ''جو میں کہتا ہوں کرو.....''

ساحل نے اس کے بازو پر کٹ لگا دیا۔

اس کے زخم سے خون رسنے لگا۔ اس نے ایک میز پر خون کے قطرے گرائے اور پھر اس نے اپنی انگلی اپنے خون پہ رکھی اور دیوار پہ کندہ پُراسرار تحریر کا جواب لکھنے لگا۔

اس نے بھی خون سے لکھا۔ ''طلسماتی اور سنسناتی دنیا سے سبکدوش ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔''

عارفین، اسامہ اور ساحل تینوں پتھر کے بت کی طرح کھڑے تھے۔ ان کے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئی تھیں وہ جانتے تھے کہ وہ اپنی موت کو للکار چکے ہیں۔ وہ چاروں اعلانِ جنگ کر چکے تھے۔ جس کا نتیجہ بھیانک ترین ہو سکتا تھا۔ اسامہ عمارہ کے قریب کھڑا ہو گیا۔ ان کی کوشش تھی کہ وہ ایک دوسرے سے دور نہ ہوں۔ اچانک پہاڑوں میں زلزلے کی بھیانک گونج کے ساتھ کچن کی ہر چیز لرزنے لگی۔ ٹیبل کے ہلنے کی وجہ سے میز پر رکھے برتن ٹک ٹک کی آواز کے ساتھ ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔

اسامہ کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی ساعت میں عمارہ، ساحل اور عارفین اپنی جگہ سے غائب ہو گئے، ایک لمحے کے لیے اسامہ کو ایسا لگا جیسے کسی نے اس کی روح کھینچ لی ہو۔ وہ حواس باختہ ہو گیا۔ اس نے اپنے بازو پھیلائے اور اوپر کی طرف دیکھتے ہوئے چلایا۔ ''اس طرح چھپ کے وار مت کرو، ہمارے سامنے آؤ۔''

اسامہ نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ عمارہ کی دلسوز چیخیں اس کی سماعت سے ٹکرائیں۔ وہ کچن سے باہر نکلا اور آواز کی سمت کی طرف پاگلوں کی طرح دوڑنے لگا۔ آواز کا تعین کرتے کرتے اسامہ ریسٹ ہاؤس کے برآمدے تک پہنچ گیا داخلی دروازے کے دونوں حصے کھلے ہوئے تھے، چیخوں کی آوازیں ریسٹ ہاؤس کے باہر سے آرہی تھیں۔ وہ ایک لمحے کے لیے اپنے ذہن کی نہیں سن رہا تھا بس دوڑتا جا رہا تھا۔

وہ پہاڑ کی چوٹی تک پہنچ گیا۔ چیخوں کی بازگشت اس طرح گونج رہی تھی کہ اس کے لیے یہ اندازہ لگانا مشکل ہو گیا تھا کہ یہ آوازیں کہاں سے آرہی ہیں۔ وہ پریشانی سے ادھر اُدھر دیکھ رہا تھا پھر نیچے کی طرف دیکھا جہاں گہری کھائیاں تھیں۔ اسی دوران اس کی نظر پہاڑ کے ایک کونے سے اُبھرتے ہوئے درخت پر پڑی وہ سر تا پا کانپ کے رہ گیا۔ عمارہ درخت کی شاخ کو دونوں ہاتھوں سے تھامے لٹکی ہوئی تھی، نیچے گہری کھائیاں تھیں اور اس کے ہاتھوں کی گرفت کسی بھی وقت ڈھیلی ہو سکتی تھی۔

''عمارہ حوصلہ رکھو میں آرہا ہوں۔''

یہ کہہ کے اسامہ نے اپنے بیگ سے بیلٹ اور رسی نکالی۔ اس نے اپنی کمر پر بیلٹ پہنی جس کے ساتھ اس نے رسی کا ہک اٹکایا۔ رسی کا دوسرا حصہ اس نے بڑے سے پتھر پر باندھ دیا اور دھیرے دھیرے پہاڑ کی چوٹی سے اترتا ہوا عمارہ کی طرف بڑھنے لگا۔ اس نے عمارہ کے قریب پہنچ کر اس کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''عمارہ میرا ہاتھ پکڑ لو تمہیں کچھ نہیں ہوگا۔ ہمت کرو۔''

روتی ہوئی عمارہ کے چہرے کے تاثرات یکسر بدل

گئے اس کے لبوں پہ تضحیک آمیز مسکراہٹ بکھر گئی اس نے اپنے دونوں ہاتھ چھوڑ دیئے۔

اسامہ چلایا۔ ''عمارہ .....''

عمارہ کا چہرہ بھیانک ہو گیا اور وہ کسی چڑیل کی طرح چنگھاڑتی ہوئی ہوا میں اُڑتی ہوئی دوسرے پہاڑ پر جا بیٹھی اور پھر غائب ہو گئی۔ اسامہ پہاڑ پر جوگرز لگاتے ہوئے بمشکل اوپر چڑھا۔ کسی نے اس کی سماعت میں سرگوشی کی۔ ''تم جانتے ہو کہ ہمزاد اسی طرح تنگ کرتے ہیں پھر بھی تم ان کے دھوکے میں آ گئے۔''

اسامہ نے جبیں پیمائی کرتے ہوئے خود کلامی کی۔

''پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا تھا......''

پھر وہ وقت ضائع کیے بغیر ریسٹ ہاؤس واپس چلا گیا۔ وہ اونچی اونچی آواز میں اپنے دوستوں کو پکارنے لگا۔

''عمارہ، ساحل، عارفین .....''

بدلے میں اسے کوئی جواب نہ ملا۔

اس نے اپنے دوستوں کو سارے کمروں میں ڈھونڈا مگر وہ نہیں ملے پھر وہ صحن میں گیا اور ایک بار پھر اونچی اونچی آواز میں اپنے دوستوں کو پکارنے لگا۔ اسے اپنے ایک ایک قدم پر دہشت کی آہٹ محسوس ہو رہی تھی۔ اس کا دشمن اس پر وار کر رہا تھا مگر وہ اسے دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

اس نے اپنے ساتھیوں کو صحن کے سارے حصے میں ڈھونڈا مگر بے سود۔ وہ ایک بار پھر بڑے کمرے میں آ گیا اس کی نظر وال مرر پر پڑی تو وہ اس کے قریب گیا۔

بیضوی شکل کا یہ شیشہ تقریباً 2 فٹ چوڑا اور 3 فٹ لمبا تھا جس کے گرد سنہری فریم تھا۔ اسامہ آئینے کے سامنے کھڑا ہوا اپنے ہی عکس کو غور سے دیکھنے لگا جیسے وہ خود میں کسی اور کو ڈھونڈ رہا ہو۔ ''تم کون ہو۔ میرے سامنے آؤ..... میرے دوست کہاں ہیں..... انہیں ڈھونڈنے میں میری مدد کرو۔''

''مجھے آئینے میں کہاں ڈھونڈ رہے ہو اپنے پیچھے دیکھو۔'' اسامہ کے عقب سے آواز آئی۔ اسامہ نے پیچھے مڑ کر دیکھا تو ایک سفید ہیولا ہوا میں منڈلا رہا تھا۔

''تم میرے سامنے کیوں نہیں آتے.....'' اسامہ نے کہا۔

''ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔ رہی بات تمہارے دوستوں کی تو میں خود بھی نہیں جانتا کہ وہ کہاں ہیں ہم دونوں مل کر انہیں ڈھونڈیں گے۔''

تمہارے جسم میں داخل ہونے کے بعد میں اپنی طاقتیں تمہیں سونپ دیتا ہوں تم وہ پُراسرار قوتیں استعمال کر سکتے ہو بس ایک بار آنکھیں بند کر کے مجھے یاد کرنا ہے تمہیں بدلے میں میری آواز سنائی دے گی میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم چاہتے تو پہاڑ سے چھلانگ مارنے والی چڑیل کے ساتھ ہوا میں اُڑ بھی سکتے تھے۔ جہاں تمہارے مادی وجود کی ضرورت ہو گی تو تم اپنا مادی وجود استعمال کرنا اور جہاں میرے غیبی وجود کی ضرورت ہو گی وہاں میں اپنا غیبی وجود استعمال کروں گا۔''

سفید ہیولے کی طرف سے آنے والی آواز بند ہو گئی اور وہ سفید ہیولا آہستہ آہستہ اسامہ کی طرف بڑھتا ہوا اس کے جسم میں داخل ہو گیا۔ اسامہ کا حوصلہ پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ وہ صحن کی طرف بڑھا کیونکہ اس کا ذہن اسے بار بار صحن کی طرف اشارہ کر رہا تھا۔

اس نے اپنے بیگ سے دعاؤں کی کتاب نکالی اور کتاب کھول کے کوئی دُعا پڑھنے لگا۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا صحن میں چل رہا اور ساتھ ساتھ دُعا پڑھتا رہا۔ اس کا پاؤں لکڑی کی کسی چیز سے ٹکرایا۔ اس نے نیچے دیکھا تو لکڑی کا ایک تختہ سا تھا۔ اسامہ اس تختے کے قریب بیٹھ گیا۔ تختے کا آدھا حصہ اُبھرا ہوا تھا۔ اس نے اُبھرے ہوئے حصے کو دائیں طرف دھکیلا تو وہ بآسانی فرش کے نیچے کسی فریم میں داخل ہو گیا۔ ایک لکڑی کی سیڑھی اندر جاتی ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ اسامہ نے اندر جھانک کے دیکھا غالباً یہ تہہ خانہ تھا۔ وہ زیادہ سوچے بغیر اس لکڑی کی سیڑھی سے تہہ خانے میں اُتر گیا۔ اس راستے سے دن کی چلچلاتی روشنی بھی تہہ خانے میں داخل ہوئی ورنہ رات کی تاریکی جیسا ہی اندھیرا ہوتا۔ اندر آکسیجن کی بھی کمی تھی جس کے باعث اسامہ کو سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ راستہ کھلنے کے باعث وہ بھی اب دھیرے دھیرے بحال ہو رہی تھی۔

تہہ خانہ بہت بڑا تھا۔ تھوڑا سا چلنے کے بعد ہی اسامہ

کو ٹارچ کا استعمال کرنا پڑا۔ یہ جگہ بہت عجیب تھی بالکل کسی لیبارٹری کی طرح یہاں سامان تھا، لمبے لمبے ٹیبل اور ان کے ساتھ پڑے ہوئے چھوٹے چھوٹے بینچ اور اسٹینڈز میں مختلف قسم کی ٹیسٹ ٹیوبز لگی ہوئی تھیں۔

یہاں بہت بدبو تھی۔ اسامہ نے اپنی ناک پر رومال رکھ لیا۔ تہہ خانے کی گمبھیر تاریکی میں خوف کا راج تھا۔ اسامہ ٹارچ کو چاروں طرف گھماتا ہوا آگے بڑھ رہا تھا۔

یہ جگہ اس کے علم میں نہیں تھی۔ ایک بڑے سے ٹیبل کے قریب جاکے اس کے قدم رُک گئے۔ یہاں بڑے بڑے شیشے کے جار تھے۔ اسامہ ٹارچ کی مدد سے انہیں قریب سے دیکھنے لگا۔ ایک دم اسامہ کو ابکائی سی آنے لگی۔ ان شیشوں کے مرتبانوں میں چھوٹے چھوٹے جانوروں کے Stuffed تھے جنہیں Formaline Liquid میں بھگویا گیا تھا۔ چھوٹی چھوٹی بوتلوں میں چھوٹے چھوٹے جانوروں کے یا پرندوں کے دل اور دماغ علیحدہ سے رکھے ہوئے تھے۔

اسامہ اگلے ٹیبل کے قریب گیا تو اس کا دل مزید خراب ہوگیا وہاں بدبو اتنی زیادہ تھی کہ اس کا سانس لینا مشکل ہو رہا تھا۔ یہاں میز پر کچھ جانور خون میں لت پت پڑے تھے۔ اس نے ان پر ٹارچ کی روشنی ڈالی تو کچھ سانپ اور سیہ تھے جن کے جسموں کو نوچ نوچ کے کچھ حصے ان کے جسموں سے نکال لیے گئے تھے ساتھ ہی تین یا چار الو بھی خون میں لت پت گرے پڑے تھے جن کی حالت بھی ایسی ہی تھی۔

گھٹی گھٹی سی آوازیں اسامہ کی سماعت سے ٹکرائیں تو وہ بوکھلا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔ وہ ٹارچ کی روشنی میں ان آوازوں کی سمت میں بڑھنے لگا۔ اس کا دل دہل رہا تھا۔ اس کے قدم اسے ان آوازوں تک لے گئے۔

گھٹی گھٹی بے بس آوازیں صاف سنائی دے رہی تھیں مگر اسے کوئی نظر نہیں آرہا تھا۔ کسی نے اس کے پاؤں پر زور سے اپنا پاؤں مارا تو اس نے میز کے نیچے دیکھا۔ تو عمارہ میز کے ساتھ بندھی گھٹے گھٹے سانس لے رہی تھی۔ عارفین اور ساحل بھی میز کے ساتھ بندھے ہوئے تھے ان کی حالت بھی عمارہ جیسی تھی۔

اس نے عمارہ کے چہرے کو اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ "خود کو سنبھالو عمارہ! میں آگیا ہوں۔"

اس نے پہلے عمارہ کو کھولا اور پھر دونوں کو۔ ان کی یہ حالت دم گھٹنے کی وجہ سے تھی۔

اسامہ نے ان تینوں کو تہہ خانے سے باہر نکالا۔ تہہ خانے سے باہر نکلتے ہی وہ لمبے لمبے سانس لینے لگے۔ اسامہ نے پانی کی بوتل نکالی تو تینوں نے پانی کے لیے منع کردیا۔ وہ آکسیجن کی کمی کے باعث نڈھال ہوگئے تھے.... صحن میں آنے کے بعد ان کی طبیعت میں کافی بہتری آگئی تھی۔ اسامہ ان کے پاس بیٹھ گیا۔

عمارہ نے تھکی تھکی آنکھوں سے اسامہ کی طرف دیکھا۔ "تم کچھ دیر اور تہہ خانے میں نہ آتے تو اپنے دوستوں کی لاشیں تمہیں ملتیں۔"

اسامہ نے عمارہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا۔ "ایسا کبھی نہ ہو...."

پھر وہ عمارہ کے پاس سے اُٹھ کر ساحل اور عارفین کے پاس بیٹھ گیا۔ "اب بہتر محسوس کررہے ہو؟"

ساحل نے لمبا سانس کھینچا۔ "ہاں.... اب کافی بہتر ہوں۔"

اسامہ نے عارفین کے بال سہلائے۔ "اور تم؟"

عارفین نے اثبات میں سر ہلایا۔ "ٹھیک ہوں۔"

عمارہ کافی نڈھال لگ رہی تھی۔ "مجھے تھوڑی دیر کے لیے اس ریسٹ ہاؤس سے باہر لے جاؤ۔"

عمارہ نے اسامہ سے کہا تو اسامہ اس کے قریب بیٹھ گیا۔ "ابھی تم ٹھیک طرح سے چل نہیں سکتی تھوڑی دیر کے بعد چلتے ہیں۔"

عمارہ نے اپنائیت سے اسامہ کی طرف دیکھا۔ "پلیز...."

اسامہ کھڑا ہوگیا۔ اس نے عمارہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ عمارہ اس کا ہاتھ تھام کر کھڑی تو ہوگئی مگر چلتے ہوئے اس کے قدم لڑکھڑانے لگے۔

اسامہ نے اسے سہارا دیا اور ساحل کی طرف دیکھتے ہوئے کہنے لگا۔ "میں تم لوگوں کو بھی ابھی لے جاتا ہوں۔"

ساحل اور عارفین دونوں کھڑے ہوگئے۔ "آپ

عمارہ کو لے کر جائیں ہم دونوں چل سکتے ہیں۔ ہم خود آ جائیں گے۔"

یہ کہہ کر وہ دونوں بھی اسامہ کے ساتھ ساتھ چلنے لگے۔

ہمزاد اپنی موجودگی ظاہر کر چکے تھے، اس لیے خوف ان چاروں کی رگوں میں سرائیت کر چکا تھا وہ چاروں ہال نما بڑے کمرے سے گزرتے ہوئے برآمدے کی طرف بڑھ رہے تھے۔ خوف و دہشت کی سرسراہٹیں ان کا تعاقب کر رہی تھیں۔ وہ جیسے پُراسرار قوتوں کے گھیرے میں تھے۔

وہ چاروں ریسٹ ہاؤس کے عقبی دروازے سے باہر نکل گئے۔ پہاڑ سے تھوڑا نیچے اُترنے کے بعد تھوڑے سے فاصلے پر سبزہ دکھائی دے رہا تھا۔ اخروٹ اور چیڑ کے گھنے درخت بھی دکھائی دے رہے تھے۔

ساحل نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "وہ سامنے جو جگہ نظر آرہی ہے وہیں چلتے ہیں، وہ جگہ بیٹھنے کے لیے بہتر ہے۔"

"ہم دونوں تو چلے جائیں گے مگر عمارہ....." عارفین نے کہا۔

"تم دونوں آہستہ وہاں پہنچو، میں عمارہ کو لے کر آرہا ہوں۔" اسامہ نے کہا۔

عارفین اور ساحل دھیرے دھیرے چلتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اُترنے لگے۔

اسامہ نے عمارہ کا بازو اپنے گلے میں حائل کیا ہوا تھا اور وہ آہستہ آہستہ عمارہ کو سہارا دیتے ہوئے پہاڑ سے نیچے اُتر رہا تھا۔

اسامہ کے من میں ایک پیارے سے احساس نے کروٹ لی تھی جو کسی من موجی پرندے کی طرح وفا کے آسمان پر اُڑنا چاہتا ہو۔

عمارہ کے ساتھ پہاڑ سے نیچے اُترتے وقت وہ مسلسل سوچ رہا تھا کہ عمارہ کی چیخیں سن کر اس کی حالت کیسی ہوگئی تھی۔ عمارہ کی زندگی بچانے کے لیے اس نے اپنی جان داؤ پہ لگاتے ہوئے ایک پل کے لیے بھی نہ سوچا یہ کیسا جذبہ ہے۔ "عمارہ کی قربت میرے من میں ہلچل سی مچا دیتی ہے۔"

ہوا بہت تیز چل رہی تھی۔ عمارہ کے بال اسامہ کے چہرے کو چھو رہے تھے۔

پہاڑ سے اُترنے کے بعد اب راستہ ہموار تھا۔ عمارہ نے اسامہ کے کندھے سے اپنا بازو پیچھے کرلیا۔ "آگے راستہ ہموار ہے۔ میں آہستہ آہستہ چل لوں گی۔"

"عمارہ! یہ غلطی مت کرو تم گر جاؤ گی۔"

اسامہ نے اسے روکا مگر وہ نہیں مانی۔ اس نے اسامہ کی طرف اپنا ہاتھ بڑھایا۔ "تم میرا ہاتھ تھام لو۔"

اسامہ نے آگے بڑھ کر اس کا ہاتھ تھام لیا اور آہستہ آہستہ اس کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔

عارفین اور ساحل پہلے ہی اس جگہ پہنچ چکے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد اسامہ اور عمارہ بھی وہاں پہنچ گئے یہ جگہ جو دور سے بہت چھوٹی سی دکھائی دے رہی تھی اچھی خاصی وسعت پر پھیلی ہوئی تھی۔

عارفین اور ساحل تو نرم نرم گھاس پر چت لیٹ گئے اور لمبے لمبے سانس لینے لگے۔

اسامہ اور عمارہ گھاس پر بیٹھ گئے۔ انہوں نے اپنے اردگرد دیکھا تو اس خوشگوار قدرتی ماحول سے ایک عجیب سی تسکین کا احساس ہوا۔ ان کے آس پاس اخروٹ اور چیڑ کے گھنے درخت تھے، زمین پر کچھ خودرو جھاڑیاں تھیں جن پر جامنی رنگ کے خوبصورت پھول اس قدر زیادہ تھے کہ اس نے پوری زمین کو ہی جامنی رنگ میں رنگ دیا تھا۔

عمارہ بھی لمبے لمبے سانس لے کر اپنی طبیعت کو بحال کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔

اسامہ کی نظر عمارہ کے چہرے پہ ٹھہر گئی تھی۔ عمارہ گندمی رنگت، تیکھی بھنویں اور تیکھے نین نقوش والی عام صورت والی لڑکی تھی مگر اس کی شخصیت دبلی پتلی جسامت اور اس کے لب و لہجے نے اسے بہت خوبصورت اور پُرکشش بنا دیا تھا۔

اسامہ نے اپنے بیگ سے ایک جوس کا ڈبہ اور ایک گلاس نکالا۔ اس نے عمارہ کو جوس ڈال کر دیا۔ "یہ پی لو۔ طبیعت میں کچھ بہتری آجائے گی۔"

عمارہ نے اس کے ہاتھ سے جوس کا گلاس لیا۔ "طبیعت میں بہتری تو اس پُرفضا جگہ پر آکے آگئی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ ساری تکلیف دور ہوگئی ہے۔"

ساحل نے بھی عمارہ کا ساتھ دیا۔ "ہاں اس میں کوئی شک نہیں۔"

پھر اسامہ نے عارفین اور ساحل کو بھی جوس ڈال کے دیا۔ پھر وہ خود بھی آرام دہ حالت میں گھاس پر بیٹھ گیا۔

"تم تینوں میں سے کسی نے انہیں دیکھا ہے..... میرا مطلب ہے ان تین ہمزاد میں سے کسی کو بھی" اسامہ نے پوچھا۔

"ہمیں تو کچھ بھی پتہ نہیں چلا کہ کب ہم جن سے غائب ہوکے اس تہہ خانے میں پہنچ گئے اور ہمیں کب اور کس نے باندھا، یہ بھی پتہ نہیں چلا۔"

عمارہ نے اسامہ کی بات کا جواب دیا۔

اسامہ نے ان تینوں کو ایک چیف کی طرح ہدایت دی۔ "ایک بار وہ چاروں شیطان ہمزاد ہم پر حملہ کر چکے ہیں۔ ہم اس وقت بھی ان کے گھیراؤ میں ہیں، وہ کسی بھی وقت کسی بھی روپ میں ہم پر حملہ کر سکتے ہیں اس لیے بہت محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔"

عارفین اپنے بیگ سے سیب نکالتے ہوئے حسب معمول بے تکان بولا۔ "وہ تو ایک جھٹکے میں ہی ہمیں فارغ کرنے والے تھے....."

"پروردگار نے ہمیں بچانا تھا سو ہم یہاں بیٹھے ہیں۔ اگر مسلمانوں کا عقیدہ پکا ہو کہ ان کو موت اسی وقت آنی ہے جب رب نے لکھ دی ہے تو ان کے سارے خوف ختم ہو جائیں گے۔" ساحل نے عارفین کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں جس طرح میں ان ہمزاد کے ہاتھوں مرنے یہاں آ گیا ہوں۔" عارفین نے ہنستے ہوئے کہا تو ساحل نے اسے کندھوں سے پکڑ کے مذاق کے انداز میں جھنجھوڑ دیا۔

"تو تو آج ان کا ناشتہ ضرور بنے گا۔"

ان کی اس حرکت پر عمارہ کی بھی ہنسی چھوٹ گئی، اس نے بھی ساحل کی پیٹھ پر مکا رسید کیا۔ "اور تم..... تم ہو گے ان کا ڈنر"

اسی دوران عارفین کی آواز عمارہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ "واؤ..... کتنی خوبصورت تتلیاں ہیں۔ یہ تو خودرو جھاڑیوں کے پھولوں پر بھی اس طرح بیٹھی ہیں جیسے گلاب پر بیٹھی ہوں۔"

اسامہ اور عمارہ نے ایک ساتھ ان پھولوں کی طرف دیکھا۔

دلفریب رنگوں کے پروں والی خوبصورت تتلیاں جامنی پھولوں پر منڈلا رہی تھیں۔ ڈھیرے ڈھیرے تتلیوں کی تعداد میں بھی اضافہ ہو رہا تھا۔

اسامہ برق سرعت سے اٹھا، اس نے اپنے بیگ سے ایک چاک اور چھوٹی سی کتاب نکالی۔

"جلدی سے دائرہ کھینچو۔" اس نے عمارہ کو چاک دیتے ہوئے کہا۔ اور خود کتاب سے اونچی آواز میں خاص آیات پڑھنے لگا۔

وہ آیتیں پڑھتا رہا اور عمارہ دائرہ کھینچتی رہی۔ دائرہ مکمل ہو گیا تو اسامہ نے پڑھنا چھوڑ دیا۔

وہ سب دائرے میں ایک دوسرے کے قریب ہو کے بیٹھ گئے۔ اسامہ نے ایک نظر سب کو دیکھا۔ "ہم اس دائرے میں محفوظ ہیں جو بھی اس دائرے سے نکلا وہ ہمزاد کا شکار بن جائے گا۔"

"لیکن مجھے تو آس پاس ایسا کچھ نظر نہیں آ رہا۔" عارفین نے حیرت سے اردگرد دیکھا تو اسامہ نے اپنے لبوں پہ انگشت رکھ کے اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا اور اسی انگلی سے تتلیوں کی طرف اشارہ کیا۔

اسامہ سمیت ان تینوں کی نظر ان تتلیوں کی طرف مرکوز ہو گئی۔ تتلیوں کی تعداد اتنی زیادہ ہو گئی کہ جامنی پھول بالکل چھپ گئے۔

ان تتلیوں میں سے ایک تتلی نکل کر ہوا میں ادھر ادھر اڑنے لگی پھر وہ چیڑ کے درخت کے پاس جا کے جیسے ہوا میں معلق ہو گئی، اس کے پروں کی حرکت رک گئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ تتلی وشاء کے سراپا وجود میں تبدیل ہو گئی۔ وشاء کا لباس اسی طرح کا تھا جس طرح کے رنگ اس تتلی کے پروں میں تھے۔ وہ اس ملٹی کلر کے گاؤن میں بہت خوبصورت دکھائی دے رہی تھی مگر اس کی خوبصورت آنکھوں میں بغاوت تھی۔ چہرے پہ کھچاؤ تھا۔ پیشانی پر شکنیں تھیں۔

وہ دائرے کے گرد بے چینی سے ٹہلنے لگی اور پھر اخروٹ کے درخت کے قریب کھڑی ہوگئی۔ وہ لمبے لمبے سانس لینے لگی جیسے اس کے اندر کوئی الاؤ سلگ رہا ہو۔ وہ شرابور نگاہوں سے ان چاروں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند سیکنڈز کے بعد اس کے قریب سفید ہیولا نمودار ہوا جو حوریہ کے وجود میں ڈھل ہوگیا۔

دائرے میں ان چاروں نے ایک دوسرے کے ہاتھ تھام لیے اور متوحش نظروں سے ان خوبصورت بلاؤں کو دیکھنے لگے جوان چاروں کو کھا جانے والی نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔

حوریہ نے سفید فراک پہن رکھا تھا، اس کے لمبے بال بے جان اور خشک تھے۔ چہرے میں زندگی کی رمق نہیں تھی، جلد خشک..... آنکھیں سرد اور پتھرائی ہوئی گویا کہ وہ کسی مُردے جیسی ہی تھی۔

اچانک کسی عورت کے رونے اور سسکیاں لینے کی آواز سنائی دینے لگی غالباً یہ آواز اس پہاڑ کے پیچھے سے آرہی تھی جس کے خوبصورت سبزے سے بھرے دامن میں وہ سب کھڑے تھے۔

آواز قریب تر ہوتی جارہی تھی۔ یہ دلسوز آواز کسی ادھیڑ عمر عورت کی لگ رہی تھی جو اس قدر بے حال تھی کہ جیسے اس میں رونے کی سکت بھی نہ رہی ہو۔

اسامہ اور اس کے ساتھی ایک دوسرے کی طرف تذبذب کی کیفیت میں دیکھ رہے تھے، یہ درد میں ڈوبی آواز ان کے دل دہلا رہی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد پہاڑ کے پیچھے سے ایک نوجوان نکلا جس نے پینٹ شرٹ کے ساتھ لانگ کوٹ پہنا ہوا تھا، لانگ کوٹ کے ساتھ جڑی ہوئی ٹوپی اس نے سر پر ڈال رکھی تھی جس نے اس کا چہرہ اس طرح ڈھانپا ہوا تھا کہ اس کی آدھی ناک اور ہونٹ نظر آرہے تھے، اس نے وہی لباس زیب تن کیا ہوا تھا جو زرغام نے مرتے وقت پہنا ہوا تھا۔

پھر جو نظارہ ان کی آنکھوں نے دیکھا ان چاروں کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی، وہ جوان عمارہ کی والدہ رابعہ کو بازوؤں سے پکڑے پتھروں پر گھسیٹتا ہوا ان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ رابعہ نیم بیہوشی کی حالت میں سسکیاں لے رہی تھی، اس کے جسم سے جگہ جگہ سے خون رس رہا تھا۔

عمارہ چیختی چلاتی دائرے سے باہر بھاگنے لگی تو اسامہ نے اسے اپنے مضبوط بازوؤں میں جکڑ لیا۔ ''پاگل ہوگئی ہو یہ سب نظر کا دھوکہ ہے وہ شخص زرغام ہے اور وہ سب مل کر ڈرامہ رچا رہے ہیں ہمیں دائرے سے باہر نکالنے کے لیے.....''

عمارہ اسامہ کے بازوؤں پر مکے مارنے لگی۔

''تم مجھے چھوڑ دو..... میں کچھ نہیں جانتی، مجھے اپنی ماں کے پاس جانا ہے۔ میری ماں موت کے دہانے کھڑی ہے اور تم مجھے روک رہے ہو۔''

''ہوش سے کام لو.....'' اسامہ نے عمارہ پر اپنی گرفت اور مضبوط کرلی۔

ساحل اور عارفین بھی یہ منظر دیکھ کے تڑپ اُٹھے تھے ساحل نے طیش بھری نظروں سے اسامہ کی طرف دیکھا۔

''پاگل عمارہ نہیں بلکہ تم ہوگئے ہو۔ وہ لوگ آنٹی کو جان سے مار دیں گے اور یہ ہولناک منظر ہم یہاں کھڑے کھڑے نہیں دیکھ سکتے۔''

''اگر تم لوگوں کو میری بات پر یقین نہیں ہے تو میں دائرے سے باہر نکلوں گا۔ تم تینوں ادھر ہی رہو گے دائرے میں۔'' اسامہ نے ساحل کو سمجھایا۔

عمارہ اسامہ کی گرفت میں اونچی اونچی آواز میں رو رہی تھی مگر وہ خود کو اس کی گرفت سے چھڑا نہ پا رہی تھی۔

وہ پُراسرار نوجوان رابعہ کو گھسیٹتا ہوا حوریہ اور وشاء کے قریب لے آیا۔

رابعہ درد سے کراہ رہی تھی اور وہ دونوں اس کے درد سے لطف اندوز ہو رہی تھیں، ان کے لبوں پہ شیطانی مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

''مضبوط اعصاب کی مالک ہے جو ابھی تک زندہ ہے ورنہ جس بیدردی سے تم اسے گھسیٹتے ہوئے لا رہے ہو..... اسے تو ابھی تک مرجانا چاہیے تھا۔'' حوریہ نے اپنی سرد آنکھوں سے رابعہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا اور پھر اس کے قریب بیٹھ گئی۔

اس نے اپنا ہاتھ رابعہ کی گردن کی طرف بڑھایا اور پھر پیچھے کھینچ لیا۔ ''نہیں اسے اتنی آسان موت نہیں دینی

چاہیے، ہمیں تو اس ٹکڑوں میں چاہیے۔"

پُر اسرار نوجوان خفیف سا مسکرایا اور اس نے سامنے پہاڑ کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا۔ چند ہی ساعتوں میں پہاڑ کے پیچھے سے بہت سے کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دینے لگیں اور پھر تھوڑی ہی دیر میں بھیڑیا نما خوفناک کتے پہاڑ سے نیچے اُترنے لگے۔ وہ تعداد میں سات تھے۔

وہ بھونکتے ہوئے حملے کے انداز میں آگے بڑھ رہے تھے عمارہ نے دیکھا کہ وہ خونخوار کتے اس کی ماں کی طرف بڑھ رہے ہیں تو اس نے اپنا پاؤں زور سے اسامہ کی ٹانگ پر مارا اسامہ نے ایک جھٹکا لیا مگر اس نے عمارہ کو نہیں چھوڑا۔

دشاء، حوریہ اور وہ نوجوان مسلسل مسکرا رہے تھے۔ وہ رابعہ کی موت کا تماشہ دیکھنے کے لیے بے چین بھی تھے۔

کتے رابعہ کے قریب آچکے تھے۔ رابعہ خونخوار کتوں کو اپنی طرف بڑھتا دیکھ کے اپنے زخمی وجود کو گھسیٹتی ہوئی خود کو بچانے کی کوشش کر رہی تھی اس کے جسم سے خون رس رس کر زمین کو رنگ رہا تھا۔

خود کو اسامہ کی گرفت سے چھڑانے کی جب سب کوششیں ناکام ہوگئیں تو عمارہ نے اس کے ہاتھ پر کاٹ لیا۔

اسامہ نے اپنا ہاتھ جھٹکا تو وہ اس کی گرفت سے نکل گئی۔

"عمارہ......" اسامہ نے اسے روکنا چاہا مگر وہ دائرے سے باہر نکل گئی۔

اسامہ بھی اس کے پیچھے دائرے سے باہر آگیا۔ عمارہ اپنی زخمی ماں کی طرف لپکی مگر جونہی اس نے اپنی ماں کو چھوا، وہ سیاہ دھوئیں میں تبدیل ہو کے فواد کا روپ دھار گئی۔

عمارہ نے پتھرائی آنکھوں سے شکاری کتوں کی طرف دیکھا تو وہ کتے ہوائی وجود کی طرح غائب ہوگئے عمارہ چیخ کر اسامہ کے شانے سے جا لگی۔

پُر اسرار نوجوان نے اپنے سر سے ٹوپی پیچھے کی اور خود کو بے نقاب کر دیا۔ وہ زرغام ہی تھا۔ ساحل اور عارفین بھی دائرے سے باہر آچکے تھے اور دائرہ بھی مٹ چکا تھا۔

زرغام پہلے سے زیادہ بھیانک دکھائی دے رہا تھا کیونکہ وہ انسان نہیں تھا بلکہ زرغام کا ہمزاد تھا۔ جو بے شمار شیطانی قوتوں کا حامل تھا۔

اس کے چہرے پہ فاتحانہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔ ان چاروں کو دشاء، حوریہ اور فواد نے اپنے گھیرے میں لے لیا۔

عمارہ اور اس کے ساتھیوں کو ایسا محسوس ہو رہا تھا جیسے ان کے گرد آگ سلگ رہی ہے، جسے پار کر کے وہ فرار نہیں ہو سکتے۔

اسامہ اور عمارہ آگے کھڑے تھے اور ساحل اور عارفین ان کے پیچھے کھڑے تھے۔ ساحل اور عارفین کو یقین ہو گیا تھا کہ اب وہ زندہ نہیں بچیں گے مگر پھر بھی ان کے حوصلے پختہ تھے، موت کو اس قدر قریب پا کے بھی ان کے چہروں پہ ڈر کے تاثرات نہیں تھے کیونکہ وہ ذہنی طور پر اس چیز کے لیے تیار تھے۔

زرغام مسکراتا ہوا ان کے قریب آیا۔

"تم چاروں ہم سے مقابلہ کرنے آئے تھے۔ تم چاروں کو تو ہم چیونٹیوں کی طرح مسل سکتے ہیں لیکن تم چاروں سے ہماری کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہے۔ ہمارے ساتھ ایک سودا کر لو ہم تم چاروں کی جان بخش دیں گے۔ تم خیام کو ہمارے حوالے کر دو۔"

"ہم خیام کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔" اسامہ اور عمارہ نے جواب دیا۔

زرغام نے زوردار قہقہہ لگایا۔ "تم چاروں مجھے بیوقوف سمجھتے ہو۔ تم چاروں کو یہاں تک لانے والا کون ہے؟ تم چاروں، ہم تک کیسے پہنچ گئے؟"

"اس ریسٹ ہاؤس میں کالے جادو کا عمل کیسے ہوا؟ یہ سب بتانے والا خیام ہے۔" یہ کہہ کے زرغام اسامہ کے قریب آیا اور اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ طیش میں جھٹکے سے پیچھے ہٹا۔

"اس وقت وہ اس کے وجود میں نہیں ہے۔" پھر ادھر اُدھر دیکھ کر چلانے لگا۔ "خیام! ہمارے سامنے آؤ......"

اسامہ نے بہت ہوشیاری سے اپنے بیگ سے ایک کپڑے کی پوٹلی نکال لی۔ جس میں ایک کافور کی ڈلی کے ساتھ چکنی مٹی کے چار چھوٹے چھوٹے گولے تھے جن پر

خاص عمل کیا گیا تھا اور ان پر زرغام، وشاء اور حوریہ اور فواد کے ناموں کے ہندسے کندہ تھے۔

جس پہاڑ کے دامن میں وہ سب کھڑے تھے۔ اس کے قریب ہی ایک چھوٹی سی آبشار بہہ رہی تھی جو نیچے گر کے چشمے کی صورت اختیار کررہی تھی۔

اس نے احتیاط سے وہ پوٹلی عمارہ کے ہاتھ میں تھما دی اور سرگوشی کے انداز میں کہا۔ ''اسے چشمے کی طرف اُچھال دو۔''

عمارہ نے فوراً وہ پوٹلی چشمے کی طرف اُچھال دی۔

جونہی وہ پوٹلی پانی میں گری، وہ سارے ہمزاد غائب ہوگئے۔

اسامہ نے عمارہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے عارفین اور ساحل کی طرف دیکھا۔ ''نکلو یہاں سے.....''

ساحل اور عارفین اسامہ کے پیچھے بھاگنے لگے، انہیں معلوم نہیں تھا کہ اسامہ کہاں جارہا ہے۔

وہ پہاڑوں کے کٹاؤ دار حصوں پر قدم رکھتے ہوئے پہاڑوں کے نشیب و فراز سے گزر رہے تھے۔

اسامہ اور عمارہ جو کوئی بات کیے بغیر بس بھاگ رہے تھے، کہاں جانا چاہتے تھے ساحل اور عارفین کو کچھ سمجھ نہیں آرہا تھا۔ ساحل نے اسامہ کو پکارا۔

''کہاں بھاگے جارہے ہو، اگر زرغام پھر ہمارے سامنے آگیا..... تو ہمیں کوئی قریبی جگہ دیکھ کے چھپ جانا چاہیے۔''

اسامہ نے بھاگتے بھاگتے ہی اونچی آواز سے کہا۔ ''قریبی نہیں محفوظ جگہ پر..... جو اب قریب ہی ہے۔''

کافی نیچے اُترنے کے بعد اسامہ ایک پہاڑ کے قریب کھڑا ہوگیا۔ اس پہاڑ میں ایک غار دکھائی دے رہی تھی۔

''میرا خیال ہے کہ یہی جگہ مناسب ہے۔'' اسامہ نے ساحل سے کہا اور پھر سب نے اپنی اپنی ٹارچیں آن کر لیں اور اس غار میں داخل ہوگئے۔ غار کافی گہری کھلی تھی، وہ سب مناسب سی جگہ دیکھ کر بیٹھ گئے۔

''ہم کس طرح چین سے بیٹھ سکتے ہیں، وہ بدروحیں کسی بھی وقت ہمارے سامنے آسکتی ہیں۔'' عمارہ نے گھبراہٹ میں کہا۔

اسامہ نے اپنا ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔ ''اطمینان رکھو..... جب تک وہ مٹی کے گولے پانی میں گھل نہیں جاتے وہ ہمزاد ہمارے سامنے نہیں آسکتے ہم ان کی گرفت سے آزاد ہیں مگر ہمیں اس دوران اپنے بچاؤ کا اگلا بندوبست کرنا ہوگا، کیونکہ مٹی کو گھلنے میں زیادہ وقت نہیں لگےگا۔''

ساحل اور عارفین اسامہ کے قریب ہوگئے۔ ''ہمیں بتاؤ کیا کرنا ہے.....''

فی الحال تم کچھ لکڑیاں جمع کر کے آگ لگاؤ، میں کہیں سے چکنی مٹی ڈھونڈتا ہوں، ہمیں مٹی کی گولیاں اور بنانی ہوں گی۔''

اسامہ کی بات سن کے عمارہ نے کہا۔ ''میں تمہارے ساتھ چکنی مٹی ڈھونڈتی ہوں۔''

ساحل اور عارفین غار سے باہر جاکے لکڑیاں اکٹھی کرنے لگے۔

اسامہ اور عمارہ ابھی غار کے اندر ہی بیٹھے تھے۔

اسامہ نے ٹارچ کو کسی پتھر سے ٹکا دیا تھا جس سے غار میں دھیمی دھیمی سرخی مائل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

عمارہ اپنے جوگرز کے تسموں کو لوز کررہی تھی، اسامہ خاموشی سے اس کے چہرے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ عمارہ نے ترچھی نظر سے اسامہ کی طرف دیکھا اور پھر اس کی طرف منہ کر کے بیٹھ گئی۔

اس نے اپنی نمدار آنکھوں سے اسامہ کی آنکھوں میں جھانکا جن میں ہلکی ہلکی سرخی اُبھر آئی تھی۔ ''کیا سوچ رہے ہو.....؟''

اسامہ نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔ ''ویسے ہی سوچ رہا تھا کہ موت کو قریب دیکھ کے دل میں ایسے احساسات بھی بیدار ہوجاتے ہیں جن سے انسان غافل ہوتا ہے آج سے پہلے میں موت سے کبھی نہیں ڈرا، نہ جانے کیوں اب زندگی اچھی لگنے لگی ہے۔''

اسامہ کی آنکھوں میں کچھ تھا جو شاید عمارہ نے پڑھ لیا تھا۔ عمارہ نے مروت سے بھرپور انداز میں اسامہ کی طرف دیکھا۔ ''اگر تمہارے دل میں کسی کے لیے سچا جذبہ ہے تو

تمہیں تمہاری خوشیاں ضرور ملیں گی۔"

اسامہ نے پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ عمارہ کو اپنے کٹے ہوئے ہاتھ والا بازو دکھایا جیسے وہ کہہ رہا ہو کہ وہ ایک نامکمل انسان ہے۔

عمارہ نے اس کے ہاتھ پر دھیرے سے اپنا ہاتھ رکھ دیا۔"اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔"

اتنے میں ساحل اور عارفین لکڑیاں لے کر آگئے۔

"لو جی! ہم تو لکڑیاں بھی لے آئے اور تم دونوں ابھی تک یہیں بیٹھے ہو، جلدی سے چکنی مٹی ڈھونڈو ورنہ وہ ہمزادان لکڑیوں پر ہمیں بھون کر کھا لیں گے۔" عارفین نے لکڑیاں زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

اسامہ اور عمارہ فوری اُٹھ کے چکنی مٹی ڈھونڈنے لگے۔ وہ دونوں غار سے باہر چلے گئے۔انہیں جلد ہی چکنی مٹی مل گئی۔

وہ چکنی مٹی لے کر غار میں آگئے۔ اسامہ نے ایک بڑا سا چپٹا پتھر لیا اور اس کے اوپر مٹی رکھ دی، عمارہ نے بیگ سے پانی کی بوتل نکالی اور اسامہ کے ہاتھ میں تھما دی۔ اسامہ نے مٹی میں پانی ڈال کر مٹی کو گوندھنا شروع کر دیا، جب مٹی تھوڑی سی گندھ گئی تو اس نے کوئی خاص عمل پڑھنا شروع کر دیا۔ وہ عمل پڑھتا جاتا اور گوندھی ہوئی مٹی میں پھونک مار کے اسے پھر گوندھنا شروع کر دیتا، اس نے تین دفعہ مٹی کو گوندھا اور تین بار عمل پڑھ کر اس پر پھونک ماری اور پھر اس نے اس مٹی کی چھوٹی چھوٹی سی بارہ گیندیں سی بنالیں۔

عمارہ حیرت سے اسامہ کی طرف دیکھ رہی تھی کہ ایک ریٹائرڈ میجر یہ سب کیسے جانتا ہے۔

ساحل اور عارفین نے لکڑیاں اکٹھی کر کے آگ لگا دی۔

اسامہ نے مٹی کی وہ گولیاں آگ میں جھونک دیں اور ایک لکڑی کی چھڑی سے انہیں اُلٹ پلٹ کرنے لگا۔

سردی بھی بہت شدید تھی۔ وہ سارے آگ کے گرد بیٹھ گئے۔

عمارہ اسامہ کے ساتھ ہی بیٹھی ہوئی تھی آگ کی دھیمی دھیمی سرخی مائل روشنی پھیلی ہوئی تھی۔"میں تمہاری مدد کردوں۔" عمارہ نے اسامہ سے کہا۔

"نہیں ..... یہ کام مجھ اکیلے کو ہی کرنا ہے۔" اسامہ نے جواب دیا۔

عمارہ نے گہری نظر سے اسامہ کی طرف دیکھا جو اپنے کام میں مگن تھا پھر مہین سے انداز میں گویا ہوئی۔

"اسامہ! زرغام جو بات کہہ رہا تھا خیام کے متعلق اس کا کیا مطلب تھا، تم نے ہمیشہ اس حقیقت پر پردہ گرائے رکھا ہے۔ میں چاہوں تو تمہیں ہپناٹائز کر کے ساری حقیقت اگلوا لوں مگر نہ تو میرے پاس اس عمل کے لیے وقت ہے اور نہ ہی مناسب صورت حال....."

اسامہ نے عمارہ کی طرف دیکھا۔"تمہیں زیادہ گہرائی میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کچھ باتوں پر مصلحتاً پردہ گرا دیا جاتا ہے۔ تمہارے لیے اتنا ہی جاننا کافی ہے کہ زرغام جو کچھ کہہ رہا تھا وہ سچ ہے۔ ہمیں یہاں تک لانے والا، چھپے ہوئے راز آشکار کرنے والا خیام ہی ہے۔ وہ ہم میں سے کسی کے دماغ کو ہدایات دیتا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے، ہمارے لیے تو یہ بات اہم ہے کہ وہ اس محاذ میں ہمارے ساتھ ہے۔"

عمارہ نے اسامہ کے بازوؤں پر اپنا ہاتھ رکھا۔

"اسامہ بات کو گول مت کرو۔ میں جب سے تم سے ملی ہوں میں نے تمہاری ذات کو دو انسانوں میں بٹے ہوئے دیکھا ہے۔ تمہارے اندر کوئی شخص چھپا ہوا ہے وہی شخص جو تمہیں ہم تک لایا ہے۔"

اسامہ نے مٹی کے پیڑے آگ سے نکالتے ہوئے عمارہ سے کہا۔"یہ ان باتوں کا وقت نہیں ہے۔ تم تو ایک سائیکاٹرسٹ بھی ہو اور عاملہ بھی، کب میں اپنے روپ میں ہوتا ہوں۔ یہ تو جان جاتی ہوتا۔"

"اس کا مطلب کہ تم مانتے ہو کہ تمہارے دو روپ ہیں۔" عمارہ نے فوراً کہا۔

"میں یہ بات تمہارے ذہن کی کہہ رہا ہوں۔ اس موضوع پر پھر بات کریں گے ابھی ہمارے سر پر خطرہ منڈلا رہا ہے۔ مجھے اپنے سر کی پن دو۔" اسامہ نے عمارہ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

عمارہ نے اپنے سر سے پن اُتار کے اسامہ کے ہاتھ میں رکھ دی۔

اسامہ نے اس پن سے زرغام، وشاء، حوریہ اور فواد کے ناموں کے اعداد کے ہندسے ان مٹی کے پیڑوں پر کندہ کیے اور پھر انہیں ایک کپڑے کی پوٹلی میں ڈال لیا۔

''اسامہ! اب ہمیں آگے کیا کرنا ہے...'' ساحل نے پوچھا۔

''اب آگے ہمیں جو کرنا ہے یہ حالات پر منحصر ہے۔ ہمیں خود کو بھی بچانا ہے اور انہیں بھی ختم کرنا ہے۔'' عمارہ اور عارفین بھی اسامہ کی بات توجہ سے سن رہے تھے، عمارہ نے فوراً کہا۔

''اسامہ! ہم صرف مرنے کے لیے ان کے سامنے نہیں جاسکتے، ہمارے پاس کوئی پلان ہونا چاہیے۔''

''میں ایسا اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میری معلومات بس یہیں تک تھی۔ میرا کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں حالات بتائیں گے کہ ہمیں آگے کیا کرنا ہے۔ ہمارا پلان ہے، ایسے ہی تو ہم اتنی بڑی جنگ لڑنے کے لیے نہیں آئے۔'' اسامہ نے معنی خیز انداز میں جواب دیا۔

''کیا پلان ہے ہمیں ابھی بتادو نہ جانے دوبارہ ہم اس طرح مل کر بیٹھ سکیں یا نہ بیٹھ سکیں۔'' ساحل نے پوچھا۔

اسامہ نے انہیں تھوڑا قریب ہونے کے لیے کہا اور پھر اس نے بات شروع کی۔

''پہلے تم لوگ کچھ ضروری باتیں سمجھ لو۔ جب کوئی زندہ انسان اپنا ہمزاد مسخر کرتا ہے تو عمل شمی یا عمل شمسی کرتا ہے۔ وہ اپنا عمل اپنے سائے کے گرد کرتا ہے۔ مگر جب کوئی عامل کسی مردے کا ہمزاد قابو کرتا ہے تو وہ اس کی قبر کے قریب کھڑا ہو کے تسخیر ہمزاد کا عمل کرتا ہے۔

فواد، حوریہ، وشاء اور خیام نے اپنی محدود معلومات کے ساتھ کالے جادو کا خطرناک عمل کیا۔ ان کا عمل ناکام ہوا تو زرغام نے انہیں باتوں میں پھنسا کر اپنی مرضی کا عمل کروایا جس کے بعد ان چاروں کی موت ہوئی۔ زرغام نے بہت مہارت سے ان کے ہمزاد قابو کر لیے۔

ایک ہمزاد چونکہ ہر روپ لے سکتا ہے اس لیے ان چاروں کی خواہش کے مطابق وہ جو روپ لینا چاہتے تھے ان کے ہمزاد نے لے لیے۔ میں نہیں جانتا کہ اس عمل کے دوران ایسا کیا ہوا کہ خیام کا ہمزاد زرغام کے قابو میں نہیں آیا۔ وہ روشنی کی تیز شعاع کی صورت میں ظاہر ہوا اور فضا میں کہیں غائب ہو گیا۔

فواد، حوریہ اور وشاء کے ہمزاد زرغام نے قابو کر لیے، وہ اس کے اشاروں پر کٹھ پتلی کی طرح کام کرتے ہیں۔

خیام پر زرغام کی اصلیت کھل چکی تھی اس لیے اس کی اور خیام کی دشمنی کی بنیاد اسی روز پڑ گئی تھی۔ خیام نے نیکی کا راستہ اختیار کر لیا مگر اس کے تینوں ساتھی فواد، حوریہ اور وشاء شیطانیت میں اتنے آگے بڑھ گئے کہ انہوں نے سینکڑوں لوگوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیا۔

زرغام نے ان چاروں کے مُردہ جسموں پر عمل کر کے ان کے ہمزاد تسخیر کرنے کا عمل کیا تھا۔ ہمیں کسی طرح ان ہمزاد کو زرغام کی قید سے رہا کر کے ان کے اصل مقام تک انہیں پہنچانا ہے کسی خاص وسیلے کے تحت مجھے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ ان ہمزاد کو ان کے شیطانی روپ سے کس طرح بری الذمہ کیا جاسکتا ہے اس کا راز ہمیں اس ریسٹ ہاؤس سے ملے گا۔ بس یہی ہمارا پلان ہے کہ ہم نے اس ریسٹ ہاؤس سے وہ چیز ڈھونڈنی ہے جس میں ان ہمزاد کی بربادی پوشیدہ ہے۔''

''ہمیں وقت ضائع کیے بغیر ریسٹ ہاؤس جانا چاہیے...'' ساحل نے کہا۔

''ہاں... ہم نے اپنے بچاؤ کا بندوبست کر لیا ہے۔ اب ہمیں چلنا چاہیے...'' اسامہ نے کپڑے کی پوٹلی اپنے بیگ میں رکھتے ہوئے کہا اور پھر عمارہ اور عارفین بھی کھڑے ہو گئے۔

عمارہ اپنا بیگ اُٹھا کے اسامہ کی طرف بڑھی۔

''تمہیں اپنے بیگ سے پوٹلی نکالنے میں دقت ہوتی ہے تم یہ پوٹلی مجھے دے دو، میں اپنے بیگ میں رکھ لیتی ہوں۔''

''ہاں یہ بھی ٹھیک ہے۔'' اسامہ نے پوٹلی عمارہ کے بیگ میں ڈال دی۔ اور اس کے شانے پہ دھیرے سے ہاتھ رکھا۔

''بہت احتیاط کی ضرورت ہے، ہم اس وقت ان کے ٹارگٹ پر ہیں۔ کوئی بھی غلطی نہیں ہونی چاہیے۔''

عمارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر گویا ہوئی۔

''میرے خیال میں ہمیں سب سے پہلے اس جگہ سے تلاش شروع کرنی چاہیے جہاں ہمیں زرغام نے قید کیا تھا، اس تہہ خانہ کا دروازہ کھلا رہے گا تو آکسیجن کا مسئلہ نہیں ہوگا۔''

عمارہ کی بات ابھی مکمل نہیں ہوئی تھی عافین بے تکان بولا۔''اور اگر کسی نے تہہ خانے کا دروازہ بند کر دیا تو وہ تہہ خانہ ہماری مشترکہ قبر بن جائے گا۔''

ساحل تپ کر بولا۔''کبھی تو منہ سے اچھی بات نکال دیا کر۔'' پھر وہ اسامہ سے مخاطب ہوا۔

''میرا خیال ہے کہ عمارہ ٹھیک کہہ رہی ہے، وہ جگہ بالکل کسی لیب جیسی ہے ہوسکتا ہے ہمیں وہاں سے کچھ مل جائے۔ میں تہہ خانے کے دروازے کے پاس ہی بیٹھوں گا جونہی خطرہ محسوس کروں گا، آپ لوگوں کو آگاہ کردوں گا۔''

''ٹھیک ہے پھر پہلے اُدھر ہی جاتے ہیں۔'' اسامہ نے کہا اور وہ سب وہاں سے نکل کر ریسٹ ہاؤس کی طرف بڑھے۔ وہ ریسٹ ہاؤس سے زیادہ فاصلے پر نہ تھے اس لیے جلد ہی ریسٹ ہاؤس پہنچ گئے۔

ریسٹ ہاؤس میں داخل ہوتے ہی عجیب طرح کی دہشت ان کی رگوں میں سرایت کر گئی تھی کیونکہ اب انہیں ایک پل کا بھروسا بھی نہ تھا کہ کب ہمزاد ان پر حملہ کردیں۔

وہ ہال نما کمرے سے گزرتے ہوئے صحن کی طرف بڑھے وہ تیز تیز قدموں سے تہہ خانے کے دروازے کے قریب آئے۔ تہہ خانہ کا دروازہ بند تھا۔

ساحل نے آگے بڑھ کر تہہ خانہ کے دروازے کے کلپ کو دائیں طرف دھکیلا تو وہ دروازہ کھل کر سرکتا ہوا ایک فریم میں داخل ہوگیا۔

ساحل دروازے کے قریب ہی بیٹھا رہا اور اسامہ، عمارہ اور عارفین سیڑھیوں کے زینے سے نیچے اتر گئے۔

نیچے وہی گھٹن اور بدبودار ماحول تھا مگر ان کی مجبوری تھی، وہ خود پر قابو رکھتے ہوئے سارے ٹیبلز کے درازوں کی تلاشی لینے لگے۔ یہاں بہت گندگی اور غلاظت تھی انہوں نے اپنے ناک پر رومال رکھے ہوئے تھے۔

یہ جگہ بالکل کسی پُراسرار لیبارٹری جیسی تھی۔ لمبے لمبے ٹیبلز پر بڑے بڑے اسٹینڈ تھے جن میں شیشے کے چھوٹے اور بڑے دونوں طرح کے جار پڑے تھے۔

ان جاروں میں چھوٹے چھوٹے اسنفد تھے اور کئی جانوروں کے جسم کے نازک حصے Formaline لیکوڈ میں بھگو کر رکھے گئے تھے۔

سیہہ، اُلو اور سانپ کے جسم کے مختلف حصے کاٹ کر زمین پر ایسے ہی پھینکے ہوئے تھے جیسے وہ چھوڑ کر گئے تھے۔ وہ تینوں تہہ خانہ کے مختلف حصوں میں بکھر گئے۔

عارفین ٹیبلز کی چیزیں چیک کر رہا تھا اور اسامہ تہہ خانہ کی دوسری چیزوں کا جائزہ لے رہا تھا۔ عمارہ کو ایک کتابوں کی الماری نظر آرہی تھی اور وہ اس میں وہ خاص کتاب ڈھونڈ رہی تھی جس سے انہیں کچھ مدد مل سکے۔

''عمارہ جلدی کرو۔ ہمارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔'' اسامہ نے کہا۔

اسے کوئی خاص چیز نظر نہیں آرہی تھی پھر اچانک اس کی توجہ تہہ خانہ کی ایک دیوار پر مرکوز ہوگئی وہاں اسے کچھ چمکتا ہوا دکھائی دیا۔ وہ اس کے قریب گیا تو وہ کوئی لاک تھا جسے کسی خاص نمبر سے گھمایا جاسکتا تھا۔

اسے یقین ہوگیا کہ اسے گھمانے سے یہ دیوار کسی دروازے کی طرح کھل جاتی ہوگی، وہ مختلف نمبروں سے وہ لاک گھمانے لگا۔

عمارہ کو اپنے مطلوبہ موضوع کے مطابق چار کتابیں مل گئیں۔ وہ یکے بعد دیگرے ان کتابوں کی فہرست پڑھنے لگی اسے تین کتابوں سے ایسا کچھ نہیں ملا جو ان کے کام آسکے، ایک آخری کتاب ''تسخیر ہمزاد'' اب اس کے ہاتھ میں تھی۔

اس نے اس کتاب کی فہرست پڑھی۔ کافی لمبی فہرست پڑھنے کے بعد ایک ٹوپک پر اس کی انگلی رُک گئی وہ ٹوپک تھا ''ہمزاد کو برباد کرنے کا عمل'' اس نے صفحہ نمبر پڑھا اور وہ صفحہ ڈھونڈنے لگی۔ اسے جلد ہی صفحہ مل گیا پھر وہ پڑھنے لگی۔ اسامہ نے عمارہ کو پکارا۔''جلدی کرو...... عمارہ'' اور پھر

اس نے عارفین سے پوچھا۔ ''تمہیں کچھ ملا۔''

''نہیں مجھے تو کچھ نہیں ملا۔ تم اس دیوار کے ساتھ کیا کر رہے تھے۔'' عارفین نے پوچھا۔

اسامہ نے تذبذب سی کیفیت میں سر کو ہلایا۔ ''مجھے اس دیوار میں ایک لاک نظر آیا ہے مگر نمبر نہ معلوم ہونے کی وجہ سے کافی کوشش کے باوجود وہ لاک نہیں کھلا۔''

''یقیناً اس دیوار کے پیچھے کوئی بڑا راز چھپا ہے۔ میں بھی کوشش کرتا ہوں۔'' یہ کہہ کر عارفین اسامہ کے ساتھ اس دیوار کی طرف بڑھا تو ساتھ ہی ساحل اونچی آواز میں چلایا۔

''جلدی تم سب باہر آجاؤ۔ مجھے عجیب طرح کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔''

یہ سنتے ہی عمارہ نے کتاب اپنے بیگ میں ڈالی اور سیڑھیوں کی طرف دوڑی، اسامہ اور عارفین بھی سیڑھی کے قریب آگئے۔ وہ تینوں سیڑھی چڑھتے ہوئے تہہ خانے سے باہر آگئے۔ ساحل نے تہہ خانے کا دروازہ پہلے کی طرح بند کر دیا۔

وہ چاروں اخروٹ کے درخت کے پیچھے چھپ گئے۔ یہ آواز بہت عجیب تھی جیسے کوئی لڑکی سسک سسک کے رو رہی تھی۔

عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھا اور ہمدردانہ لہجہ میں بولی۔ ''لگتا ہے کہ کوئی لڑکی بہت اذیت میں ہے۔''

''یہ زرغام کی کوئی چال ہو سکتی ہے۔'' اسامہ نے کہا۔

آواز پہلے سے زیادہ اونچی ہوگئی اس بار وہ درد سے چیخ رہی تھی۔

''ہم بغیر سوچے سمجھے اس کے قریب نہیں جائیں گے مگر دیکھنے میں کیا حرج ہے۔'' ساحل نے کہا۔

''ٹھیک ہے پھر ہم سب ایک ساتھ ہی جائیں گے۔'' اسامہ نے کہا اور پھر وہ سب ایک ساتھ اس آواز کی سمت کی جانب بڑھنے لگے۔ وہ سب ہال نما کمرے میں داخل ہوئے۔ آواز بائیں جانب کے کمرے (بیڈروم) سے آ رہی تھی۔ وہ دھیرے دھیرے قدم رکھتے ہوئے بیڈروم کے دروازے کے قریب آئے۔

اسامہ نے انہیں وہیں رُکنے کا اشارہ کیا اور خود آگے بڑھ کر بیڈروم کا دروازہ کھولا سب کے دل دہل کر رہ گئے۔ آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

جوڑی کمرے کے ایک کونے میں لوہے کی زنجیروں میں جکڑی بے بسی کی حالت میں سسک رہی تھی وہ دینا تھی۔ اس کی کلائیوں اور پیروں سے (جہاں جہاں زنجیریں تھیں) خون رس رہا تھا۔

ایک لمحے کے لیے تو عارفین کی حالت ایسی ہوگئی جیسے اس میں زندگی کی رمق نہ رہی ہو۔ وہ دیوانہ وار اس لڑکی کی طرف دوڑا تو ساحل اور عمارہ نے اسے پکڑ لیا۔

''کیا کر رہے ہو عارفین! تم نے دیکھا نہیں تھا کہ کس طرح عمارہ کی ماں کی موت کا ڈرامہ انہوں نے ہمارے سامنے پیش کیا۔ ہم نے طے کیا تھا نا کہ ہم سوچے سمجھے بغیر آگے نہیں بڑھیں گے۔'' اسامہ عارفین کو سمجھانے کی کوشش کر رہا تھا مگر عارفین کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے اس نے اسامہ کی طرف دیکھا۔ ''ایسا منظر دیکھنے کے بعد سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معدوم ہو جاتی ہے۔''

''آپ لوگ اِدھر ہی رہیں مگر پلیز مجھے جانے دیں۔'' ساحل نے اس کے بازوؤں کو زور سے جھٹکا دیا۔

''خود بھی مرو گے اور ہمیں بھی مرواؤ گے۔''

دینا نے اپنی بھیگی آنکھوں سے عارفین کی طرف دیکھا اور پُر امید انداز میں مسکرائی۔ ''عارفین تم آگئے ہو..... دیکھو تو اونے میرا کیا حال کیا ہے۔ اگر تم اب بھی نہ آتے تو تمہیں میری لاش ملتی۔''

عارفین جذبات کی رو میں بہتا ہوا اپنے دماغ کے احکامات سے غافل ہوگیا اس نے عمارہ اور ساحل سے خود کو چھڑایا اور بھاگ کر دینا کے پاس چلا گیا۔

''عارفین اسے چھونا مت۔'' اسامہ چلایا مگر وہ کسی کی کب سن رہا تھا وہ تو اپنے دل کا غلام تھا اس نے اس کا ہاتھ تھاما۔ اسے یوں لگا جیسے کسی نے برف پر ہاتھ رکھ دیا ہو، اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ہی ساعت میں وہ لڑکی حور یہ کا روپ دھار گئی۔ ساتھ ہی وہ زنجیریں بھی غائب ہوگئیں۔ حور یہ کا روپ ہوائی تھا اس لیے عارفین کا ہاتھ خالی تھا۔

اسامہ، ساحل اور عمارہ بھی عارفین کے قریب آگئے

تھے۔ حوریہ سفید چولہ پہنے اپنے بھیانک روپ میں ان کے سامنے کھڑی تھی۔

اس کے سلیٹی مائل چہرے پہ جیسے فخر سا آ گیا اس نے استہزائیہ انداز میں ان چاروں کو دیکھا۔ ”تم کمزور جسموں والے، ہر بار زندگی اور موت کے اس کھیل میں مزا آنے لگا ہے جس محبت کے نام پر تم ہر دفعہ پھنس جاتے ہو نا وہی تم انسانوں کی سب سے بڑی کمزوری ہے۔ اس جذبے کو دل سے نکال پھینکو تو تم میں کئی وجدانی قوتیں جاگ جائیں گی۔“

اسامہ نے اونچی آواز میں کہا۔ ”ہم شیطان نہیں ہیں جو تمہاری طرح زندگی کا قاعدہ اُلٹا پڑھیں۔ ہم تو اس جذبے کے لیے جیتے ہیں اور اس کے لیے مرجاتے ہیں۔“

”اچھا ابھی تو اپنے ایک دوست کی موت کا نظارہ دیکھو۔“ حوریہ نے یہ کہہ کر اپنے ایک انچ لمبے ناخنوں والے ہاتھ سے عارفین کی طرف اشارہ کیا۔ عارفین کو دھچکا سا لگا اور اس کے قدم زمین سے اوپر اُٹھ گئے۔ حوریہ نے اپنے ہاتھ کو تھوڑا بلند کیا تو عارفین اوپر اُڑتا ہوا چھت کے قریب پہنچ گیا۔

عمارہ کی چیخیں نکل گئیں۔ حوریہ نے اپنے ہاتھ کی حرکت کو وہیں روک لیا اور عارفین ہوا میں معلق چیخنے لگا۔

اسامہ کی آنکھوں کی پتلیاں نیلی ہو گئیں، اس کے چہرے کے تاثرات بھی بدل گئے اور اس کی آواز بھی تبدیل ہو گئی۔ اس کے جسم میں چھپی ماورائی طاقت سامنے آ گئی۔

وہ گرجدار آواز میں چلایا۔ ”حوریہ! عارفین کو چھوڑ دو ورنہ میں تمہیں جلا کر راکھ کر دوں گا۔“

حوریہ کے چہرے پہ ایک بار پھر شیطانی مسکراہٹ بکھر گئی۔

”اوہ خیام...... تو تم اس کے جسم میں چھپے ہو۔ تمہارا دوست تو اب نہیں بچ سکتا اگر اس کو چھوڑتی ہوں تو بھی اس نے مرنا ہی ہے۔“

اسامہ نے عارفین کی طرف دیکھا جس کی زندگی واقعی موت کے دہانے پر تھی۔

اسامہ کے جسم سے ایک شعاع نکلی جو عارفین کی طرف بڑھی اس کے بعد عارفین کا جسم آہستہ آہستہ نیچے اُترنے لگا۔

حوریہ کو نظر آ رہا تھا کہ عارفین کو خیام ہی بچا رہا ہے جو اسامہ کے جسم میں اب موجود نہیں ہے حوریہ نے فوراً اسامہ کی طرف ہاتھ سے دھکے کا اشارہ کیا تو اسامہ کا وجود اُچھل کر دیوار سے بجا اور پھر حوریہ نے اسے زمین پر پٹخ دیا۔ اسامہ کے حلق سے کرب آمیز چیخیں نکلیں۔

عمارہ نے اسے اپنی بانہوں میں لے لیا۔ اسامہ کے جسم کی ہڈیاں بُری طرح پٹخ گئی تھیں، مگر عارفین کے جسم پر خراش تک نہ آئی تھی۔ روشنی کی پُراسرار شعاع حوریہ کی طرف بڑھی اور خیام کے روپ میں تبدیل ہو گئی۔

ساحل اور عارفین نے مل کر اسامہ کو اُٹھایا عمارہ نے اسامہ کا بیگ اُٹھایا اور وہ سب کمرے سے باہر نکل گئے۔

ساحل اور عارفین نے اسامہ کو صحن میں لٹایا۔ عمارہ نے برق سرعت سے اپنے بیگ سے مٹی کے پیڑوں کی پوٹلی نکالی اور اکیلی ہی بھاگتی ہوئی ریسٹ ہاؤس سے باہر چلی گئی۔ اس نے بہت پھرتی سے پوٹلی کو آبشار کی طرف اُچھال دیا۔ جونہی پوٹلی پانی میں گری۔ عمارہ نے سکھ کا لمبا سانس کھینچا اور پھر واپس دوڑتی اسامہ کے پاس آ گئی۔ ”اب ہم خطرے سے باہر ہیں۔ وہ پوٹلی پھینک آئی ہوں۔“

اسامہ نے عمارہ کا ہاتھ تھاما اور تھکے تھکے لہجے میں بولا۔ ”بس یہ ہمارے پاس آخری موقع ہے۔“ عمارہ نے مسکراتے ہوئے اسامہ کے بالوں کو سہلایا۔

”فکر نہ کرو، مجھے وہ عمل مل گیا ہے جس سے ہمزاد کو برباد کیا جا سکتا ہے۔ بس یہ پتہ چل جائے کہ ان چار ہمزاد کی قبریں کہاں ہیں۔“

”جو...... جو نیچے دیوار پہ لاک ہے یعنی تہہ خانہ میں...... مجھے یقین ہے کہ ان کی قبریں اس دیوار کے پیچھے ہوں گی۔“ اسامہ بمشکل بولا۔

”یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ قبریں ریسٹ ہاؤس سے باہر ہوں اور ہم یونہی لاک کھولنے کے چکر میں اپنا وقت برباد کر لیں۔“ عارفین نے اپنی رائے دی۔

”پہلے تہہ خانے میں ڈھونڈ لیتے ہیں پھر باہر دیکھیں گے...... شاید یہ ہماری آخری کوشش ہو...... اگر کامیاب ہو گئے تو ہمزاد ختم ہو جائیں گے اور ہم اگر ناکام ہو گئے تو

ہم....'' عمارہ نے افسردگی سے کہا۔

ساحل بھی بہت پریشان اور اُداس تھا۔ اس کی آنکھوں میں نمی اُتر آئی تھی۔ اس نے عمارہ کی طرف دیکھا اور انتہائی شکستہ لہجے میں بولا۔

''پتہ نہیں مرنے سے پہلے بھی اپنوں کی آواز سننا نصیب ہوگی یا نہیں۔ ہم جب سے یہاں آئے ہیں موبائل میں سگنل ہی نہیں ہیں۔ وہ سم بھی ڈال کے دیکھی ہے جو یہاں چلتی ہے پھر بھی سگنل نہیں ہیں۔''

ساحل نے جیسے سب کی دُکھتی رگ پہ ہاتھ رکھ دیا یہ ان سب کا مسئلہ تھا۔

''میں بھی کتنی بار کوشش کر چکا ہوں مگر گھر والوں سے بات نہ ہوسکی۔'' اسامہ نے کہا۔

عمارہ نے بھی اسامہ کے ساتھ اپنا دکھڑا بیان کیا۔ ''میں بھی ترس گئی ہوں۔ امی کی آواز سننے کے لیے۔''

عارفین بھی جیسے ٹوٹ گیا۔ ''مجھے بھی گھر والوں کی بہت یاد آرہی ہے۔''

''چلو.... دنیا سے تو تمہاری ملاقات ہوگئی نا۔'' ساحل نے اسے چھیڑ کر سب کو ہنسا دیا۔

تھوڑی دیر کے بعد وہ تہہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ عمارہ نے تہہ خانے کا دروازہ کھولا پھر وہ ساحل سے مخاطب ہوئی۔ ''تم اور عارفین اسامہ کو لے کر نیچے اترو، میں بعد میں آتی ہوں۔''

ساحل اور عارفین اسامہ کو لے کر آہستہ آہستہ سیڑھیاں اُترنے لگے۔ وہ سیڑھیاں اُتر گئے تو عمارہ بھی نیچے اُتر آئی۔

وہ سب اس پُراسرار دیوار کی طرف بڑھے جہاں لاک لگا ہوا تھا۔ انہوں نے اسامہ کو زمین پر بٹھا دیا۔

''تہہ خانے کے دروازے کے پاس کسی کو رُکنا چاہیے تھا۔'' ساحل نے عمارہ سے کہا۔

عمارہ نے قدرے اطمینان سے کہا۔ ''تھوڑی دیر تک تو ہمیں کوئی خطرہ نہیں ہے۔ کچھ دیر کے بعد عارفین کو بھیج دیں گے ابھی لاک کھولنے کی کوشش کرتے ہیں۔''

عمارہ لاک کے چھلے کو گھما گھما کے مختلف نمبر ملا ملا کے لاک کھولنے کی کوشش کرتی رہی مگر اس سے لاک نہیں کھلا۔ وہ ناکام ہوگئی تو عارفین اور ساحل کوشش کرنے لگے۔

اسامہ بے چینی سے بار بار تہہ خانے کے دروازے کی طرف دیکھ رہا تھا پھر اسے خیام کا خیال آیا تو اس نے آنکھیں بند کر کے خیام کو یاد کیا اور اس کے ساتھ خیال خوانی کی ''خیام! ہماری مدد کرو۔''

پھر اس نے آنکھیں کھول دیں۔ ساحل اور عارفین بھی نمبر گھما گھما کے لاک کھولنے کی کوشش کر رہے تھے۔

''یار! یہ ہمارے بس کا کام نہیں ہے۔ ہم اسی چکر میں لگے رہیں گے اور موت ہمیں ایک بار پھر اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔'' عارفین نے جیسے ہار مان لی۔

''نہیں یار! تھوڑی دیر اور کوشش کر لیتے ہیں....'' ساحل نے کہا۔

اسی دوران لاک کے گرد روشنی کے چھوٹے چھوٹے سے ستارے ٹمٹمانے لگے۔

ساحل کے ہاتھ جہاں تھے وہیں رُک گئے۔ لاک خود بخود گھومنے لگا اور لاک کے نمبر خود بخود ملنے لگے اور پھر ٹک کی آواز کے ساتھ لاک کھل گیا اور دیوار خود دائیں طرف کو تھوڑی سی سرک گئی۔

اتنا راستہ کھل گیا کہ ایک شخص بآسانی گزر سکتا تھا وہی روشنی کے ٹمٹماتے ستارے اسامہ کو اپنے جسم پر چپکتے محسوس ہوئے پھر خیام کی آواز اس کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''میں تمہارے جسم میں موجود نہیں ہوں مگر تمہارے آس پاس ہی رہوں گا تمہارا پانچواں ساتھی بن کر....''

آواز ختم ہونے کے ساتھ ہی وہ نور کے جگمگاتے ستارے بھی غائب ہوگئے۔

عمارہ کی خوشی سے بھرپور آواز اسامہ کی سماعت سے ٹکرائی۔ ''اسامہ ہمیں راستہ مل گیا ہے۔''

ساحل اور عارفین اسامہ کی طرف بڑھے کہ اسے سہارا دے کر اٹھائیں۔

''تم لوگ مجھے یہیں پڑا رہنے دو۔ میری وجہ سے اپنا وقت برباد مت کرو۔'' اسامہ نے مایوسی سے اپنا سر جھکاتے ہوئے کہا۔

عمارہ نے ساحل اور عارفین کو اسامہ سے پیچھے ہٹنے کا اشارہ کیا۔ ”تم دونوں اندر جاؤ میں اسامہ کو لاتی ہوں۔“

”تم اکیلی.....؟“ ساحل نے پوچھا۔

”تم دیکھ لینا اسامہ خود قدم رکھ کے اندر داخل ہوگا۔“

عمارہ کی بات سن کر اسامہ نے نفی کے انداز میں سر ہلایا۔ ”میں چل نہیں سکتا.....“

عمارہ اسامہ کے قریب آئی اور اس کا بازو اپنے گلے میں حائل کرتے ہوئے اسے اٹھانے کی کوشش کرنے لگی۔

”اسامہ کوشش کرو، اپنے پیروں پر وزن ڈالو.....“

اسامہ کراہتا ہوا کھڑے ہونے کی کوشش کرنے لگا مگر تکلیف کی وجہ سے پھر بیٹھ گیا۔

عمارہ نے انتہائی پیار سے اسامہ کی آنکھوں میں جھانکا۔ ”اسامہ پلیز.....“

اسامہ نے تکلیف برداشت کر کے ایک بار پھر کھڑے ہونے کی کوشش کی اور وہ عمارہ کا سہارا لیتا ہوا آہستہ آہستہ کھڑا ہو گیا۔

اس نے عمارہ کے خوبصورت چہرے کی طرف دیکھا تو اس کے دل کے محسوسات اس کی آنکھوں میں دکھنے لگے۔ الفاظ بے اختیار اس کی زبان سے نکلے۔

”اب تو یقین ہونے لگا ہے کہ زندگی ریت کی طرح ہمارے ہاتھوں سے سرک رہی ہے۔“

”کیوں.....“ عمارہ نے پوچھا۔

”کیونکہ آج سے پہلے جینے کی اتنی حسرت نہیں ہوئی۔“ اسامہ کی آواز میں درد اُمڈ آیا۔

عمارہ نے اسامہ کے چہرے کو چھوا۔ ”ہم یہاں سے زندہ سلامت لوٹیں گے بھی اور وفاؤں کے باغ سے خوشیوں کے جگنو بھی چنیں گے۔“

عمارہ کا اظہار وفا جیسے اسامہ کی طاقت بن گیا وہ عمارہ کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم رکھتا ہوا دیوار سے اندر داخل ہو گیا۔

اسامہ اور عمارہ اس پُراسرار جگہ میں داخل ہوئے تو ان کے ہوش اُڑ گئے۔ انہوں نے ساحل اور عارفین کی طرف دیکھا جو حیران ساکت وجامد کھڑے تھے۔

یہ پانچ قبروں کا چھوٹا سا قبرستان تھا کچی مٹی کی چار قبریں ایک ہی ترتیب میں تھیں اور ایک قبر ان سے تھوڑے فاصلے پر تھی۔

قبروں پر لکڑی کے کتبے لگے تھے جن پہ ان کے نام لکھے تھے، فواد، خیام، حوریہ اور وشاء اور ایک طرف قبر تھی اس کے کتبے پر زرغام کا نام کندہ تھا۔ یہ نام پڑھ کے ان کے دل ایسے ہو گئے جیسے کسی نے اپنی مٹھی میں بھینچ کے رکھ دیئے ہوں۔

عمارہ سے خود پر قابو نہیں ہوا وہ بے اختیار پھوٹ پھوٹ کے رونے لگی۔

اسامہ نے عمارہ کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ”خود کو سنبھالو عمارہ! یہ وقت جذباتی ہونے کا نہیں ہے، کچھ کرنے کا ہے.....“

عمارہ رندھی ہوئی آواز میں بولی۔ ”مجھے تو انسانیت کی تذلیل پر رونا آ رہا ہے۔ زرغام کو اتنا بھی رحم نہ آیا کہ ان کے والدین کو ان کی میتیں ہی دے دے۔ ان کی میتوں پر رو کر انہیں صبر آ جاتا۔“

”عمارہ! تم قدرت کا انصاف نہیں دیکھ رہی۔ ان کی قبروں کے ساتھ زرغام کی قبر بھی ہے۔ اس نے لوگوں سے جینے کا حق چھینا تو رب نے اس سے جینے کا حق چھین لیا۔“ اسامہ نے عمارہ کو سمجھایا۔ اور پھر دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا اسے سخت تکلیف ہو رہی تھی۔

عارفین نے زرغام کی قبر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ”میں تو اس بات پر حیران ہوں کہ ہم زرغام کی لاش اس کے گھر چھوڑ کر آئے تھے..... کس طرح اس کی لاش یہاں تک پہنچ گئی Amazing۔“

”ہمزاد کے لیے کچھ بھی ناممکن نہیں۔“ اسامہ نے کہا۔

ساحل دھیرے دھیرے وشاء کی قبر کے قریب بڑھ رہا تھا۔ وہ بالکل ٹوٹ چکا تھا۔ کسی نے جیسے اس کے جسم سے اس کی جان ہی نکال لی تھی۔ اس کے قدم بھاری ہو گئے تھے وہ بمشکل چل رہا تھا۔

وہ وشاء کی قبر کے قریب بیٹھ گیا۔ اس کی بھیگی ہوئی

دھندلی آنکھوں میں وشاء کا چہرہ جھلملانے لگا۔ ماضی کے دریچوں سے وشاء کے ساتھ گزارے ہوئے لمحے یاد آنے لگے۔ عمارہ ساحل کے قریب آئی، اس نے ساحل کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ ساحل نے بھیگی ہوئی آنکھوں سے عمارہ کی طرف دیکھا۔ ''میری وشاء تو یہاں سو رہی ہے...''

عمارہ ساحل کے پاس بیٹھ گئی۔ ''اس طرح رونے سے تمہاری وشاء واپس نہیں آسکتی۔ اگر تم اسے چاہتے ہو تو اسے اس کے بھیانک روپ سے آزاد کرنے میں ہماری مدد کرو... وقت ضائع کریں گے تو ہم ہمزاد کی گرفت میں آسکتے ہیں۔''

○...❖...○

''ہمارے پاس وقت بہت کم ہے۔''

''کیا ہم ایسا کرسکیں گے...'' ساحل نے پوچھا۔

''تم آؤ میرے ساتھ میں سمجھاتی ہوں۔'' عمارہ نے کہا اور پھر ساحل کو ساتھ لے کر اسامہ اور عارفین کے پاس آئی۔ اس نے اپنے بیگ سے وہ کتاب نکالی جو اسے تہہ خانے سے ملی تھی۔

اس نے کتاب کا وہ خاص صفحہ نکالا جس میں وہ عمل تھا پھر وہ اسامہ سے مخاطب ہوئی۔

''تم نے بتایا تھا کہ زرغام نے فواد، حوریہ، وشاء اور خیام کی میتوں پر خاص عمل کر کے ان کے ہمزاد تسخیر کیے تھے تو اس کتاب کے مطابق شیطان ہمزاد کو برباد کرنے کا عمل بھی ان لوگوں کی میتوں پر کیا جاتا ہے۔ ہمیں ان چاروں میتوں پر چراغ جلانے ہوں گے، دو میتوں کے قریب کھڑے ہو کے اسامہ یہ عمل پڑھے گا اور دو میتوں کے پاس کھڑی ہو کے میں عمل پڑھوں گی اور ساحل اور عارفین اردگرد کے ماحول پر نظر رکھیں گے۔''

پھر عمارہ نے اسامہ کو سارا عمل یاد کرایا یہ کچھ قرآنی آیات تھیں جو بھٹکی ہوئی روحوں کو ان کے اصل مقام تک پہنچانے کے لیے تھیں اور اس شیطان ہمزاد کے خاتمے کے لیے جسے عامل کالے جادو کے ذریعے تسخیر کرتے ہیں۔ بے شک کالے جادو کا توڑ قرآنی آیات سے ہی کیا جاتا ہے۔

اسامہ نے بہت جلد ہی سارا عمل یاد کرلیا لیکن وہ ذہنی طور پر مطمئن نہیں تھا کہ یہ عمل کامیاب بھی ہوگا یا نہیں اس نے تذبذب سی کیفیت میں عمارہ سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں یقین ہے کہ یہ عمل کامیاب ہوگا۔''

''ہاں... مجھے پورا یقین ہے خداوند کریم کے کلام میں بہت طاقت ہے تم اللہ پر بھروسا کر کے عمل پڑھنا شروع کرو۔'' عمارہ نے معنی خیز انداز میں کہا مگر اسامہ کی بے چینی یونہی قائم تھی اس نے ساحل اور عارفین کی طرف دیکھا اور پھر عمارہ سے مخاطب ہوا۔

''عمارہ! یہ بات تو میں جانتا ہوں کہ اگر وہ ہمزاد یہاں پہنچ گئے تو جو لوگ عمل پڑھنے میں مصروف ہوگئے انہیں وہ ہمزاد کچھ نہیں کہہ سکیں گے لیکن ساحل اور عارفین کو زندہ نہیں چھوڑیں گے یا پھر انہیں اس حد تک تنگ کریں گے کہ ہم عمل ادھورا چھوڑنے پر مجبور ہو جائیں۔''

اسامہ کی بات سن کر عمارہ بھی پریشان ہوگئی۔

''تمہاری یہ بات تو ٹھیک ہے مگر دو انسان اکٹھے ایک یا دو قبروں پر یہ عمل نہیں پڑھ سکتے ورنہ میں اور ساحل دو قبروں پر اور تم اور عارفین دوسری دو قبروں پر یہ عمل پڑھ لیتے۔ یہ عمل دو انسانوں کو ہی پڑھنا ہے چاہے میں اور تم پڑھ لیں چاہے ساحل اور عارفین پڑھ لیں۔''

عمارہ کی بات کا جواب اسامہ کے بجائے ساحل نے دیا۔ ''میں اور عارفین یہ عمل نہیں پڑھیں گے ہر اعتبار سے یہ عمل تم دونوں کو ہی پڑھنا چاہیے کیونکہ تم ایک عاملہ ہو اور اسامہ اس وقت فزیکلی فٹ نہیں ہے۔ ہم نے جب سر پر کفن باندھ ہی لیا ہے تو موت کا ڈر کیسا۔ اگر ہم میں سے کوئی بھی یہ عمل نہ کرے تو ہم سب کے لیے یہ بات خودکشی کرنے کے مترادف ہوگی۔ ہمیں یہ آخری کوشش ہر حال میں کرنی ہوگی۔''

عارفین نے بھی ساحل کی حمایت کی۔ ''میں بھی ساحل کے ساتھ ہوں آپ بسم اللہ پڑھ کر آیات پڑھنا شروع کریں ہم بھی کچھ آیات پڑھتے رہیں گے مارنے والے سے بچانے والے کی ذات زیادہ طاقتور ہے...''

ساحل اور عارفین کی باتیں سن کر عمارہ کی آنکھیں بھیگ گئیں مگر ان کے لیے یہ آخری کوشش بہت ضروری تھی۔ ان دونوں نے اپنی اپنی جگہ پر کھڑے ہو کے عمل پڑھنا شروع

کر دیا۔

اسامہ کی ٹانگوں میں تکلیف زیادہ تھی اس لیے وہ ایک شنک کی مدد سے کھڑا تھا۔

ساحل اور عارفین اکٹھے کھڑے تھے۔ تہہ خانے کا یہ حصہ کسی غار جیسا تھا۔ تہہ خانے کا دروازہ کھلا ہونے کی وجہ سے روشنی نے یہ حصہ بھی روشن کر دیا تھا ورنہ یہاں ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جس سے باہر کی روشنی اندر آسکے۔ اس حصے کی زمین بالکل کچی تھی، یہاں پانچ قبروں کے علاوہ اور کچھ نہیں تھا۔

پورا ماحول سراسیمگی میں ڈوبا ہوا تھا۔ ساحل اور عارفین کے دل و دماغ کو ایک عجیب سی دہشت نے اپنی لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان کے من میں عجیب عجیب اوہام کھنک رہے تھے۔ قبرستان کا خوفناک سناٹا جیسے اموات کی زد او سنا رہا تھا۔

ساحل اور عارفین کو ہر چیز خطرناک دکھائی دے رہی تھی، ان کی نظر قبروں پر پڑتی تو انہیں یوں لگتا جیسے قبریں ہل رہی ہیں مگر وہ اپنے ذہن کو جھٹک کر آیات پڑھنے لگتے۔ اسی طرح کھڑے کھڑے ساحل کو تہہ خانے کے دروازے کا خیال آیا۔

"تم ادھر ہی رکو میں ابھی آتا ہوں۔" ساحل نے عارفین سے کہا اور پھر تہہ خانے کی سیڑھیوں کی طرف بڑھا۔

وہ سیڑھی چڑھنے لگا تو اسے ایک دم خیال آیا کہ اس دروازے کو اکھاڑ پھینکے۔ یہ سوچ کر وہ سیڑھی چڑھنے کے بجائے تہہ خانے میں کچھ ڈھونڈنے لگا اسے کلہاڑی نظر آگئی اس نے جلدی سے وہ کلہاڑی اٹھائی اور سیڑھی چڑھتا ہوا تہہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھا۔

وہ تہہ خانے سے باہر ریسٹ ہاؤس کے صحن میں آگیا۔ اس نے کلہاڑی سے تہہ خانے کے دروازے کو اکھاڑ پھینکا اور واپس نیچے تہہ خانے میں آگیا۔

وہ عارفین کے پاس آیا تو عارفین نے پوچھا۔ "کہاں گئے تھے؟"

"میں نے تہہ خانے کے دروازے کی ٹینشن ہی ختم کردی ہے، دروازہ ہی توڑ دیا ہے۔" ساحل نے بتایا۔

"یہ تو تم نے اچھا کیا۔" عارفین نے کہا۔

عمارہ اور اسامہ نے کچھ آیات پڑھنے کے بعد چار دیے زمین پر رکھے اور ان سب دیوں میں زیتون کا تیل ڈالا اور ان سب دیوں کو چاروں قبروں کے اوپر رکھا۔

عمارہ نے ان چاروں قبروں کو روشن کیا اور پھر اسامہ سے مخاطب ہوئی۔

"اب ہم نے عمل نمبر 2 پڑھنا ہے۔ اس عمل میں آیات رکے بغیر مسلسل پڑھنی ہیں۔ درمیان میں نہ تو کسی سے بات کرنی ہے اور نہ ہی اس عمل کو درمیان میں چھوڑنا ہے ورنہ نہ صرف یہ عمل ناکام ہوگا بلکہ بے اثر بھی ہو جائے گا ہم اسے دوبارہ نہیں پڑھ سکتے۔"

اسامہ نے اثبات میں سر ہلایا اور دونوں نے عمل پڑھنا شروع کر دیا۔

دونوں کی نظر عمل کے دوران دیے پر مرکوز تھی۔

ساحل اور عارفین، اسامہ اور عمارہ پر بھی نظر رکھ رہے تھے اور ارد گرد کے ماحول پر بھی۔

اسامہ سکون کے ساتھ عمل پڑھنے میں مصروف تھا کہ اچانک دیا اس کی آنکھوں سے اوجھل ہو گیا اور قبر کی مٹی بھول اڑاتی خود بخود پیچھے ہٹنے لگی یہاں تک کہ قبر کا تختہ دکھائی دینے لگا۔ اسامہ کی آنکھیں باہر کو ابل پڑیں، پیشانی پر پسینہ چمکنے لگا۔

اسے عمارہ کی بات یاد تھی وہ عمل مسلسل پڑھتا رہا مگر اس کے پاؤں اپنی جگہ سے لرز رہے تھے، تھرتھراہٹ کی ایک لہر پورے وجود سے دوڑ گئی تھی۔

دیکھتے ہی دیکھتے وہ تختہ کسی دھماکے کی طرح پھٹا اور اس کے ٹکڑے ہوا میں بکھر گئے۔

یہ فواد کی قبر تھی۔ اتنا وقت گزرنے کے بعد جو مردے کی حالت ہوتی ہے وہ اسامہ کے سامنے تھی کیڑوں نے اس کا جسم کا گوشت نوچ نوچ کے کھا لیا تھا اور وہاں اس کا اب صرف ڈھانچہ تھا، جس کی کھوپڑی میں آنکھوں کے بڑے بڑے سوراخوں میں ابھی بھی کیڑوں نے اپنا مسکن بنایا ہوا تھا۔

اسامہ کو ابکائی بھی آرہی تھی اور دہشت سے پورے وجود پر کپکپی طاری ہوگئی تھی خاص طور پر ٹھوڑی کانپنے سے

اس کے دانت بجنے لگے تھے جس کی وجہ سے اسے عمل پڑھنے میں دشواری ہو رہی تھی۔

اس نے عمارہ کی طرف دیکھا جو انتہائی محو ہو کے عمل پڑھنے میں مصروف تھی، اس کے چہرے پر کسی طرح کے خوف کے تاثرات نہیں تھے۔

اس نے دوبارہ قبر کی طرف اپنی نظریں مرکوز کر دیں۔ وہ ایک فوجی تھا اس لیے خوف اس کے ارادوں کو کمزور نہ کر سکا اور وہ مسلسل عمل پڑھتا رہا یہاں تک کہ وہ قبر جس طرح کھلی تھی اسی طرح خود بخود بند بھی ہو گئی۔

اسامہ سمجھ گیا کہ وہ جو کچھ دیکھ رہا تھا وہ صرف اسے ہی دکھائی دے رہا تھا۔ شاید یہ سب کچھ ہمزاد ان کا عمل ناکام بنانے کے لیے کر رہے ہیں۔ اس عمل کے دوران وہ دونوں نہ تو بات کر سکتے تھے اور نہ ہی اپنی جگہ چھوڑ سکتے تھے لیکن اسامہ جان چکا تھا کہ ہمزاد ان تک پہنچ چکے ہیں۔

ساحل نے ایک نظر اسامہ اور عمارہ کی طرف دیکھا اور پھر عارفین سے مخاطب ہوا۔ ''دعا کرو کہ اسامہ اور عمارہ اس عمل میں کامیاب ہو جائیں۔''

''ہاں اگر وہ دونوں اس عمل میں کامیاب ہو گئے تو ان ہمزاد سے ہمیں ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھٹکارا مل جائے گا، بس وہ منتی کی گولیاں پوری طرح کھلی نہ ہوں کاش ہمیں تھوڑا سا وقت اور مل جائے۔'' عارفین نے ابھی یہ کہا ہی تھا کہ حوریہ کی دلفریب مسحور کن آواز ان دونوں کی سماعت سے ٹکرائی۔

وہ اپنی سحر انگیز آواز میں کوئی گیت گا رہی تھی اس کی آواز کے طلسم نے ان کے دلوں میں ہلچل سی مچادی۔

ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیت معدوم ہو گئی وہ دیوانوں کی طرح اس آواز کی سمت کی طرف چلنے لگے۔

اسامہ اور عمارہ کو یہ آواز نہیں سنائی دے رہی تھی۔ اسامہ اور عمارہ نے انہیں اس طرح بدحواس تہہ خانے کی دیوار کی طرف بھاگتے ہوئے دیکھا تو وہ دونوں پریشان ہو گئے مگر وہ نہ تو ان سے پوچھ سکتے تھے کہ کہاں جا رہے ہیں اور نہ ہی انہیں جانے سے روک سکتے تھے۔ انہوں نے انہیں اللہ کے سہارے چھوڑ دیا اور یہ سوچ کر اپنا دھیان عمل کی طرف مرکوز کر لیے گئے کہ اگر عمل کامیابی سے پورا ہو گیا تو ان دونوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچے گا مگر وہ دونوں نہیں جانتے تھے کہ ساحل اور عارفین تو موت کی صدا کی طرف ہی بھاگے ہیں۔

وہ دونوں اس خوبصورت آواز کے پیچھے بھاگتے بھاگتے ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل پڑے۔ آواز کی مقناطیسیت انہیں اپنی طرف کھینچتی ہوئی ایک خوبصورت باغ میں لے آئی۔

ایک گھنے درخت کے قریب حوریہ خوبصورت لباس میں ستار تھامے بیٹھی تھی۔ حسن و زیبائش سے وہ کسی پری جیسی دکھائی دے رہی تھی۔ وہ گھاس پر بیٹھی تھی، اس کا فیروزی جالی کا فراک دائرے کی شکل میں گھاس پر پھیلا ہوا تھا۔ وہ اپنی خم دار لمبی انگلیوں سے ستار کی تاروں کو چھیڑتی اور اپنی مسحور کن آواز کے جادوئی سحر ہوا میں بکھیر دیتی۔

پہلے وہ وقفہ کے ساتھ تھوڑا تھوڑا گا رہی تھی مگر اب وہ بغیر رکے مسلسل گا رہی تھی۔ اب عارفین اور ساحل کو اس کی آواز چبھنے لگی تھی اور دل کی دھڑکنیں بھی تیز ہوگئی تھیں مگر ان پر کچھ ایسا سحر طاری تھا کہ وہ وہاں سے جانے پر آمادہ نہ تھے۔

آہستہ آہستہ وہ آواز اتنی تیز ہوگئی کہ ساحل اور عارفین کی دماغ کی رگیں پھٹنے لگیں، کانوں کے پردے چرنے لگے۔ دل ڈوبنے لگا۔ وہ دونوں اپنے کانوں پر ہاتھ رکھ کے گھٹنوں کے بل بیٹھ کے چیخنے لگے۔ ''خدا کے لیے خاموش ہو جاؤ.....''

حوریہ اٹھ کے اپنے گانے کے ساتھ ساتھ جھومنے لگی۔

ساحل اور عارفین زمین پر گر کے مچھلی کی طرح تڑپنے لگے ہاتھ ان کے کانوں پر ہی تھے۔ ان کی دماغ کی رگیں باہر کی طرف ابھر گئی تھیں۔ وہ درد سے چلا رہے تھے۔

حوریہ گھومتے گھومتے اپنے خوبصورت روپ سے اپنے اصل روپ میں آ گئی۔ وہی مُردوں جیسی سفیدی مائل سرد جلد، مُردہ آنکھیں، پپڑی جمے سیاہ ہونٹ، کفن جیسے سفید چولے میں وہ بدمست جھونکے کی طرح ادھر اُدھر اڑ رہی تھی۔

وہ دشمن کے شکار کے مزے سے لطف اندوز ہو رہی تھی۔

روشنی کی ایک شعاع حوریہ کی طرف بڑھی اور پھر خیام کا روپ دھار گئی۔

خیام کے ہاتھ میں ایک بڑا سا آئینہ تھا جو تقریباً چار فٹ لمبا اور دو فٹ چوڑا تھا۔

خیام کو دیکھ کر حوریہ کے لبوں پہ تمسخرانہ مسکراہٹ بکھر گئی، اسے یقین تھا کہ خیام اس کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ اسے اب شکار کا زیادہ مزا آ رہا تھا کہ خیام کے سامنے اس کے دوستوں کے دماغ کی رگیں پھٹ جائیں گی اور ان کے کانوں اور ناک سے لہو بہے گا۔

وہ اپنے خاص انداز میں گاتی ہوئی ہوا میں ادھر اُدھر اُڑ رہی تھی۔

خیام بھی ہوا میں اُڑتا ہوا ایک پہاڑ کے قریب کسی خاص جگہ پہ کھڑا ہوگیا، وہ جانتا تھا کہ حوریہ اس کے پیچھے ضرور آئے گی۔ وہ اسی باغ میں ہی کھڑا تھا جہاں ساحل اور عارفین زمین پر گرے پڑے تڑپ رہے تھے۔

حوریہ بھی مسکراتی ہوئی خیام کے سامنے آ کھڑی ہوئی۔ سورج پوری آب و تاب کے ساتھ دمک رہا تھا۔ دھوپ بہت تیز تھی۔

جس جگہ خیام اور حوریہ کھڑے تھے سورج ان کے بالکل سامنے تھا۔

حوریہ کو اپنی شیطانی قوتوں پر بہت بھروسا تھا وہ ساحل اور عارفین کے ساتھ خیام کو بھی ختم کرنے کا ارادہ رکھتی تھی۔

خیام نے اپنے ہاتھوں میں اُٹھایا ہوا آئینہ حوریہ کے سامنے کیا تو حوریہ کا عکس اس آئینے پر روشنی کے ایک ذات کی صورت میں نمودار ہوا، خیام ایک روحانی جسم تھا اس لیے اس کے ہاتھ آئینے کو چھو نہیں رہے تھے، آئینہ اس کے ہاتھوں میں گویا معلق تھا مگر اس کی روحانی قوتوں کے باعث وہ آئینہ خیام کی گرفت میں ہی تھا۔

خیام نے اپنے ہاتھوں کو تھوڑا ترچھا کیا تو آئینہ اس طرح ترچھا ہوگیا کہ روشنی کے اس ذات سے سورج کی شعاعیں ٹکرائیں۔ آئینے سے تیز روشنی نکل کر حوریہ سے ٹکرائی حوریہ کا گیت چیخوں میں بدل گیا اور وہ اپنی جگہ سے غائب ہو گئی۔ آئینہ بھی کرچی کرچی ہوکے ہوا میں بکھر گیا۔

خیام نے ساحل اور عارفین کی طرف دیکھا وہ اب سکون میں آ چکے تھے مگر نڈھال لیٹے تھے پھر آہستہ آہستہ وہ ہمت کر کے اٹھ کے بیٹھ گئے۔ انہوں نے تشکر آمیز نگاہوں سے خیام کی طرف دیکھا۔ حوریہ تو غائب ہوگئی تھی مگر خیام کو خطرے کی سرسراہٹیں محسوس ہو رہی تھیں آس پاس درختوں کے جھنڈ تیزی سے ہلے تھے جیسے کوئی چیز تیزی سے ان میں سے گزری ہے۔

فضا میں عجیب طرح غرغراہٹوں کی آوازیں بھی گونجنے لگی تھیں، پھر اچانک خیام کو تین ہیولے دکھائی دیئے جو زرغام، فواد اور دوشاء کا روپ دھار گئے۔

وہ تینوں جیسے چلتے پھرتے مُردے تھے مگر ان کے جسم ہوائی تھے۔

وہ تینوں انتہائی طیش میں تھے، غصہ اور انتقام الاؤ بن کر ان کی آنکھوں میں سلگ رہا تھا۔

زرغام نے دہکتی آنکھوں سے خیام کی طرف دیکھا۔ ''تم حوریہ کو تھوڑی دیر کے لیے غائب تو کر سکتے ہو مگر اسے مار نہیں سکتے کیونکہ روح کی موت کبھی نہیں ہوتی..... مگر جن مادی وجود والے انسانوں کو تم بچانے کی کوشش کر رہے ہو..... وہ ہم سے نہیں بچ سکتے..... ہاں ایک صورت ہوسکتی ہے کہ تم خود کو ہمارے حوالے کر دو۔ میرے تابع ہو جاؤ۔ میں نہ صرف ان چاروں کی جان بخش دوں گا بلکہ انہیں ان کے گھروں تک پہنچا دوں گا۔''

خیام نے ہنستے ہوئے زرغام کی بات کا جواب دیا۔

''جن لوگوں کو تم بچانے کی بات کر رہے ہو وہ موت سے نہیں ڈرتے..... وہ تمہیں ختم کرنے کے لیے سر پر کفن باندھ کر آئے ہیں..... تمہاری بات ٹھیک ہے کہ روح کی موت نہیں ہوسکتی مگر شیطان ہمزاد کو تباہ کیا جا سکتا ہے جو دنیا میں بھی انسان کو بہکاتا ہے اور مرنے کے بعد اگر تمہارے جیسے خناس کے قابو میں آ جائے تو بھی تباہی کا باعث بنتا ہے..... پروردگار اگر چاہے تو ایک ساعت میں ہی شیطان کو ختم کر سکتا ہے مگر وہ شیطان کو ہمارے ایمان پرکھنے کے لیے زندہ رکھتا ہے۔''

’’انہیں کوئی ختم نہیں کر سکتا.....‘‘ فواد نے قہقہہ لگایا۔ ’’اسامہ اور عمارہ قرآن پاک کی جو آیات پڑھ رہے ہیں..... تم سب اس سے برباد ہونے والے ہو کیونکہ ان کا عمل پورا ہونے والا ہے اور اس عمل کے دوران تم انہیں ختم نہیں کر سکتے۔‘‘

خیام کی اس بات پر زرغام پھر ہنسا۔ ’’ہم انہیں ختم نہیں کر سکتے مگر انہیں ڈرا کر اس عمل سے روک سکتے ہیں۔ ان کا حال دیکھو ان کے پورے جسم پر سانپ رینگ رہے ہیں۔‘‘

اس حال میں ان کی موت یقینی ہے۔ دہشت کے مارے ان کا عمل ٹوٹ جائے گا۔ جونہی ان کا عمل ٹوٹا یہ سانپ انہیں ڈس لیں گے۔‘‘

ساحل اور عارفین یہ سنتے ہی ریسٹ ہاؤس کی طرف بھاگے..... وہ اپنے نڈھال جسم کو گھسیٹتے ہوئے لمبے لمبے قدم رکھ رہے تھے۔

وہ تہہ خانے میں داخل ہوئے تو ان کی چیخیں نکل گئیں عمارہ اور اسامہ کے جسموں پر سینکڑوں سانپ اس طرح رینگ رہے تھے کہ ان کے جسموں کے حصے دکھائی نہیں دے رہے تھے۔

ساحل اور عارفین دیوانہ وار ان کی طرف لپکے کہ سانپوں کو ان کے جسموں سے نوچ نوچ کر پھینک دیں چاہے تو ان کی جان ہی چلی جائے ابھی وہ عمارہ اور اسامہ کے قریب بھی نہ گئے تھے کہ خیام کی آواز ان کی سماعت سے ٹکرائی۔

’’ان سانپوں کو چھونا مت ورنہ اسامہ اور عمارہ کا عمل ٹوٹ جائے گا اور یہ سانپ انہیں ڈس لیں گے۔ اسامہ اور عمارہ کا زندہ ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ وہ ابھی تک کامیابی سے عمل پڑھ رہے ہیں۔‘‘

وہ دونوں جہاں کھڑے تھے وہاں رُک گئے انہوں نے خیام کی طرف دیکھا جو ان کے سامنے کھڑا تھا۔

مگر چند سیکنڈ میں ہی ساحل اور عارفین اپنی جگہ سے غائب ہو گئے۔

ایک پل ضائع کیے بغیر خیام بھی غائب ہو گیا۔

ساحل اور عارفین باہر اسی جگہ پہنچ گئے جہاں زرغام، حوریہ، دشاء اور فواد کھڑے تھے خیام بھی وہاں ظاہر ہو گیا۔

زرغام نے غصے سے بھری نگاہوں سے خیام کی طرف دیکھا۔ ’’تم میری طاقت کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔‘‘

یہ کہہ کر زرغام نے ساحل اور عارفین کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا اور پھر اپنے ہاتھ کو آسمان کی طرف جھٹکا۔

عارفین اور ساحل روئی کے پھلوں کی طرح ہوا میں معلق ہو گئے پھر زرغام نے مشرق کی طرف اپنے ہاتھ کو دھکیلا۔

خیام ان کی مدد کرنے کے لیے آسمان کی طرف اُڑا تو دشاء نے تیزی سے کچھ پڑھا جس سے ہوا میں خیام کے سامنے دو فٹ چوڑا اور تین فٹ لمبا آئینہ آ گیا۔ دشاء نے اس کے ساتھ وہی طریقہ استعمال کیا جو اس نے حوریہ کے ساتھ کیا تھا۔

خیام کا عکس ایک ذات کی شکل میں آئینے پر اُبھرا۔ دشاء نے اپنے ہاتھوں کی حرکت سے آئینے کو اس طرح ترچھا کیا کہ سورج کی شعاع اس ذات سے ملی جس کے ساتھ خیام کی چیخیں فضا میں گونجیں اور پھر وہ غائب ہو گیا اس عمل سے وہ کچھ دیر کے لیے خود کو ظاہر کرنے کی صلاحیت سے محروم ہو گیا۔

ساحل اور عارفین مشرق کی سمت اس طرح اُڑ رہے تھے جیسے کوئی ہوائی طاقت انہیں اُڑا رہی ہو۔ وہ دونوں اس آبشار کے قریب تھے جو نیچے چھوٹے چھوٹے چشمے بناتی ہوئی نہر میں گر رہی تھی۔

زرغام نے اپنے ہاتھ کو زور سے جھٹکا تو وہ دونوں برفیلے پانی کی اس نہر میں جا گرے۔ انہیں تیراکی بھی نہیں آتی تھی۔

برفیلے پانی نے ان کی رگوں میں بہتا لہو جیسے منجمد کر دیا۔

وہ چیختے چلاتے بار بار اوپر آتے۔ ’’بچاؤ..... بچاؤ.....‘‘ مگر ان کی مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔

اب وہ اپنی موت کھلی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے ان کی جلد سرد اور سفید ہو گئی تھی۔ رفتہ رفتہ ان کی چیخیں بھی دبنے لگی تھیں۔ وہ بے چینی سے ہاتھ پاؤں چلاتے ہوئے اردگرد دیکھ رہے تھے کہ شاید خیام انہیں بچانے کے لیے آئے مگر

زندگی کی ڈور کے ساتھ ساتھ اُمید بھی چھوٹتی جارہی تھی۔

عارفین کی سانسیں ڈوب رہی تھیں ساحل کی اپنی حالت ٹھیک نہیں تھی پھر بھی وہ عارفین کو سنبھالنے کی کوشش کررہا تھا۔

ان کے دانت بج رہے تھے جسم پر کپکپی طاری تھی ساحل بمشکل چلایا۔ ''اسامہ... عمارہ۔'' مگر بے سود کیونکہ ان کی آواز تہہ خانے تک نہیں پہنچ سکتی تھی۔

اسامہ اور عمارہ کا عمل مکمل ہوگیا جس کے ساتھ ہی ان کے جسموں پر لپٹے سانپ بھی غائب ہوگئے۔

چاروں قبروں پر جلتے ہوئے چراغ بجھ گئے۔ اسامہ اور عمارہ نے خوشی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ عمارہ خوشی سے چلائی۔ ''اسامہ! ہمارا عمل کامیاب ہوگیا ہے شیطان ہمزاد ختم ہوگئے ہیں بغیر ہوا کے چراغوں کا بجھنا اسی بات کی علامت ہے۔''

عارفین کے ساتھ ساتھ اب ساحل کی بھی سانسیں ڈوبنے لگی تھیں... اب وہ خود کو ڈوبنے سے بچا نہیں سکتے تھے۔ ان کے بازو اور ٹانگیں برفیلے پانی سے بے جان ہو رہی تھیں۔

اچانک درخت کا موٹا سا تنا ساحل کو خود کے قریب گرتا ہوا محسوس ہوا۔ زندگی کی اُمید نے ان کے بے جان جسموں میں جان بھردی۔ ساحل نے ہاتھ بڑھا کر اس تنے کو پکڑلیا دونوں اس تنے کی مدد سے جھیل سے باہر آگئے۔

ان کی حالت بہت خراب تھی وہ بے سدھ زمین پر گر گئے اور کانپنے لگے۔

''تنے کا اس طرح ہم پر جھک جانا بالکل جادوئی عمل تھا مگر یہ کس نے کیا۔'' ابھی یہ ساحل سوچ ہی رہا تھا کہ اسے اسی درخت کے قریب ایک روشنی سی دکھائی دی جو رفتہ رفتہ اس کے قریب آنے لگی اور پھر وشا کا روپ دھار گئی۔

پہلے تو ساحل اور عارفین خوفزدہ ہوگئے کیونکہ ان کے جسموں میں اتنی سکت نہیں تھی کہ وہ اپنا دفاع کرسکیں۔

مگر اس بار وشا کا روپ بہت مختلف تھا۔ وہ سفید لباس میں تھی، اس کا سفید دوپٹہ ہوا میں لہرا رہا تھا اس کے چہرے پر وہی معصومیت وہی خوبصورتی تھی جو زندگی سے بھرپور وشا میں تھی۔

ساحل کا دل اسی طرح دھڑکا جیسے اس کی اپنی وشا۔ اس کے سامنے ہو مگر اس نے اپنے سر کو جھٹکا کہ وہ ایک بار پھر ہمزاد کے دھوکے میں نہ آجائے۔

وشا کا ہوائی نورانی جسم اس کے بالکل قریب آ گیا وہ اس کے پاس بیٹھ گئی اس کی آنکھیں احساسِ وفا سے جھلملا رہی تھیں۔ لبوں پہ مسکراہٹ بکھری ہوئی تھی۔

ساحل اس سے پیچھے نہیں ہٹ رہا تھا، نہ جانے دل کیوں کہہ رہا تھا کہ اگر یہ فریب ہے تو اس فریب میں مبتلا ہو جاؤں....

وشا نے دھیرے سے کہا۔ ''تمہیں نئی زندگی مبارک ہو.... تم سب نے مل کر موت کو شکست دے دی ہے۔''

ساحل کے دل نے کہا کہ زندگی کی نوید سنانے والی وشا ہی ہوسکتی ہے۔ اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ''وشا... تم میری وشا ہو....''

وشا مسکرائی مگر اس کی آنکھوں میں ساحل کے لیے گلہ تھا۔ ''بس تم سے ایک بات کہنے آئی ہوں۔ اگر کوئی آپ کی زندگی میں سچی محبت لے کر آئے تو اسے کبھی نہ ٹھکراؤ محبت پر پیسہ اور آسائشوں کو ترجیح مت دو... اگر آپ کسی کو محبت کے بدلے میں محبت دیں گے تو رب خود ہی آپ کو نعمتوں سے سرشار کردے گا کوئی اپنے رب سے امید تو باندھ کے دیکھے وہ کسی کو مایوس نہیں کرتا۔''

یہ کہہ کر وشا کھڑی ہوگئی اور ہوا میں معلق ہو کے ساحل سے پیچھے ہٹنے لگی۔

''وشا رُکو.... میری بات تو سنو....'' ساحل ہوا میں ہاتھ اٹھائے اسے پکارتا رہا۔

وشا پیچھے ہٹتی ہوئی ایک بار پھر روشنی میں تبدیل ہوگئی اور پھر تھوڑی ہی دیر کے بعد ساحل اور عارفین کو پانچ روشنی کی شعاعیں آسمان کی طرف بڑھتی ہوئی دکھائی دیں۔

اسامہ اور عمارہ ساحل اور عارفین کو ڈھونڈتے ڈھونڈتے ان تک آپہنچے۔

''اوہ میرے خدایا.... ان کی تو حالت بہت خراب ہے۔'' عمارہ نے ساحل اور عارفین کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا

جن کے جسموں پر کپکپی طاری تھی۔ گیلے کپڑوں کے باعث ان کا جسم مزید ٹھنڈا پڑ رہا تھا۔ ہونٹ نیلے ہوگئے تھے۔

''انہیں کسی طرح ریسٹ ہاؤس تک لے جانا ہوگا ورنہ ان کی جان کو خطرہ ہوسکتا ہے۔''

عمارہ نے اسامہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جو خود بمشکل چل کر یہاں تک آیا تھا۔ اس کی کمر اور ٹانگ میں تکلیف تھی۔

''تم اکیلی انہیں کس طرح لے کر جاؤ گی..... میں ادھر ہی آگ جلا دیتا ہوں۔'' اسامہ نے کہا۔

''ع..... ع..... عمارہ بس تھوڑا سا سہارا دے دے ہم خود چل کر جاسکتے ہیں۔'' اس نے سہارا دے کر ساحل کو کھڑا کیا اور پھر ساحل عمارہ کا سہارا لیتے ہوئے آہستہ آہستہ چل کر ریسٹ ہاؤس تک چلا گیا۔ اسے ریسٹ ہاؤس کے کمرے میں بٹھا کے عمارہ نے ایک گرم کمبل اسے اوڑھا دیا اور پھر عارفین کو لانے کے لیے دوبارہ دوڑتی ہوئی ریسٹ ہاؤس سے باہر بھاگ گئی۔

اسامہ عارفین کے پاس بیٹھا اس کے ہاتھ مل رہا تھا۔ تھوڑی ہی دیر میں عمارہ وہاں پہنچ گئی..... وہ بہت تیز بھاگ کر آئی تھی..... اس کی سانس پھولی ہوئی تھی۔ اس نے عارفین کو سہارا دے کر کھڑا کیا اور پھر عارفین بھی ساحل کی طرح عمارہ کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ ریسٹ ہاؤس تک پہنچ گیا۔ اسامہ بھی لنگڑا کر چلتا ہوا ان کے ساتھ ساتھ ریسٹ ہاؤس تک آگیا۔

عمارہ نے ان دونوں کو ہال نما بڑے کمرے میں آتش دان کے قریب بٹھایا۔

اسامہ نے جلدی سے آتش دان میں آگ لگا دی۔

ریسٹ ہاؤس اب اپنی پرانی حالت میں تھا..... کھنڈر نما دھول ومٹی سے اٹا ہوا۔

آگ ٹھیک طرح سے لگ گئی تو اسامہ نے عمارہ سے کہا۔ ''جلدی سے ان کے گرم کپڑے نکالو۔''

عمارہ نے بیگ سے ان دونوں کے گرم کپڑے اور جرسیاں نکالیں۔ اس نے دو پینٹ شرٹس اور دو جرسیاں اسامہ کو دیں اور خود کمرے سے باہر صحن میں چلی گئی۔

اسامہ نے ساحل اور عارفین کو کپڑے دیئے۔ ''ادھر آگ کے قریب اپنے کپڑے بدل لو۔''

ان دونوں نے اپنے کپڑے بدل لیے۔ اسامہ نے ان کے گیلے کپڑے کرسیوں پر پھیلا دیئے۔ کپڑے تبدیل کرنے کے بعد ان دونوں کو کافی سکون ملا تھا۔ وہ ٹھٹھرتے ہوئے آگ کے قریب بیٹھ گئے۔

''عمارہ.....'' اسامہ نے عمارہ کو آواز دی۔ عمارہ اندر آئی تو اسامہ نے اس سے تولیہ مانگا۔

عمارہ نے اسامہ کو تولیہ پکڑایا۔ اسامہ نے تولیہ لیا اور ساحل اور عارفین کے بال خشک کرنے لگا۔ عمارہ بھی ان دونوں کے قریب بیٹھ گئی۔ ''اب کچھ بہتر محسوس کررہے ہو.....''

عمارہ نے ساحل اور عارفین سے پوچھا..... دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

''حیرت کی بات ہے تم دونوں جھیل سے باہر نکلے کیسے۔ تمہیں تو تیراکی نہیں آتی۔''

عمارہ نے ساحل سے پوچھا تو ساحل کی جگہ اسامہ بولا۔ ''یہ سوال جواب کا وقت نہیں ہے۔ اس وقت ان سے کچھ مت پوچھو۔ کسی طرح سے ان دونوں کے لیے چائے بن جائے تو ان دونوں کو کافی سکون ملے گا۔''

''میرے پاس چائے کا تو سارا سامان ہے مگر پکاؤں گی کیسے؟'' عمارہ نے کہا۔

''ساس پین تو ہے نا؟'' اسامہ نے پوچھا۔

''ہاں.....'' عمارہ نے جواب دیا۔

''تم ایسا کرو کہ صحن میں کچھ اینٹیں رکھو۔ میں یہاں سے لکڑیاں لے آتا ہوں۔'' اسامہ کی بات سنتے ہی عمارہ صحن میں چلی گئی اس نے اینٹوں کا چولہا بنایا اور ساس پین میں دودھ اور پانی ملا کر ایک طرف رکھ دیا۔

اتنی دیر میں اسامہ لکڑیاں لے آیا۔ اس نے تین سوکھی لکڑیوں کے ساتھ ایک جلتی ہوئی لکڑی رکھی..... تھوڑی ہی دیر میں سوکھی لکڑیوں میں آگ بھڑک گئی۔

عمارہ نے ساس پین چولہے پر رکھا جونہی دودھ گرم ہوا اس نے چینی اور پتی ایک ساتھ دودھ میں ڈال دی۔

اسامہ اینٹوں کے چولہے کے قریب بیٹھا عمارہ کی طرف مسلسل دیکھ رہا تھا۔ اب عمارہ بھی چولہے کے پاس

اطمینان سے بیٹھی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اسامہ کی طرف دیکھا۔

''تم کیا چائے بنانا سیکھ رہے ہو۔''

''جی نہیں.... آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ میں بہت اچھا کک ہوں۔'' اسامہ نے جواب دیا۔

''بہت خوب پھر تو جس لڑکی سے تمہاری شادی ہو گی... اس کے مزے ہوں گے۔'' عمارہ نے کہا۔

اسامہ نے جواب میں کچھ نہیں کہا بس خاموشی سے عمارہ کی طرف دیکھنے لگا۔

''اب کس سوچ میں پڑ گئے ہو....'' عمارہ نے اس کی خاموشی توڑنا چاہی۔

''تو یہ ہے تم لڑکیوں کی.... نہ تو کسی کو بولنے دیتی ہو اور نہ ہی خاموش رہنے دیتی ہو۔''

اسامہ کی اس بات پر عمارہ نے موڈ خراب کرتے ہوئے دوسری طرف منہ کرلیا۔

اسامہ نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''میری زندگی کی ساتھی ہوگی....؟''

عمارہ کے لبوں پہ مسکراہٹ بکھر گئی۔ اس نے ایک نظر اسامہ کی طرف دیکھا اور پھر پلکیں جھکا دیں۔

''میری خوشیوں اور میری زندگی پر میری والدہ کا حق ہے۔ ان سے مجھے مانگ لو۔''

''ان سے تو تمہارا ہاتھ مانگ لوں گا مگر ایک بار تم سے تمہاری خوشی جاننا چاہتا ہوں۔'' آرمی کا بہادر میجر آج محبت کے ہاتھوں جیسے ٹوٹ گیا تھا۔ عمارہ نے محبت سے سرشار نگاہوں سے اسامہ کی آنکھوں میں جھانکا اور پھر دھیرے سے اثبات میں سر ہلا دیا۔

اگلے ہی لمحے چائے ابلی تو دونوں بڑبڑا اُٹھے۔ عمارہ نے اپنے دوپٹے سے چائے اُتار دی۔

''کوئی اور کپڑا لے لیتی.... دوپٹے کو آگ لگ سکتی تھی۔''

عمارہ جلدی سے چار کپ اور چائے چھلنی لے آئی۔ وہ پیالوں میں چائے ڈالنے لگی تو اسامہ نے اس کی طرف دیکھ کر لمبی آہ بھری۔ ''آج تو لگتا ہے کہ پروردگار نے میری زندگی سے سارے غم دور کرکے میری جھولی خوشیوں سے بھر دی ہے۔''

عمارہ نے ترچھی نظر سے اس کی طرف دیکھا۔

''اب زیادہ باتیں کی تو یہ چائے میں نے تمہارے اوپر انڈیل دینی ہے۔''

''ن.... نہیں.... نہیں یہ ظلم نہ کرنا....'' اسامہ وہاں سے اُٹھ گیا۔

عمارہ ٹرے میں چار کپ رکھ کے ساحل اور عارفین کے پاس چلی گئی۔

اسامہ بھی اس کے پیچھے پیچھے ساحل اور عارفین کے پاس آگیا۔

اسامہ نے ان دونوں کو چائے دی اور خود بھی ان کے قریب بیٹھ گیا۔ عمارہ بھی اپنا کپ لے کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

''ساحل! تم اور عارفین بہت بہادر ہو۔ تمہاری ہمت کی وجہ سے ہم اپنا عمل مکمل کر پائے۔ ہم نے ان شیطان ہمزاد کا خاتمہ کر دیا ہے اب ہم اپنے گھر والوں کو یہ خوشخبری سنائیں گے۔'' عمارہ نے کہا۔

مگر ساحل کی آنکھیں آنسوؤں سے جھلملا رہی تھیں۔ ''ان لوگوں کو یہ بھی بتا دینا کہ ہم خیام، فواد.... دشا، اور حوریہ کی قبریں بھی دیکھ کر آئے ہیں۔''

اسامہ نے ساحل کو اپنے بازوؤں میں لے لیا۔ ساحل اس کے کندھے سے سر لگا کے رونے لگا۔ ساحل کو اس طرح دیکھ کر سب اُداس ہو گئے۔

''اگر ان دونوں کی حالت ٹھیک ہوتی تو ہم ابھی سفر پر روانہ ہو جاتے مگر ان دونوں کی حالت ابھی ٹھیک نہیں ہے۔'' عمارہ نے کہا۔

''یہ دونوں پہلے سے بہتر ہیں اور ویسے بھی گاڑی میں سردی نہیں لگتی۔ ایک دو گھنٹے پہلے آرام کرتے ہیں پھر گھر کے لیے روانہ ہوں گے۔ تم تیاری مکمل کر لو۔'' اسامہ نے کہا۔

''تھوڑی بہت چیزیں پیک کرنی ہیں اس میں اتنا وقت نہیں لگے گا مجھے تو تم تینوں کی فکر ہے.... تم تینوں فٹ نہیں ہو۔'' عمارہ نے بڑی سی شال اوڑھتے ہوئے کہا۔

"ہم ٹھیک ہیں..... تم ہماری فکر نہ کرو۔" اسامہ نے عمارہ کو ایک بار پھر تسلی دی۔

اسامہ نے آتش دان کے سامنے ایک گدا بچھا دیا اور ایک کمبل کو موڑ کر اس کا تکیہ سا بنا دیا اور پھر ساحل سے کہا۔ "تم اور عارفین لیٹ جاؤ۔"

"ہم ٹھیک بیٹھے ہیں۔" ساحل نے جواب دیا۔

"ہم نے سفر کرنا ہے بہتر ہے کہ تم دونوں آرام کر لو۔" اسامہ نے پھر زور دیا۔

ساحل اور عارفین گدے پر لیٹ گئے۔ اسامہ نے ان پر کمبل ڈال دیا اور پھر وہ عمارہ کے قریب آیا۔ "تم میرے ساتھ آؤ..... ایک ضروری کام کرنا ہے۔"

"اب ایسا کون سا کام ہے.....؟" عمارہ نے حیرت سے پوچھا۔

"باہر صحن میں آؤ..... میں سمجھاتا ہوں۔" اسامہ نے کہا۔

عمارہ اٹھ کے اس کے ساتھ باہر صحن میں چلی گئی۔

"اب بتاؤ کون سا کام ہے....." عمارہ نے پوچھا۔

"ہم نے شیطانوں کو تو ختم کر دیا ہے..... میں چاہتا ہوں کہ اس غلاظت کو بھی جلا ڈالیں جنہیں زرغام کالے جادو میں استعمال کرتا تھا۔"

اسامہ نے تہہ خانے کے دروازے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

"ہاں..... تم ٹھیک کہہ رہے ہو..... ہمیں وہ سب ناپاک چیزیں جلا دینی چاہئیں تاکہ کوئی اور اس شیطانی علم کی طرف مائل نہ ہو۔" یہ کہہ کر عمارہ تہہ خانے کے دروازے کی طرف بڑھی جو ٹوٹ کر ایک طرف گرا ہوا تھا۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گئی۔

اسامہ بھی آہستہ آہستہ سیڑھیوں سے نیچے اتر گیا۔

اس نے اور عمارہ نے ساری غلاظت اکٹھی کر کے ایک بوری میں ڈالی۔ عمارہ نے کالے جادو کی کتابیں بھی اس بوری میں ڈال دیں۔ اسامہ خود مشکل سے چل رہا تھا اس لیے عمارہ اس بوری کو اٹھا کر سیڑھیاں چڑھنے لگی۔

اسامہ ابھی تہہ خانے میں ہی تھا تو عمارہ صحن میں بوری رکھ کے واپس بھی آ گئی۔

اسامہ اور عمارہ نے وشاء، حوریہ، فواد اور خیام کی قبروں کے قریب کھڑے ہو کر سورۃ فاتحہ پڑھی اور ان کے لیے دعائے مغفرت کی اور پھر واپس اوپر صحن میں آ گئے۔

اسامہ نے غلاظت سے بھری اس بوری کو آگ لگا دی۔

عمارہ پیکنگ کرنے لگی۔ جب روانگی کی ساری تیاری مکمل ہو گئی تو اسامہ نے ساحل اور عارفین کو جگایا۔

وہ دونوں بھی تیار ہو گئے۔ جب سامان اٹھا کر سب ریسٹ ہاؤس سے باہر جانے لگے تو ساحل نے عمارہ سے کہا۔

"ایک بار وشاء کی قبر دیکھ لوں۔"

عمارہ نے اثبات میں سر ہلایا اور پھر اسامہ سے کہا۔

"تم دونوں ادھر ہی ٹھہرو..... ہم ابھی آتے ہیں۔"

ساحل اور عارفین اب خود سے چل سکتے تھے۔ اب انہیں سہارے کی ضرورت نہیں تھی۔

ساحل اور عمارہ تہہ خانے کی سیڑھیاں اتر کر اس چھوٹے سے قبرستان میں گئے۔

ساحل وشاء کی قبر کے پاس بیٹھ گیا..... وہ ایک بار پھر جذبات کی رو میں بہنے لگا..... اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ وہ گلوگیر آواز میں بولا۔ "مجھے معاف کر دو وشاء۔"

عمارہ نے اس کے شانے پہ ہاتھ رکھا۔ "وشاء کے لیے سورہ فاتحہ پڑھو اور اس کی مغفرت کی دعا مانگو..... اس طرح آنسو بہانے سے روحوں کو اذیت ہوتی ہے۔"

ساحل نے سورۃ فاتحہ پڑھی اور وشاء کے ساتھ ساتھ حوریہ، فواد اور خیام کے لیے بھی دعا مانگی۔ وہ دونوں اوپر ریسٹ ہاؤس کے صحن میں آئے اور پھر سارے اس ریسٹ ہاؤس سے باہر نکل گئے۔

گاڑی تک پہنچنے کا مسئلہ بھی ان کے لیے کافی کٹھن تھا۔ انہیں پہاڑوں کے دشوار گزار غاروں سے گزر کر گاڑی تک پہنچنا تھا۔

انہوں نے ہمت کی اور اس دشوار گزار راستے سے گزر کر گاڑی تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے۔

اسامہ تو وہیں زمین پر سربسجود ہو گیا اور اپنے رب کا

شکر ادا کیا کہ وہ اپنے مشن میں کامیاب ہوئے اور اب صحیح سلامت گھر واپس لوٹ رہے ہیں۔

ساحل ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا اور عمارہ اس کے ساتھ اگلی نشست پر بیٹھ گئی، اسامہ اور عارفین پیچھے بیٹھ گئے۔

وہ شام کے پانچ بجے وہاں سے روانہ ہوئے۔ تقریباً آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد ہی ان کے موبائلز کی سروس بحال ہو گئی۔

اسامہ، ساحل اور عارفین نے اپنے اپنے گھر والوں کو فون کیا اور انہیں اپنی کامیابی اور خیریت کی اطلاع دی۔

گھر والوں سے بات کر کے انہیں ایک عجیب سا سکون ملا۔ انہیں محسوس ہوا کہ جذبات سے بھرپور زندگی ہاتھوں میں خوشیوں کے گلاب اُٹھائے ان کی منتظر ہے۔

ان کی گاڑی پہاڑوں پر بل کھاتے سانپ جیسی سڑک پر لبانی کی طرف دوڑ رہی تھی۔ بادل جیسے بار بار گاڑی کے آگے آ کر چھیڑ خانی کر جاتے تھے۔

عمارہ نے اپنی والدہ رابعہ کا نمبر ملایا تو بیل جانے لگی۔ عمارہ کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی کہ وہ کب اپنی ماں کی آواز سنتی ہے۔ رابعہ واش روم میں تھی اس لیے اس نے فون اٹینڈ نہیں کیا۔

عمارہ نے دوبارہ کوشش کی مگر ماں سے بات نہ ہو سکی پھر اس نے ظفر کا نمبر ملایا۔

''ہیلو عمارہ.... کہاں ہو تم لوگ.... خیریت سے تو ہو۔ ہم تو تم سب کے موبائلز پر فون کرتے رہے مگر رابطہ ہی نہیں ہوا اور نہ تم میں سے کسی نے فون کیا۔''

''انکل ہم سب خیریت سے ہیں۔ ہمارے موبائلز پر سگنل ہی نہیں تھے۔ ہم تو ایک دوسرے سے بھی رابطہ نہیں کر سکتے تھے۔ امی تو ٹھیک ہیں نا۔''

''ہاں.... ٹھیک ہیں۔ مگر تمہاری وجہ سے بہت پریشان ہیں۔'' ظفر نے کہا۔

''میں جو خوشی کی خبر سنانے والی ہوں۔ اس سے آپ سب کی پریشانیاں دور ہو جائیں گی۔'' عمارہ نے خوشی بھرے لہجے میں کہا۔

''تو پھر سناؤ عمارہ....'' ظفر نے بے چینی سے کہا۔

''ہم اپنے مشن میں کامیاب ہو گئے ہیں اور اب صحیح سلامت گھر لوٹ رہے ہیں۔'' عمارہ اتنی خوش تھی کہ اس کی آواز فون سے باہر آ رہی تھی۔

تھوڑی دیر کے لیے ظفر کی طرف سے خاموشی چھا گئی۔

خوشی کے احساس سے اس کی آنکھیں اشک بار ہو گئیں۔ وہ گلوگیر لہجے میں بولا۔ ''اپنوں کی جدائی کے غم نے تو مجھے مار ہی ڈالا تھا.... یہ خبر سن کر میں پھر سے جی اُٹھا ہوں۔''

''انکل آپ خیام، فواد اور حوریہ کے گھر والوں کو بھی بتا دیں۔'' عمارہ نے کہا۔

''عمارہ میں سب کو بتا دوں گا۔ تم سب نے میرے گھر آنا ہے۔ میں خیام، فواد اور حوریہ کے گھر والوں کو اور ساحل اور عارفین کے گھر والوں کو اپنے گھر ہی بلا لوں گا۔ اسامہ کی والدہ تو اپنے بڑے بیٹے کے ساتھ گجرات رہتی ہیں۔ ان کے لیے آنا مشکل ہوگا۔ اس لیے انہیں نہیں کہوں گا۔ تم لوگ آجاؤ تو ہم خود کسی دن شکریہ ادا کرنے ان کے گھر جائیں گے.... ہماری اس کامیابی کا کریڈٹ تو اسامہ کو ہی جاتا ہے۔ تم سب خیریت سے پہنچ جاؤ تو ہم سب کی دعائیں تمہارے ساتھ ہیں۔'' ظفر نے کہا۔

''اس میں کوئی شک نہیں کہ اسامہ ہمارا ہیرو ہے لیکن مزے کی بات بتاؤں کہ یہ دونوں اناڑی فوجی ساحل اور عارفین بھی اس جنگل میں بہت بہادری سے لڑے ہیں۔'' یہ کہہ کر عمارہ ہنسنے لگی۔

''اللہ تم لوگوں کو اپنے امان میں رکھے.... میں پہلے رابعہ کو یہ خبر سناتا ہوں۔'' یہ کہہ کر ظفر نے فون بند کر دیا۔

عمارہ، اسامہ، ساحل اور عارفین، ظفر کے گھر پہنچے تو سب نے مل کر ان کا استقبال کیا۔

اسی مہینے کی چوبیس تاریخ کو عارفین اور روبینا کی شادی طے کر دی گئی۔

عارفین اور روبینا کی شادی کی تقریب میں اسامہ اور عمارہ بھی ایک دوسرے کو منگنی کی انگوٹھی پہنا کر ایک نئے رشتے میں بندھ گئے۔

○ ختم شد ○

موت کا بدلہ

منعم اصغر۔ ڈیرہ غازی خان

آدھی رات سے زیادہ کا وقت تھا کہ اچانک دل کو دہلاتی خوفناک چنگھاڑ سنائی دی اور سوتے ہوئے ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھے کہ چشم زدن میں کسی نادیدہ وجود نے نوجوان کو ایک طرف گھسیٹنا شروع کردیا اور پھر.....

رات کے گھٹاٹوپ اندھیرے میں جنم لینے والی اور جسم و جاں کو سحرزدہ کرتی ہولناک کہانی

آج میں ایک بار پھر تازلی کے ساتھ تھا ہمیشہ کی طرح آج بھی وہ میرے سامنے اداس اور خاموش بیٹھی تھی۔ ''تازلی کیا آج بھی ایسے ہی بیٹھی رہو گی خاموش؟'' میں نے اسے دیکھ کر پوچھا کیونکہ آج تیسرا دن تھا کہ وہ ایسے ہی خاموش بیٹھی تھی جیسے کہ منہ میں زبان ہی نہ ہو۔

''کیا کہوں مجھے کچھ نہیں کہنا تم سے تم جان کر کرو گے بھی کیا؟''

وہ ان تین دنوں میں پہلی بار بولی تھی مجھے خوشی ہوئی۔ ''تم بتاؤ تو سہی آخر تمہارا گھر کہاں ہے تم مجھ سے رات میں کیوں ملتی ہو اور تمہارے گھر والے کہاں ہیں؟''

میں نے اسے بولتا دیکھ کر سوال کیا تو اس نے خالی نظروں سے مجھے دیکھا، آج تیسرا دن تھا مجھے اس سے ملتے ہوئے پہلی بار وہ مجھے درخت کے نیچے ملی تھی،

اداس اداس اور خاموش خاموش میں پہلے تو ڈر گیا کہ کوئی روح ہو سکتی ہے مگر وہ لڑکی تھی ایک عام سی، میرے پوچھنے پر وہ کچھ نہ بولی اور اب تیسری رات تھی پتہ نہیں دو دن کو کہاں جاتی مگر رات میں وہ ہمیشہ مجھے درخت کے نیچے کنویں کے منڈیر پر بیٹھی ملتی تھی، میں نے اس کے بارے میں بہت پوچھا مگر وہ خاموش رہتی اور آج بھی ہمیشہ کی طرح بنا جواب دیئے وہ آہستہ سے اٹھی اور وہاں سے چلی گئی۔

☆......☆......☆

عرفان نے ایک بار پھر اپنے دوستوں کے ساتھ مل کر دوبارہ اس گاؤں جانے کا فیصلہ کیا تھا۔

''نہیں یار پچھلی بار جانتے ہو نا کیا ہوا تھا؟'' نوید نے انہیں ڈرانے کی کوشش کی تھی مگر وہ ہنس دیا۔

''ارے کیا ہوا تھا مزہ آیا تھا نا اور جو بھی ہوا بہت سال پہلے ہوا تھا اب تو لوگ اسے بھول بھی گئے ہوں گے، بابا جانی سے اجازت لے لی ہے تم لوگ بس چلنے کی تیاری کرو۔'' اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

پچھلی بار جو بھی ہوا تھا اسے یاد کرکے اس کے چہرے پر کوئی ملال نہ تھا۔ ایسے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ خیر اس کی ضد کے آگے سب دوست ہار مان گئے تھے۔ اس لئے مجبوراً مجھے بھی ہامی بھرنی پڑی۔

عرفان اپنے ماں باپ کا اکلوتا بگڑا ہوا بیٹا تھا۔ ایک گاؤں میں اس کے باپ نے کچھ زمینوں پر باغات لگائے ہوئے تھے، اس جگہ رہنے کے لئے ایک مکان بھی بنا ہوا تھا۔ باغ میں طرح طرح کے پھل فروٹ کے درخت تھے اس لئے وہ ہر بار وہاں جانا پسند کرتا تھا۔

خیر پھر عرفان کے ساتھ میں، نوید، روحیل اور اسد چل پڑے۔ میں وہاں پہلی بار آیا تھا اس لئے راستوں سے بھی انجان تھا۔

گاؤں پہنچ کر سب سے پہلے ہم نے اپنا سامان کمرے میں رکھا اور باغ میں سیر کے لئے نکل پڑے۔ پتہ نہیں کیوں باغ کے قریب ایک جگہ پہنچ کر وہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ اشاروں میں باتیں کرنے لگے۔ اسد چونکہ میرے ساتھ تھا اس لئے وہ ان میں شامل نہیں ہوا تھا کچھ دیر بعد سیر کرکے سب واپس مکان کی طرف لوٹ آئے، اب اندھیرا ہر سو پھیلنے لگا تھا، پھر ہم سب کھانا کھانے کے بعد سو گئے۔

رات کا نجانے کون سا پہر تھا جب ایک خوفناک آواز سنائی دی، وہ آواز ایسی تھی کہ ہم سب لرز کر رہ گئے۔

''آ گئے تم لوگ؟ بہت انتظار کروایا تم لوگوں نے، خیر مجھے مار کر تم زندہ کیسے رہ سکتے ہو، میں تم لوگوں کو جینے نہیں دوں گی۔''

وہ کس کی آواز تھی میں اندازہ نہیں لگا پایا تھا کیونکہ وہ ایک نہیں بلکہ دو تین آوازیں مکس لگتی تھیں مگر اس وقت ہر کسی کو اپنی جان کی پروا تھی۔

دروازہ دو بار بجا اور پھر دروازہ خود بخود کھل گیا۔ میرے تو رونگٹے کھڑے ہو گئے تھے مگر جب دروازہ کھلا تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ مجھے اور بھی زیادہ ڈر لگا مگر ڈر کچھ کم ہوا کہ ہو سکتا ہے کسی نے مذاق کیا ہو۔ اس سے پہلے کہ میں مزید کچھ سوچتا ایک دم عرفان بیڈ سے اچھل کر نیچے اترا اور زور زور سے چلانے لگا۔

''بچاؤ!! مجھے لے کے جا رہی ہے..... مجھے مار ڈالے گی۔ یار مجھے بچا لو'' وہ مجھے دیکھ کر التجا کر رہا تھا۔

مگر میں کرتا بھی تو کیا؟ میری تو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا اور عرفان کو گھسٹتا دیکھ کر ایسا لگ رہا تھا کہ کوئی نادیدہ وجود اسے لے کے جا رہا ہے مگر وہ وجود مجھے نظر نہیں آ رہا تھا، پھر بھی میں نے ہمت کی اور عرفان کو پکڑ لیا۔ ''چھوڑو عرفان کو کون ہو تم کیا چاہتے ہو؟'' میں نے چیخ کر کہا، اور اس کے ساتھ ہی میں ہوا میں اڑتا ہوا بیڈ پر جا گرا، بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے سنا تھا۔

''تم ایک اچھے لڑکے ہو واپس چلے جاؤ یہاں سے کیونکہ ان سب سے بدلہ لئے بغیر مجھے چین نہیں آئے گا، جب مجھے مرنے پر مجبور کیا گیا تو یہ زندہ کیوں رہیں گے، میں انہیں جینے نہیں دوں گی۔''

کچھ دیر بعد میری آنکھ کھلی تو نوید، روحیل اور اسد میرے اردگرد بیٹھے خوف سے کانپ رہے تھے۔ سب

کچھ یاد آتے ہی مجھے عرفان کا خیال آیا تو ایک دم میں خوف سے لرز کر رہ گیا مگر میں نے روحیل، اسد اور نوید کے ساتھ عرفان کی تلاش میں باہر آ گیا۔ ہم باغ میں آ گئے، میں عرفان کو آواز دینے لگا۔ جب روحیل جھاڑیوں کو ہاتھ سے ہٹانے لگا تو اس کا ہاتھ ایسا لگتا تھا کہ اس کا ہاتھ جھاڑی سے چپک گیا ہو۔ میں اس کی مدد کو آگے بڑھا۔ وہ اپنے ہاتھ جھاڑیوں سے ہاتھ نہیں نکال پا رہا تھا۔

''مجھے نکالو یہاں سے۔'' وہ خوف سے حلق پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگا۔ ہم نے بہت کوشش کی مگر ہاتھ نہ نکلا تو ہم سب نے مل کر زور لگایا اور روحیل کو وہاں سے کھینچ لیا۔ اس کی کرب ناک چیخ فضا میں بلند ہوئی اور وہ وہیں گر پڑا۔ جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو جان ہی نکل گئی۔ کیونکہ اب اس کا ایک بازو غائب تھا۔

ہم نے وہاں سے بھاگ جانے میں ہی عافیت جانی اور پورا زور لگا کر بھاگے۔

تبھی نوید زور سے زمین پر گرا اور گھسٹنے لگا جیسے کوئی اس کے پاؤں پکڑ کر اسے گھسیٹ کر لے جا رہا ہو۔ میں اپنے دو دوستوں کو کھو چکا تھا اسے نہیں کھونا چاہتا تھا۔ اس لئے میں نے بھاگ کر اسے پکڑ لیا۔ ''نہیں میں نوید کو نہیں جانے دوں گا تم چاہے کچھ بھی کرلو۔'' میں نے روتے ہوئے کہا۔

پھر نسوانی آواز سنائی دی۔ ''میں نے تمہیں پہلے بھی کہا ہے کہ میری تم سے کوئی دشمنی نہیں۔ تم میرے راستے سے ہٹ جاؤ ورنہ تم بھی مرو گے۔'' اس کے ساتھ ہی اس کی ایک جھلک دکھائی دی، انتہائی بدنما چہرہ!! میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے اور وہ نوید کو بھی گھسیٹتی ہوئی لے گئی۔

☆......☆......☆

وہ رات میری زندگی کی بھیانک ترین رات تھی، میں آج بھی اس کے بارے میں سوچتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں اور ان دونوں کی موت کے بعد نوید بھی مر گیا تھا، میں اور اسد بچ گئے تھے۔

صبح ہوتے ہی ہم نے ان کی تلاش شروع کی تھی، وہ بہت بری حالت میں ملے تھے۔

میں تو اب تک حیران ہوں کہ اس نے مجھے اور اسد کو کیوں چھوڑ دیا تھا اور ان تینوں سے اس کی کیا دشمنی تھی؟ یہ اس رات کو گزرنے کے ایک رات بعد دوسری رات کی یہ بات تھی کہ میں نازلی کو یہ واقعہ سنا رہا تھا۔

''تمہیں دکھ نہیں ہوا؟'' اسے یوں دیکھ کر میں نے پوچھا تو وہ سپاٹ لہجے میں بولی۔''انسان جو بوتا ہے وہی کاٹتا ہے، مجھے کیوں دکھ ہو، کیونکہ انہیں ان کے کئے کی سزا ملی ہے۔'' اس نے پہلی بار سکون سے بات کی تھی، ورنہ وہ ہمیشہ خاموش ہی رہتی یا بے چینی سے ''ہوں'' ''ہاں'' میں جواب دیتی تھی۔

''تم جانتی ہو ان کا گناہ کیا تھا؟'' میں نے حیرانی سے پوچھا تھا۔

''ہاں میں جانتی ہوں، آج سے کچھ سالوں پہلے ایک لڑکی اپنے ماں باپ اور بہن بھائیوں کے ساتھ ہنسی خوشی رہتی تھی کہ ایک دن اچانک تمہارا دوست عرفان گاؤں میں آیا، اس کے ساتھ یہ دونوں بھی تھے، وہ زہر خند لہجے میں بولی۔ لیکن میں خاموش رہا۔

اس لڑکی کی منگنی ہو چکی تھی۔ وہ دن اس لڑکی کی زندگی کا بھیانک ترین دن تھا، وہ اس دن اچھلتی کودتی باغ میں آنکلی تھی۔ اور یہ اس کی بہت بڑی بھول تھی، زندگی کی۔

تمہارے دوستوں نے اسے باغ میں دیکھ لیا تھا۔''

میں نے نوٹ کیا کہ یہ بات کہتے ہوئے اس کے چہرے پر کرب چھا گیا تھا۔

''اور اس معصوم لڑکی کو دیکھتے ہی تمہارے دوستوں کے دماغ میں درندگی گھس گئی اور وہ تینوں اس پر بھوکے بھیڑیے کی طرح جھپٹے تھے، تمہارے تینوں دوستوں نے اس ننھی کلی کو مسل کر رکھ دیا تھا۔''

اس نے ایک گہرا سانس لیا اور اپنے آنسو بے دردی سے صاف کئے میں نے اسے خاموش دیکھا تو اس سے پوچھا۔''تو اسد کو اس نے کیوں چھوڑ دیا؟''

میں نے اس سے پوچھا تھا۔''اس سب میں اسد شامل نہیں تھا اس لئے شاید وہ بچ گیا ہے۔'' وہ اسی سنجیدگی سے بولی۔ ''اچھا پھر آگے کیا ہوا؟'' میں نے اسے بولنے پر اکسایا۔

''ہونا کیا تھا! بات تو صاف ہے جب گھر والوں کو یہ بات پتہ چلی تو قیامت آگئی۔ گاؤں میں طرح طرح کی باتیں ہونے لگیں، یہ صدمہ اس کے ماں باپ نہ سہہ سکے اور اس دنیا سے چل بسے، اس کے بھائی نے اسے گھر سے نکال دیا، اس کے بعد وہ نہ چاہتے ہوئے بھی عرفان کے پاس گئی، اس کے آگے ہاتھ جوڑے، اس کے پاؤں پکڑے مگر وہ نہ مانا اور اس طرح اس نے کنویں میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی تھی۔'' وہ ایک گہرا سانس لے کر ہاتھوں کو آپس میں مسلنے لگی۔

''تم یہ سب کیسے جانتی ہو؟ تم نے بھی تو یہ صرف سن رکھا ہے ناں، اصل بات تو تمہیں بھی نہیں پتہ۔''

وہ میری طرف دیکھنے لگی۔''آج تمہیں ایک اور حقیقت بھی بتا ہی دیتی ہوں کہ وہ لڑکی میں ہی ہوں، میں نے مارا ہے تمہارے دوستوں کو کیونکہ جب انہوں نے مجھے مارا تو میں انہیں کیوں جینے دیتی۔ یہ بات تو جائز ہے ناں کہ موت کا بدلہ موت ہونا چاہئے۔'' اور اس کی بات پر میں اچھل پڑا۔

اس نے میری طرف دیکھا اس کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے اس نے سر جھکا لیا، پھر اس نے اپنا سر اوپر کو اٹھایا اور گھمبیر لہجے میں بولی۔''اب میں چلتی ہوں کیونکہ میرا بدلہ پورا ہو گیا ہے۔'' وہ اٹھ کر جانے لگی اور میں بے چین سا ہو گیا۔''نازلی'' میری بات پر وہ رکی۔''مت جاؤ پلیز!''

''ہوں'' اس کے ہونٹوں پر زہریلی ہنسی عود کر آئی۔''میں نہیں رک سکتی، میں جا رہی ہوں اپنوں کے پاس۔'' کہتے ہوئے وہ ایک دم غائب ہو گئی اور میں بوجھل دل کے ساتھ واپس گھر لوٹ آیا۔